زنجیر



پیش لفظ

اس منفرد ناول کو ہم نے پچیس برس پہلے ایک ماہنامے کے لیے قلمی نام سے لکھا تھا۔ یہ اُس ماہنامے میں قسط وار شائع ہوا اور اِسے پڑھنے والوں نے بے حد پسند کیا۔ مختلف موضوعات پر ہم نے متعدد ناول لکھے ہیں مگر اُن میں یہ ناول الگ حیثیت کا حامل ہے۔ یہ تحریکِ آزادی کے جاں بازوں کا قصہ ہے، تحریکِ آزادی کی وہ تاریخ ہے جو اِس سے پہلے کبھی نہیں لکھی گئی۔ یہ اولوالعزم اور کفن بردوش نوجوانوں کی سرگذشت ہے۔ یہ اچھوتا ناول کتابی صورت میں پہلی بار شائع کیا جا رہا ہے۔

یہ ناول ہے تو تاریخی لیکن یہ ماضیٔ بعید کی نہیں بلکہ ماضیٔ قریب کی تاریخ ہے، جدوجہدِ آزادی کا آئینہ ہے۔ تحریکِ آزادی کی نوے سالہ جدوجہد دراصل دو سمتوں میں کی گئی تھی۔ اس کی ایک سمت یا جہت سیاسی پلیٹ فارم تھا اور دوسری جہت یا سمت زیرِ زمین سرگرمیاں!

یہ سرگذشت زیرِ زمین کام کرنے والے اُن سرفروشوں کی جاں بازی پر مشتمل ہے جنھوں نے سامراجی قوت کے ایوان لرزا دیے تھے، اِنھی جاں بازوں نے مشرق سے مغرب تک پھیلی ہوئی عظیم طاقت کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ سیاسی پلیٹ فارم پر ہمارے رہنماؤں سے مصالحانہ گفتگو کرے۔

یہ خوں چکاں سرگذشت نئی نسل کے لیے معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ جنگِ آزادی ہم نے کس کس انداز میں اور کس کس پہلو سے لڑی نیز کس طرح فتح حاصل کی؟ اِن تمام سوالوں کا جواب یہ سرگذشت ہے۔

ہمیں یقین ہے کہ یہ ناول آپ کے ذوقِ مطالعہ پر پورا اُترے گا۔

طالبِ دُعا
شمیم نوید

اِنتساب

نئی نسل کی نمائندگی کرنے والے اپنے بچوں
باذل نوید، ابریز نوید اور انوشہ نوید کے نام

بولیں اماں محمد علی کی۔

جان بیٹا خلافت پہ دے دو

اندلسی نے بیل گاڑی ہانکتے ہوئے پُر سوز تان اٹھائی۔ یہ تان دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں لہلہاتی فصلوں کے خوشوں اور پھلوں سے لدے ہوئے درختوں کی بالائی پھننگوں کو چومتی آسمانوں کی طرف بیر گئی۔ اندلسی کی آواز میں کچھ ایسا ہی کرب تھا کہ میرا دل بوجھل ہو گیا، یہ نالۂ جہاد اب محض ایک حسین آرزو کی شہادت کا مرثیہ بن کر رہ گیا تھا۔ بھلا اب خلافت پر جان دینے سے کیا فائدہ تھا؟ مجھے ہندوستان کے مسلمانوں کی سادہ لوحی پر ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی! جو اب بھی خلافت کے تحفظ کے لیے تڑپ رہے تھے، فنڈ جمع کر کے ترکی بھیج رہے تھے، طبی وفد بھیج رہے تھے اور جن کے لیڈر ہندوستان کے انگریز وائسرائے کو بار بار تنبیہیں کر رہے تھے کہ ترک خلیفہ اور خلافت کے معاملے میں اسلامیانِ ہند کے مذہبی جذبات کا خیال رکھا جائے۔ یہ دھمکیاں وہ اس انگریز حکومت کو دے رہے تھے جس نے تیس پینتیس برس سے مشرقِ وسطیٰ میں مسلم وحدت کی سب سے بڑی علامت، خلافت ترکیہ کی اینٹ سے اینٹ بجانے کے لیے اپنے مختلف کارندوں، سیاحوں اور مشنوں کے ذریعے عربوں کی عصبیت کو ہوا دی تھی۔

''جان بیٹا خلافت پہ دے دو۔'' اندلسی کی درد میں ڈوبی ہوئی آواز پھر ابھری۔

بی اماں! کیوں دے دے محمد علی خلافت پہ جان؟ میں نے بڑے دکھ سے سوچا۔ کیا تمہارا بیٹا محمد علی جو ہر فالتو ہے؟ کیا تمہارے وہ بیٹے جو جو ہر کی آواز پر لبیک کہہ رہے ہیں، فالتو ہیں کہ خلافت پہ جان دے دیں۔ بی اماں، تم مکے کے شریف حسین سے کیوں نہیں کہتیں، عرب کے ان شیوخ سے خلافت پر جان دینے کو کیوں نہیں کہتیں جو مسلمان بنتے ہیں، عربی ہیں، رسولِ عربیؐ کی امت ہیں، پانچوں وقت نمازیں پڑھتے ہیں پھر بھی اس خلافت کی پیٹھ میں خنجر گھونپ چکے ہیں جس کی خاطر تم اپنے بیٹوں کو قربان ہو جانے کی تلقین

کر رہی ہو؟ بی اماں کچھ تو سوچو، یہ کہاں کا انصاف ہے؟ میں نے تصور ہی تصور میں مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی کی والدہ، بی اماں سے سوال کیے مگر بی اماں تصور میں بھی خاموش رہیں۔

''جان بیٹا خلافت پہ دے دو'' اندلسی کی زخمی آواز پھڑ پھڑا کر اڑی۔ بیل گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے اونچے نیچے، ناہموار راستے پر ہچکولے کھاتی اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اندلسی اپنی تان اڑانے اور بیلوں کو ہانکنے میں مصروف تھا۔ آسمان سے گرم سورج آگ برسا رہا تھا اور افق پر سیاہ بادل امنڈ رہے تھے۔ شاید آج تمام دنیا کے مسلمان کھلے آسمان تلے، جلتے سورج کے نیچے محوِ سفر ہیں۔ نہ کوئی مہربان شجر سایہ دار کہ پناہ دے، نہ کوئی مہربان آواز جو تسلی دے، نہ کوئی ہمدرد ہاتھ کہ زخموں پر مرہم رکھے۔ سر پر غلامی کی لٹکتی ہوئی شمشیریں، پیروں تلے ذلتوں اور رسوائیوں کے کانٹے، بس یہی کچھ رختِ سفر ہے اس قوم کا! میں سوچتا رہا۔ اندلسی کی خون روتی آواز پھر ابھری۔ میں نے اپنے بقیہ ساتھیوں صحرائی اور کوہستانی کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھیں بھی میری طرح نم تھیں۔ شاید وہ بھی وہی کچھ سوچ رہے تھے جو میں سوچ رہا تھا مگر ان کی آنکھوں میں نمی کے پیچھے مجھے عزم اور امید کے دیے لو دیتے محسوس ہوئے۔

''بولیں اماں محمد علی کی، جان بیٹا خلافت پہ دے دو'' ایک پُر خلوص نالہ پھر آسمان کی طرف لپکا۔ مگر میں جانتا تھا یہ نالہ، نارسا ہے۔ یہ خواہش بے تال ہے۔ محمد علی جان بھی دے دے تو کیا حاصل؟ آج محمد علی کی ہر قربانی بے سود ہو چکی۔ ہے اماں بی! میں نے پھر خیال میں اماں بی سے کہا۔ ترک عثمانی خلافت کے تار و پود بکھر چکے ہیں، عرب محض عرب بن چکے ہیں، ترک صرف ترک، وہ مسلمان نہیں رہے اماں بی! انگریز ہندوستان کی طرح ترک عثمانی خلافت کے مقابلے میں بہت سے میر جعفر اور میر صادق پیدا کر چکا ہے۔ اسپین اور ہندوستان کی طرح مشرق وسطیٰ میں بھی فرنگی سیاست نے مسلمانوں کو مسلمانوں سے لڑوا کر، ان کی طاقت کو کمزور کر کے اپنے مخصوص استحصالی اقتدار کو مستحکم کر لیا ہے۔ ''بولیں اماں......'' خاموش رہو اماں بی! کیوں محمد علی کو خودکشی پر اکسا رہی ہو! دیکھو اماں بی ادھر دیکھو، شریفِ مکہ حسین، انگریزوں کے سہارے عرب کا بادشاہ بننے کے خواب دیکھ رہا ہے اس کا ایک بیٹا شام کا بادشاہ بن گیا ہے دوسرا عرق کا! انگریزوں نے فرانسیسیوں اور روسیوں سے ایک معاہدے کے تحت ترک سلطنت کے عرب علاقوں کو آپس میں بانٹنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ اب عربوں کے سرپرست ہوں گے کیونکہ انہوں نے ترک عثمانی خلافت

کی ایسی تیسی کر دی ہے۔ نہیں اماں بی، محمد علی کو خلافت پر جان دینے کے لیے مت اکساؤ محمد علی کی یہاں ہندوستان میں ضرورت ہے، یہاں ہندوستان میں! اس سے کہو کہ وہ اس انگریز کے خلاف اٹھ کھڑا ہو جو دنیا کے ہر مسلمان کا دشمن ہے۔

یہ خیالات میرے ہی نہیں، میرے ان تینوں ساتھیوں کے بھی ہیں جن کے ساتھ میں اس وقت بیل گاڑی میں سفر کر رہا تھا اور یہ خیالات ہمارے ان ساتھیوں کے بھی تھے جو ہماری خفیہ تنظیم سے وابستہ تھے۔ ہمارے یہ خیالات اس وقت کے عام ہندوستانی مسلمان سے مختلف تھے۔ جو خلافت پر جان دینے کے عملی مظاہرے کر رہے تھے جنہوں نے خلافت کے تحفظ کی خاطر سرکاری عہدے چھوڑ کر نا کام ہجرت کی صعوبتیں جھیلی تھیں، جن پر افغانستان کے دروازے بند کر دیے گئے تھے۔ ہمارے یہ خیالات ان مسلمانوں سے بھی مختلف تھے جنہوں نے ریشمی رومال کی تحریک میں حصہ لیا تھا اور ہمارے یہ خیالات ان مسلمانوں سے بھی مختلف تھے جن میں سے ایک نے یعنی ملتان کے نواب نے، نہایت عیاری کے ساتھ ریشمی رومال کی تحریک کا بھانڈا پھوڑ کر انگریز کی نمک حلالی کا ثبوت دیا تھا۔

ہم سب، یعنی خفیہ تحریک کے اراکین، انگریز کے خلاف خفیہ اور مسلح جدوجہد کے قائل تھے۔ ہم چھاپا مار جنگ کے قائل تھے، وہ جنگ جس کا نقشہ ہمارے سالارِ اعلیٰ نے تیار کیا تھا، وہ جنگ جس کا مقصد نظم و نسق کو تباہ کر کے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں افراتفری پھیلانا تھا تاکہ انگریزوں کو جلد از جلد ہندوستان چھوڑنے کے لیے ہندوستانی رہنماؤں کی شرائط مان لینے پر جھکایا جا سکے۔ یہ ایک طویل، صبر آزما اور قربانیوں کی راہ تھی۔

اور اس وقت ہم چاروں کامریڈ یعنی میں، اندلسی، صحرائی اور کوہستانی اسی جنگ کا آغاز کرنے کے لیے ایک مہم کی تکمیل پر نکلے تھے اس مہم کے ساتھ ہی انگریزوں کے خلاف ہماری کارروائیوں کا آغاز ہوتا تھا اور اس مہم کا سربراہ میں تھا۔ روانگی سے قبل ہمارے سالارِ اعظم نے کہا تھا۔ ''کفن پوش مجاہدو! تم ہماری جدوجہد کا ہراول ہو۔ تمہیں ہر قیمت پر اس مہم کو کامیاب بنانا ہے۔ آزادی تم سے خون طلب کر رہی ہے۔ اپنی جان دینے سے دریغ نہ کرنا۔ یاد رکھو ہم نے اپنی قوم کی آزادی کے لیے موت سے یاری کی ہے۔ جاؤ خدا تمہارا حامی اور ناصر ہے''۔

''بولیں اماں......'' اندلسی نے پھر تان اڑائی۔

''چپ رہو یار!'' میں نے کہا۔ ''مت جی جلاؤ''۔

''یہ تو نوحہ ہے میرے دوست!'' اندلسی نے کہا۔ ''اس قوم کے بے حس شیوخ کا جو

محض سونے، دولت اور سلطنت کی لالچ میں انگریزوں کے کاسہ لیس بن گئے ہیں''۔

ہاں یہ نوحہ یہ تھا۔ ان عربوں اور ترکوں کو کیا پتا تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی کیا حالت تھی؟ اسلامیانِ ہند تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ دیارِ رسولؐ سے قربت رکھنے والے، ان علاقوں کے رہنے والے بھی، جو سب سے پہلے آغوش اسلام میں داخل ہوئے تھے، میر جعفر اور میر صادق پیدا کر سکتے ہیں۔ وہ تو بس اسی خام خیالی میں مبتلا تھے کہ ان علاقوں کے لوگ جہاں کئی صحابیوں اور خلفاء کے قدم پہنچے ہیں، ان سے بہتر مسلمان تھے اور اسلام کے مجاہد تھے۔

میں سوچتا، سوچتا رہا اور میرے کانوں میں اپنے سالار کی آواز گونجی۔ ''ہندوستانی مسلمان پاگل اور احمق ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ایک غلام ملک کے غلام مسلمان اپنے انگریز آقا کی مرضی کے خلاف کسی کی مدد نہیں کر سکتے۔ خلافت پر جان ضرور دو مگر اس سے پہلے انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرو، آزادی حاصل کرو، پھر آزاد قوم کی حیثیت سے اپنی فوج کو خلافت کے تحفظ کے لیے بھیجو اور پھر میرے دوستو، میرے سرفروشو، میرے کفن پوش مجاہدو! ذرا سی خود غرضی کے ساتھ بھی سوچو۔ ہم ہندوستانی مسلمانوں پر کب سے ستم نہیں ٹوٹ رہے۔ جنگ پلاسی سے لے کر 1857ء تک ہم پر کیا کیا قیامتیں نہیں ٹوٹیں اور اس کے بعد سے اب تک ہمیں قعرِ مذلت میں دھکیلنے کے لیے بھوک، غربت اور جہالت کے گڑھے میں پھینکنے کے لیے کیا کیا نہیں کیا گیا۔ اس وقت ترکی یا عرب کے کس محمد علی نے ہمارے لئے کلمۂ خیر نکالا۔ کس عثمانی خلیفہ یا شریفِ مکہ نے ہم سے ہمدردی کا اظہار کیا! دوستو یہ سب بے حسی، یہ تمام سرد مہری زوال کے پاتال میں دفن قوم کا طرۂ خاص ہے۔ سو ہمارا یہ فرض ہے کہ پہلے ہم اس زوال سے اور اس غلامی سے نجات حاصل کریں جس پر ہم قانع ہو چکے ہیں''۔

یہ تھی ہمارے سالار کی آواز، اس سالار کی آواز جس کی شخصیت اور نام سے ہم ناواقف تھے۔ اس نے شوقِ شہادت سے سرشار چند سرفروشوں پر مشتمل ایک خفیہ تنظیم بنائی تھی۔

''میرے مجاہدو!'' ایک موقع پر اس نے کہا تھا۔ ''اس خفیہ تنظیم کا مقصد غلامی کی افیون کے نشے میں بدمست قوم اور اس کے سیاسی لیڈروں کو عملی طور پر بتانا ہے کہ آزادی کی راہ انسانی لہو سے تیار ہوتی ہے۔ آزادی کے لیے کاسۂ گدائی نہیں پھیلایا جاتا، تلوار اٹھائی جاتی ہے۔ آزادی تحفے کے طور پر کسی کو نہیں بخشی جاتی، اپنے زورِ بازو سے چھینی جاتی ہے۔ ہمارے سیاسی لیڈر، سیاسی محاذ پر اپنی صلاحیتوں اور اپنے نظریات کے مطابق سیاسی

جنگ لڑ رہے ہیں۔ ہم ان کا بازوئے شمشیر بن کر کام کریں گے۔ ہم محدود پیمانے پر چھاپہ مار کارروائیاں شروع کر کے اس ملک کے غلام عوام کے دلوں میں آزادی کی بجھی ہوئی چنگاری کو بھڑکا کر الاؤ بنا دیں گے۔ ہم خاص طور پر مسلمان رہنماؤں کو اس بات پر مجبور کریں گے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ قومی حیثیت تسلیم کرائیں۔ ہم اس راہ پر چل رہے ہیں جو قربانیوں کی راہ ہے۔ اس راہ میں ہمیں صرف جان دینی ہے۔ ہم سب کفن پوش ہیں۔ ہمیں کسی صلے کی تمنا نہیں کسی ستائش کی پروا نہیں''۔

ہاں! یہ تھی ہمارے سالار کی آواز جو ہمارے دلوں کو گرماتی بھی تھی اور برماتی بھی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ''ہماری یہ جدوجہد صرف انگریزوں کے خلاف ہی نہیں بلکہ ان قوم فروشوں کے خلاف بھی ہے جو جعفر و صادق کے جانشین ہیں، جنہوں نے ملت فروشی کے عوض سر اور خان بہادر کے خطاب حاصل کر کے انگریزوں کی وفاداری میں اچھی نسل کے کتوں کو بھی شرما دیا ہے اور جس کے عوض انہیں القابات کے ساتھ جاگیرداریوں اور زمینداریوں کا راتب ملا ہے''۔ جس وقت سالار نے یہ جملے کہے، میرے دماغ میں پے در پے دھماکے ہوئے تھے۔ ایسے لوگوں میں میرا باپ بھی شامل تھا۔ اسے خان بہادری کا خطاب ملا تھا اور دوسری طرف میرا چچا تھا جو انگریز دشمنی کی پاداش میں مقید ہوا تھا اور کالے پانی کی سزا پا کر انڈیمان میں موت کی نیند جا سویا تھا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ میرا چچا تو میرے لیے مینارہ نور تھا اور میرا باپ میرے لیے باعث ندامت!

سالار اعظم ایک سچا مومن تھا وہ انگریزوں اور ہندوؤں ہی کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے ہر دشمن کا دشمن تھا، وہ سراپا آگ تھا، آتش فشاں تھا۔ انقلاب اور بغاوت کی آگ اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ سراج الدولہ، ٹیپو سلطان، حیدر علی اور بخت خان کی روحیں اس میں حلول کر گئی تھیں۔ وہ ہندوستان کے مسلم رہنماؤں کی سیاست کو اسلامیانِ ہند کے حق میں سم قاتل سمجھتا تھا۔ اسے ایک مسلمان کی حیثیت سے تحریکِ خلافت سے ہمدردی تھی لیکن ساتھ ہی اسے بے سود بھی سمجھتا تھا۔ وہ اس تحریک کو اسلامیانِ ہند کی توانائی اور وقت کا زیاں سمجھتا تھا۔ اس کے سیاسی تجزیئے، دوسرے مسلم رہنماؤں کے سیاسی تجزیوں سے مختلف تھے۔ وہ کہتا تھا کہ اس وقت جبکہ مکے کا شریف حسین اور دوسرے کرد اور عرب شیوخ ترکوں اور عثمانی خلافت کے خلاف انگریزوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں اور خلافت کے حلقوم کو اپنی عصبیت اور حرص و طمع کی شمشیر سے چھید رہے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کو خلافت کی قربان گاہ پر دھکیلنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

ہم سب یعنی اس خفیہ تنظیم کے ارکان اپنے سالارِ اعلیٰ کے ان خیالات سے قطعی متفق تھے لیکن المیہ یہ تھا کہ اس وقت جو جذباتی فضا قائم ہو چکی تھی اس میں محققل و دانش کی اس آواز کو سننے والا کوئی نہ تھا۔ تحریک خلافت ہندوستان کا سب سے بڑا سیاسی مسئلہ بنی ہوئی تھی جبکہ عربوں کا سب سے بڑا قومی مقصد ترک خلافت کا خاتمہ تھا جو حاصل ہو چکا تھا اور ترک پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کی شکست کے ساتھ ہی میسوپاٹامیہ اور عرب علاقوں سے انگریز اور عرب بدوؤں کی فوج کی یلغار کے سبب پسپائی اختیار کر چکے تھے۔

ان ہی خیالات کی بنا پر ایک اجتماع کے موقع پر جب مختلف سیاستداں لکھنؤ آئے تھے تو ایک ملاقات میں، میں مولانا محمد علی جوہر سے الجھ گیا تھا اس موقع پر ولایت علی بمبوق بھی موجود تھے جو مولانا کے اخبار کامریڈ میں زبردست کالم لکھا کرتے تھے۔ اسی اخبار کی مناسبت سے ہم تمام ساتھی ایک دوسرے کو کامریڈ کہہ کر پکارتے تھے۔ اس موقع پر میں مولانا محمد علی جوہر سے اڑ گیا اور خلافت تحریک کی بے معنویت پر گفتگو کی اور وہی تمام دلائل خلافت تحریک کی مخالفت میں پیش کیے جو ہماری تنظیم کے اراکین کے سامنے ہمارا سالار اعظم پیش کیا کرتا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر میری باتوں کو دلچسپی سے سنتے رہے اور متبسم ہو کر فرمایا۔

''نوجوان! تم بہت جذباتی ہو۔ لہو گرم ہے تمہارا!'' ان کی تیز آنکھیں میرے چہرے پر جمی رہیں۔ ''ابھی ناسمجھ ہو، سیاست کی باریکیوں کو تم نہیں سمجھ سکتے''۔

''جناب!'' میں نے نہایت ادب سے کہا۔ ''آپ مجھے اتنا بتا دیجیے کہ اگر ہندوستان کے تمام مسلمان خلافت پر جان دے دیں، اپنا مال و متاع لٹا دیں تو کیا خلافت بچ جائے گی! میرا خیال ہے ہرگز نہیں۔ یہ اتنی موٹی سی بات جو میری سمجھ میں آ سکتی ہے، آخر آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی! میں خوب جانتا ہوں کہ آپ بھی اس جدوجہد کے مآل سے واقف ہیں۔''

''اچھا'' مولانا محمد علی جوہر نے کہا۔ ''مگر بیٹا مجھے معلوم نہیں تھا۔ ویسے تم یہ بتاؤ کہ تمہارے نزدیک اس مسئلے کا کیا حل ہے؟''

مسلح جدوجہد!'' میں نے تڑ سے جواب دیا۔ ''چھاپا مار جنگ!''

''اس کے لیے ہندوستان کی فضا سازگار نہیں ہے بیٹے!'' مولانا محمد علی جوہر نے کہا۔ ''اگر فضا سازگار ہوتی تو تم جوہر کو سیاستداں کے روپ میں نہیں ایک چھاپا مار فوج کے قائد کے روپ میں دیکھتے۔''

''فضا سازگار ہے جناب!'' میں نے کہا تھا۔

''نہیں ہے! نہیں ہے! نہیں ہے!'' مولانا محمد علی جوہر نے نہایت جوشیلے انداز میں کہا۔ ''ہم منافقوں اور مخبروں میں گھرے ہوئے ہیں۔ سیاستداں ہوں، یا طالب علم، تاجر ہوں یا اساتذہ ہر طبقے اور ہر شعبے میں مخبروں اور قوم فروشوں کا جال بچھا ہوا ہے۔'' ان کی آواز بلند ہوتی گئی۔ ''تم نہیں جان سکتے کہ تمہارا کون سا ہمدرد، کون سا رفیق، مارِ آستین ہو گا۔ چھاپا مار جنگیں افراد لڑتے ہیں۔ مگر انہیں پوری قوم کی ہمدردیاں حاصل ہوتی ہیں۔ اس ہندوستان میں آج الٰہی بخشوں، میر جعفروں، میر صادقوں کی بہتات ہے۔'' وہ خاموش ہو گئے ایک تکلیف دہ سناٹا کمرے میں پھیل گیا۔ ''بمبوق تم اس نوجوان کو سمجھاؤ۔'' انہوں نے کہا تھا۔

مگر ولایت علی بمبوق مجھے کیا سمجھا سکتے تھے۔ جس راہ پر میں چل نکلا تھا، وہ خود انہوں نے مجھے دکھائی تھی۔ خود انہوں نے ہی سالار اعظم سے میرا تعارف کرایا تھا۔ سالار اعظم کون تھا؟ اس کا نام کیا تھا؟ وہ کہاں رہتا تھا؟ یہ تو مجھے اس وقت بھی، جبکہ میں تین ساتھیوں کے ہمراہ بیل گاڑی میں سفر کر رہا تھا، معلوم نہیں تھا البتہ ولایت علی بمبوق نے مجھے سالار اعظم کے بارے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ ایک انقلابی مسلمان ہے۔ جنوبی ہندوستان سے اس کا تعلق ہے وہ کافی عرصہ جنوبی افریقہ میں رہا ہے اور وہاں انگریزوں کے خلاف ڈی ویٹ کی کمان میں بوئروں کی طرف سے کئی معرکوں میں شرکت کر چکا ہے۔ اسے چھاپا مار جنگوں کا خاصا تجربہ ہے۔ جنوبی افریقہ میں انگریزوں کی کامیابی کے بعد وہ وہاں سے فرار ہو کر ہندوستان آ گیا۔ اب وہ یہاں مسلح چھاپا مار جدوجہد منظم کرنے کا پروگرام رکھتا ہے۔ یہ تمام کچھ انتہائی رازداری کے ساتھ ہو رہا تھا۔ ولایت علی بمبوق نے کہا۔ ''یوں سمجھ کہ میں نے اسی رازداری کے سبب یہ بات مولانا جوہر کو بھی نہیں بتائی۔''

بہر حال میں نے بھی کلام پاک پر ہاتھ رکھ کر رازداری کا عہد کیا تھا اور الحمدللہ میں وہ منافق نہیں کہ کلام پاک بیچ میں لا کر بھی عہد شکنی کروں۔ اس کے بعد ولایت علی بمبوق نے سالار اعظم سے میری ملاقات لکھنؤ کے ایک ہوٹل کے اس کمرے میں کرائی جس میں ولایت علی بمبوق ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس ملاقات کے وقت کمرے میں تاریکی تھی۔ ایک کمرے میں پتلی سی موم بتی روشن تھی۔ میں اسی موم بتی کے پاس ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر سیاہ نقاب تھی اور سر پر ہیٹ تھا اور لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ آواز بدل کر بول رہا ہے۔ میری اس سے تمام گفتگو انگریزی ہی میں ہوئی تھی۔

'' بولیں اماں محمد علی کی۔'' کامریڈ اندلسی کا نغمہ پھر جاری ہو گیا تھا۔ یہ وہ نغمہ تھا جو چھ ماہ قبل تک اسلامیان ہند کا جنگی ترانہ تھا۔ یہ ترانہ انہیں جذبۂ شہادت سے سرشار کر کے نئی توانائی بخشتا ہے مگر یہ ترانہ محض ایک مرثیہ بن کر رہ گیا تھا۔ اسلامیانِ ہند پر شام غریباں اتر آئی تھی۔ تمام امنگیں، آرزوئیں اور امیدیں اس کربلا میں مقتول ہو چکی تھیں جو مسلمانوں نے انگریزوں کے تعاون سے نہایت اہتمام کے ساتھ سجائی تھیں۔ اب ہر طرف مسلم امیدوں کے لاشے، خون میں غلطیدہ، سر بریدہ، ریت پر پڑے تھے۔ خیمے جل رہے تھے۔ تقدیس و تہذیب اور معاشرت کے سروں سے چادر کھینچ لی گئی تھی، پیاسے حوصلوں کے خشک ہونٹوں پر پپڑیاں جمی تھیں اور حلقوم میں تیر پیوست تھے۔ انگریز وزیراعظم لائڈ جارج ترک حکومت کے عرب حصوں کو پانچ ٹکڑوں میں تقسیم کر کے بڑے کروفر سے عثمانی خلافت کے کاسۂ سر پر قمچیاں مارہا تھا اور خوش تھا کہ اس نے مسلم مرکزیت کی سب سے بڑی علامت کو ختم کر دیا ہے۔ کتنا بھیانک تھا یہ انجام، کیسا مایوس کن تھا یہ ماحول! اس کے باوجود میرے ساتھیوں کو اور مجھے یہ یقین تھا کہ وہ دن ضرور طلوع ہو گا کہ جب کوئی شریف حسین، کوئی عرب شیخ، کوئی مسلمان لارنس آف عریبیا کے ابلیسی دام کا شکار نہیں ہو گا۔

بیل گاڑی بڑھتی رہی۔ کامریڈ اندلسی غم سے بوجھل آواز میں مرثیے کے انداز میں بار بار وہی شعر الاپتا رہا۔ اس شعر کے ہر ہر لفظ اور لحن کے ہر اتار چڑھاؤ کے ساتھ میرے دل میں انگریزوں کے خلاف بڑھتی ہوئی آگ اور تیز ہو گئی۔ مسلمانوں کے اس بدترین دشمن کے خلاف نفرت کی، ایک چنگاری ہمیشہ میرے دل میں موجود تھی مگر سالارِ اعظم کی قیادت اور اس کے فلسفۂ جدوجہد نے اس چنگاری کو الاؤ بنا دیا تھا۔

'' نفرت اور محبت!'' سالار اعظم نے ایک میٹنگ میں کہا تھا۔'' یہی وہ دو جذبے ہیں جو انسان کو عزم اور حوصلہ عطا کرتے ہیں اور ہمارے پاس ان دونوں جذبوں کی نعمت ہے۔ ہمیں نفرت ہے مسلمان کے ہر دشمن سے! ہمیں محبت ہے ہر مسلمان سے اور اپنے نصب العین سے، لہٰذا مجاہدو، نفرت اور محبت کے ان دونوں جذبوں کی لو تیز کرتے رہو، اور تیز کرتے رہو، یہاں تک کہ تمہارا دشمن اس میں بھسم ہو جائے اور یہ آگ تمہارے دوستوں کے لیے گلزار ابراہیم میں تبدیل ہو جائے۔''

'' بولیں اماں محمد علی کی۔'' کامریڈ اندلسی کی آواز پھر ابھری۔

'' جان بیٹا خلافت پہ دے دو۔'' قریب ہی کھیت میں کام کرتے کسان خاندان نے ایک لحن میں، کورس کے انداز میں ٹکڑا پورا کر دیا۔

'' بولیں اماں محمد علی کی۔'' اس مرتبہ کامریڈ اندلسی کے ساتھ ہم تینوں نے بھی یہ مصرعہ الاپا۔ شاید میں بھی اس وقت جذبات کی رو میں بہہ گیا تھا۔

اور جواب میں، آس پاس کھیتوں پر کام کرتے ہوئے کسانوں نے ایک تان میں دوسرا مصرعہ پورا کیا۔ ذرا دیر تک پورا ماحول اسی شعر کی تکرار سے گونجتا رہا۔ ہم چاروں، یعنی میں، کامریڈ اندلسی، کامریڈ صحرائی اور کامریڈ کوہستانی اب بیل گاڑی میں کھڑے تھے۔ کسان اپنا کام چھوڑ کر، پُر جوش انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر گویا ہمارا خیر مقدم کر رہے تھے۔ یہ گویا ایک اجتماعی جدوجہد میں ان کی خاموش رفاقت اور وابستگی کا اظہار تھا۔ جواب میں ہم چاروں نے بھی ہاتھ ہلا کر ان کے ساتھ وابستگی کی توثیق کی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ محبت اور یگانگت کا ایک مقدس رشتہ ہمارے مابین قائم ہے۔ ہم سب پیار اور محبت کے ایک سمندر میں تیر رہے ہیں۔ اپنائیت کے اس شدید احساس اور حالات کی مایوس کن روش کی بنا پر میرا دل غم سے اور بھی نڈھال ہو گیا۔

'' کہاں جاوت ہو بھیا؟'' کچے راستے کی دائیں طرف کھیت سے ایک نوجوان کاشتکار نے بلند آواز میں پوچھا۔

'' امروہے۔'' میں نے اونچی آواز میں جواب دیا۔

'' آوت کہاں سے ہو؟'' اس نے پھر سوال کیا۔

'' مرادآباد سے۔'' میں نے اسے بتایا۔

'' تنک آرام کر لیو ہم گریبن کا پاس۔'' اس نے نہایت خلوص سے دعوت دی۔

کامریڈ اندلسی نے ایک جھاڑی کے پاس گاڑی روک دی۔ تھوڑی دیر بعد ہم چاروں کامریڈ، لال املی کے ایک گھنے درخت کے سائے میں بیٹھے، مکھن چپڑی بیسنی روٹیوں سے بیٹھے اور رسیلے آم کھا رہے تھے۔ قریب ہی، رہٹ کی روں روں کا جلترنگ مسلسل بج رہا تھا۔ آم اور جامن کے گھنے درختوں میں کہیں کوئی کوئل میٹھی پی ہو، پی ہو کی صدا لگا رہی تھی۔ نرم نرم ہوا کھڑی فصلوں کے نرم و نازک پودوں سے سرسراتی گزر رہی تھی۔ سامنے امرود کے درخت کے تھانولے پر بیٹھا ایک ہد ہد درخت کے تنے کو کھود رہا تھا اور اوپری شاخ پر بیٹھا ہوا نیل کنٹھ بڑی دلچسپی سے ہدہد کی اس کارروائی کو دیکھنے میں منہمک تھا۔ فاختائیں اور چڑیاں کھیت کی منڈیر پر بیٹھی دانہ دنکا چننے اور چہچہانے میں مصروف تھیں۔ دور ایک کھیت میں کھڑا ہوا ایک کسان گوپھن سے پتھر چلا کر چڑیوں کو اڑا رہا تھا۔ اس تمام ماحول میں امن اور سکون کی ایک موسیقی تھی مگر یہی موسیقی ہماری بے کلی

میں اضافہ بھی کر رہی تھی۔

علم دین ہم سے خلافت اور خلیفہ کے بارے میں مسلسل سوالات کیے جا رہا تھا۔ سوال نہایت سیدھے سادے تھے اور اس کی سادہ لوحی اور بے خبری کے غماز بھی! وہ کروڑوں ہندوستانی کاشتکاروں میں سے تھا جن کے پاس خبریں بہت دیر سے پہنچتی ہیں۔ اس بیچارے کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ ترک عثمانی خلیفہ سلطان عبدالحمید اب محض نام کا خلیفہ رہ گیا تھا۔ اس کی باگیں اب انگریزوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ وہ اب مسلمانوں کا خلیفہ نہیں رہا، انگریزوں کا کٹھ پتلی بن گیا ہے۔ انگریزوں نے مسلمانوں کی قوت کو منتشر کر دیا ہے۔ علم دین کو تو بس اتنا معلوم تھا کہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی، خلیفہ کی مدد کے لیے جہاد کر رہے ہیں اور لوگوں کو جہاد پر آمادہ کر رہے ہیں اور اس جہاد میں کامیابی کے بعد مسلمانوں کی حکومت قائم ہوگی۔ گورے کافروں کی حکومت ختم ہو جائے گی اور ہندوستان میں پھر دودھ اور شہد کی نہریں بہنے لگیں گی۔

”محمدی جھنڈا کب لہراوے گا لال قلعے پر؟“ علم دین نے سوال کیا۔

میں اسے کیسے سمجھاتا کہ علم دین خلافت کی تحریک سے لال قلعے پر محمدی جھنڈا نہیں لہرائے گا، تیری کوئی مصیبت کم نہیں ہوگی تو پھر بھی غلام ہندوستان کا غلام کاشتکار رہے گا۔ تیرے خون پسینے کی کمائی انگریز ہڑپ کرتا رہے گا۔ ہندو بنیا تجھے یوں ہی قرضے اور سود در سود کے جال میں پھنسا کر خوفناک مکڑی کی طرح تجھے چوستا رہے گا۔

”جلدی لہرائے گا علم دین!“ میں نے اسے تسلی دی۔ بھلا میں کیوں اس کی آس کو ناامیدی میں تبدیل کر کے اس کے جینے کی امنگ شکستہ کرتا۔ اس نے نہ معلوم کیا کیا خواب دیکھے ہوں، محمدی جھنڈا لہرانے کے سلسلے میں امید کا قائم رہنا امید کے ختم ہو جانے سے کہیں بہتر ہے۔

”کیا سوچت ہو بابو جی؟“ علم دین نے مجھے چونکا دیا۔

”کچھ نہیں علم دین۔“ میں نے کہا۔ ”محمدی جھنڈا جلد ہی لہرائے گا، علم دین! مگر اس کے لیے ہمیں ابھی بہت قربانیاں دینی ہوں گی۔“

”ہم مسلمان ہیئن بھیا! ہم کا بولو۔ ہم دیہن قربانی۔ گاجی ہوئے یا شہید اور ہم کا، کا چاہئے؟“

”ابھی اس کا وقت نہیں بھیا!“ کامریڈ کوہستانی نے کہا۔

”بابو جی!“ ننھے کرمو نے جو بہت سے دیر کچھ کہنے کے لیے بے قرار تھا بالآخر ہمت

کر کے زبان کھولی۔ ”محمدی جھنڈے کے بعد تو یہ گورے، بنئے ہمیں قتل نہیں کریں گے؟“

”نہیں بیٹا!“ میں نے اسے دلاسا دیا۔ ”مگر اس کے لیے ہمیں ان کے ہتھیار چھیننے پڑیں گے۔“

”کب چھینیں گے؟“ ننھے کرمو نے طفلانہ بے صبرے پن کا مظاہرہ کیا۔

”تُو چپ رہ کرمو!“ علم دین نے اپنے بیٹے کو ڈانٹا۔ ”بڑوں کے بیچ ماں بچے ناہیں بولت!“

”کرمو کو مت ڈانٹو علم دین!“ کامریڈ صحرائی نے کہا، پھر اس نے کرمو کا تجسس ختم کرنے کے لیے کہا۔ ”چھین لیں گے بیٹا!“

”کب؟“ کرمو کا تجسس قائم تھا۔

”اس میں وقت لگے گا۔“ میں نے کرمو کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اس کے لیے ہمیں کوشش کرنا ہوگی۔“

”تو کوشش کیوں نہیں کرتے؟“ طفلانہ نوعیت کے ایسے سوالوں کا سلسلہ جاری تھا جن کے جواب دینا بعض اوقات بڑوں کے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔

”کر رہے ہیں بیٹا!“ میں نے کہا۔ ”ہم بہت جلد ان سے ہتھیار چھین لیں گے۔“

”سچی!“ کرمو نے خوش ہو کر کہا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا دیا تو اس نے نہایت جوشیلے انداز میں کہا۔ ”جانو ہو بابو پھر میں کا کروں گا؟“

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ ننھے کرمو کا انداز ایسا تھا جیسے وہ کوئی بہت بڑا راز افشا کرنے والا ہے۔

”پھر میں لالہ گوپی ناتھ کو مار دوں گا۔“ کرمو نے دانت کچکچا کر اپنے عزم کا اظہار کیا اور فاتحانہ انداز میں وہاں موجود سب لوگوں کو دیکھا۔

ہم سب کامریڈ چونک پڑے۔

”چپ رہ کرمو! بک بک مت کر!“ علم دین نے اپنے بیٹے کرم دین کو جھڑکا۔

”بات کیا ہے علم دین؟“ کامریڈ کوہستانی نے پوچھا۔ ”یہ لالہ گوپی ناتھ کون ہے؟“

”کوئی نہیں بابو جی! یہ میرے گھر کی بات ہے۔“ علم دین نے کہا۔ اس کی آواز میں خفیف سی لرزش تھی۔

ہم لوگوں کا اصرار جاری رہا تو بڑی مشکل سے علم دین نے بتایا لالہ گوپی ناتھ کون تھا

اور کرمو نے کیوں اسے قتل کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔

لالہ گوپی ناتھ ایک بڑا زمیندار تھا۔ وہ علم دین کی بہن پر بری نظر رکھتا تھا۔ اس نے علم دین کو پیشکش کی تھی کہ وہ علم دین کا تمام قرضہ معاف کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنی بہن کی اس سے شادی پر آمادہ ہو جائے۔ علم دین نے یہ کہہ کر اس تجویز کو ٹھکرا دیا کہ وہ مسلمان ہے اور اپنی بہن کی شادی ایک ہندو سے نہیں کر سکتا۔ اس پر لالہ گوپی ناتھ نے کہا تھا کہ علم دین اپنے تمام خاندان والوں کے ساتھ شدھی ہو جائے۔ علم دین اس پر بھی تیار نہ ہو سکا تو گوپی ناتھ نے کہا کہ وہ علم دین کو بہن کی شدھی کر کے شادی کرے گا کیونکہ وہ بھی اپنا دھرم بھرشٹ کرنا نہیں چاہتا۔ اس پر علم دین بہت چراغ پا ہوا۔ ''یہ ن لالہ میں تم کا بتائے دئین، ہم مسلمان ہئین۔ ہم جان دے دیت پر یہ پاپ ہم نہیں کریں سمجھا۔'' علم دین نے اس سے کہا تھا۔ پھر ان میں سے خاصی تو تکار ہوئی تھی اور لالہ گوپی ناتھ اسے دھمکیاں دے کر چلا گیا تھا۔ اس کے چند دن بعد لالہ گوپی ناتھ نے باہر کے غنڈوں سے علم دین کے مکان پر حملہ کرایا۔ اس حملے کے نتیجے میں غنڈے اس کی بہن کو اغوا کر کے لے گئے۔ علم دین نے بہت دوڑ دھوپ کی مگر اسے اپنی بہن کا کوئی سراغ نہیں ملا، پھر کئی دن بعد لالہ ہی کے ایک آدمی نے علم دین کو بتایا تھا کہ غنڈے اس کی بہن کو اغوا کر کے امروہے میں لالہ گوپی ناتھ کی حویلی لے گئے تھے۔ اس وقت گوپی ناتھ وہیں تھا مگر اس سے پہلے کہ گوپی ناتھ اس کی عزت کو داغ دار کرتا، علم دین کی بہن نے حویلی میں بنے ہوئے کنویں میں چھلانگ لگا کر جان دے دی تھی۔

''وہ علم دین کی بہن تھی بابو جی!'' علم دین نے تمام داستان سنا کر کہا۔ ''اگر وہ ایسا نہ کرتی شادی کر لیتی تو علم دین مر جاتا۔ علم دین جندہ ہے اجت سے!'' اس کے لہجے میں درد و غم کی کسک بھی تھی اور فخر بھی!

''پھر تم نے کیا کیا؟'' میں نے علم دین سے پوچھا۔

''سب کچھ کر لیا بابو جی!'' علم دین نے کہا۔ ''کوتوالی، رپٹ، کچہری پر سب بیکار! ہم غریب ہیں نا بابو! اب تو بس یہاں آگ ہی آگ ہے۔'' اس نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''جی چاہت ہے وہ سُر ہاتھ آ جائے پھر ایسا مجا چکھاؤں بچو کو کہ سورے کی سو پشتیں یاد رکھیں۔'' اس نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ انداز ایسا تھا کہ جیسے تصور ہی تصور میں لالہ گوپی ناتھ کی گردن مروڑ رہا ہو۔

''فکر نہ کرو علم دین!'' میں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے ہم اس معاملے میں تمہاری مدد کر

سکیں۔ اس کا پتا بتاؤ امروہے میں!''

بہر حال میں نے اس سے لالہ گوپی ناتھ کا پتا معلوم کر ہی لیا۔ پھر ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ علم دین کے ایک ساتھی نے اس دوران میں ہمارے بیلوں کو بھی کھلا پلا دیا تھا۔ ہم ان لوگوں سے رخصت ہو کر پھر بیل گاڑی میں آ بیٹھے اور پھر ایک مرتبہ اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

فضا میں حبس کافی بڑھ گئی تھی۔ دور افق پر سیاہ بادلوں کے پَرے کے پَرے بلند ہو کر بجلیاں برساتے اور دیوؤں کی طرف غراتے گڑگڑاتے، پیش قدمی کر رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر بعد نم آلود ٹھنڈی ہوا کے جھونکے زمین پر لوٹ لگاتے مٹی دھول اڑاتے، چاروں طرف سے بڑھے۔ ہر طرف گرد اور غبار پھیل گیا۔ سورج اس پیلے غبار کی دبیز چادر کے پیچھے چھپ گیا۔ موسم کے یہ بدلے ہوئے تیور دیکھ کر کامریڈ اندلسی پریشان ہو گیا۔

''سعدی!'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''بارش آ گئی تو؟''

''آندھی طوفان، بارش ہمارا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ ہمارا سفر جاری رہے گا۔ ہمیں بہر حال اپنی منزل پر پہنچنا ہے۔''

''میں جانتا ہوں کامریڈ!'' اندلسی نے کہا۔ ''میرا مطلب تھا کہ بارش کی وجہ سے ہمیں دیر ہو سکتی ہے۔''

''رفتار تیز کر دو کامریڈ!'' میں نے پریشان ہو کر کہا۔ ''ہمیں بہر صورت وہاں وقت پر پہنچنا ہے۔''

آسمان پر چھائے ہوئے زرد غبار کی جگہ سیاہ بادلوں نے لے لی تھی۔ ہوا کے جھکڑوں میں اور بھی شدت آ گئی تھی۔ بجلی کے کوندے لہریں لے کر بادلوں میں لوٹ رہے تھے۔ پھر موٹی موٹی بوندیں آ گئیں اور اگلے لمحے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ میں نے گٹھریوں میں بندھے ہوئے تھیلوں کو پھر احتیاط سے لپیٹا، ان پر ترپال ڈالا اور پریشانی سے آسمان کو دیکھا۔

''کیا ہم وقت پر پہنچ سکیں گے؟'' یہی سوال بار بار میرے ذہن میں کچوکے لگا رہا تھا۔

کامریڈ اندلسی نے بیلوں کو تکتکا کر ان کی رفتار بڑھا دی تھی۔

☆======☆======☆

بہ ہزار دقت ہم آٹھ بجے امروہے کے قریب سوت ندی پر بنے ہوئے اس چھوٹے

سے پل کے پار پہنچے جو ہماری منزل تھا۔ بارش نے اگرچہ ہماری راہ میں کافی مشکلات کھڑی کردی تھیں لیکن ہم نے ان پر قابو پالیا تھا اور موسلا دھار بارش نے دیکھتے ہی دیکھتے کچی سڑک کو کیچڑ اور گارے میں تبدیل کردیا تھا اور نصف کوس کا فاصلہ بہت تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ بیل گاڑی کے پہیے جگہ جگہ کیچڑ میں دھنس جاتے تھے جس کی وجہ سے یہ تمام فاصلہ ہمیں پیدل ہی طے کرنا پڑا تھا، اس کے باوجود بیل گاڑی کی رفتار گھٹ کر رہ گئی تھی۔ بیلوں کو آگے بڑھنے میں خاصی وقت پیش آرہی تھی۔ جب اور جہاں کہیں بیل گاڑی پھنس جاتی ہم سب پہیوں پر زور لگا کر گاڑی کو نکالتے۔ نصف کوس کے بعد ہم نے بیل گاڑی کو پکی سڑک پر لے لیا تھا۔ کچا راستہ ہم نے احتیاطاً طے کیا تھا جو کچا بھی تھا اور دشوار بھی کیونکہ ان دنوں پولیس جگہ جگہ چھاپے مار رہی تھی اور تلاشیاں لے رہی تھی۔ پرنس آف ویلز کی ہندوستان آمد سے قبل ہندوستانی حکومت کچھ زیادہ ہی وہمی ہو رہی تھی۔ ہم اس تلاش سے بچنا چاہتے تھے کیونکہ ہمارے پاس جو سامان تھا اس کی وجہ سے ہم بڑی آسانی سے پولیس کی گرفت میں آسکتے تھے۔ موسلا دھار بارش کی وجہ سے اب ہمیں اس احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ پکی سڑک پر آتے ہی کامریڈ اندلسی نے بیلوں کی رفتار بڑھا دی اور جو وقت بارش کی وجہ سے کچا راستہ طے کرنے میں زیادہ صرف ہوا تھا اس کا خسارہ رفتار بڑھا کر پورا کرلیا تھا اور ہم بروقت اپنی منزل پر پہنچ گئے تھے۔

چھوٹے سے ریلوے پل سے کچھ دور بڑ کے ایک درخت کے نیچے کامریڈ اندلسی نے بیل گاڑی روک کر کہا۔ ''لو کمانڈر، منزل آگئی۔''

بارش کا کہنا تھا کہ آج برس کے پھر کبھی نہ برسے گی۔ گھپ اندھیرا ایسا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ یہ اندھیرا بار بار اس وقت چکا چوند کر دینے والی روشنی سے نہا جاتا جب آسمان پر بجلی چمکتی۔ بڑ کے اس درخت کے نیچے اب ہم اس ساتھی کے منتظر تھے جسے یہ بیل گاڑی لے جانی تھی اور ہمیں اپنی کارروائی کا آغاز کرنا تھا۔

ہمیں وہاں ٹھہرے ہوئے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ اس اندھیرے کی چادر سے، کھیتوں کی طرف سے ایک نوجوان برآمد ہوا اور ہمارے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔

''مجھے عشاء سے پہلے پل پار جانا ہے۔''

یہ وہی شخص تھا جس کا ہم انتظار کر رہے تھے۔ اس نے جو جملہ کہا تھا، اس کے ذریعے اس نے اپنی شناخت کرادی تھی۔

''تو پھر یہ بیل گاڑی لے جاؤ سرفروش۔'' میں نے شناخت کا جوابی جملہ کہا۔

وہ پلٹ کر بیل گاڑی میں بیٹھ گیا۔ ہم نے بیل گاڑی میں رکھی ہوئی چاروں گٹھریاں اٹھالیں۔ ان گٹھریوں میں کینوس کے بڑے بڑے تھیلے بندھے ہوئے تھے۔ آنے والے کامریڈ کو وہ بیل گاڑی یہاں سے لے کر چلے جانا تھا۔ کہاں؟ اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں تھی اور ہمیں اپنی مہم کی تکمیل کے بعد آگے چلا جانا تھا۔ ہماری منزلیں مختلف تھیں۔ اس کے بعد ہمیں کبھی ایک دوسرے سے ملنا تھا یا نہیں، ہمیں کچھ علم نہ تھا۔ سالار اعظم نے سرفروشوں کے اس گروہ کو جس انداز میں منظم کیا تھا وہ ایسا ہی تھا۔ ہر مہم میں لوگ مختلف ساتھیوں کے ساتھ کام کرتے تھے۔ یہ میری کوئی دسویں گیارھویں مہم تھی اور آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ کبھی میرے ساتھ کوئی کامریڈ رہا ہو جو اس سے قبل بھی میرے ساتھ کسی مہم میں شامل تھا۔

آنے والا کامریڈ بیل گاڑی لے کر اسی پل کی طرف چلا گیا تھا جسے پار کر کے ہم یہاں آئے تھے۔ اس کے اندھیرے میں گم ہو جانے کے بعد ہم ان گٹھریوں کو سر پر اٹھائے جو ہماری دیہاتی وضع قطع سے مناسبت رکھتی تھیں۔ درختوں کے جھنڈ میں گھس گئے۔ اس جھنڈ میں پیپل کے اس درخت کو تلاش کرنے میں ہمیں کوئی مشکل پیش نہیں آئی جس کی نشاندہی سالار اعظم نے پہلے ہی کر دی تھی۔ اس درخت کے تنے میں پہلے دو شاخے کے درمیان ایک بڑی سی پوٹلی رکھی تھی جس میں ہم چاروں کے لیے رات کا کھانا موجود تھا۔

بارش اب بھی دھواں دھار ہو رہی تھی۔ دور کسی کٹیا میں جلتا ہوا چراغ ستارہ امید کی مانند تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم کچھ دیر اسی درخت تلے ستاتے رہے۔ ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ ابھی رات کے دس ہی بجے تھے لیکن اب ہم یہ کام جلد بھی شروع کر سکتے تھے۔ طوفانی بارش کے سبب سڑک پر آمد ورفت بالکل بند تھی۔ جب سے ہم یہاں آئے تھے ابھی تک کوئی گاڑی، کوئی شخص اس سڑک سے نہیں گزرا تھا۔ ظاہر تھا کہ اس طوفان میں کسے گھر کی پناہ سے نکلنا اچھا لگتا ہے۔ سو میں نے اپنا کام جلد ہی نمٹانے کا فیصلہ کرلیا۔

ہمارا کام ریل کے اسی چھوٹے سے پل کو تباہ کرنا تھا۔

اس کام کی میں نے تربیت حاصل کی تھی۔ سالار اعظم نے ڈائنا مائٹ استعمال کرنے کے نئے طریقے بتائے تھے، ان طریقوں کو میں نے آزمایا بھی تھا۔ دہرہ دون جا کر وہاں کے غیر آباد پہاڑی علاقے میں ڈائنا مائٹ استعمال کرنے کا تجربہ بھی کیا تھا اور اپنی کوشش میں کامیاب بھی رہا تھا۔

اس مختصر سی تربیت کے بعد سالار اعظم نے مجھے اصل مہم کی نوعیت بتائی تھی۔

’’شیرازی! تمہاری اس تربیت کا مقصد ایک چھوٹے سے پل کو تباہ کرنا ہے۔ یہ ریلوے پل امروہے کے پاس ایک نالے پر بنا ہوا ہے۔ تم اس مہم کے سربراہ ہو۔ اس کے لیے تمہیں تین سرفروشوں کی مدد بھی حاصل ہوگی۔ اس مہم کو سر کرنے کا منصوبہ تمہیں خود تیار کرنا ہے۔ تم اس کے لیے کیا تدابیر اختیار کرو گے اس کا فیصلہ کرنا بھی تمہارا کام ہے۔ مجھے تمہاری حکمت عملی سے کوئی غرض نہیں۔ صرف اتنا یاد رکھو کہ ہمیں اس پل کو تباہ کرنا ہے۔ رات کو ٹھیک بارہ بجے اس پل کو تباہ ہو جانا چاہیے۔‘‘

’’کب؟‘‘ میں نے دریافت کیا تھا۔

’’یہ میں وقت آنے پر بتا دوں گا۔ اس وقت صرف اتنا جاننا ضروری ہے کہ تمہیں نالے پر بنا ہوا پل تباہ کرنا ہے اور رات کو ٹھیک بارہ بجے لیکن اس طرح کہ تم بھی محفوظ رہو اور تمہارے ساتھی بھی۔ تمہاری کارروائیاں اس طرح ہونی چاہئیں کہ تم کسی کی نظر میں نہ آسکو۔‘‘ سالار اعظم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

اس پل کو کیوں تباہ کرنا ہے، مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ دشمن پر ضرب لگانے اور اسے نقصان پہنچانے کے لیے حکمت عملی تیار کرنے اور سوچنے کا کام سالار اعظم کی ذمے داری تھی۔ وہ ہمارا سپہ سالار تھا۔ ہم اس کے سپاہی تھے۔

’’تم نے یہ نہیں پوچھا شیرازی کہ ہم وہ پل کیوں تباہ کرنا چاہتے ہیں؟‘‘ مجھ سے سالار اعظم نے سوال کیا تھا۔

’’توپ اور بندوق سوال نہیں کرتے سالار! انہیں اس سے بھی غرض نہیں ہوتی کہ ان کا ہدف کون ہے۔ وہ تو بس انگلی کے اشارے پر اپنا کام کرتے ہیں۔‘‘

’’ٹھیک ہے شیرازی! تم قوم کا اسلحہ ہو مگر ساتھ ہی تم دل اور دماغ بھی رکھتے ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمہاری کارروائی کا مقصد کیا ہے۔ تم کیا نتائج حاصل کرنا چاہتے ہو۔ سنو!‘‘ سالار اعظم نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ ’’جس دن تم یہ پل تباہ کرو گے اسی دن پل تباہ ہونے کے ٹھیک پانچ منٹ بعد مراد آباد سے دہلی جانے والی ٹرین اس پل سے گزرے گی۔ اس ٹرین سے ایک اہم فوجی جماعت سفر کر رہی ہوگی۔ اس فوجی جماعت میں ایک جنرل بھی شامل ہے۔ اس جماعت کے تمام اراکین انگریز ہیں۔‘‘

’’مگر سالار!‘‘ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ’’اس ٹرین میں بہت سے ہندوستانی بھی ہوں گے۔‘‘

’’ہاں!‘‘ سالار اعظم نے کہا۔ ’’وہ سب بھی مر جائیں گے مگر ہر عمارت کی تعمیر کے

لیے بنیاد میں پتھر بھرے جاتے ہیں۔ عمارت جتنی بڑی ہوگی بنیاد میں اتنے ہی زیادہ پتھر بھرے جائیں گے۔ ہم آزادی کی ایک بڑی عمارت تعمیر کر رہے ہیں۔ اب تک ہماری سرگرمیاں بہت محدود اور مختصر پیمانے پر تھیں۔ یہ سب ایک بڑے آپریشن کی ریہرسل تھی۔ اس پل کی تباہی انگریزوں کے خلاف ہماری طرف سے اعلانِ جنگ ہوگا۔ پھر توڑ پھوڑ، آتشزنی، اور سبوتاژ کی کارروائیاں ہوں گی۔ امن و امان تہ و بالا کر دیا جائے گا۔ شدھی کی تحریک چلانے والے ہندوؤں سے انتقام لیا جائے گا۔ مسلمانوں کو ہندوؤں کی بھینٹ چڑھانے والے انگریزوں کے اس عقوبتی نظام میں رخنے ڈال دیے جائیں گے۔‘‘ سالار اعظم نے کہا۔ ’’مجھے خوشی ہے کہ ہمارے اس بڑے آپریشن کی افتتاحی مہم کے سربراہ تم ہو شیرازی!‘‘

’’اس مہم میں میرے ساتھ اور کون کون ہوگا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’اندلسی، صحرائی، کوستانی اور تم سعدی کی حیثیت سے شریک ہوگے۔ تم اپنا اصل نام آفاق شیرازی کسی ساتھی کو نہیں بتاؤ گے۔‘‘

’’سعدی؟‘‘ میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

’’تمہارے نام کی طرح تمہارے دوسرے ساتھیوں کے اصل نام بھی راز میں ہی ہیں۔ تمہارے باقی تینوں ساتھی مختلف علاقوں سے یہاں آئیں گے۔ تم میں سے کوئی کسی سے اس کا اصلی نام، اس کا پتا اس کا شہر دریافت نہیں کرے گا۔ تم سب ہم سب، صرف مسلمان ہیں۔ ہم سب صرف ہندوستانی ہیں۔ ہم صرف ہندوستان کے رہنے والے ہیں۔ تمام صوبے، تمام ریاستیں، تمام شہر، گاؤں اور قریے جو ہندوستان میں ہیں، ہمارے ہیں۔ سارا ہندوستان ہمارا ہے، سمجھے!‘‘

’’مگر سالار اعظم۔‘‘ میں نے اس خلش کی بنا پر پوچھا جو میرے ذہن میں پیدا ہوگئی تھی۔ ’’اس رازداری کی وجہ؟‘‘

’’احتیاط اور کچھ نہیں۔‘‘ سالار اعظم نے کہا۔ ’’ان ابتدائی منازل میں ہم ذرا سی غفلت اور بے احتیاطی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد کرتے ہوئے بھی محتاط رہنا ہوگا۔ ہماری صفوں میں ایک بھی کالی بھیڑ ہم سب کے لیے ملک الموت ثابت ہو سکتی ہے۔ تم سب سونا ہو، آگ کی بھٹی میں تپ کر ہی کندن بنو گے۔ آگ اور خون کے دریا سے گزرتے ہوئے رفاقت تعاون، ایثار اور دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے ہی ہم اعتماد کی منازل طے کریں گے۔‘‘

''سالارِ اعظم!'' میں نے کہا۔ ''کیا اس طرح ہم بے اعتمادی کی فضا میں کام نہیں کریں گے۔''

''بے اعتمادی، شخصی مفادات اور منفعت کی کوکھ سے جنم لیتی ہے لیکن ہمارے سامنے ایسی کوئی مصلحت نہیں ہے۔ پھر یہ رازداری ہمارے اجتماعی تحفظ کے لیے بھی ضروری ہے۔ یاد رکھو ہمارا مقابلہ ایک حکومت سے ہے جس کے وسائل لامحدود ہیں۔ ہماری پشت پر ایسی قوم ہے جس میں قوم فروشوں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ فرض کرو، اس مہم کے دوران میں یا کسی اور مرحلے پر تم چاروں کی کمپنی کا کوئی شخص گرفتار ہو جائے تو وہ ایسی صورت میں اپنے کسی ساتھی کی نشاندہی نہیں کر سکے گا کیونکہ تم میں سے کسی کو معلوم نہیں کہ تمہارے ساتھی کس شہر سے تعلق رکھتے ہیں، کس نام سے پکارے جاتے ہیں۔''

''اور اگر ہم چاروں ہی بیک وقت پکڑ لیے جائیں۔'' میں نے پھر پوچھا تھا۔

''اس کا امکان نہیں۔'' سالارِ اعظم نے کہا۔ ''تم چاروں مل کر ایک کمپنی ہی نہیں ایک فوج بھی ہو۔ تمہیں آخر دم تک مقابلہ کرتے رہنے کی ہدایت ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی ہدایت ہے کہ جب آخری گولی رہ جائے اور کوئی راہ نہ رہے تو آخری گولی تم اپنے وجود کے خاتمے کے لیے استعمال کرو گے۔''

''اور اگر کوئی ایسا نہ کرے؟''

''سنو شیرازی!'' سالارِ اعظم نے کہا۔ ''کیا تم میری ان ہدایات پر عمل نہیں کرو گے؟''

''میں اپنی حد تک یہ یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کی ہدایت کے ایک ایک لفظ پر عمل کروں گا۔'' میں نے کہا تھا۔

''یہی یقین باقی سب نے بھی دلایا ہے۔'' سالارِ اعظم نے کہا۔ ''مگر سنو، ہم کسی کی نیت پر شک و شبہ نہیں کر سکتے۔ ہماری جیسی تنظیموں میں لوگ صرف جان پر کھیلنے کے جذبے سے سرشار ہو کر شرکت کرتے ہیں۔ ایسی تنظیموں میں غداری کے امکانات ایک فیصد ہوتے ہیں۔ یہ تمام احتیاط اسی ایک فیصد خطرے سے بچنے کے لیے ہے۔ ہمیں ایک دوسرے پر اعتماد بھی کرنا ہے اور آستین کے سانپوں سے ہوشیار بھی رہنا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں نے عقیدت سے جواب دیا۔

''بہرحال تمہیں اس پل کو تباہ کرنا ہے۔'' سالارِ اعظم نے کہا۔ ''وہ پل، یوں سمجھو کہ ایک دروالا پل ہے۔ ایسا ہی پل جو نالوں پر بنایا جاتا ہے۔ تم دن میں کٹگھر کے پل کا جائزہ

لے لو۔ بالائی قینچیوں کو چھوڑ کر باقی ساخت اسی پل جیسی ہے، پھر ایک پلان مرتب کرو۔ کیا کیا سامان تمہیں درکار ہے، اس کی فہرست تیار کرو۔ تمہارے ذہن میں اپنے منصوبے کی ایک ایک تفصیل واضح ہونی چاہیے۔ اچھا اب تم سے کل رات ملاقات ہوگی۔''

''مگر سالارِ اعظم!'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں، کہو کیا بات ہے؟''

''اگر ہمیں پل ہی تباہ کرنا ہے تو کیوں نہ بڑا پل تباہ کر دیں۔ کٹگھر کا پل کیوں نہ تباہ کیا جائے؟''

''وقت سعدی وقت!'' سالارِ اعظم نے کہا۔ ''امروہے کے اس پل کو تباہ کرنے کے لیے تم جس وقت کارروائی شروع کرو گے، اس وقت آمد و رفت بہت کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوگی، پھر اندھیرا بھی ہوگا لیکن کٹگھر کے پل کو تباہ کرنے کے لیے تمہیں جس وقت اپنی سرگرمیاں شروع کرنا ہوں گی اس میں خطرات زیادہ ہوں گے اور اس وقت ہمارا اصل مقصد پل کو تباہ کرنا نہیں بلکہ اس فوجی جماعت کو ٹھکانے لگانا ہے۔ تم دیکھو گے، ایک کہرام مچ جائے گا حکومت کے حلقوں میں! بہرحال خدا حافظ۔'' اس کا مطلب یہ تھا کہ ملاقات ختم!

سالارِ اعظم سے میری یہ ملاقات کٹگھر اسٹیشن کے ساتھ پھیلے ہوئے میدان میں املی کے درخت تلے رات کے وقت ہوئی تھی۔ سالارِ اعظم کے چہرے پر اس وقت بھی نقاب پڑا ہوا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا اور بائیں ہاتھ کی جانب کٹگھر اسٹیشن کی طرف بڑھ گیا جہاں سے تانگا یا یکا کر کے مجھے مراد آباد اسٹیشن پہنچنا تھا کیونکہ میں وہیں مسافر خانے میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اگر اگلے دن مجھے کوئی اور پیغام نہ ملتا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ کہ اگلی رات مجھے پھر اسی وقت اور اسی جگہ سالارِ اعظم سے ملاقات کرنی ہے۔

اگلے دن میں نے حسب ہدایت کٹگھر کے پل کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ان دنوں جب کہ موسم سیلابوں کا ہے، بارشیں ہو رہی ہیں، تمام ندی، نالے اور دریا طغیانی پر ہیں اور بھرے ہوئے چل رہے ہیں، یہ کام خاصا وقت طلب اور خطرناک ہوگا۔ بہرحال پل کو اڑانے کی کارروائی کے خدوخال میرے ذہن میں ابھر آئے تھے۔ رات کو سالارِ اعظم سے ملاقات کے دوران میں مَیں نے اپنا منصوبہ اس کے سامنے رکھ دیا اور اس نے میرے منصوبے کی منظوری دے دی۔ ساتھ ہی تیاری کا حکم دیتے ہوئے ضرورت کا سامان خریدنے کے لیے رقم بھی دے دی۔ اگلے دن میں ضرورت کا تمام سامان خرید چکا تھا۔ اسی

دن مسافر خانے میں میرے بقیہ تینوں کامریڈ ساتھی بھی مختلف اوقات میں آکر اترے۔ ہم لوگوں کو ایک ہی مسافر خانے میں ٹھہرنے کا علم اسی رات اس وقت ہوا جب ہم سالارِ اعظم کی ہدایت پر جامع مسجد کی ان سیڑھیوں پر ملے تھے جو دریا کے رخ پر تھیں۔ اس ملاقات پر ہمیں ہدایت ملی تھی کہ اگلے دن ہمیں امروہے روانہ ہونا ہے اور رات بارہ بجے پل کو تباہ کرنا ہے۔

اسی ہدایت کے مطابق ہم اس وقت یہاں موجود تھے اور سامنے وہی پل تھا جسے تباہ کرنا تھا۔

☆======☆======☆

بارش اور بھی تیز ہوگئی تھی۔ اتنی تیز کہ اس میں کوئی شخص باہر جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وہی موسم جو دن میں علم دین سے رخصت ہونے کے بعد ہمارے لیے پریشانی کا سبب بن گیا تھا اس وقت ہمارا بہترین معاون تھا، ہمارا سب سے بڑا مددگار اور کامریڈ تھا۔ اتنی شدید بارش کی وجہ سے آمدورفت بالکل ختم ہو چکی تھی۔ پھر اب رات کے وقت بھلا کس کو مصیبت پڑی تھی کہ باہر جا کر بھیگے۔ میں کامریڈ اندلسی کو ساتھ لے کر پل کے معائنے کے لیے چلا۔ سوت ندی جس پر یہ پل بنا ہوا تھا، برساتی پانی سے بھری ہوئی چل رہی تھی۔ دونوں کناروں کے معائنے کے بعد یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ تیز رفتار پانی پل کے دونوں پایوں کی مٹی کو تیزی سے کاٹ رہا تھا۔ کٹاؤ کی رفتار بہت تیز تھی۔ پل کے پایوں کے گرد مٹی کی گرفت لحظہ بہ لحظہ کمزور ہو رہی تھی۔

''کامریڈ!'' میں نے اندلسی سے کہا۔ ''قدرت ہمارے ساتھ ہے، ہمارا کام آسان ہوگیا ہے۔''

''کیسے؟'' اس نے پوچھا تھا اور میں نے اسے تمام بات بتا دی تھی۔ پھر اس سے کہا تھا کہ وہ دوسرے کنارے پر جا کر ڈائنا مائٹ اور اوزاروں کے تھیلے لے آئے۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی ہدایت کی تھی کہ وہ پل کے دوسرے سرے پر صحرائی اور کوہستانی کو متعین کر دے اور اس ہدایت کے ساتھ کہ وہ اس طرف سڑک پر نظر رکھیں۔ اگر کوئی شخص ادھر آتا نظر آئے تو اشارہ کر دیں تاکہ ہم اپنی حفاظت کر سکیں۔

اندلسی کے روانہ ہوتے ہی بارش اچانک رک گئی تھی۔ بارش کا رکنا اس وقت ہمارے لیے مفید تھا یا نہیں، میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا لیکن اس وقت اس بات پر سوچنا

فضول تھا۔ میں نے پل کے پائے کا ایک مرتبہ پھر معائنہ کیا اور اسے ڈائنا مائٹ کرنے کے لیے برمے سے سوراخ بنانے کی مناسب جگہیں منتخب کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اندلسی، تھیلے لے کر آ گیا اور میں اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

ساڑھے گیارہ بجے تک میں تمام کام سے فارغ ہو چکا تھا۔ میں نے نہ صرف پل کے اس پائے میں ڈائنا مائٹ رکھ دیے تھے بلکہ پل کے وسط میں بھی رسی کی سیڑھی کی مدد سے نیچے اتر کر دونوں پہلوؤں میں گڈرز کے ساتھ ڈائنا مائٹ باندھ چکا تھا۔ اب کام اتنا تھا کہ فیتے کے تاروں کی لمبائی اس طرح رکھی جائے کہ تمام ڈائنا مائٹ ایک ساتھ ہی پھٹیں اور یہ کام زیادہ مشکل نہ تھا۔ یہ تار میں نے رسی کے سہارے پل کے دونوں پہلوؤں پر بندھی ہوئی فٹ پاتھوں کے نیچے کھینچے تھے اور لمبائی ایسی رکھی تھی کہ پل کے وسط میں گڈرز کے ساتھ بندھے ہوئے اور پل کے پائے کے سوراخوں میں رکھے ہوئے ڈائنا مائٹ ایک ساتھ ہی پھٹیں۔

اس کام سے فارغ ہو کر صحرائی اور کوہستانی کو بھی میں نے پل کے اسی طرف بلا لیا۔ سالارِ اعظم کی ہدایات کے مطابق ہمیں اپنا کام مکمل کر کے پل کی دوسری طرف الگ الگ ہو کر اپنی اپنی منزلوں کو روانہ ہونا تھا۔ اس کے بعد ہمیں پھر ایک دوسرے کے لیے اجنبی بن جانا تھا لیکن میں نے فیصلہ کیا تھا کہ امروہے میں ہی رک کر پہلے لالہ گوپی ناتھ سے علم دین کی بہن کی موت کا بدلہ لوں گا۔ بدلہ لینے کی صورت کیا ہوگی ابھی مجھے اس کا کچھ پتا نہ تھا۔

''اب تم لوگوں کی ضرورت نہیں رہی ہے۔'' میں نے ان تینوں سے کہا تھا۔ ''تم لوگ اب اپنی اپنی منزلوں کو روانہ ہو سکتے ہو۔''

''اور آپ؟'' اندلسی نے پوچھا تھا۔

''میں یہیں رکوں گا۔'' میرا جواب تھا۔

مگر وہ تینوں بھی شاید میرے انداز میں ہی سوچ رہے تھے۔ تینوں نے بیک آواز کہا تھا۔ ''گوپی ناتھ......''

''ہاں!'' میں نے جواب دیا۔ ''گوپی ناتھ ہی کے لیے۔''

''ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔'' اندلسی نے کہا۔

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں، مجھے کیا کیا خطرات پیش آ سکتے ہیں۔ تم لوگ جاؤ۔''

مگر وہ نہ مانے اور مجھے ہار ماننی ہی پڑی۔ ان کا اصرار تھا کہ وہ میرا ساتھ دیں

گے۔

''کمانڈر!'' اندلسی نے کہا تھا۔''گوپی ناتھ کا معاملہ نمٹنے کے بعد ہی ہم لوگ اپنی اپنی منزلوں کی طرف جائیں گے اس سے پہلے ناممکن ہے۔''

اس کے بعد میرے لیے بحث کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا تھا۔''پتا نہیں اس کے بعد ہم ایک دوسرے سے مل سکیں یا نہیں مگر یہ مختصر سی رفاقت میں کبھی نہیں بھولوں گا۔''

''ہم میں سے کسی کے لیے بھی اس رفاقت اس مہم اور اس رات کو بھولنا ممکن نہ ہو گا۔'' صحرائی نے کہا۔

میں نے گھڑی دیکھی، ابھی بارہ بجنے میں بیس منٹ تھے۔ اس عرصے میں ہم نے تھوڑے فاصلے پر ایک گڑھا کھود کر کینوس کے تین تھیلے اس میں دفن کر دیے۔ صرف ایک تھیلا اب ہمارے پاس تھا جس میں ہم سب کا ایک ایک جوڑا رکھا تھا۔ برما میں نے نالے میں پھینک دیا البتہ اس کی سوراخ کرنے والی سلاخ میں نے نکال کر تھیلے میں ڈال لی۔ سن کی موٹی موٹی رسی کے تین لچھے جو باقی بچ رہے تھے وہ بھی میں نے رکھ لیے۔

اب بارہ بجنے میں دس منٹ تھے۔ ڈائنامائٹ کا فلیتہ تین منٹ کا تھا یعنی فلیتے کے آگ پکڑنے کے ٹھیک تین منٹ بعد ڈائنامائٹ پھٹ جاتے اس تین منٹ کے عرصے میں ہم پل سے محفوظ فاصلے پر پہنچ جاتے۔ گویا اب سات منٹ تھے۔ مگر سات منٹ کا یہ عرصہ سات صدیوں پر محیط ہو گیا۔ وقت جیسے اپنی مسافت طے کرنا بھول گیا تھا۔

کامیابی کی قربت کے احساس سے میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں اپنے ساتھیوں کی تیز تیز سانسوں کی آواز سن سکتا تھا۔ شاید وہ بھی جذباتی تناؤ کی اسی شدت سے دوچار تھے جس میں مبتلا تھا گو اس سے قبل بھی میں اپنی تنظیم کی مختلف مہموں میں حصہ لے چکا تھا لیکن یہ مہم اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل منفرد، مختلف اور نئی تھی پھر میں اس مہم کا سربراہ بھی تھا اور میری کیفیت اس بچے سے مختلف نہ تھی جو پہلی جماعت کا طالب علم ہو اور پہلی مرتبہ امتحان دے کر اس میں کامیابی کے لیے بے چین ہو۔ سالار اعظم نے اس مہم کو تنظیم کی چھاپا مار کارروائیوں کا نقطۂ آغاز قرار دیا تھا۔ اس بنا پر اس مہم کی اہمیت دو چند ہو گئی تھی اور میں اس مہم کو کامیاب دیکھنا چاہتا تھا۔

آخر یہ طویل لمحات گزر گئے۔ میں نے فلیتوں کو آگ لگائی اور ہم تینوں تیزی سے پیچھے دوڑ گئے۔ محفوظ فاصلے پر پہنچ کر ہم نے پلٹ کر دیکھا۔ فلیتے بڑی تیزی سے سلگ رہے

تھے۔ ان سے چنگاریاں اس طرح گر رہی تھیں جیسے وہ مہتابیاں ہوں۔ تباہی کے پٹ بیجنے، چٹ پٹ کرتے رسی کے ساتھ بندھے ہوئے فلیتے پر بڑھ رہے تھے۔

دو منٹ کی بات اور تھی۔

آسمان پر بادل اب بھی گرج رہے تھے۔ بجلی بار بار چمک کر آنکھوں کو خیرہ کر رہی تھی ور ہر جھماکے کے بعد تاریکی کچھ زیادہ ہی گہری معلوم ہوتی تھی۔ پٹ بیجنے اب ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

''سب کچھ ٹھیک ہے نا کامریڈ؟'' اندلسی نے سوال کیا۔

''ہاں!'' میں نے دھڑکتے دل سے جواب دیا اور پل کی طرف دیکھنے لگا۔ میرا دل شاید دھڑکنا بھول گیا تھا۔ میرے حلق میں ایک گولا سا اٹک کر رہ گیا۔ یہ اعتماد اور بے اعتمادی کا بڑا جانگسل لمحہ تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ دس سیکنڈ باقی رہ گئے تھے۔ میری آنکھیں پل کی سمت جمی ہوئی تھیں جو تاریکی کے سبب اب ہمیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ دو، تین، چار میں دل ہی دل میں گزرتے سیکنڈوں کا شمار کر رہا تھا۔

''دس۔'' میں نے بلند آواز میں کہا۔ مگر سب کچھ جوں کا توں تھا۔ فلیتے پر بڑھنے والا جگنو کبھی کا غائب تھا۔ پندرہ۔ پل ابھی تک سالم تھا۔ فضا اچانک مجھے پُرسکون اور خاموش سی لگی۔ ایسا محسوس ہوا گویا میں سناٹے کی قبر کی گود میں ہوں۔ کیا فلیتے بجھ گئے ہیں؟ میں نے دھڑکتے دل سے سوچا تھا کیا تمام کے تمام ڈائنامائٹ ناقص تھے؟ میں نے خود سے کئی سوال کر ڈالے۔

''کیا بات ہے کامریڈ؟'' کس نے کہا تھا مجھے معلوم نہ تھا۔''کیا کوئی خرابی ہو گئی ہے۔''

''پتا نہیں۔'' میں نے اٹکتے ہوئے کہا۔ میرا گلا رندھ گیا تھا۔''میں جا کر دیکھتا ہوں۔''

اس وقت آسمان میں چاروں طرف بجلی زور سے کڑکڑائی۔ روشنی کی آڑی ترچھی لکیریں آسمان میں چمکیں۔ اس کے ساتھ ہی پے در پے کئی دھماکے ہوئے۔ وہ دھماکے اس قدرتی گرج چمک میں مدغم ہو گئے لیکن میرے کانوں نے ان دھماکوں کی ہر گت، ہر تان کو سنا تھا، کتنی نغمگی تھی ان میں!

پل ٹوٹ چکا تھا۔ ہم سب باری باری ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ میری

آنکھیں نم تھیں۔

''مبارک ہو کمانڈر!'' اندلسی کی آواز رقت سے کپکپا رہی تھی۔ شاید ہم سب جذ
سے مغلوب تھے۔

''تم سب کو بھی مبارک ہو۔'' میں نے جواب دیا۔

پھر ہم چاروں سجدے میں گر گئے۔

کامرانی اور کامیابی سے بوجھل احساسات میں وقت اتنی تیزی سے گزرا کہ ہما
کچھ پتا ہی نہ چلا ہم چونکے تو اس وقت جب دہلی جانے والی ٹرین کے انجن کی کوک سُ
دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پوری ٹرین انجن سمیت نالے میں جا گری۔ چند لمحوں کے لیے انـ
چیخوں کا شور ابھرا اور طغیانی میں دفن ہو گیا۔

نالے میں عجیب سی سنسناہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ایسی سنسناہٹ جو دہکتی آگ پر پا
پڑنے سے ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انسانی چیخوں کا شور، بادل بھی شاید کڑکنا اور گر
بھول گئے تھے۔ بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ ایک لمحے کو میں نے فنا کی گود میں سو جا
والے مسافروں کے لیے ہمدردی سی محسوس کی۔ ہم چاروں میں کسی کو بھی معلوم نہ تھا کہ
ٹرین کے مسافر کون تھے؟ ان مسافروں میں ہمارے عزیز بھی ہو سکتے تھے لیکن تاسف کا
احساس صرف ایک لمحے کا تھا۔ میرے ذہن میں تو سالارِ اعظم کی بھاری اور کھرکھرا
آواز گونج رہی تھی۔ ''عظیم عمارتوں کی تعمیر کے لیے بے شمار پتھر اور روڑے بنیادوں میں بھر
جاتے ہیں ہم نے جو راہ اختیار کی ہے وہ آزادی کی اس عالیشان عمارت کی بنیادوں ک
بھرائی کی راہ ہے جو وقت کے اندیکھے ہاتھ تعمیر کر رہے ہیں۔ ہم سب، میں تم ہمارے ساتھ
اسی عظیم عمارت کا اینٹ گارا ہیں جو تیار ہو رہی ہے۔ میں اس عمارت کو تعمیر ہوتا ہوا دیکھ
ہوں۔ جس میں ہمیں اینٹ گارے کے طور پر استعمال ہونا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی ا
عمارت کی پیشانی پر نہیں سجے گا۔''

''ہاں، ہم آزادی کی بنیادیں بھر رہے ہیں۔'' میں نے شاید قدرے بلند آواز م
خود سے کہا تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو کامریڈ؟'' صحرائی نے سوال کیا۔

''میں ہندوستان کے مسلمانوں کا قصرِ آزادی تعمیر ہوتے دیکھ رہا ہوں۔'' میں
سالارِ اعظم کا جملہ دہرایا۔

''کمانڈر!'' اندلسی نے کہا۔ ''کیا ہم آزادی کا سورج طلوع ہوتے دیکھ

گے؟''

''نہیں معلوم۔'' میں نے گہرے دکھ کے ساتھ کہا۔ ''1857ء سے اب تک ہم جیسے
نہ معلوم کتنے اسی سوال کے جواب کی آس میں مر کھپ چکے ہیں۔ ہمیں صرف اتنا معلوم ہے
کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ آزادی قریب تر آتی جا رہی ہے لیکن ہم اس سے بے خبر ہیں
کہ آزادی کا یہ لمحہ کب آئے گا؟ اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جب میں مروں گا تو اس
اطمینان کے ساتھ کہ میری زندگی بے مصرف اور بے مقصد نہیں گزری۔''

''ہاں کمانڈر، یہی امیدیں، یہی توقعات تو ہماری جدوجہد کا سب سے مؤثر ہتھیار
ہیں۔'' کامریڈ کوہستانی نے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہم چاروں امروہے کی آبادی کی سمت بڑھ رہے تھے۔ امروہہ جو میرا
دیکھا بھالا شہر تھا۔

☆======☆======☆

رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔

میں، صحرائی اور اندلسی لالہ گوپی ناتھ کی حویلی کی چھت پر تھے، کوہستانی نیچے اس
کمرے میں ایک مسہری کے نیچے چھپا ہوا تھا جس میں دونو جوان لڑکیاں محوِ خواب تھیں۔

جس وقت ہم اس کوٹھی کے سامنے پہنچے تھے تو لالا کی کوٹھی کی بیٹھک میں روشنی ہو رہی
تھی۔ کوٹھی کے باہر تانگے، یکے اور بگھیاں کھڑی تھیں۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر ہم عقبی حصے کی
طرف آ گئے تھے۔ جہاں حویلی کے احاطہ میں ایک طرف چھوٹا سا مندر بنا ہوا تھا۔ اس کے
ساتھ ہی ایک کنواں بھی تھا۔ شاید وہی کنواں جس میں کود کر علم دین کی بہن نے جان دی
تھی۔ احاطے میں باغ پھیلا ہوا تھا۔ جس میں مختلف پھلوں کے درخت، پھولوں کے
پودے اور باڑھیں لگی ہوئی تھیں۔ ہمیں اندر داخل ہونے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔
ایک درخت پر چڑھ کر ہم رسی کے سہارے باغ میں اتر گئے تھے اور سب سے پہلا کام یہ کیا
تھا کہ عقبی دروازے کی کنڈی کھول دی تھی۔ واپسی کے لیے ہم یہی دروازہ استعمال کرنا
چاہتے تھے۔

بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ مسلسل بھیگتے رہنے کے سبب میرا ذہن کچھ بھاری سا ہونے لگا
تھا۔ مگر میرے سامنے ایک مقصد تھا اور اسی مقصد کے حصول کی دھن میرے ذہن پر سوار
تھی۔ باغ میں تاریکی پھیلی ہوئی تھی ایک طرف رسوئی میں روشنی ہو رہی تھی۔ جس کے
ساتھ ہی اوپر جانے کے لیے زینہ بنا ہوا تھا۔ رسوئی میں ایک بوڑھا اور ایک ادھیڑ عمر کی

عورت بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ باغ میں اترتے ہی ہم نے اپنے چہروں پر رومال باندھ تھے۔ اب ہماری صرف آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ جوتے ہاتھ میں لے کر ہم دبے قدم رسوئی کے برابر زینے سے چھت پر آ گئے تھے۔ چھت پر آ کر میں نے سب سے روشندان سے تمام کمروں کا جائزہ لیا۔ ایک کمرے میں دو نوجوان لڑکیاں محوخواب تھیں وہ یقیناً لالہ گوپی ناتھ کی بیٹیاں ہی ہوں گی۔ ایک کمرے میں ادھیڑ عمر کی عورت سو رہی تھی اس کے برابر والی مسہری خالی تھی اور یہ اندازہ لگانا زیادہ مشکل نہ تھا کہ وہ عورت لالہ گو ناتھ کی بیوی ہو گی اور برابر کا بستر لالہ گوپی ناتھ کا ہو گا۔

اس جائزے سے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ مہمانوں کے جانے کے بعد لالہ گو ناتھ کمروں کو اندر سے بند کر لے گا، جس سے ہمارے لئے مشکلات پیدا ہو سکتی تھیں۔ ا بنا پر میں نے کوہستانی کو اس ہدایت کے ساتھ نیچے بھیجا تھا کہ وہ کسی کمرے میں داخل ہو اس میں چھپنے کی کوشش کرے۔ کوہستانی نے یہ مرحلہ کامیابی سے طے کر لیا تھا۔ وہ لڑکیو کے کمرے میں ایک مسہری کے نیچے موجود تھا۔

میں، اندلسی اور صحرائی کو دو مقامات پر متعین کر کے بیٹھک کی طرف بڑھا روشندان سے نیچے جھانک کر کمرے کا جائزہ لینے لگا۔ اس وقت مجھے افسوس ہوا کہ میں بیٹھک پر پہلے توجہ کیوں نہ دی تھی۔ یہ ایک بہت اہم اجلاس تھا۔ جس میں امروہے سرکردہ ہندوؤں کے علاوہ ہندو غنڈے اور ہندو کوتوال شریک تھا۔ جو باتیں میں نے تھیں اس سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ یہ اجلاس سوامی شردھانند کی ہدایات کے تحت رہا تھا جس نے پورے ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف شدھی کی تحریک شروع کر رکھی تھی اور جس کا مقصد ہندوستان کے ہر قصبے میں شدھی تحریک کو منظم کرنا تھا تاکہ جہاں بھی مو لگے، مسلمانوں کو شدھی کو لیا جائے ورنہ پھر انہیں ٹھکانے لگا دیا جائے۔ اس کام کے لیے ہندو سرمایہ داروں، سیٹھوں اور بنیوں نے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیے تھے اور شدھی تحریک کو بروئے عمل لانے کے لیے بدنام ہندو غنڈوں اور ہندو طلبا کو ساتھ ملایا گیا تھا بیٹھک میں ہونے والی گفتگو سے یہ بات سامنے آ گئی تھی کہ امروہے میں اس تحریک سربراہ لالہ گوپی ناتھ ہے اور وہی خازن بھی ہے۔ لالہ گوپی ناتھ کے سامنے میز پر نوٹوں کی گڈیاں رکھی تھیں۔ اس میں سے دو گڈیاں اٹھا کر اس نے ایک شخص کو دی تھیں۔

''باقی رقم کام پورا ہونے پر؟'' اس نے کہا تھا۔ ''تم تیاری کرو راموں!''

''بندوقیں کب ملیں گی؟'' اس شخص نے کہا جو شکل ہی سے غنڈا معلوم ہوتا تھا۔

''کل رات۔'' کوتوال نے کہا تھا۔ ''یہیں۔''

''میں چلتا ہوں۔'' رامو نے نوٹوں کی گڈیاں انٹی میں اڑسیں اور کھڑا ہو گیا۔

''نمستے مہاراج!''

''رام بھلا کرے۔'' گوپی ناتھ نے کہا تھا اور رامو باہر چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی چار اور افراد اٹھ کر چلے گئے تھے۔

بیٹھک میں اب لالہ گوپی ناتھ سمیت چھ آدمی اور رہ گئے تھے۔

''سہنا جی!'' گوپی ناتھ نے کوتوال سے کہا۔ ''اس دھرم سینا کی حفاظت تمہارا کام ہے۔''

''ڈونٹ وری لالہ جی!'' سہنا نے کہا۔ ''اٹ از مائی سیکرڈ ڈیوٹی۔''

لالہ جی نے ایک گڈی کوتوال کی طرف بڑھا دی۔ ''فار یور سروسز۔''

''تھینک یو!'' سہنا نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ایوری تھنگ ول بی پروائیڈڈ بائی ٹو مارو۔''

''دھرم سیوکو!'' لالہ گوپی ناتھ نے سہنا کے جانے کے بعد باقی چاروں سے کہا۔ ''ابھی دس ہزار کی رقم اور چاہئے۔ آپ کتنا اور دے سکتے ہیں؟''

اس کے بعد بھاؤ تاؤ شروع ہو گیا۔ کاروبار کی باتیں ہونے لگیں۔ بدری ناتھ، بھگوان داس، رام پرشاد اور جگ موہن سب اپنی اپنی پریشانیاں بیان کرنے لگے۔ اپنی کاروباری مشکلات پیش کرتے رہے۔

''دھرم سیوکو! پریشان مت ہو۔ بھگوان سب ٹھیک کر دے گا۔'' لالہ گوپی ناتھ نے سب کو تسلی دی۔

پھر ان سب نے اپنا اپنا مدعا بیان کیا۔ آخر میں سب ہی دو دو ہزار روپے دینے پر آمادہ ہو گئے مگر اس سے قبل لالہ گوپی ناتھ ان کے کام کرا دینے کا وعدہ کر چکا تھا۔ بدری ناتھ اور بھگوان داس کو نینی تال اور شملہ میں ٹھیکے درکار تھے۔ رام پرشاد کو ڈوئی والا کے جنگلوں میں لکڑی کا ٹھیکا چاہیے تھا اور جگ موہن ریلوے میں سپلائی کا بڑا آرڈر لینے کا خواہشمند تھا۔ لالہ گوپی ناتھ نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان سب کے کام کرا دے گا۔

سارے معاملے ہو جانے کے بعد وہ چاروں بھی چلے گئے۔

''کالو، سنگھے!'' گوپی ناتھ نے اپنے ملازموں کو آواز دے کر کہا۔ ''گیٹ بند کر دو۔'' یہ کہہ کر گوپی ناتھ نے بیٹھک کا دروازہ بند کر دیا۔ اس نے نوٹوں کی گڈیاں سمیٹیں اور

وہاں سے دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میرے ذہن میں الاؤ جل رہا تھا۔ لالہ گوپی ناتھ نے سوامی شردھانند کی ہدایت پر مسلمانوں کو شدھی کرنے یا ان کا خون بہانے کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ میں اس منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے بے قرار ہو گیا تھا۔ لالہ گوپی ناتھ اب میرا شکار تھا۔ پہلے مجھے اس سے علم دین کی بہن کا انتقام لینا تھا۔ پھر مسلمانوں کے قتل عام کے منصوبے کو ناکام بنانا تھا۔

''شانتی، موتی!'' لالہ گوپی ناتھ کی آواز ابھری۔

''جی مالک!'' رسوئی سے آوازیں ابھریں۔

''جاؤ سو جاؤ۔'' گوپی ناتھ کی آواز ابھری۔

برابر کے کمرے میں، میں نے روشندان سے جھانکا۔ گوپی ناتھ دروازہ بند کر کے اپنے کمرے کی طرف بڑھا اور اس سے پہلے اس کمرے کی روشنی بھی گل کر دی۔ اب گوپی ناتھ اپنے کمرے میں تھا۔ اس نے ایک کونے میں رکھی ہوئی تجوری کھولی۔ کھٹکے کی آواز سے لالائن کی آنکھ کھل گئی۔

''اب سو بھی جاؤ'' لالائن نے نیند سے بوجھل آواز میں اپنے شوہر سے کہا اور کروٹ لے لی۔

''سوتا ہوں ری!'' گوپی ناتھ نے تجوری میں رقم رکھنے کے بعد تجوری بند کرتے ہوئے کہا اور اپنے بستر کی طرف بڑھ گیا۔

ذرا ہی دیر میں، کوٹھی سناٹے میں ڈوب گئی۔ گوپی ناتھ کے خراٹے روشندان میں بھی صاف سنائی دے رہے تھے۔

اب میرا ذہن بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔ اس وقت تک میں نے جو کچھ کیا تھا محض جذباتی اشتعال میں کیا تھا۔ ریلوے پل کو تباہ کرنے کے بعد میں اپنی کامیابی پر اتنا نازاں تھا کہ اس مہم کے لیے کوئی منصوبہ ہی نہ بنایا تھا۔ میں گوپی ناتھ کو سزا دینا چاہتا تھا لیکن کس نوعیت کی سزا، اس کے بارے میں، میں نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ گوپی ناتھ کی بیٹیوں کا اغوا میں نے سوچا، مگر اس سلسلے میں پریشانی یہ تھی کہ انہیں لے کر کیسے جایا جائے اور کہاں لے کر جایا جائے۔ امروہے میں میرے ایک دوست کا گھر موجود تھا۔ مگر ظاہر ہے کسی لڑکی کو میں وہاں لے کر نہیں جا سکتا تھا۔ میں سوچتا رہا۔ سوچتا رہا، ایک خاکہ میرے ذہن میں بنتا چلا گیا۔

میں نے گھڑی دیکھی گوپی ناتھ کو سوئے نصف گھنٹہ گزر چکا تھا۔ چھت سے میں نے

کوٹھی کے پورے احاطے کا جائزہ لے لیا تھا۔ مندر کے مقابل دوسری سمت سرونٹ کوارٹرز بنے ہوئے تھے۔

''سنو صحرائی! تم سرونٹ کوارٹرز کے دروازوں پر باہر سے کنڈی چڑھا دو۔ یہ کام کر کے فوراً زینے پر آؤ۔ ہم وہیں انتظار کریں گے۔''

صحرائی کے جانے کے بعد میں نے ٹارچ کی روشنی سے نیچے لڑکیوں کے کمرے میں چھپے ہوئے کامریڈ کوہستانی کو اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی وہ کسی چیتے کی مانند مسہری کے نیچے سے نکلا، چاروں ہاتھ پیروں کے بل چلتا ہوا دروازے کی طرف گیا اور اگلے لمحے وہ میری نظر سے اوجھل تھا۔ میں کامریڈ اندلسی کے ساتھ زینے پر آ گیا۔ ٹھیک اسی وقت کوہستانی بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔ ذرا ہی دیر بعد صحرائی بھی اپنا کام کر کے وہاں آ گیا۔

''اب کیا کرنا ہے کمانڈر؟'' اندلسی نے پوچھا۔

''ہمیں پہلے لڑکیوں کو قابو میں کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ذرا ایک منٹ ٹھہرو۔'' میں نے رسوئی کے دروازے کو ٹٹولا اور ٹارچ کی روشنی میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ یہاں میں نے سبزی ترکاری کاٹنے کی دو چھریاں قبضے میں لیں۔ چھریاں اٹھاتے ہوئے میں نے دوسری مرتبہ قصد کیا تھا کہ سالار اعظم سے اگلی ملاقات پر ضرور کہوں گا کہ وہ ہمارے لیے پستولوں کا بندوبست کرے۔ میں نے ٹارچ سے رسوئی کا مزید جائزہ لیا۔ ایک کونے میں مجھے اور زیادہ اہم ہتھیار مل گیا۔ یہ لکڑیاں پھاڑنے کی ایک کلہاڑی تھی اسے اٹھانے کے لیے میں بڑھا ہی تھا کہ کلہاڑی کے ساتھ فرش پر ہی مجھے ٹارچ کی روشنی میں ایک گنڈاسا بھی رکھا ہوا نظر آیا۔ میں نے احتیاط سے وہ دونوں چیزیں بھی اٹھا لیں اور باہر آ گیا۔

ایک چھری میں نے اپنے پاس رکھی ایک اندلسی کو دی۔ گنڈاسا صحرائی کو دیا اور کلہاڑی کوہستانی کو۔

''یہ آپ کو اچھی سوجھی۔'' کوہستانی نے سرگوشی میں کہا۔

''تم میری جگہ ہوتے تو شاید تم بھی یہی سوچتے۔'' میں نے کہا۔ ''ذمے داری انسان کو محتاط اور ذہین خود ہی بنا دیتی ہے۔'' پھر میں نے اپنی نقاب ٹھیک کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو بھی نقابیں درست کرنے کی ہدایت دی۔

''سنو!'' میں نے کہا۔ ''غور سے سنو، ہمیں سب سے پہلے لڑکیوں کو قابو کرنا ہے۔ اتنی خاموشی اور اتنی ہوشیاری سے کہ ذرا سی آواز نہ ہو۔ میں اور صحرائی ایک لڑکی کو قابو میں

کریں گے، اندلسی تم اور کوہستانی دوسری لڑکی کو۔ میں اور اندلسی ان چادروں سے لڑکیوں کے منہ بند کر دیں گے تا کہ وہ چیخ نہ سکیں۔ جبکہ کوہستانی تم اور صحرائی اس کے ساتھ ہی ان کی ٹانگوں کو گرفت میں لو گے تا کہ وہ ٹانگیں نہ چلاسکیں۔ اس کے بعد چھری کی نوک پر انہیں خاموش رکھنا اور بے دست و پا کرنا مشکل نہ ہوگا۔''

پھر ہم آہستہ آہستہ لڑکیوں کے کمرے کی طرف بڑھ گئے۔

ایک ہی وقت پر ہم چاروں کے ہاتھ حرکت میں آئے تھے۔ دونوں لڑکیاں بے بس ہوگئی تھیں، پھر میں نے اور اندلسی نے ان کے گلوں پر چھریاں رکھ دی تھیں۔ دہشت سے ان لڑکیوں کی آنکھیں پھٹ کر رہ گئی تھیں۔

''ذرا آواز نکالی اور یہ چھری۔'' میں نے چھری کی نوک کو اس کے گلے پر خفیف سا دبایا۔

اس کے بعد ان کے منہ میں کپڑا ٹھونسنا اور ان کے ہاتھ باندھنا کچھ مشکل نہ تھا۔

ان لڑکیوں کو لے کر ہم لالہ گوپی ناتھ کے کمرے میں دبے قدموں داخل ہوئے۔

لالہ اور لالائن کو قابو کرنا بھی اتنا ہی آسان ثابت ہوا۔ لالائن کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس کر اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے گئے۔ صرف لالہ گوپی ناتھ ایسا تھا جس کے ہاتھ تو بندھے ہوئے تھے لیکن جس کا منہ نہیں باندھا گیا تھا۔

''کیا چاہتے ہو بالکو!'' لالہ گوپی ناتھ نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

''اس لڑکی کا بدلہ جس نے تمہارے کنویں میں کود کر جان دی تھی۔'' میں نے کہا۔

لالہ نے گھبرا کر لالائن کی طرف اور پھر اپنی بیٹیوں کو دیکھا۔ ''تم کیا کہہ رہے ہو؟''

''حسمہ پور کے علم دین کی بہن کی بات کر رہا ہوں لالہ!'' میں نے کہا۔ ''جسے تم شدھی کر کے اپنی بیوی بنانا چاہتے تھے۔''

لالہ گوپی ناتھ نے پھر گھبرا کر اپنی بیوی اور لڑکیوں کو دیکھا۔ ''بالک کیا بکتا ہے؟''

''یہ بکواس نہیں ہے لالہ، پچھلے مہینے تم نے رامو اور اس کے غنڈوں سے علم دین کی بہن کو اغوا نہیں کرایا تھا؟'' میں نے اندھیرے میں تیر پھینک کر رامو کا نام لیا تھا۔

''وہ...... وہ...... کمینہ رامو، خود ہی اسے اٹھا کر لایا تھا۔'' لالہ نے کہا۔

''اور تمہیں دے گیا تھا۔ مجھے بتاؤ اس کی لاش کہاں ہے؟'' میں نے کہا۔ ''اندلسی تم تجوری کھولو اور اسے خالی کر دو۔''

''یہ یہ کیا کر رہے ہو۔ تجوری خالی ہے۔'' لالہ نے گھبرا کر کہا۔ ''تجوری کی چابی بھی

کھوگئی ہے۔''

''جھوٹ مت بول گوپی ناتھ!'' میں نے چھری سے اس کے کرتے کو پھاڑ دیا۔

خون کی چند بوندیں کرتے پر چھلک آئیں۔

''سچ کہہ رہا ہوں بالک...... مائی باپ۔'' لالہ نے کپکپا کر کہا۔

ایک مرتبہ پھر میرا ہاتھ چلا۔ اس کے کرتے کی آستین رنگین ہوگئی۔ اس کے جھوٹ پر میرا خون کھول اٹھا تھا۔ ''تم جھوٹے بھی ہو اور ذلیل بھی گوپی ناتھ!'' میں نے کہا۔

''اندلسی! سرہانے، گدے کے نیچے سے چابیاں نکال لو۔'' میں نے لالہ کی مسہری کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

گوپی ناتھ کا چہرہ زرد ہوگیا۔ اندلسی چابیاں نکال کر تجوری کی طرف متوجہ ہوگیا۔

گوپی ناتھ کی آنکھیں تجوری پر لگی ہوئی تھیں۔

''لالہ!'' میں نے پھر اس کے پیٹ پر چھری رکھتے ہوئے کہا۔ ''قاتل کی سزا کیا ہوتی ہے؟''

''میں نے کسی کو قتل نہیں کیا!'' لالہ نے خوفزدہ انداز میں کہا۔ اس کے جسم میں تھرتھری چھوٹ گئی تھی۔

''تجوری خالی کر دو اندلسی! اب اس دولت کو صحیح جگہ صرف کیا جائے گا۔'' میں نے اندلسی سے کہا، جو نوٹوں کو کینوس کے تھیلے میں بھر رہا تھا۔ پھر اس نے تجوری میں رکھے ہوئے بکس کھول کر زیورات اور جواہرات بھی تھیلے میں الٹنے شروع کر دیے۔

''تم نے بتایا نہیں لالہ قاتل کی سزا کیا ہوتی ہے؟'' میں نے غصے سے کہا۔

''میر صاحب، رام قسم میں نے اسے قتل نہیں کیا؟'' گوپی ناتھ نے کہا۔ ''اس نے خود ہی چھلانگ لگا دی تھی کنویں میں۔'' الفاظ بڑی مشکل سے نکل رہے تھے۔

''کیوں لگائی تھی؟'' میں پورے زور سے دہاڑا۔ مجھے اس سؤر پر سخت غصہ تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ اس کے جسم میں پے در پے چھریاں بھونک دوں۔ میں نے اس کے کان کی لو کھینچی اور چھری سے اسے کاٹ ڈالا۔

لالہ نے چیخ ماری۔ خون کی بوندیں اس کے کرتے پر گرنے لگیں۔ لالہ تھرتھر کانپ رہا تھا۔ اندلسی تجوری کا تمام مال کینوس کے تھیلے میں منتقل کر چکا تھا۔ دونوں لڑکیوں کی حالت ابتر تھی۔ لالائن بیہوش ہو کر فرش پر گر چکی تھی۔

''وہ تمہاری وجہ سے کنویں میں کودنے پر مجبور ہوئی تھی لالہ!'' میں نے بلند آواز میں

کہا۔ ''تم اس کی عزت لوٹنا چاہتے تھے اور اب ہم تمہیں اسی کنویں میں دھکا دیں گے جو اس شریف لڑکی کی قبر بنا تھا۔ مگر نہیں پہلے یہ بتاؤ اس کی لاش کہاں ہے؟''

''اسے، اسے رامو نے ٹھکانے لگایا تھا'' لالہ گوپی ناتھ نے گھبرا کر کہا۔

''صحرائی اس خبیث بڈھے کا منہ بند کردو۔''

تم...... تم کیا کرنا چاہتے ہو؟'' لالہ نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

''تم کو اسی کنویں میں دھکا دینا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں'' لالہ گوپی ناتھ ملتجیانہ انداز میں چیخا تھا۔ ''تم یہ پاپ نہیں کر سکتے۔ تم مسلمان ہو۔ یہ پاپ مت کرو۔''

''اور تم نے جو کچھ کیا تھا وہ پاپ نہیں پُن تھا؟'' میں دہاڑا۔ ''صحرائی منہ باندھ دو کتے کا۔''

اس کے بعد لالہ گوپی ناتھ کچھ نہ کہہ سکا۔ صحرائی نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ لالہ گوپی ناتھ کو سزا دینے کا نیا منصوبہ میرے ذہن میں آیا تھا۔ ''چلو لالہ!'' میں نے اسے باہر کی طرف دھکا دیا۔ اندلسی اور صحرائی کو وہیں کمرے میں عورتوں کی نگرانی کے لیے چھوڑ کر میں اور کوہستانی، لالہ گوپی ناتھ کو دھکے دیتے ہوئے کنویں کی طرف لے چلے۔ ایک دو مرتبہ لالہ نے رکنے کی کوشش کی تھی۔ مگر چھری کی خراشوں نے اس کے کس بل نکال دیے۔ ''سنو لالہ!'' میں نے اسے دھکا دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم تمہاری لڑکیوں کو ساتھ لے جائیں گے تب تمہیں پتا چلے گا کہ علم دین پر کیا گزری ہوگی؟'' بارش اب بھی پوری رفتار سے ہو رہی تھی۔

لالہ یہ سن کر رکا تھا۔ ''چلتے رہو۔'' میں نے اس کے چہرے پر تھپڑ مار کر کہا۔ ''رکو مت۔''

کنویں کے پاس آ کر وہ بری طرح مچلنے لگا۔ ''لالہ زیادہ پریشان مت ہو۔'' میں نے کہا۔ ''ہم تمہیں کنویں میں دھکا نہیں دیں گے صرف اس میں اتار دیں گے تاکہ تم خوب اچھی طرح اس لڑکی کی قبر کو دیکھ سکو، چلو، ڈول میں کھڑے ہو جاؤ۔'' میں نے چمڑے کا ڈول اس کے سامنے کر دیا۔ آخر اسے اپنے دونوں پیر ڈول میں رکھنے ہی پڑے، پھر میں نے اس کے ہاتھ کھڑے کر دیے اور رسی کو اس کے سر سے اونچا لے جا کر اس کے ہاتھ رسی سے باندھ دیے۔ اسی حالت میں لالہ کنویں میں اتار دیا گیا۔ اس کی کیفیت ایسی تھی کہ وہ ڈول میں کھڑا ہوا تھا اور ہاتھ سر سے اٹھے ہوئے تھے۔ کرتے کی جیب سے ٹاچ نکال کر

میں نے روشنی نیچے ڈالی پانی لالہ گوپی ناتھ کے شانوں تک تھا۔ اس کی آنکھیں ٹارچ کی روشنی میں چمکی تھیں۔ رسی کو مضبوطی کے ساتھ چرخی سے باندھ دیا گیا تھا۔

''لالہ!'' میں نے کنویں میں منہ ڈال کر کہا۔ ''سوچتے رہو کہ اس لڑکی نے کنویں میں کیسے جان دی ہوگی؟'' پھر ہم دونوں پلٹ آئے تھے۔

لالائن ہوش میں آ گئی تھی۔ اس نے اور دونوں لڑکیوں نے سوالیہ انداز میں ہم دونوں کو دیکھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور جسم ہچکیوں سے لرز رہے تھے۔ میں ان آنکھوں میں پوشیدہ مطلب کو خوب سمجھتا تھا۔ وہ نگاہیں مجھ سے سوال کر رہی تھیں لالہ گوپی ناتھ کہاں ہے؟ بھگوان کے لیے بتا دو، گوپی ناتھ کہاں ہے؟

''گوپی ناتھ زندہ ہے لالائن!'' میں نے کہا۔ ''وہ کنویں میں لٹکا ہوا ہے۔ وہ تمہیں صبح صحیح سلامت مل جائے گا۔ اس نے جو پاپ کیا ہے یہ سزا بہت کم ہے مگر سنو لالائن! تمہاری یہ دونوں لڑکیاں ہمارے ساتھ جائیں گی۔''

ماں اور بیٹیوں نے زور زور سے سر ہلایا۔ ان کے بند منہ سے۔ ''ہوں اوں، اوں'' کی گھٹی گھٹی آوازیں ابھریں۔ لالائن بستر سے فرش پر گھٹنوں کے بل گری اور اپنا سر میرے قدموں میں رکھنا چاہا میں پیچھے ہٹ گیا۔ ''لالائن تم سوچ سکتی ہو کہ اس لڑکی پر اور اس کے گھر والوں پر کیا بیتی ہوگی جسے لالہ گوپی ناتھ نے، تمہارے پتی نے، رامو سے اغوا کرایا تھا۔''

منہ بندھے ہونے کے باوجود تینوں ماں بیٹیوں کے حلق سے رحم طلب آوازیں ابھرتی رہیں اور جسم ہچکیوں سے ڈولتے رہے۔ ''سمجھیں لالائن!'' میں نے پوچھا۔ ''اپنے پتی کو سمجھا دینا آئندہ وہ ایسا پاپ نہ کرے۔ چلو لڑکیو!'' دونوں لڑکیوں اور ان کی ماں نے زور زور سے نفی میں سر ہلائے اور رحم طلب نگاہوں سے باری باری ہم چاروں کو دیکھا۔ انداز ایسا ہی تھا گویا وہ ہم سے رحم کی بھیک مانگ رہی ہوں۔

اندلسی اپنا تھیلا اٹھا چکا تھا۔ ''چلو!'' میں نے زور سے کہا۔ دونوں لڑکیوں نے پھر انکار میں سر ہلائے۔ ان کی ماں نے فرش پر سر پٹکنا شروع کر دیا۔

''کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے! سمجھے، ورنہ میں گولی مار دوں گا!'' ایک بھاری اور سخت آواز ابھری۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ ''اے زنانو، ہاتھ اٹھاؤ!'' اس شخص نے پھر کہا۔ دروازے میں رامو کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی اور نال میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ ''سب ہاتھ اٹھا دو۔''

یہ افتاد غیر متوقع اور اچانک تھی۔ ہم چاروں نے ہاتھ اٹھا دیے۔

''تو یہ بات ہے۔'' رامو نے پھر کہا۔ ''ہاتھی کے منہ سے گنے چھیننے آئے تھے۔'' رامو نے کھلی تجوری کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''مال کہاں ہے؟''

''اسی تھیلے میں۔'' میں نے کینوس کے تھیلے کی طرف اشارہ کیا۔

''اے لونڈیو!'' رامو نے سختی سے کہا۔ ''اپنی جگہ کھڑی رہو۔ ورنہ......'' اس نے رائفل کی نال ان کی طرف کر دی۔ دونوں لڑکیاں جو شاید مدد کے لیے رامو کی طرف بڑھ رہی تھیں، سہم کر رک گئیں۔ انہوں نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا، گھٹی گھٹی آوازیں ان کے حلق سے ابھریں۔ مگر شاید رامو ان کا مطلب نہ سمجھ سکا۔

''اور ذرا دیر نہ آتا تو بیٹا ہاتھ ہی صاف کر گئے تھے اپنے باپ کے مال پر۔'' رامو نے کہا اور زور سے قہقہہ لگایا۔ ''چلو لاؤ ادھر تھیلا۔''

''مگر رامو!'' میں نے کہا۔ ''تجھے تو لالہ نے رقم دی تھی۔ تو کیوں آیا ہے یہاں؟'' میں اسے باتوں میں الجھانا چاہتا تھا شاید اس افتاد سے چھٹکارا پانے کی کوئی صورت نکل آئے۔

''رامو مال کے لیے آیا ہے، مال کے لیے۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔ ''اس مال کے لیے جو تم نے سمیٹ لیا ہے۔''

''مگر تم تو لالہ گوپی ناتھ کے خاص آدمی ہو۔ تمہیں تو کل بندوقیں بھی ملنے والی تھیں۔'' میں نے کہا۔

''میں کسی کا آدمی نہیں ہوں بیٹا!'' رامو کا لہجہ تضحیک آمیز تھا۔ ''رامو صرف بدمعاش ہے۔ چور ہے۔ رامو کو مال چاہئے۔''

''اور وہ بندوقیں، وہ کام جو لالہ نے تمہیں بتایا؟'' میں نے پھر سوال کیا۔

رامو زور سے ہنسا۔ ''لالہ کہتا تھا یہ دھرم سیوا کی بات ہے، دھرم سیوا۔ ہونہہ۔ اپنا دھرم تو بس مایا ہے بیٹے۔ مسلمانوں کو مار کر، انہیں شدھی کر کے مجھے یہ مال تو نہیں مل سکتا نا۔''

''تو پھر......'' میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن رامو زوردار آواز میں میری بات کاٹتا ہوا بولا۔ ''باتیں مت بناؤ۔ تھیلا ادھر لاؤ۔'' رامو نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔

میرے اشارے پر اندلسی نے جھک کر تھیلا اٹھایا۔ دونوں لڑکیوں نے پھر اپنے سر کو زور زور سے ہلایا۔ ان کے حلق سے گھٹی گھٹی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ ان کی ماں فرش پر بیٹھی

رامو کو سر کے اشاروں سے کچھ بتانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''کیوں منڈیا ہلاتی ہے؟'' رامو نے کہا۔ ''میں کسی کی مدد کرنے یا فریاد سننے نہیں آیا سمجھی!'' رامو نے ایک قدم اور پیچھے ہٹایا۔ ''ادھر لاؤ۔ دروازے کے باہر۔'' یہ کہہ کر وہ ہمیں بندوق کی زد پر لیے اور پیچھے ہٹا۔ اب وہ دروازے کے باہر تھا۔

ٹھیک اسی وقت جب کہ اس نے دروازے سے باہر سر نکالا تھا۔ ٹھک کی ایک زوردار آواز ہوئی۔ رامو کسی کٹے ہوئے درخت کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ تینوں ماں بیٹیاں شاید بے تحاشا چیخی تھیں۔ مگر یہ چیخیں ان کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ ہم چاروں نے غیر شعوری طور پر ہاتھ نیچے گرا کر پھر اپنے ہتھیار سنبھال لیے تھے۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا؟ ہمیں علم نہ تھا لیکن جو کچھ ہو رہا تھا وہ ہمارے پروگرام کے برعکس تھا اور ہمارے لیے خطرناک بھی۔

اس سے پہلے کہ ہم کوئی اور اقدام کرتے کمرے کے باہر سے آواز آئی۔ ''شیر کی ایک روزہ زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔''

''رات ختم ہو رہی ہے۔ صبح ضرور طلوع ہو گی۔'' کسی نامعلوم شخص کے شناختی جملے کے جواب میں، میں نے فوراً کہا۔ یہ دونوں جملے ہماری تنظیم کے شناختی کوڈ ورڈز تھے۔ یہ کوڈ ورڈز ہر ماہ تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا تھا۔ خطرہ ٹل گیا تھا۔ صحرائی، اندلسی اور کوہستانی نے میری طرف دیکھا تھا ان کی آنکھوں میں مسرت کی چمک تھی۔

ہمارا نیا ساتھی اب دروازے میں آ گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بندوق تھی چہرے پر ہماری طرح نقاب پڑا ہوا تھا۔ اس نے فرش سے رامو کی بندوق اٹھالی۔ ''سعدی!'' ہمارے ساتھی نے کہا تھا۔ ''ادھر آؤ۔'' نو وارد کے کپڑے بارش سے بھیگے ہوئے تھے۔ اس کے سر سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں۔ میں اس کی طرف بڑھ گیا۔ رامو کے جسم کو پھلانگتے ہوئے میں نے ایک نظر ڈالی تھی۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ ''یہ مر تو نہیں گیا؟''

''زندہ بھی ہے تو کیا فرق پڑتا ہے؟'' آنے والے نے کہا تھا۔ ہم اس وقت دوسرے کمرے کے وسط میں تھے۔ ''سنو! باہر پچھلی طرف باغ کی سمت، دروازے کے پاس دو تانگے کھڑے ہیں۔ تم ان میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ وہ تمہیں جہاں لے جائیں چلے جاؤ۔ جلدی کرو۔''

''مگر تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہم یہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

"وقت ضائع نہ کرو۔ جلدی کرو۔" ہمارے نئے ساتھی نے کہا۔ "تمہارے جانے کے پانچ منٹ بعد میں بھی اس مکان سے نکل جاؤں گا۔ جلدی کرو۔"

مزید کچھ کہنا سننا بیکار تھا۔ میں کمرے میں واپس آ گیا۔ "کوہستانی! لالائن کے پیر باندھ دو۔"

لالائن نے بہت ہاتھ پیر مارے تھے مگر بے سود، کوہستانی ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں اس کے ہاتھ پیر باندھ چکا تھا۔ "اندلسی تھیلا اٹھاؤ، ہم چل رہے ہیں۔ کامریڈ ہمارے لیے تانگے لے کر آیا ہے۔" میں نے کہا، اندلسی نے تھیلا اٹھا لیا۔ "کوہستانی، صحرائی! لڑکیوں کو لے چلو۔"

اس کے ساتھ ہی لڑکیوں اور ان کی ماں نے پھر مچلنا شروع کر دیا۔ وہ یقیناً چیخ رہی ہوں گی۔ ان کے بندھے ہوئے منہ سے گھٹی گھٹی غراہٹیں بلند ہو رہی تھیں۔ دونوں لڑکیاں زور زور سے انکار میں سر ہلا رہی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے، چہرے کی جلد تنی ہوئی تھی، آنکھو میں التجا تھی، رحم کی بھیک تھی!

"لڑکیو!" میں نے ان سے کہا تھا۔ "ہمیں تم سے کوئی دشمنی نہیں، مگر تمہارے باپ نے ہماری ایک بہن کو اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہا اور اسے کنویں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا۔ ہم تمہیں ساتھ لے جا رہے ہیں تاکہ تمہارے ماں باپ کو پتا چل سکے کہ وہ دوسروں کے گھر جو آگ لگانا چاہتے ہیں، اس کی آگ خود ان کے گھر کو بھی جلا سکتی ہے البتہ میں تمہیں اتنا یقین دلانا چاہتا ہوں کہ تم ہمارے پاس بھی محفوظ رہو گی۔ ہم اتنے ذلیل نہیں ہیں کہ تمہاری عزت لوٹ کر اپنا دامن گناہوں سے آلودہ کریں۔ لے چلو!" میں نے کوہستانی اور صحرائی سے کہا۔

لڑکیاں مچلیں تو میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "لڑکیو! ہمیں مجبور نہ کرو۔ کوہستانی، صحرائی، اب اگر یہ ہچر مچر کریں تو......" میں نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ اس کا اثر ان پر خاصا ہوا۔ وہ اپنی جگہ سہم کر رہ گئیں۔

پھر احتیاطاً دونوں لڑکیوں کے پیر باندھ دیے گئے۔ یہ تجویز اندلسی کی تھی اور معقول تھی۔ پیر باندھنے کے بعد کوہستانی اور صحرائی نے ایک ایک لڑکی کو شانے پر ڈال لیا۔ اس دوران میں ہمارا مددگار کامریڈ دروازے سے رامو کو ہٹا چکا تھا۔

"خدا حافظ کامریڈ!" میں نے آخر میں کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

"خدا حافظ!" نوارد کامریڈ نے کہا۔ "ہاں تم سب پیچھے ہی بیٹھنا۔" اس نے

آخری ہدایت دی تھی اور ہم کمرے سے باہر آ گئے۔

آسمان سے پانی اب بھی اسی رفتار سے برس رہا تھا۔ سارے معاملات بخیر و خوبی طے ہو گئے تھے۔ اس وقت سب سے زیادہ اطمینان بخش بات یہ تھی کہ ہمیں امروہہ ہی میں ایک جائے پناہ مل گئی تھی۔ ایسی جائے پناہ جو ہماری تنظیم کے افراد فراہم کر رہے تھے۔

میرے ذہن میں اس وقت کئی سوالات تھے، آخر ہماری تنظیم کو کس طرح یہ پتا چل گیا تھا ہم لالہ گوپی ناتھ کی کوٹھی میں موجود ہیں؟ جبکہ تنظیم کے طریقۂ کار کے مطابق، امروہے میں ہماری مہم خفیہ تھی۔ ہم چار کے سوا کسی اور کو اس کا علم ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر علم ہو بھی جاتا تو اصل منصوبے کے مطابق ہمیں اس وقت امروہے سے دور اپنی اپنی منزل پر پہنچنے کے لیے مختلف راہوں پر نکل جانا تھا لیکن اس وقت ان مسائل پر سوچنا بیکار تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ ہمیں ایک پناہ گاہ مل رہی تھی۔ اس سے پہلے خود میرے ذہن میں یہ بات واضح نہیں تھی کہ ہمیں لالہ گوپی ناتھ کی حویلی سے نکل کر کہاں جانا ہے؟

تھوڑی دیر بعد ہم لالہ گوپی ناتھ کی حویلی کے عقبی دروازے سے باہر آ چکے تھے جہاں نوارد کامریڈ کے کہنے کے مطابق دو تانگے موجود تھے۔ تانگوں پر چادروں سے پردے باندھ دیے گئے تھے۔ اس وقت میری سمجھ میں آیا کہ کامریڈ نے تانگوں میں پیچھے بیٹھنے کی ہدایت کیوں کی تھی۔ اب ہم محفوظ انداز میں امروہے کی سڑکوں سے گزر سکتے تھے۔ اندلسی اور صحرائی ایک لڑکی کو ساتھ لے کر پیچھے والے تانگے میں بیٹھے، جبکہ میں اور کوہستانی دوسری لڑکی کے ساتھ اگلے تانگے میں۔ تانگے والوں نے ہم سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی تانگے چل پڑے، تاہم تانگوں میں بیٹھنے سے قبل ہم دونوں لڑکیوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ چکے تھے۔ تانگے معمول کے مطابق رفتار سے بڑھتے رہے۔ میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد چادر کا کونا اٹھا کر باہر دیکھ لیتا۔ ہم کوٹ سے نکل کر سخا الحسنین روڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اس کے بعد تانگوں نے دو ایک گلیوں میں بے مقصد چکر لگائے، جس کا مقصد شاید یہ تھا کہ تانگے والے نہیں چاہتے تھے کہ ہم جو اندر پردے میں بیٹھے تھے راستے کا اندازہ کر سکیں، یا سمت کا تعین! مگر انہیں شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ میں امروہے کے چپے چپے سے واقف ہوں۔

بارش اب ایک ہی رفتار سے اور مسلسل ہو رہی تھی۔ پانی تانگے کی چھت سے ٹپک کر اندر آ رہا تھا لیکن ہم سب تو پہلے ہی شرابور تھے۔ دیر تک بھیگتے رہنے کی وجہ سے مجھے اپنے جسم میں سردی محسوس ہونے لگی۔ میری آنکھیں جل رہی تھیں اور سر میں ہلکے ہلکے دھماکے ہو

رہے تھے۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد ہمارا یہ سفر تمام ہوا۔ تانگے ایک گلی میں رک گئے تھے۔ پھر تانگے والا اترا تھا اور اس نے تانگے کو آگے پیچھے کر کے تانگے کے پائدان کو ایک ڈیوڑھی کے دروازے کی طرف کر دیا۔ اس سے قبل ہی میں لڑکی کے پیروں کی رسی کھول چکا تھا۔ میں نے چادر اٹھا دی۔ ڈیوڑھی کی سیڑھیوں کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر تاریکی تھی۔ اسی وقت پائدان اور ڈیوڑھی کی سیڑھیوں پر ٹارچ کی روشنی پڑی۔ ہم تینوں تانگے سے اتر کر ڈیوڑھی میں آ گئے۔ ٹارچ پھر بجھ گئی۔ مقابل کے دروازے سے آگے صحن تھا اور صحن میں کہیں سے بہت ہی ہلکی روشنی آ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ کہیں دور کوئی چراغ جل رہا ہو۔ میں نے اس شخص کو دیکھنا چاہا جس نے ٹارچ روشن کی تھی۔ ’’اندر چلے جاؤ۔‘‘ سالارِ اعظم کی سرد اور سخت آواز ابھری۔

یہ آواز سن کر میں حیران بھی ہوا تھا اور خوف کی ایک ہلکی سی لہر بھی میں نے اپنے جسم میں دوڑتی محسوس کی تھی۔ اس کے لہجے میں غراہٹ تھی، ناراضگی تھی۔ اس نے آج تک کبھی اس لہجے میں مجھ سے گفتگو نہیں کی تھی۔ جب وقت ہم تینوں آگے پیچھے صحن میں داخل ہوئے۔ دوسرا تانگا دروازے پر آ لگا تھا۔ ہم بارش میں بھیگتے ہوئے دائیں طرف بڑھ گئے، جہاں ایک کمرے میں روشنی ہو رہی تھی اس کے سوا باقی تمام مکان تاریک اور خاموش تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد اندلسی اور صحرائی بھی آ گئے۔ اندلسی نے کاندھے پر کینوس کا تھیلا اور صحرائی نے لڑکی کو اٹھا رکھا تھا۔ اندلسی نے تھیلا رکھ دیا۔ صحرائی نے احتیاط سے لڑکی کو ایک مونڈھے پر بٹھا کر اس کی ٹانگیں کھول دیں۔

جس کمرے میں ہم تھے، اس میں بہت مختصر سامان تھا۔ دس مونڈھے ایک ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف کونے میں میز پڑی ہوئی تھی اور اس پر لیمپ رکھا تھا۔ ایک کونے میں تپائی پر صراحی اور گلاس رکھا تھا اور بس! ہمارے چہرے اب بھی نقابوں میں چھپے تھے۔ کوہستانی نے نقاب اتارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا کہ میں نے اسے روک دیا۔

’’ابھی کامریڈ ذرا صبر کرو۔‘‘

پھر میں نے اور اندلسی نے لڑکیوں کے ہاتھ اور منہ بھی کھول دیے تھے۔ کینوس کے تھیلے سے دو چادریں نکال کر انہیں دے دی تھیں کیونکہ ان کی ساڑھیاں، بھیگ جانے کے سبب، ان کے جسم سے چپک کر رہ گئی تھیں۔ پھر ہم چاروں نے دوسری چادروں سے اپنے سر اور منہ ہاتھ خشک کیے تھے۔ لڑکیاں چادریں اوڑھ کر ایک طرف بیٹھ گئی تھیں۔ ان کے

ہونٹوں سے دبی دبی سسکیاں ابھر رہی تھیں۔

مکان میں خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اس کمرے سے نکل کر دیکھوں، مگر مکان میں سالارِ اعظم کی موجودگی کے سبب میں اس خیال سے باز رہا۔ یہ لمحات میرے ذہن کے لیے بہت پریشان کن تھے۔ پل کی تباہی کے بعد میں نے جو کچھ کیا، منصوبے کے مطابق نہ تھا اور سالارِ اعظم کی ہدایت تھی کہ ہمیں کسی بھی مرحلے پر اپنے منصوبے سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔

کمرے کے باہر برآمدوں میں مجھے قدموں کی آہٹ سنائی دی، لیکن یہ آہٹیں اس کمرے کی جانب نہ بڑھیں۔ جس میں ہم موجود تھے۔ پھر ہم نے تھوڑے فاصلے پر ایک چرچراہٹ سنی۔ یہ شاید دروازہ کھلنے کی آواز تھی۔ رات کے سناٹے اور موسلا دھار بارش کے مسلسل اور بے کیف شور میں یہ آوازیں بہت پُراسرار لگ رہی تھیں۔

’’تم ہمیں یہاں کیوں لائے ہو؟‘‘ ایک لڑکی نے، جو بڑی بہن معلوم ہوتی تھی، مجھ سے پوچھا۔ ’’تم کون ہو؟‘‘

’’میرا نام سعدی ہے بی بی۔‘‘ میں نے جواب دیا۔ ’’اور تمہیں ہم یہاں جس وجہ سے لائے ہیں، اس کا علم تمہیں ہو چکا ہے۔‘‘

’’تم ہمارے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟‘‘ سوال کیا گیا۔

’’جو ایک مہمان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔‘‘ میں نے جواب دیا تھا۔ ’’ہم تمہارے ساتھ وہ سلوک ہرگز نہیں کریں گے جو تمہارے باپ، لالہ گوپی ناتھ نے اس معصوم لڑکی سے کیا تھا۔‘‘

’’وہ لڑکی کون تھی؟‘‘

’’وہ ایک مسلمان لڑکی تھی۔ تمہیں معلوم نہیں؟ اس نے تمہاری کوٹھی میں ہی کنویں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کی تھی۔ تمہیں اور تمہاری بہن اور تمہاری ماں کو بھی اس پر رحم نہیں آیا۔‘‘

’’تم جھوٹ بولتے ہو؟‘‘ اس لڑکی نے کہا۔ ’’باپو ایسا پاپ ہرگز نہیں کر سکتے۔‘‘

’’جب تم گھر واپس جاؤ تو اپنے باپو سے پوچھ لینا بی بی! وہی تمہیں اس کا جواب دے گا۔‘‘ میں نے نفرت سے کہا۔

’’تو کیا تم ہمیں چھوڑ دو گے؟‘‘ اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

’’ابھی تک تو یہی ارادہ ہے۔ میں اور میرے ساتھی، گوپی ناتھ نہیں کہ تم اپنی عزت

کی حفاظت کے لیے خودکشی پر مجبور ہو جاؤ۔''

''تم!'' اس لڑکی نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ برآمدے میں تیز تیز قدموں کی آواز ابھری۔ ایک نوجوان جس کا چہرہ نقاب سے چھپا ہوا تھا کمرے میں آیا۔ ہم سب کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی۔

''کامریڈ سعدی!'' اس نے دروازے کے قریب ہی ٹھہرتے ہوئے کہا۔ ''میرے ساتھ آیئے۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

میں فوراً ہی کمرے سے نکلا۔ میں جلد از جلد سالارِ اعظم سے ملنا چاہتا تھا اور میرا خیال تھا کہ اسی نے مجھے بلایا تھا۔ جس وقت میں برآمدے میں پہنچا، وہ شخص آخری کمرے کے دروازے پر پہنچ چکا تھا اس نے پلٹ کر دیکھا اور مجھے اپنے پیچھے آتا دیکھ کر کمرے میں داخل ہو گیا۔

کمرے میں داخل ہو کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہاں سالارِ اعظم ہو گا۔ مگر وہاں سوائے اس اجنبی کے اور کوئی نہ تھا۔ کمرے میں فرش پر چار بستر لگے ہوئے تھے۔ ''مجھے افسوس ہے اس وقت اس کے سوا کچھ اور انتظام نہیں ہو سکتا کامریڈ!'' نوجوان نے کہا۔ ''اور اس بکس میں چار جوڑے موجود ہیں۔ کپڑے بدل لیں۔ آپ لوگ کافی بھیگ چکے ہیں۔'' وہ خاموش ہو گیا۔

''سالارِ اعظم کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کپڑے بدل لیں۔'' اس نے کہا۔ ''ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ کامریڈ سعدی!''

''کامریڈ! میں ان سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔'' میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''آپ مجھے کامریڈ غزنوی کہہ سکتے ہیں۔'' اس نوجوان نے کہا۔

''کامریڈ غزنوی، پلیز! آپ مجھے ان سے فوراً ملوا دیں۔ مجھے بہت ضروری باتیں انہیں بتانی ہیں۔'' میں نے اصرار کیا۔

''میں نے کہا نا آپ سے۔'' غزنوی کا ٹھنڈا مزاج مجھے مشتعل کیے جا رہا تھا۔ ''آپ کی ملاقات سالارِ اعظم سے ہو جائے گی۔ وہ خود آپ سے جلد از جلد ملنا چاہتے ہیں۔ آپ لباس تبدیل کیجیے۔''

''پہلے لڑکیوں کے لباس کا انتظام کریں۔'' میں نے کہا۔

''وہ ہو رہا ہے۔'' کامریڈ غزنوی نے کہا۔ ''اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ آپ دو لڑکیوں کو

بھی ساتھ لا رہے ہیں، تو آپ کو ان کے لباس تیار ملتے اور بستر بھی۔ پانچ دس منٹ کی بات اور ہے۔''

''اس کامریڈ کا نام کیا ہے جس نے ہماری مدد کی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے صرف آپ کی میزبانی کی ہدایات ملی ہیں۔'' کامریڈ غزنوی نے کہا۔ ''کون کیا کر رہا ہے مجھے علم نہیں۔''

''مجھے بتاؤ سالارِ اعظم کہاں ہیں؟'' میں نے جھلا کر کہا۔ ''نہیں بتاؤ گے تو میں خود تلاش کر لوں گا۔''

''اپنی توانائیاں فضول باتوں میں ضائع نہ کیجیے۔'' غزنوی نے کہا۔ ''آپ کو یقین ہونا چاہیے کہ آپ سے ملاقات کے لیے وہ آپ سے زیادہ بے چین ہیں۔''

مجھے یقین آ گیا کہ اس سے کچھ اگلوانا یا اسے اس کے فرائض سے ہٹانا میرے لیے ناممکن ہے۔ ''ٹھیک ہے'' میں نے کہا۔ ''میں کپڑے تبدیل کرتا ہوں۔''

اسی وقت چھت پر تین مرتبہ دھماکے سے ہوئے۔ ''آپ لباس تبدیل کیجیے۔'' غزنوی نے کہا تھا۔ ''شاید لڑکیوں کے لباس اور بستر آ گئے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے قدم اٹھاتا صحن پار کر کے ڈیوڑھی میں چلا گیا۔ میں نے چھت کی طرف دیکھا۔ یہ غالباً کوئی دو منزلہ مکان تھا اور کوٹھے پر جانے والا زینہ شاید ڈیوڑھی میں ہی رہا ہو گا۔ میں جلدی جلدی لباس تبدیل کرتا ہوا سوچ رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ سالارِ اعظم اس وقت کوٹھے پر ہی ہو گا۔

میں لباس تبدیل کر ہی چکا تھا کہ غزنوی کمرے میں آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا اور سر پر ایک موٹا سا ہولڈال جس میں یقیناً بستر تھے۔

''لیجیے لڑکیوں کا انتظام بھی ہو گیا۔'' غزنوی نے خوشدلی سے کہا۔ ''آپ بلاوجہ ہی پریشان ہو رہے تھے۔'' اس نے اسی دوران میں ہولڈال اور تھیلا زمین پر رکھ دیا تھا۔ ''کیا آپ ان کا لباس بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔'' اس کے لہجے میں شرارت پنہاں تھی۔

''تم بہت دلچسپ آدمی ہو غزنوی!'' میں نے کہا۔ ''پہلے میں سمجھا تھا شاید تم میرا مذاق اڑا رہے ہو۔''

''میرا خیال ہے اپنا خیال تبدیل کر کے آپ غلط نتیجے پر پہنچیں گے۔'' وہ ہنسا تھا۔

''ان کے سونے کا انتظام کہاں ہو گا؟''

''آپ کے ساتھی اور آپ اسی کمرے میں سوئیں گے۔'' کامریڈ غزنوی نے

میرے سوال کی نوعیت سے جواب دینے میں فائدہ اٹھایا تھا۔

''یار میں لڑکیوں کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میرا خیال تھا کہ آپ انہیں اپنے ساتھ نہیں سلائیں گے۔'' اس کے جواب پھر شرارت کا عنصر شامل ہو گیا تھا۔

میں نے اس کے دھپ جڑ دیا۔ ''تم کامریڈ ہو، یا طوطا کہانی!؟''

''آپ مہمان ہیں جناب ہمارے، بلکہ مہمان عزیز۔'' غزنوی بولا۔ ''اس لیے جو کہیں سر آنکھوں پر، بہر حال ان کے سونے سلانے کا انتظام ہماری دردسری ہے۔ وہ جیسے مہمانوں کی مہمان ہیں، ان کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے۔''

''شکریہ کامریڈ غزنوی!'' میں نے کہا۔ ''میری پریشانی کا سبب یہ ہے کہ ان آرام اور دیکھ بھال کو میں اپنی ذمے داری سمجھتا ہوں۔ اس کا تنظیم سے کوئی تعلق ہے۔''

''اور آپ کی وجہ سے وہ ہماری ذمے داری بن گئی ہیں۔'' غزنوی کے لہجے میں تھی۔ ''ویسے آپ کے اطمینان اور تسکین طبع کے لیے بتائے دیتا ہوں کہ ان کے کا انتظام برابر والے کمرے میں ہے، آیئے دیکھ لیجیے۔'' وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

برابر والا کمرہ بھی پیمائش کے اعتبار سے ویسا ہی تھا البتہ اس میں ایک لمبی چو مسہری پڑی ہوئی تھی۔ جس پر کوئی گدا یا چادر نہ تھی۔ میں نے اس کمرے کا جائزہ موم روشنی میں لیا تھا جو کامریڈ غزنوی نے آتے ہی روشن کر دی تھی۔ ''ٹھیک ہے۔'' میں یونہی کہہ دیا۔

''جی ہاں! مسہری خاصی بڑی ہے، تین افراد بھی آسانی سے سو سکتے ہیں۔'' غزنوی نے پھر خوش مزاجی کا مظاہرہ کیا۔

میرے ساتھی لباس تبدیل کر چکے تھے۔ لڑکیوں کو اس کمرے میں بھیج دیا گیا تھا میں انہیں سونا تھا، مگر مصیبت یہ آپڑی تھی کہ دونوں بہنیں کپڑے تبدیل کرنے پر آمادہ تھیں۔ تقریباً ہم سب ہی انہیں بار بار سمجھا چکے تھے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئی تھیں۔ اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ گیلے کپڑے پہنے رہنے سے ان کی طبیعت خراب ہو سکتی بخار ہو سکتا ہے۔ مسلسل بارش کی وجہ سے خنکی بڑھی گئی تھی اور وہ دونوں بڑی نرم اور کو تھیں۔ میں نے انہیں ایک مرتبہ پھر سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

''ہم نے کہہ دیا کہ ہم کپڑے نہیں بدلیں گے۔'' بڑی بہن نے کہا تھا۔ ''

نے۔''

''آخر کیوں؟'' میں نے پوچھا تھا۔

''بس ہماری مرضی۔''

''ٹھیک ہے۔'' کامریڈ غزنوی نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ ''سعدی پھر ہمیں خود ان کے لباس تبدیل کرنے پڑیں گے۔'' یہ کہہ کر اس نے بڑی بہن کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''یہ کیا کر رہے ہو؟'' اس نے حیرانی اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہا۔

''اچھی بچی! میرے دوست کو تم دونوں اور خاص طور پر تمہاری بہت فکر ہے۔ ہم اسے پریشان نہیں دیکھ سکتے۔'' پھر اس نے مجھ سے کہا تھا۔ ''کامریڈ! تم اس کا دوسرا ہاتھ پکڑ لو۔''

''یہ...... یہ تم کیا کر رہے ہو؟'' لڑکی نے پھر کہا تھا۔

''کمال ہے بھئی، ابھی تک نہیں سمجھ پائیں۔'' کامریڈ غزنوی نے کہا۔ ''ہم چاہتے ہیں کہ تم اپنے والدین کے پاس چاق و چوبند جاؤ، لباس تبدیل نہ کیا گیا تو تمہاری طبیعت خراب ہو جائے گی، پھر تمہارے ماں باپ کو کتنی پریشانی ہو گی۔ یار میں تم سے کہہ رہا ہوں۔'' وہ اب مجھ سے مخاطب تھا۔ ''ادھر آؤ، ہاتھ پکڑو۔''

مگر میں اپنی جگہ کھڑا رہا تو اس نے اندلسی اور صحرائی کو اپنی مدد کے لیے بلا لیا۔ میں نے آنکھ کے اشارے سے انہیں بڑھنے کے لیے کہا۔ ان دونوں نے بڑھ کر بڑی بہن کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

لڑکی نے بہت زور لگایا، کسمسائی۔ ''نہیں! نہیں!'' وہ چیخی۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' دوسری بہن سمٹ کر کونے میں کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

''ایسا ضرور ہو گا لڑکی!'' کامریڈ غزنوی نے کہا تھا۔ ''تم نے ہمیں مجبور کر دیا ہے۔ یقین جانو، ہم آنکھیں بند کر لیں گے۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''کامریڈ سعدی! تم اور کوہستانی دوسری کو پکڑ کر منہ پھر لو۔ ہم اس کے کپڑے تبدیل کرنے جا رہے ہیں۔''

ہم دنوں لڑکی کی طرف بڑھے تھے۔ ''یہ...... تو کیا تم......'' بڑی لڑکی نے پھر تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے؟

''جی ہاں، میں تمہارے کپڑے تبدیل کروں گا۔ ہم سب کی آنکھیں بند رہیں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے لڑکی کے شانے سے ساڑھی کا پلو کھینچ لیا۔

''نہیں، نہیں ایسا مت کرو۔'' لڑکی نے روہانسا ہو کر کہا تھا۔

''تو پھر تم خود لباس تبدیل کر لو۔'' غزنوی نے کہا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' وہ بولی تھی۔ ''ہم بدل لیں گے۔'' تقریباً روتے ہوئے اس نے کہا۔ ''تم ہمارے دھرم کے دشمن ہو۔ ہمارے جسم نجس ہو جائیں گے۔''

''تو گنگا جل سے اشنان کر لینا۔'' غزنوی نے کہا۔

اور یوں ان دونوں بہنوں نے لباس تبدیل کیے تھے۔ اس کے بعد کامریڈ غزنوی ہمارے لیے گرم گرم چائے لایا تھا۔ ساتھ ہی دوا کی گولیاں بھی جن کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ ان سے بدن کا درد اور تھکن دور ہو جائے گی۔ بخار آنے کا خطرہ بھی ٹل جائے گا۔

لڑکیوں کو چائے ان کے کمرے میں دے دی گئی تھی اور پھر باہر سے کمرہ بند کر دیا گیا تھا۔ ہم سب اپنے بستروں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

''کامریڈ غزنوی!'' میں نے کہا۔ ''اب تو شاید کوئی رکاوٹ نہیں۔ میں سالارِ اعظم سے فوراً ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔''

''چائے پینے کے پانچ منٹ بعد آپ ان سے ملاقات کر سکیں گے۔'' غزنوی نے کہا تھا اور پھر گھڑی دیکھ کر بولا۔ ''اوفوہ، پانچ بج گئے، تمام رات ہی گزر گئی۔''

واقعی تمام رات گزر چکی تھی۔ ہم فرش پر لگے ہوئے اپنے بستروں پر دراز تھے۔ چادریں ہم نے اپنے اوپر لے لی تھیں۔ کامریڈ غزنوی پیالیاں سمیٹ کر جا چکا تھا، اس نے کہا تھا کہ وہ سالارِ اعظم کو بتانے جا رہا ہے کہ ہم لوگوں نے چائے وغیرہ پی لی ہے اور ملاقات کے لیے تیار ہیں۔ کامریڈ غزنوی، خاصا زندہ دل اور خوش مزاج تھا اس کی گفتگو نے ہمارے ذہنوں پر چھائے ہوئے کشیدگی اور تناؤ کے غبار کو ہٹا دیا تھا۔ سالارِ اعظم نے واقعی ایک نہایت مناسب شخص کو میزبانی کا فریضہ سونپا تھا۔

نیند کا غلبہ شدید ہو گیا تھا۔ کامریڈ غزنوی ابھی تک نہیں آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ اٹھ کر برآمدے میں جاؤں لیکن نیند کا غبار ذہن، جسم اور آنکھوں کو بوجھل کر چکا تھا۔ میں وہیں بستر پر لیٹا رہا۔ میں نے جاگتے رہنے کی کوشش کی مگر یہ کوشش بے سود تھی۔ نیند تو میری نس نس میں، میرے جسم کے روم روم میں تیرتی چلی جا رہی تھی۔

☆======☆======☆

میری آنکھ کھلی اور میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میرے تینوں ساتھی گہری نیند سو رہے

تھے۔ میں کھڑا ہوا اور پھر کمرے سے باہر آ گیا۔ برابر کا کمرہ جس میں دونوں لڑکیاں سو رہی تھیں، بند تھا۔ دروازے پر باہر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔ دن کی سرمئی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ بادل اب بھی آسمان پر جمے ہوئے تھے اور بارش کا سلسلہ اسی طرح جاری تھا۔ میں نے برابر کے کمرے کے دروازے کی کنڈی کھول کر دروازے کو اندر دھکیلنا چاہا مگر لڑکیوں نے دروازہ اندر سے بند کر رکھا تھا۔ مکان میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں برآمدے میں اس سرے سے دوسرے سرے تک چلا گیا۔ برابر، برابر تین کمرے اور تھے مگر سب بند اور ان کے دروازوں پر تالے لٹک رہے تھے۔ پہلو میں دو کمرے بنے تھے اور ان کے درمیان برآمدہ نما جگہ خالی تھی جسے موٹی موٹی بھاری چقیں ڈال کر کمرے کی شکل دی جا سکتی تھی۔ یہ چقیں اوپر لٹک رہی تھیں۔ دوسرے کمرے کے بعد باورچی خانہ تھا۔ سامنے کی دیوار کے ساتھ کیاری اور گملوں میں مختلف بیلیں اور پودے لگے ہوئے تھے۔ ہرے ہرے پتوں کے درمیان جوہی، چنبیلی، موتیا اور بیلے کے سفید سفید پھول کھلے ہوئے تھے۔

میں ابھی اس جائزے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ کامریڈ غزنوی ڈیوڑھی سے صحن پار کرتا ہوا آ گیا۔ ''اٹھ گئے؟''

''سالارِ اعظم کہاں ہیں؟'' میں نے پھر سوال کیا۔

''منہ ہاتھ دھو لو، ناشتہ کرنے کے بعد وہ تم سے ملاقات کریں گے۔'' اس کا جواب تھا۔

''رات تم نے ہمیں خواب آور گولیاں دی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''سالارِ اعظم کا خیال تھا کہ تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔'' غزنوی نے کہا تھا۔

''لڑکیاں اٹھ گئیں؟''

''پتا نہیں۔ دروازہ اندر سے بند ہے۔ کیا انہیں بھی خواب......''

''جی ہاں!'' کامریڈ غزنوی نے کہا۔ ''ہم میں سے کوئی بغیر نقاب کے ان کے سامنے نہیں جائے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے رومال سے اپنا چہرہ چھپا لیا، صرف آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

ناشتے کے بعد ہم چاروں غزنوی کے ساتھ کوٹھے پر آئے۔ اوپر کا یہ حصہ بھی نیچے کی طرح سنسان تھا۔ لگتا تھا کہ شاید سفیدی اور مرمت کا کام ہو رہا تھا۔ ایک طرف لمبی سی سیڑھی پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی بڑا سا ٹب رکھا تھا جس میں سفیدی کے لیے چونا گھلا ہوا تھا۔ طاق میں سفیدی کی کوچیاں، کرنیاں، اور تھاپیاں رکھی تھیں۔ سیدھے ہاتھ کی

طرف گلی کی دوسری طرف مسجد تھی جس کے صحن میں نیم کا ایک بڑا اور گھنا درخت تھا جس نے گلی پر سایہ کر رکھا تھا۔

ایک اندھیری کوٹھری میں ہماری ملاقات سالارِ اعظم سے ہوئی۔ وہ اس وقت بھی چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے تھا۔ کمرے میں روشنی صرف ایک چھوٹے سے موکھلے سے آ رہی تھی۔ شروع شروع میں تو اس اندھیرے میں ہم کچھ نہیں دیکھ پائے مگر تھوڑی دیر بعد اس کوٹھری میں مختلف جاندار اور بے جان ہیولے واضح ہونے لگے۔

کمرے میں داخل ہوتے ہی سالارِ اعظم نے غزنوی سے کہا تھا۔

''ان کامریڈوں کو بٹھاؤ غزنوی!''

اور غزنوی نے ٹارچ کی باریک سی روشنی میں ہمیں وہ چاروں مونڈھے دکھائے جو دو تین قدم کے فاصلے رکھے ہوئے تھے۔ ''اب تم جا سکتے ہو غزنوی!'' وہ بھاری، سخت اور کھردری آواز ابھری جس سے ہمارے کان خوب مانوس تھے۔ ''دونوں لڑکیوں کی نگرانی ضروری ہے۔ انہیں اس گھر کا نقشہ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ دن میں اگر انہیں کمرے سے باہر لاؤ تو ان کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہونی چاہئیں۔ ویسے تمہیں زیادہ دیر ان کی نگرانی نہیں کرنی ہوگی۔ رضیہ آنے ہی والی ہے۔''

غزنوی باہر کو چلا گیا اور دروازہ پھر بند ہو گیا۔ اب اس اندھیری کوٹھری میں خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔

''پل تباہ کر دیا تھا؟'' کامریڈ نے سوال کیا۔

''جی ہاں!'' میں نے کہا۔

''میں نے بھی دیکھا تھا۔'' سالارِ اعظم کی آواز ابھری۔ ''پھر تم یہاں کیوں ہو؟ پل کی تباہی کے بعد تمہیں امروہے میں نہیں ہونا تھا۔'' لہجہ کرخت تھا اس میں تنبیہہ تھی، سرزنش تھی۔

''جناب! اس کی ذمے داری مجھ پر ہے، میرے ساتھیوں پر نہیں۔'' میں نے کہا۔

''ان پر بھی ہے اس لیے کہ تم سب ایک دوسرے کے محافظ ہو۔ ایک سے کوتاہی ہو تو دوسرے کو اسے ٹوکنا چاہیے۔'' سالارِ اعظم کی آواز ابھری۔ ''مجھے بتاؤ، تم یہاں امروہے میں کیوں ہو؟ تمہیں کیا ہدایات دی گئی تھیں۔ یاد ہیں وہ ہدایات؟''

''جی ہاں۔'' میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ کہا تھا۔ ''بات یہ ہے کہ مراد آباد سے آتے ہوئے .....'' پھر میں نے علم دین سے ملاقات کا تمام واقعہ سنا دیا۔

''تمہارے ارادے واقعی نیک تھے۔'' سالارِ اعظم نے کہا۔ ''مگر تمہیں یہ سب کچھ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم اس قوم کی فوج ہو، سمجھے اور فوج کا کام صرف حکم کی تعمیل کرنا ہوتا ہے۔ یہ تمہاری پہلی غلطی تھی اس لیے میں معاف کیے دیتا ہوں، مگر آئندہ کے لیے یاد رکھو، تمہیں ہدایات پر پوری طرح عمل کرنا چاہیے۔ کسی بھی مرحلے پر تمہیں ہدایات سے انحراف نہیں کرنا چاہیے۔''

''بہت بہتر جناب!'' میں نے اطمینان کا یقین دلایا تھا۔

''تم رات مجھ سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھے۔ کیا اطلاع تھی؟'' سالارِ اعظم نے سوال کیا۔ ''کیا بتانا چاہتے تھے تم؟''

اور پھر میں نے وہ تمام باتیں بتا دیں جو رات میں نے لالہ گوپی ناتھ کے ہاں سنی تھیں۔ میں نے ایک ایک بات یاد کر کے بتائی تھی۔ میری کوشش تھی کہ کوئی لفظ ایسا باقی نہ رہ جائے جو کسی اہمیت کا حامل ہو۔

''جگہ لیش نہیں تھا؟'' سالارِ اعظم نے پوچھا۔

''اس وقت تو نہیں تھا، ہو سکتا ہے پہلے رہا ہو اور آ کر چلا گیا ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ جگہ لیش کون ہے؟''

''امروہے کا ایک متعصب ہندو، بہت مالدار!'' سالارِ اعظم نے کہا۔ ''ہاں اب مجھے وہاں پیش آنے والے دوسرے واقعات بتاؤ۔''

اور پھر میں نے لالہ گوپی ناتھ کی کوٹھی میں پیش آنے والے تمام واقعات بتا دیے۔ آخر میں، میں نے کہا۔ ''اس تھیلے میں لالہ گوپی ناتھ کی تجوری سے ملنے والی تمام رقوم اور زیورات موجود ہیں۔ یہ تنظیم کے لیے ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ رقم جو ہندوؤں نے مسلمانوں کے قتل عام کے لیے قاتلوں کو دینے کی خاطر جمع کی تھی اب انہی کے خلاف استعمال ہوگی۔''

''شاید۔'' سالارِ اعظم نے کہا۔ ''تو تم مجھے یہی سب کچھ بتانے کے لیے بے قرار تھے۔''

''جی ہاں!''

''ہندوؤں کی اس سازش کی سن گن مجھے بھی ملی تھی۔'' سالارِ اعظم نے کہا۔ ''اسی لیے میں یہاں آیا تھا۔ بہرحال تمہاری اس باغیانہ مہم جوئی کی وجہ سے ہمیں ان کے صحیح منصوبے کا علم ہو گیا ہے۔ ہمیں سوچنا ہوگا کہ اس سلسلے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے مگر میں تمہیں

آخری وارننگ دے رہا ہوں۔ اگر آئندہ تم سے ایسی کوتاہی ہوئی تو اس کی سزا بہت سخت ہو گی۔'' سالارِ اعظم نے پھر ناراضگی کا اظہار کیا۔ ''کل رات اگر تمہارا ساتھی وقت پر نہ پہنچتا تو کیا ہوتا؟ سوچو!''

میں اور میرے ساتھی خاموش تھے۔ ہمارے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

''پھر یہ بتاؤ کہ لالہ گوپی ناتھ کی کوٹھی سے نکل کر اس کی لڑکیوں کو لے کر تم کہاں جاتے؟''

ہم میں سے کسی کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ یہ مسئلہ تو رات کامریڈ کے وہاں پہنچنے سے قبل تک میرے لیے پریشان کن رہا تھا۔ ''یقیناً تم نے اس کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ تم نے جو کچھ کیا تھا، جذبات سے مغلوب ہو کر کیا تھا۔ یہ تمہاری بہت بڑی غلطی تھی۔ سعدی! یہ تمہاری بہت بڑی بھول تھی۔'' وہ رکا اور قدرے توقف کے بعد بولا۔ ''تم یہ معلوم کرنے کے لیے بے چین ہو گے کہ ہمارا ایک سرفروش تمہاری مدد کے لیے عین وقت پر تانگے لے کر کیسے پہنچ گیا؟ تو سنو! جس وقت تم نے پل تباہ کیا تھا، میں تم سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ یہ ضروری تھا اس لیے کہ یہ تمہاری پہلی مہم تھی اور ہماری جانب سے سبوتاژ کی پہلی کارروائی! میں اس مہم کو بہر قیمت کامیابی سے ہمکنار کرنا چاہتا تھا۔ پھر اس کے بعد تمہارا تعاقب کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ تمہاری مدد کرنا میری ذمے داری اور فرض تھا۔''

''ہم آپ کے شکرگزار ہیں جناب!'' میں نے کہا۔

''احمقانہ جملے مت کہو۔'' سالارِ اعظم نے کہا تھا۔ ''ہم میں سے کوئی کسی پر کرم نہیں کر رہا ہے۔ کوئی کسی کا شکرگزار نہیں ہے سمجھے! ہم میں سے ہر شخص اپنا اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔'' وہ خاموش ہو گیا۔

''پل کی تباہی کے بعد کیا ہوا؟''

''وہی، جو ہونا تھا۔ ٹرین ندی میں جا گری، صرف دو ڈبے بچے مگر ان دونوں ڈبوں میں وہ فوجی جماعت نہیں تھی۔ وہ یقیناً ختم ہو گئی ہے۔ ابھی تک مزید اطلاعات نہیں مل سکیں۔ رات تک کچھ معلوم ہو سکے گا۔ میں تمہیں اس کامیاب مہم پر مبارکباد دیتا ہوں۔ تم سب مبارکباد کے مستحق ہو۔''

''گوپی ناتھ کے ہاں کی کچھ خبر؟''

''اس نے پولیس کو اطلاع دی ہے۔'' سالارِ اعظم نے کہا۔ ''مزید کچھ پتا نہیں چل سکا۔ شام تک شاید چل سکے۔''

''اب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''ہم کب یہاں سے جائیں گے؟''

''تم سب انتظار کرو۔'' سالارِ اعظم نے کہا۔ ''جلدی تمہارے سفر کا انتظام کر دیا جائے گا۔ ایک بات بتاؤ۔ خوب سوچ سمجھ کر جواب دینا۔'' سالارِ اعظم کی بھاری آواز ابھری۔ ''لالہ گوپی ناتھ کے گھر میں کسی موقع پر تم نے کوئی ایسی بات تو نہیں کہی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ تم ان کے منصوبے سے واقف ہو گئے ہو۔ میں نے وہ باتیں سن لی ہیں جو لالہ گوپی ناتھ کی بیٹھک میں ہوئی تھیں خوب غور سے سوچ کر جواب دو۔''

''جی نہیں۔'' میں نے بڑے وثوق سے کہا۔ ''لالہ گوپی ناتھ سے گفتگو کے موقع پر میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا اور کوشش یہ کی تھی کہ لالہ گوپی ناتھ محض یہی سمجھے کہ ہمارا مقصد صرف علم دین کی بہن کا بدلہ لینا ہے۔''

اس ملاقات کے بعد ہم سب نیچے آ گئے تھے۔

لڑکیوں کے کمرے میں باہر اب بھی کنڈی لگی ہوئی تھی۔ کامریڈ غزنوی ہمارے کمرے میں ایک بستر پر دراز تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ بیٹھا۔ پھر اس کے کہنے پر کامریڈ اندلسی اسے رات کی مہم کی تفصیلات بتانے لگا۔ وہ مزے لے لے کر اس داستان کو سنا رہا تھا اور کامریڈ غزنوی اتنے انہماک سے سب کچھ سن رہا تھا گویا یہ مہم خود اسی انجام دی ہو۔ ابھی اندلسی علم دین سے ملاقات کا واقعہ بیان کر رہا تھا کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

''کہاں چلے؟'' غزنوی نے پوچھا۔

''میں ذرا لڑکیوں سے مل لوں۔''

''ضرور۔'' کامریڈ غزلوی نے کہا۔ ''میں ابھی آیا۔'' اس نے اندلسی سے کہا۔

''کامریڈ سعدی کے کمرے میں جانے کے بعد کنڈی لگا کر واپس آتا ہوں۔''

میرے اس استفسار پر کہ اس کی کیا ضرورت ہے؟ غزنوی نے کہا کہ وہ ایسا محض احتیاط کی بنا پر کرے گا کیونکہ سالارِ اعظم نے یہ حکم دیا ہے کہ لڑکیوں کو اس گھر کا نقشہ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ ''ایک لڑکی ہوتی تو کوئی بات نہ تھی۔'' اس نے پھر شوخی سے کہا۔ ''وہاں تو دو۔ دو ہیں۔''

ان دونوں نے مجھے دیکھتے ہی نفرت سے منہ پھیر لیے تھے۔ میں تھوڑی دیر مونڈھے پر ہی بیٹھا رہا۔ پھر کہا۔ ''تم دونوں ناراض ہو مجھ سے؟'' وہ خاموش رہیں ظاہر ہے ناراض ہی تھیں۔ ''میں نے تم سے کہہ دیا ہے، تم یہاں بالکل محفوظ ہو، کوئی تمہاری عزت کا لٹیرا نہیں

ہے۔ ہم تمہیں جلدی واپس بھیج دیں گے، فکر کرنے، ڈرنے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''ہمیں یقین نہیں ہے، سمجھے!'' بڑی نے کہا۔ وہ بڑی پیاری سی لڑکی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے کے خدوخال زیادہ واضح تھے۔ بڑی بڑی ہرنی جیسی آنکھیں، ان پر گہری پلکوں کے لمبے لمبے سائے، کھڑی ستواں ناک، پتلے پتلے، سرخ اور بھرے ہوئے رسیلے ہونٹ، کتابی چہرہ، دائیں گال پر بڑا سا سیاہ تل، لانبے ریشمی بالوں کی گھٹا کمر سے نیچے تک چھائی ہوئی، ساڑھی میں کسا ہوا گداز جسم! وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ وہ سانپ کی طرح خوبصورت، ہرنی کی طرح چوکنا، اور زخمی شیرنی کی طرح حملہ کرنے کے لیے بیتاب تھی۔

''اب تک تو تمہیں یقین آ جانا چاہیے تھا۔'' میں نے کہا۔

''شاید ہم صرف اس وقت تک محفوظ ہیں جب تک تم سب یہاں موجود ہو۔'' بڑی نے کہا تھا۔ ''اس لیے کہ تم شاید ایک دوسرے کے سامنے زیادتی سے گریز کر رہے ہو، اگر تم میں سے کوئی ایک بھی یہاں تنہا ہو جائے تو......'' وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی۔

''جب ایک مسلمان لڑکی بھرے گھر میں گوپی ناتھ سے نہ بچ سکے تو تمہیں......''

''یہ جھوٹ ہے۔'' بڑی نے کہا۔

''تمہارے جھوٹ بولنے سے حقیقت تبدیل نہیں ہو سکتی۔ تم دونوں بہنوں اور تمہاری ماں کو اس لڑکی پر ذرا رحم نہیں آیا۔ شاید اس لیے کہ وہ ایک مسلمان لڑکی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''شاید اس لیے کہ تم مسلمان لڑکیوں کی عزت کو عزت نہیں سمجھتیں۔ اس نے ایک مسلمان لڑکی کو اغوا کرایا، اپنے گھر میں رکھا کہ اسے شدھی کرے اور اس کی عزت کو داغدار کرے۔''

''یہ غلط ہے۔'' اس مرتبہ چھوٹی بولی۔ ''ہمارے سامنے ایسا کوئی واقعہ نہیں ہو۔''

''تو پھر تمہارے باپ نے کیوں یہ بات تسلیم کی تھی کہ رامو نے اس لڑکی کو اغوا کیا تھا۔ کیوں اس نے یہ مانا تھا کہ اس معصوم لڑکی نے کنوئیں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''کیا یہ سب باتیں بھی جھوٹ ہیں۔ وہ تمہارے باپ سے زیادہ شریف تھی۔ تمہارے باپ کو اتنی بھی شرم نہیں آئی کہ جس لڑکی کو وہ اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتا ہے وہ عمر میں اس کی بیٹیوں کے برابر ہے۔ کم از کم دو جوان بیٹیوں کا باپ ہونے کی وجہ سے ہی اسے کچھ شرم کرنی چاہیے تھی۔''

پھر ان لڑکیوں کو ہار ماننی ہی پڑی۔ بڑی نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے تم سچ کہتے ہو مگر جو کچھ

بھی ہوا ہمارے سامنے نہیں ہوا تھا۔ ہم دونوں اپنی ماتا جی کے ساتھ چچا کے پاس ہردوار گئے ہوئے تھے۔ ہم تینوں ایک ہفتہ ہوا ہردوار سے واپس آئے ہیں۔ ہمارے سامنے اگر ایسا ہوتا تو ہم خود اس کو بچاتے...... مگر...... مگر تم...... تم ہم سے بدلہ لینا چاہتے ہو۔'' بڑی بہن کا لہجہ بھرا گیا۔

''نہیں!'' میں نے کہا۔ ''ہم صرف تمہارے ماں باپ کو یہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ اگر کسی گھر کی بیٹی اغوا کر لی جائے تو گھر والوں پر کیا بیتتی ہے۔ ہم تمہیں اپنی پارسائی کا یقین دلانا نہیں چاہتے۔ جب تم گھر جاؤ، تم اس کا یقین تم اپنے آپ سے حاصل کرنا کہ تم اتنی ہی پوتر ہو کہ نہیں جتنی یہاں آتے وقت تھیں۔ ویسے کیا تم اپنے نام بتاؤ گی۔''

''میرا نا شکنتلا ہے۔'' بڑی نے کہا۔ ''اور اس کا نام کامنی۔''

''اور میرا نام......'' میرا جملہ مکمل نہ ہو سکا۔

''سعدی ہے۔'' بڑی نے آنکھیں پھیلا کر کہا تھا۔ ''کامریڈ سعدی مگر مجھے یہ نام اصلی معلوم نہیں ہوتا۔ کیا نام ہے تمہارا؟''

''کیا فائدہ؟'' میں نے کہا تھا۔ ''زندگی کے کسی موڑ پر اب شاید تم سے ملاقات نہ ہو سکے۔ بس اتنا یاد رکھنا کہ کبھی ایک شخص سے، جس کا نام سعدی تھا تمہاری ملاقات ہوئی تھی۔ شاید یہ ملاقات تمہیں یاد دلاتی رہے کہ مسلمان اتنے قابل نفرت نہیں جتنا تمہارا باپ یا دوسرے متعصب ہندو سمجھتے ہیں۔''

پھر میں باہر آ گیا۔ شکنتلا میرے ذہن پر قبضہ جما چکی تھی۔ اس کے لیے میں اپنے دل میں ایسے جذبات محسوس کر رہا تھا جن سے میں اس وقت تک ناآشنا تھا۔ ایک خلش سی تھی جو میری روح میں اتر گئی تھی۔ ایک کانٹا تھا جو میرے دل میں چبھ کر رہ گیا تھا۔

شکنتلا سے ملاقات کے بعد وہ دن مجھے اور بھی سوگوار معلوم ہونے لگا تھا۔ دن بھر بارش یکساں رفتار سے ہوتی رہی تھی۔ کچھ دیر بعد کامریڈ رضیہ بھی آ گئی ان دونوں بہنوں کے پاس چلی گئی۔ کامریڈ رضیہ کیسی تھی، اس کی شکل وصورت کیسی تھی، مجھے معلوم نہ تھا۔ وہ سفید لانبے برقعے میں آئی تھی اور کامریڈ غزنوی اسے سیدھا لڑکیوں کے کمرے میں لے گیا تھا لیکن اس سے پہلے اس نے کامریڈ رضیہ کو ہدایت کی تھی کہ وہ لڑکیوں سے اپنا چہرہ چھپائے رکھے اور رضیہ نے بتایا تھا کہ برقعے کے نیچے اس نے اپنے چہرے پر بھی نقاب ڈال رکھی ہے۔

''آخر اس نقاب پر اتنا زور کیوں ہے۔'' میں نے کامریڈ غزنوی سے پوچھا تھا۔

"شاید اس لیے کہ ہمارا تعلق امروہہ سے ہے۔" اس نے جواب دیا تھا۔

بارش اب بھی اسی رفتار سے ہو رہی تھی۔

ہم چاروں یعنی میں اور میرے ساتھی پیپل کے درخت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ہمیں ایک اور مہم درپیش تھی۔ اس مہم کا سربراہ پھر مجھے ہی بنایا گیا تھا۔

مغرب کے بعد ہی سالارِ اعظم نے ہمیں پھر کوٹھے پر طلب کیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ پولیس نے امروہے میں بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کی ہیں۔ ان گرفتار شدگان میں سیاسی کارکنوں کے علاوہ تمام بدنام اور مشتبہ افراد میں شامل ہیں، نامی گرامی بدمعاش، غنڈے، دس نمبری اور لفنگے بھی شامل ہیں۔ ان لوگوں میں ہندو، مسلمان، سبھی ہیں۔ ان سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے، ریلوے پل کی تباہی کے بارے میں اور گوپی ناتھ کے گھر ڈکیتی کے بارے میں بھی! پولیس گوپی ناتھ کی لڑکیوں کے اغوا کو چھپا رہی ہے، شاید اس لیے کہ گوپی ناتھ نے ایسا ہی کہا ہے۔ وہ شاید اپنی بیٹیوں کے اغوا کی داستان کو عام کرنا نہیں چاہتا۔ اس کی رپورٹ پر ایک پولیس پارٹی حسمہ پور بھی جا چکی ہے۔ شاید علم دین کو بھی گرفتار کر لیا جائے کیونکہ گوپی ناتھ نے، مشتبہ افراد میں اس کا بھی نام لکھوایا ہے۔ ایک اور اہم اطلاع یہ تھی کہ اسی دن آس پاس کے مختلف علاقوں سے پندرہ بیس ہندو، سیٹھ جگدیش کے ہاں آ کر ٹھہرے تھے۔

"تم لوگ کیونکہ یہاں موجود ہو" سالارِ اعظم نے کہا۔ "اس لیے میں چاہتا ہوں کہ یہ مہم بھی تم چاروں ہی انجام دو۔ میں نہیں چاہتا کہ امروہے کا کوئی سرفروش اس مرحلے پر سامنے آئے۔"

اور پھر اس نے اس مہم کی تفصیلات بتائیں۔ یہ مہم صرف ان بندوقوں پر قبضہ کرنے اور گوپی ناتھ کو یہ یقین دلانے پر مشتمل تھی کہ اس کے گھر ڈاکا ڈالنے والوں اور اس کی بیٹیوں کو اغوا کرنے والوں کا تعلق امروہہ سے نہیں ہے۔ گویا ہمیں نہ صرف کوتوال سہنا سے بندوقیں چھین لینی تھیں بلکہ ایک مرتبہ پھر گوپی ناتھ کے گھر میں داخل ہونا تھا۔

"مگر جناب وہ لوگ کیونکر ہماری بات پر یقین کریں گے کہ ہم امروہے سے تعلق نہیں رکھتے؟" میں نے پوچھا تھا۔

"ہمیں ان کو یقین دلانے کی ضرورت نہیں ہے۔" سالارِ اعظم نے کہا۔ "صرف انہیں شبہے میں مبتلا کرنے کی ضرورت ہے۔ تمام مشتبہ اور ناپسندیدہ عناصر اس وقت پولیس کی حراست میں ہیں۔ اس کے باوجود ایسی دلیرانہ واردات کے بعد ان کا شک و شبہے میں

مبتلا ہو جانا لازمی ہے کہ ان وارداتوں کا تعلق کسی ایسے گروہ سے ہے جو امروہے سے تعلق نہیں رکھتا۔"

اور اب میں اپنے ساتھیوں، اندلسی، صحرائی اور کوہستانی کے ساتھ پیپل کے اس گھنے درخت پر بیٹھا تھا اور مقابل کے درخت پر کامریڈ غزنوی اپنے ساتھی کے ساتھ موجود تھا۔ یہ دونوں درخت لالہ گوپی ناتھ کی کوٹھی کو جانے والی سڑک پر تھے۔ کامریڈ غزنوی کو اپنے ساتھی کے ہمراہ یہیں سے لوٹ جانا تھا۔ ان کی واپسی کے لیے دو سائیکلیں موجود تھیں۔

اس وقت رات کے بارہ بج رہے تھے اور ہمیں اپنے پیغام کا انتظار تھا۔ اندلسی، صحرائی اور کوہستانی بڑے جوش میں تھے۔ ان کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ سالارِ اعظم سے ملاقات کے بعد ان تینوں نے بڑے پُرجوش اور مخلصانہ انداز میں مجھے مبارکباد دی تھی۔ وہ خوش اس بات پر تھے کہ سالارِ اعظم ہم پر بے حد اعتماد کرتا ہے۔

"انتظار ختم! ٹم ٹم آ رہی ہے۔" ایک سائیکل سوار کا ہیولا، درخت کے نیچے سے گزرتا ہوا بلند آواز میں بولا اور چند لمحوں بعد رات کی تاریکی کی چادر میں گم ہو گیا۔ ہم اسی پیغامبر کا انتظار کر رہے تھے۔ ہم تیزی سے نیچے آ گئے اور اس رسے کو جس کا ایک سرا اس درخت کے تنے سے بندھا ہوا تھا جہاں کامریڈ غزنوی اپنے ساتھی سمیت بیٹھا تھا کھینچ لیا اور دوسرا سرا کس کر پیپل کے درخت کے تنے سے باندھ دیا۔ اب یہ رسا دونوں درختوں کے درمیان میرے سینے کی بلندی پر بندھا ہوا تھا۔ یہ کام کرنے کے بعد ہم دم سادھ کر درخت سے کچھ دور اندھیرے میں بیٹھ گئے۔

ذرا دیر میں گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ پھر چند لمحوں بعد گھوڑا رسی سے الجھا، اور توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ گھوڑا گر گیا۔ گاڑی بان اس کے ساتھ ہی اچھل کر آگے گرا تھا۔ کوتوال سہنا جو اندر بیٹھا تھا وہ بھی لڑھکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہم چاروں تیزی سے جھپٹے تھے۔ دوسری طرف سے کامریڈ غزنوی اپنے ساتھی کے ساتھ بڑھا تھا۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق غزنوی اور اس کے ساتھی نے گاڑی بان کو چھاپ لیا تھا اور ہم کوتوال کو بے بس کر چکے تھے۔ ان دونوں کو ہم نے اسی رسے سے باندھ کر بلکہ لپیٹ کر ایک طرف ڈال دیا اور ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ اس عرصے میں کامریڈ غزنوی اپنے ساتھی کی مدد سے ٹم ٹم کے اندر رکھے ہوئے لکڑی کے لانبے بکسوں کو کھول کر ان میں سے بندوقیں اور کارتوس نکال کر موٹی موٹی چادروں میں لپیٹ کر اپنی سائیکلوں کے کیریئر پر باندھ چکا تھا۔

''خدا حافظ کامریڈ!'' غزنوی نے کہا۔

''خدا حافظ! کتنی بندوقیں تھیں؟'' میں نے پوچھا

''اٹھارہ بیس تو رہی ہوں گی۔'' غزنوی نے کہا۔ ''اچھا!'' پھر وہ اپنے ساتھی کے ساتھ سائیکلوں کی طرف بڑھ گیا اور میں نے کوتوال کی ٹم ٹم سنبھالی۔ میرے تینوں ساتھی وقت ٹم ٹم کے پچھلے حصے میں بیٹھے ہوئے تھے لیکن اس سے قبل ہم نے لباس تبدیل کر لیے تھے۔ ان لباسوں میں ہم درمیانے طبقے کے ہندو ہی معلوم ہوتے تھے۔

ٹم ٹم اب لالہ گوپی ناتھ کی کوٹھی کی طرف بڑھ رہی تھی۔

لالہ گوپی ناتھ تک رسائی کچھ مشکل نہ تھی۔ کالو اس وقت برآمد میں موجود تھا۔ میں نے سہنا کی ٹم ٹم گیٹ کے سامنے کی جا کر کھڑی کر دی تھی اور کالو نے ٹم ٹم کو پہچان کر گیٹ کھول دیا تھا۔ میں نے ٹم ٹم گیٹ سے ذرا آگے روک دی تھی۔ ''دیپک لال نہیں آیا آج؟''

''اسے بخار ہے۔ لالہ جی کو اطلاع کر دو کہ سہنا نے مال بھیجا ہے۔''

''سہنا نہیں آئے؟''

''وہ بہت مصروف ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''سالے مسلوں سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ وہ مار پڑ رہی ہے کہ بیٹوں کو نانی یاد آتی ہوگی۔''

میں نے اس کے ساتھ کوٹھی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ہم تیز قدموں سے برآمدے میں آ گئے۔ ''لالہ جی کو خبر دے دو۔''

وہ اندر چلا گیا۔ گزشتہ روز میں نے اس طرف دو ملازمین کو دیکھا تھا اور گوپی ناتھ نے بھی دو آدمیوں ہی کا نام لے کر گیٹ بند کرنے کو کہا تھا۔ ایک کا نام کالو تھا دوسرے کا سنگھے مگر اس وقت دوسرا ملازم نظر نہیں آ رہا تھا۔

بیٹھک میں روشنی ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد میں ڈرائنگ روم میں لالہ گوپی ناتھ کے سامنے موجود تھا۔ ایک طرف صوفے پر ایک نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی کتاب تھی جس کی وہ بس یونہی ورق گردانی کر رہا تھا۔ لالہ گوپی ناتھ کا چہرہ اس وقت ستا ہوا تھا۔ اضطراب اور پریشانی اس کی ہر حرکت سے نمایاں تھی۔ اسے دیکھتے ہی میں نے پرنام کیا۔ ''سہنا جی نے۔'' میں نے اس ملازم اور نوجوان کی طرف دیکھا۔ ''سامان بھیجا ہے۔''

''وہ خود کیوں نہیں آئے؟'' گوپی ناتھ نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا اور میں نے

ایک مرتبہ پھر مسلوں کی پٹائی کی کہانی نمک مرچ لگا کر دہرا دی۔ اس دوران میں ملازم باہر جا چکا تھا۔

''کہو کیا بات ہے؟'' لالہ گوپی ناتھ نے مجھ سے پوچھا تھا اور میں نے صوفے پر بیٹھے ہوئے نوجوان کی طرف دیکھا تھا، انداز ایسا ہی تھا جیسے میں اس کے سامنے کچھ بتانے سے گریز کر رہا ہوں۔ ''بتاؤ! بتاؤ، میرا بھتیجا ہے، مہندر ناتھ!''

''میرا نام شنکر ہے۔'' میں نے اپنا تعارف کرایا۔ ''بنارس یونیورسٹی میں پڑھتا ہوں۔ سیٹھ جگدیش کے بلاوے پر آج ہی آیا ہوں۔''

''اچھا، اچھا! کتنے لوگ آ چکے ہیں جگدیش کے ہاں؟'' گوپی ناتھ نے دریافت کیا۔

''مجھ سمیت پینتیس۔'' میں نے کہا۔ ''سہنا جی نے بندوقیں بھیجی ہیں۔''

''کہاں ہیں؟'' گوپی ناتھ کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

''باہر ٹم ٹم میں۔ میرا ساتھی بھی ہے۔ بکس بھاری ہیں، انہیں اٹھوا لیجیے۔''

''کالو!'' گوپی ناتھ نے اپنے ملازم کو آواز دی۔ کالو وہی ملازم ثابت ہوا جس کے ساتھ میں حویلی میں آیا تھا۔ ''جاؤ ٹم ٹم سے سامان اتروا ؤ۔'' لالہ جی نے کالو کو ہدایت دی۔ ملازم کے جانے کے بعد گوپی ناتھ نے اپنے بھتیجے سے کہا۔ ''مہندر! لالی سے کہو چائے بنوا لے۔''

مہندر اٹھ کر دوسرے کمرے میں کھلنے والے دروازے پر گیا۔ ''لالی!'' اس نے آواز دی۔

''جی بھیا!'' ایک نسوانی آواز آئی۔

''چائے بنوالو، تین پیالیاں!'' مہندر ناتھ نے کہا۔

اور پھر میں نے جگدیش کے بلاوے پر امروہے آنے کی تفصیل بتائی کہ کس طرح بنارس یونیورسٹی میں دھرم پر نچھاور ہو جانے والے طلبہ نے تنظیم بنائی ہے اور وہ مختلف علاقوں میں کیا کیا کام کر رہے ہیں۔ میرا جوش وخروش رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ اب میں اسے بہار میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی ان فرضی مہموں کی کہانیاں سنا رہا تھا جو شدھی تحریک کے سلسلے میں انجام دی تھیں۔ آخر میں، میں نے کہا۔ ''ہندوستان ہمارا ہے لالہ جی! بھارت ورش ہمارا ہے۔ یہاں صرف ہم رہیں گے۔ یہاں ہم اپنے دھرم کا بول بالا کریں گے۔''

اس کے ساتھ ہی لالہ جی نے مسلمانوں کے خلاف اپنی نفرت کا غبار نکالنا شروع کر دیا۔ اس دوران میں وہ مسلمانوں کو مغلظات بھی سناتے جا رہے تھے۔ پھر انہوں نے مجھے اپنے اعتماد میں لینے کے لیے اپنی بیٹیوں کے اغوا کی کہانی بھی نمک مرچ لگا کر سنائی۔ یہ تذکرہ کرتے ہوئے ان کی آنکھوں میں آنسو بھی آ گئے۔ میں نے جواب میں انہیں تسلیاں دیں۔ ''کچھ دن کی بات اور ہے لالہ جی!'' میں نے کہا تھا۔ ''ہم ان مسلمانوں کے لیے ہندوستان کی زمین تنگ کر دیں گے۔ آپ دیکھتے جائیے۔''

''شنکر جی!'' مہندر ناتھ نے کہا۔ ''کیا مسلمان انسان نہیں ہیں؟''

''جی!'' میں نے حیرت سے کہا۔

''مہندر!'' لالہ گوپی ناتھ نے اپنے بھتیجے کو سرزنش کی۔ ''تو چپ رہ!'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''معاف کرنا شنکر جی، یہ مہندر پاگل ہو گیا ہے۔ مسلمانوں کا ہمدرد بنتا ہے۔ ہندو مسلم ایکتا کی بات کرتا ہے، پاگل ہو گیا ہے۔''

اس دوران میں چائے آ گئی تھی۔ مہندر نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''میں پاگل میں نہیں ہوں چاچا جی! پاگل سوامی شردھانند، آپ اور شنکر جیسے لوگ ہوئے ہیں۔ جب اس دیش میں سکھ، پارسی، عیسائی، بودھ سب رہ سکتے ہیں تو مسلمان کیوں نہیں رہ سکتے؟''

''اس لیے کہ وہ اب ہماری بہو بیٹیوں کو بھی اغوا کرتے ہیں، ان پر بری نظر رکھتے ہیں۔'' لالہ جی نے کہا۔

''اور اگر ہم مسلمانوں کی بہو بیٹیوں کو ان کے گھروں سے اٹھوا لیں، ان کی عزت لوٹنا چاہیں تو کیا آپ مسلمانوں کو بھی یہ حق دیں گے کہ وہ ہندوؤں سے ہندوستان میں رہنے کا حق چھین لینے کی باتیں کریں؟''

''چپ ہو جا مہندر!'' لالہ گوپی ناتھ گرجا۔ ''تو...... تو تجھے شرم نہیں آتی اپنے چاچا کے سامنے ایسی باتیں کرتے!''

''شرم تو مجھے اس دن بھی آئی تھی جب ایک مسلمان لڑکی کنویں میں ڈوبی تھی۔'' مہندر ناتھ نے کہا۔

لالہ گوپی ناتھ غصے سے اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ ''نکل جا ابھی، اسی وقت!'' وہ چیخے اور بڑھ کر مہندر کا ہاتھ پکڑ کر اٹھا دیا۔ ''چل نکل جا!''

شور وغل سن کر لالائن اور ایک نوجوان لڑکی لالی، ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ''لالہ

جی! یہ کیا کر رہے ہو؟'' لالائن کی آواز ابھری۔

''تو اندر جا!'' لالہ نے کہا مگر لالائن، مہندر کو لالہ جی سے چھڑا کر اندر لے گئی۔ اس کے بعد لالہ جی نے مجھ سے پھر کہا۔ ''برا مت ماننا شنکر! اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' پھر جیسے انہیں کچھ یاد آ گیا۔ ''ارے یہ کالو ابھی تک نہیں آیا؟''

''میں دیکھتا ہوں جا کر۔'' میں نے کہا۔

''نہیں تم یہیں ٹھہرو۔''

لالہ گوپی ناتھ نے کہا اور پھر زور سے آواز دی۔ ''سنگھے! ارے او سنگھے!''

''آیا سرکار!'' کوٹھی کے اندر سے سنگھے کی آواز آئی۔ چند لمحوں بعد وہ ڈرائنگ روم میں تھا۔ ''جی سرکار!''

''باہر جا کر دیکھ!'' گوپی ناتھ نے کہا۔ ''یہ کالو کہاں مر گیا۔ سہنا جی کی بگھی سے بکسے اٹھانے گیا تھا۔''

میں جانتا تھا کہ کالو کہاں مر گیا تھا، وہ اس وقت ٹم ٹم میں بندھا پڑا تھا اور اب سنگھے کا بھی یہی حشر ہونے والا تھا، اس کے بعد ہماری اصل کارروائی کا آغاز! لالہ گوپی ناتھ گفتگو کے دوران میں یہ بتا چکا تھا کہ اس کی لڑکیوں کے اغوا کے بعد اس کا بھتیجا مہندر اور بھتیجی لالی کو اس کے بھائی نے لالہ اور لالائن کا جی بہلانے کے لیے یہاں بھیج دیا تھا۔

سنگھے کے جانے کے بعد میں پھر لالہ گوپی ناتھ سے اس مہم کے بارے میں باتیں کرنے لگا تھا جس کے لیے جگدیش نے مختلف علاقوں سے ہندوؤں کو بلایا تھا اور لالہ گوپی ناتھ بتا رہا تھا۔ ''آج صبح ایک پارٹی حسمہ پور جائے گی اور کل رات وہاں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جائے گی۔ انہیں بتا دیا جائے گا کہ ہندو بیٹیوں کو اغوا کرنا کوئی معمولی بات نہیں۔''

''تو پھر بندوقیں یہاں کیوں بھیج گئی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بندوقیں یہاں سے جائیں گی۔'' لالہ گوپی ناتھ نے کہا۔ ''شنکر جی، تم نہیں جانتے۔ میرا خون کھول رہا ہے۔ میں اس علم دین کا خون پی جاؤں گا۔''

''بندوقیں کون لے کر جائے گا؟'' میں نے پھر پوچھا۔

مگر مہندر کی باتوں نے شاید لالہ گوپی ناتھ کے جبر وضبط کے بندھن توڑ دیے تھے۔ ''ان مُسلوں نے بڑے کل پرزے نکالے ہیں۔ اب ہماری بھی عزت سے کھیلنے لگے ہیں، ملیچھ، ذلیل! نہ معلوم میری بیٹیاں کس حال میں ہوں گی۔ میں حسمہ پور میں مسلمانوں کا ایک

ایک گھر جلادوں گا، ان کے ایک ایک بچے کو قتل کر دیا جائے گا، ان کی عورتوں کی عزتیں
کے سامنے لوٹی جائیں گی۔''

''ایسا ہی ہوگا لالہ جی!'' میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔ ''ہمیں اس وقت
سے کام لینا چاہیے۔ آپ مجھے بتائیں کہ یہاں سے بندوقیں کون لے کر جائے گا؟''

اور پھر گوپی ناتھ کھل گیا۔ اس نے بتایا تھا کہ بندوقیں وہ خود لے کر حسمہ پور جا
گا۔ اس کے ساتھ دو اور نوجوان بھی ہوں گے جو جگدیش کے ہاں سے آئیں گے۔ ا
نے یہ بھی بتایا کہ سہنا آج رات کسی وقت چار ہندو غنڈوں کو، جو پولیس کی حراست
ہیں، چھوڑ دے گا۔ کاغذات اور ریکارڈ کی رو سے وہ پولیس کی حراست میں ہی ہوں گے
حسمہ پور کے مسلمانوں پر حملے کی قیادت انہی چاروں غنڈوں کو کرنی تھی۔ وہی حملہ
پارٹیوں کو بھی حسمہ پور لے جانے والے تھے کیونکہ وہ اس علاقے سے خوب واقف تھے
''حسمہ پور کے لوگ اگر ان غنڈوں کو پہچان بھی گئے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔'' لالہ گو
ناتھ نے کہا۔ ''کیونکہ پولیس ریکارڈ کے مطابق وہ تو پہلے ہی پولیس کی حراست میں ہو
گے۔ ہمارے جوان، حملے کے بعد اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے اور یوں کوئی
تفتیش ہم لوگوں تک نہ پہنچ سکے گی۔''

میں اس کی باتوں پر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ سہنا اب ان لوگوں کو کیسے رہا
سکے گا۔ وہ تو اس وقت اپنے کوچوان کے ساتھ سڑک کے کنارے بنڈل کی طرح بندھا
تھا۔ صبح سے پہلے اس کی رہائی کا کوئی امکان نہ تھا، لیکن اب ہمیں تیزی سے کام کرنا تھا
جگدیش کے بھیجے ہوئے وہ آدمی کسی وقت بھی یہاں پہنچ سکتے تھے جنہیں لالہ گوپی ناتھ کے
ساتھ حسمہ پور جانا تھا۔

''کیا مصیبت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ رامو کے ساتھ سنگھے بھی وہاں جا کر بیٹھ
گیا۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں جا کر!''

گوپی ناتھ کو بھی شاید اب گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ میرے ساتھ ہی برآمدے
میں آیا تھا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا، بارش میں بھیگتا گیٹ کے باہر پہنچا۔ وہاں سب کام ختم
تھا۔ رامو اور سنگھے جکڑے پڑے تھے۔ ان کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا تھا۔ میں پھر الٹے
قدموں واپس آیا۔

''کچھ گڑبڑ ہے لالہ جی!'' میں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔ ''تینوں وہاں بندھے
پڑے ہیں۔ بندوقوں کے بکسے غائب ہیں۔''

''ہیں!'' لالہ گوپی ناتھ لڑکھڑا کر رہ گیا۔ ''ہائے رام! اندر آ جاؤ بیٹا، اندر آ جاؤ!''
میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہ دروازے سے دوسری طرف بڑھ رہا تھا۔ ''دروازہ
بند کر دو۔'' اس نے مجھ سے کہا۔ خوف سے اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ ''دروازہ بند کر دو۔''
اس نے پھر گھبراہٹ سے کہا۔ ''اندر ہی آ جاؤ۔'' یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

مگر مجھے دروازہ بند نہیں کرنا تھا۔ میرے تینوں ساتھی گیٹ بند کر کے اندر آ چکے
تھے۔ انہوں نے اب پھر رومالوں سے اپنے چہرے چھپا لیے تھے۔ میں نے انہیں ہاتھ کے
اشارے سے اندر آنے کے لیے کہا اور تیزی سے برابر کے کمرے میں کھلنے والے
دروازے میں آ گیا۔ گوپی ناتھ باغ کی طرف برآمدے میں کھلنے والے دروازے میں
کھڑا چیخ رہا تھا۔ ''موتی، موتی!''

تینوں کامریڈ ڈرائنگ روم میں آ چکے تھے۔ اندلسی دروازہ بند کر چکا تھا۔ میں نے
انہیں وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور لائٹ بجھا کر لالہ گوپی ناتھ کے پاس پہنچ گیا۔ لالہ گوپی
ناتھ کی آواز سے ایسی گھبراہٹ عیاں تھی کہ موتی کے ساتھ ہی شانتی، لالائن، لالی، اور
مہندر بھی وہاں آ گئے تھے۔

''کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ بتاؤ تو؟'' مختلف سوالات لالہ گوپی ناتھ سے کیے گئے۔

''بتاتا ہوں۔'' لالہ گوپی ناتھ نے کہا۔ ''دیکھ موتی! تُو فوراً جا سہنا جی کے پاس!''
لالہ گوپی ناتھ نے پھولے پھولے سانسوں کے درمیان کہا۔ ''کہنا لالہ جی نے بلایا ہے،
فوراً ان سے کہیو کہ جو مال انہوں نے بھیجا تھا، وہ کوئی اڑا لے گیا ہے۔ موتی تُو پچھلے
دروازے سے جا، جلدی کر! سہنا جی کو ساتھ لانا۔ جلدی جا۔ دوڑتا ہوا۔ سمجھا!''

موتی بھاگتا ہوا برآمدے سے باغ کی طرف بڑھا۔ چند لمحوں بعد وہ باغ کے دروازے
سے نکل چکا تھا۔ لالہ جی نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

''کالو اور سنگھے کہاں ہیں؟'' مہندر نے پوچھا۔

''باہر...... باہر...... بندھے پڑے ہیں۔'' لالہ گوپی ناتھ نے کہا۔ ''یہ وہی معلوم
ہوتے ہیں۔ انہی کا کام معلوم پڑتا ہے۔'' وہ بے حد خوفزدہ تھا۔

''میں دیکھتا ہوں۔'' مہندر نے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھنا چاہا۔

لالائن اور لالی نے اسے پکڑ لیا۔ ''نہیں نہیں۔'' لالائن بولی۔ ''تو یہیں ٹھہر بیٹا!''

''گھر میں اور کوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں بیٹا!'' لالہ جی نے کہا اور پھر باقی لوگوں سے بولے۔ ''تم سب اندر جاؤ،

کمرے میں جاؤ۔'' لالہ گوپی ناتھ کے اشارے پر لالائن، مہندر، لالی اور شانتی کو
اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ''دروازہ بند کرلو اندر سے!'' لالہ جی پر کچھ زیادہ ہی گھبرا
طاری تھی۔ انہوں نے خود بڑھ کر دروازے سے بند کر دیے تھے۔

ذرا ہی دیر میں حالات ہمارے قابو میں تھے۔ میں لالہ گوپی ناتھ کو باتوں میں لگ
ہوئے تھا کہ تینوں کامریڈ آہستگی سے وہاں داخل ہوئے۔ ان تینوں نے لالہ جی کو قابو
کیا تھا اور میں نے بڑھ کر اس کمرے کو باہر سے بند کر دیا تھا جس میں لالائن، مہندر،
اور شانتی کو لے کر گئی تھی۔ لالہ گوپی ناتھ ایک مرتبہ پھر ہمارے نرغے میں تھا۔ وہ شاید
زندگی کے بدترین صدمے اور حیرت کے لمحات سے گزر رہا تھا اور گھگیا رہا تھا۔

اس مرتبہ ہمیں زیادہ احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ لالائن، مہندر، لالی اور شا
کمرے میں زور زور سے چیخ رہی تھیں۔ دروازے کو زور زور سے جھنجھوڑا جا رہا تھا
دروازے بہت مضبوط تھے۔ ہم جانتے تھے کہ اس کمرے میں اور کوئی دروازہ نہیں
کھڑکیوں پر موٹی موٹی سلاخیں تھیں، گویا اس کمرے میں ان لوگوں کے باہر آنے کا
امکان نہ تھا۔ ہم لالہ گوپی ناتھ کو ایک مرتبہ پھر کشاں کشاں اسی کنویں کی طرف لے
جس میں اسے گزشتہ رات لٹکایا گیا تھا اور وہ بری طرح بلک رہا تھا۔

''عورتوں کی طرح سے مت شور مچاؤ لالہ؟'' میں نے دھمکی دی۔ ''ورنہ ہم تمہ
موت کے گھاٹ بھی اتار سکتے ہیں، سمجھے!'' گوپی ناتھ خاموش ہو گیا۔ وہ ہم سے کچھ ز
ہی خوفزدہ تھا۔

ایک مرتبہ پھر لالہ گوپی ناتھ کو کنویں میں اترنا پڑا تھا۔

اندر کمرے سے لالائن اور دوسرے لوگوں کو چیخ پکار کے ساتھ ایک بیٹھک کی طر
سے بھی چیخ و پکار کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ شاید جگدیش کے بھیجے ہوئے آدمی
پہنچ چکے تھے۔ ہم چاروں عقبی دروازے سے نکلے اور ایک سمت دوڑتے چلے گئے۔
رخ اس مقام کی طرف تھا جہاں ہمیں بتایا گیا تھا کہ ایک تانگا ہمارا منتظر ہوگا۔

رات کے دو بجے ہم پھر اسی مکان میں تھے۔ ہماری شب بسری کا انتظام کوٹھے
تھا۔ نچلی منزل بالکل تاریک تھی۔ میں نے کامریڈ غزنوی سے دونوں لڑکیوں کے بار
میں سوال کیا تو پتا چلا کہ سالارِ اعلیٰ کے حکم پر انہیں کہیں اور منتقل کر دیا گیا تھا۔

کوٹھے پر منتقلی کا سبب مجھے وہاں پہنچ کر سمجھ میں آیا۔ یہاں چار پلنگوں پر اجلے
لگے ہوئے تھے۔ گزشتہ شب ہمیں فرش پر ہی سونا پڑا تھا۔'' سالارِ اعظم سے ہماری ملاق

کب ہوگی؟''

مجھے اس کے بارے میں کچھ علم نہیں۔'' غزنوی نے بتایا۔ ''آپ لوگوں کو صبح سویرے فجر کی اذان کے وقت یہاں سے چلے جانا ہے۔''

''مجھے انہیں اپنی مہم کی رپورٹ بھی دینی تھی۔'' میں نے کہا۔

''وہ تم مجھے دے سکتے ہو۔''

اور میں نے اسے گوپی ناتھ کی کوٹھی پر پیش آنے والے تمام واقعات بتا دیے۔ غزنوی درمیان میں رک کر مجھ سے وضاحت کے لیے ایک دو سوال بھی کبھی کبھی کر لیتا۔ جب میں اسے تمام تفصیلات بتا چکا تو وہ بولا۔ ''واقعی کامریڈ شیرازی، سالارِ اعظم اگر تم پر اعتماد کرتے ہیں تو کچھ غلط نہیں کرتے۔'' اس کے لہجے میں رشک جھلک رہا تھا۔ ''کاش میں بھی آپ کے ساتھ ہوتا۔''

''وہ تم پر بھی اعتماد کرتے ہیں۔'' میں نے اس کو سہارا دیا۔ ''ورنہ تمہیں بندوقیں جمع کر کے پہنچانے کا فرض نہ سونپا جاتا۔''

اس کے بعد ہم سب بستر پر لیٹ گئے لیکن میری آنکھوں میں نیند نہیں تھی۔ میرا ذہن تو شکنتلا میں الجھا ہوا تھا۔ نہ معلوم وہ کہاں ہوگی؟ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ جلدی ہی دونوں بہنوں کو واپس بھیج دیا جائے گا اور میرا پروگرام تھا کہ آج رات ہی انہیں ان کے گھر چھوڑ دیا جائے گا لیکن اب انہیں کہیں اور ہی منتقل کیا جا چکا تھا اور سالارِ اعظم سے میری ملاقات کی بھی کوئی امید نہیں تھی۔ میں نے سالارِ اعظم کو بتا دیا تھا کہ دونوں بہنوں سے میں نے جلد ان کے ماں باپ کے پاس بھیجنے کا وعدہ کر رکھا ہے اور اس پر اس نے کہا تھا۔ ''تم نے اچھا کیا۔ ظاہر ہے ہم ان کا اچار تو ڈالنا نہیں چاہتے۔'' تو کیا سالارِ اعظم اس وعدے کو پورا کرے گا؟ میں نے خود سے سوال کیا اور خود کو اس سوال کا جواب اثبات میں دینے پر مجبور بھی پایا۔

''کامریڈ غزنوی، کامریڈ غزنوی!'' میں نے آہستہ آوازیں دیں، لیکن ادھر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ وہ شاید سو چکا تھا۔ میں نے اٹھ کر لالٹین کی بتی نیچے کی اور واپس پلنگ پر آ بیٹھا۔

بارش کی رم جھم کے یکساں اور بے کیف شور میں اچانک مجھے غیر معمولی سی آوازیں سنائی دیں۔ نیچے کوئی دروازے کو بری طرح پیٹ رہا تھا۔ میں نے کامریڈ کو بیدار کیا۔ وہ آنکھیں جھپکتا ہوا اٹھا۔

"کیا ہے؟"

"نیچے کوئی دروازہ پیٹ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"پولیس، میرا خیال ہے کہ پولیس نے چھاپا مارا ہے۔" کامریڈ غزنوی نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

اندلسی، کوہستانی صحرائی بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ نیچے دروازے پر دستکیں اور شدید ہوگئی تھیں۔ "تم یہیں ٹھہرو۔" میں نے ان سے کہا اور تیزی سے زینہ اتر گیا۔ بیرونی دروازے کو گویا اب توڑنے کی کوششیں شروع ہوگئی تھیں۔ میں نے زینے کا دروازہ بند کیا اور پھر اوپر آکر وہاں بھی دروازے کو کنڈی لگادی۔

"باہر جانے کا کوئی راستہ؟" میں نے غزنوی سے پوچھا۔

غزنوی نے مایوسی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

☆======☆======☆

"اب کیا ہوگا؟" کامریڈ اندلسی نے پوچھا۔ پریشانی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

پریشان تو ہم سب ہی تھے۔ صورت حال ہی ایسی تھی۔ اس مکان سے نکلنے کا ایک ہی راستہ تھا اور وہاں پولیس موجود تھی۔ اب یہاں سے فرار ہونے اور پولیس کی گرفت سے بچنے کا بس ایک ہی طریقہ تھا۔ بارش اور باہر کے ہنگامے کے سبب مجھے یقین تھا کہ ہم پولیس کے اوپر آنے سے پہلے ہی وہاں سے نکل جائیں گے۔ یہ ترکیب بس اچانک ہی میرے ذہن میں آئی تھی۔ اتفاق کی بات اور تھی ورنہ اس میں ناکامی کی کوئی صورت نہیں تھی۔ دن میں سالار اعظم سے ملاقات کے لیے جب ہم اوپر آئے تھے تو میں نے یہاں سفیدی اور مرمت کے لیے جو سامان رکھا دیکھا تھا، اس کا خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔ اب اس سامان کی مدد سے میں اپنے ساتھیوں کو پولیس کے اس شبخون سے بچا سکتا تھا۔

بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ نیچے دروازے پر ضربوں کی شدت تیز ہوگئی تھی۔ گلی میں ایک شور اور ہنگامہ تھا۔ محلے کے لوگ بھی رات کے اس پہر میں ہنگامے کے سبب بارش کے باوجود باہر آگئے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ڈیوڑھی کا بیرونی دروازہ کب تک ان ضربوں کی مزاحمت کرسکتا ہے۔

"جلدی کرو، اپنے کپڑے اور سامان سمیٹ کر ایک تھیلے میں رکھو۔" میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔

"آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟" کامریڈ غزنوی نے سوال کیا۔

"اندلسی جلدی کرو۔" میں نے غزنوی کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے سختی سے کہا۔ "یہ سستی یا کاہلی کا وقت نہیں۔"

میرے لہجے کی غراہٹ سے میرے ساتھی مرعوب ہوگئے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ میرے ذہن میں کوئی ترکیب آگئی ہے۔ اندلسی، صحرائی اور کوہستانی جلدی جلدی کپڑے سمیٹ کر کینوس کے تھیلے میں رکھنے لگے۔ اسی دوران میں، میں تھیلے سے پٹ سن کی رسیوں کے لچھے نکال چکا تھا۔

"میرا خیال ہے کہ سالارِ اعظم ہماری طرف سے غافل نہیں ہوں گے۔" کامریڈ غزنوی نے کہا۔

"ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہمیں اپنے طور پر کوشش کرنا چاہیے۔ ہم فرار ہو رہے ہیں۔ تم یہ رسی کھولو۔"

پھر میں نے غزنوی کے ساتھ مل کر ایک لچھے کو کھول لیا اور پھر رسی کو دوہرا کر کے اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گانٹھیں لگا دیں۔ اس وقت تک اندلسی، صحرائی اور کوہستانی، کینوس کے تھیلے کو کپڑوں اور دوسرے سامان سے بھر چکے تھے۔ "اندلسی! تم دوسرے لچھے کھول کر رسی میں اسی طرح گرہیں لگادو۔" میں نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت دی۔

"آخر آپ کیا کرنے جا رہے ہیں؟" غزنوی نے پھر تجسس سے پوچھا۔

"دیکھتے رہو۔" میں نے کہا، پھر رسی میں ایک اور گرہ لگادی۔ "تم ذرا پچھلی طرف دیوار سے نیچے جھانک کر دیکھو۔" میں نے غزنوی سے کہا، پھر رسی میں ایک اور گرہ لگادی۔ غزنوی نے سفیدی کے کام میں استعمال ہونے والی گھوڑی پر چڑھ کر دیوار کے نیچے جھانکا۔ میں رسی میں گرہیں لگاتا رہا۔ اندلسی اور کوہستانی دوسری رسی پر یہی عمل کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد غزنوی گھوڑی سے اتر کر جلدی جلدی چلتا ہوا میرے پاس آیا۔ "پولیس ادھر بھی موجود ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" میں نے رسی میں آخری گرہ لگاتے ہوئے کہا۔ "فکر کی کوئی بات نہیں۔ پولیس ہمیں نہیں پکڑ سکے گی۔ پولیس کو یہاں حیرت کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔"

اس کام میں ہمیں چار منٹ سے زیادہ کا عرصہ نہیں لگا تھا۔ دونوں رسیوں میں گرہیں لگ چکی تھیں۔ ہم ان کی مدد سے، بلندی سے نیچے جا سکتے تھے مگر یہ چار منٹ ہمیں بہت طویل اور پہاڑ معلوم ہوئے۔ لگتا تھا گویا ایک زمانہ بیت گیا ہو۔ نیچے دروازے پر ضربوں کی آوازیں اور بھی تیز ہوگئی تھیں۔ پھر ایک رعب دار آواز بلند ہوئی۔ "الو کے پٹھو! ہاتھوں

میں دم نہیں ہے۔ جلدی کرو، زور سے!''

یہ آواز نامانوس نہیں تھی۔ یہ آواز میں پہلے بھی سن چکا تھا۔ میں اس آواز کو بھلا کیسے بھول سکتا تھا۔ یہ آواز سہنا کی تھی۔ تھوڑی دیر بعد سہنا کی آواز پھر بلند ہوئی۔ ''رام چندر! کرشن چندر! دیوار پھاند کر اندر کودو۔''

یہ حکم ہم سب نے سنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اندلسی نے کوٹھے کی دیوار میں بنی ہوئی کھڑکی کھولی۔ یہ کھڑکی دوسری طرف چھجے پر کھلتی تھی۔ اندلسی کھڑکی میں لیٹ کر چھجے پر پہنچا اور نیچے صحن کا جائزہ لینے لگا۔ اس وقت میں اپنے دوسرے ساتھیوں کی مدد سے عقبی دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی لمبی سیڑھی اٹھا چکا تھا۔ میں نے لمبی سیڑھی بہ آہستگی مسجد کے صحن میں اُگے ہوئے بلند وبالا درخت کے اس گدے سے ٹکا دی تھی جو کوٹھے کی دیوار سے آٹھ فٹ کے فاصلے پر تھا۔

''ویل ڈن!'' غزنوی نے پُر جوش انداز میں کہا اور میرے شانے پر تھپکی دی۔

اسی وقت اندلسی کھڑکی بند کر کے واپس آیا۔ ''وہ لوگ دیوار پھاند کر اندر آگئے ہیں۔''

''چلو جلدی کرو۔'' میں نے کہا۔ پھر میرے اشارے پر اندلسی، صحرائی اور کوہستانی، آہستگی لیکن پھرتی کے ساتھ سیڑھی سے ہو کر نیم کے درخت پر پہنچ چکے تھے۔ میں نے انہیں ہدایت کر دی تھی کہ درخت پر پہنچتے ہی وہ ڈال ڈال ہو کر آہستگی کے ساتھ مسجد کی چھت پر پہنچ جائیں اور ہمارا انتظار کریں۔

نیچے کا دروازہ کھل چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گلی کا شور نیچے ڈیوڑھی میں، صحن میں اور برآمدے میں منتقل ہو چکا تھا۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ پھر ڈیوڑھی میں زینے کے نیچے والے دروازے پر ضربوں کی آواز شروع ہو گئی۔

''تم جو کوئی بھی اوپر ہو۔'' سہنا کی آواز صحن سے ابھری۔ ''دروازہ کھول کر نیچے آجاؤ۔ تم گھر چکے ہو۔''

ایک تلخ گھٹا ہوا قہقہہ میرے حلق سے ابھرا۔ ''جلدی کرو غزنوی؟'' میں نے کہا۔

''یہ رسی۔'' میں نے ایک رسی اسے دیتے ہوئے کہا جسے دہرا کر کے ہم پہلے ہی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اس میں گرہیں لگا چکے تھے۔ ''اوپر درخت پر پہنچ کر اس کا ایک سرا گدے سے باندھ دینا۔''

''کیوں؟''

اس بے وقت سوال پہ مجھے شدید غصہ آیا۔ ''جو میں کہہ رہا ہوں کرو، سمجھے!'' میں نے تلخ لہجے میں کہا تھا۔ ''میں اسی کے سہارے درخت پر پہنچوں گا۔''

''مگر یہ سیڑھی؟'' اس نے پوچھا۔

''میں کہہ رہا ہوں، چلو جاؤ!'' میں نے تلخی سے کہا۔

''پہلے آپ جائیے جناب!'' غزنوی نے کہا تھا۔ ''میں ان لوگوں سے یہیں نمٹ لوں گا۔''

''کوئی ان سے نہیں نمٹے لگا۔'' میں نے درشت انداز میں کہا۔ ''چلو بڑھو!''

''مگر جناب! یہ نہیں ہو سکتا۔ میں آپ کو نہیں چھوڑ سکتا۔''

''احمق، پاگل!'' میں نے جھلا کر اس کی گدی پر ہاتھ ڈال دیا اور سیڑھی کی طرف دھکا دیا۔ ''دیر مت کرو ورنہ ہم سب پھنس جائیں گے۔ یہ حکم ہے، سمجھے!''

''مگر......''

''بک بک مت کرو!'' میں غرایا۔ ''رسی کو مضبوطی سے باندھنا۔''

میرے لہجے میں یقیناً ایسی خونخواری تھی کہ اس کے بعد غزنوی کچھ نہ کہہ سکا۔ وہ رسی کا ایک سرا ہاتھ میں لے کر، سیڑھی سے ہو کر درخت پر پہنچ گیا اور رسی کو درخت کے گدے سے باندھ دیا۔ دوسرا سرا میں نے احتیاطاً برآمدے میں پڑی ہوئی تپائی سے باندھ دیا کہ کہیں ہوا کے جھونکے سے رسی دیوار سے پھسل کر باہر کی طرف نہ گر جائے۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے سیڑھی اٹھائی اور عقبی دیوار پر سیڑھی کو ٹکا دیا لیکن اس سے قبل سیڑھی کے آخری ڈنڈے کے درمیان میں دوسری رسی کا ایک سرا باندھ دیا۔ سیڑھی کو دیوار سے ٹکانے کے بعد میں نے وہ رسی دیوار کے باہر لٹکا دی۔ اس کارروائی کا مقصد پولیس کو صرف یہ تاثر دینا تھا کہ مکان میں جو کوئی بھی تھا اس نے فرار کے لیے یہی سیڑھی اور اس سے بندھی ہوئی رسی استعمال کی ہے۔

اس دوران میں نیچے زینے کے دروازے پر ضربیں اور شدید ہو گئی تھیں۔ جس وقت اس دروازے کے ٹوٹنے کی آواز آئی، میں تپائی سے رسی کھول کر تپائی کے سہارے دیوار پر چڑھ چکا تھا۔ رسی میری کمر کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ بارش کی وجہ سے دیوار پر کائی سی جم گئی تھی۔ پھر چنائی کا مصالحہ بھی نرم پڑ چکا تھا لہٰذا مجھے بہت احتیاط سے کام لینا تھا۔ ذرا سے غلط وزن کی وجہ سے دیوار ٹوٹ بھی سکتی تھی جس سے سارا کیا دھرا خاک میں مل سکتا تھا کیونکہ دیوار ٹوٹنے کے ساتھ ہونے والے شور کی بنا پر پولیس کا اس طرف متوجہ ہو جانا لازمی تھا،

پھر ان کے لیے ہمارا تعاقب کرنا یا ہم پر ہاتھ ڈالنا زیادہ مشکل نہ ہوتا۔ اس مرحلے پر میں اس سے بچنا ہی چاہتا تھا۔

میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

پولیس کی جمعیت اب کوٹھے کے دروازے کو توڑنے میں مصروف تھی۔ میں نے رسی کو مضبوطی سے پکڑا اور دہری رسی کے درمیان گرہ کے مقام پر ایک پیر جمایا۔ اگلے لمحے میں رسی کے سہارے باہر جھول گیا۔ چند لمحوں بعد رسی کی گرہوں میں پیر رکھتا ہوا میں درخت کے گدے پر پہنچ چکا تھا جس پر غزنوی دو شاخے سے چمٹا ہوا میرا منتظر تھا۔ گدے سے رسی کھول کر میں نے کمر کے گرد لپیٹی اور غزنوی سے کہا۔ ''چلو۔''

پھر ہم دونوں آگے پیچھے، ڈالوں، شاخوں اور گدوں سے ہو کر مسجد کی چھت پر پہنچ گئے۔ بارش اب بھی ہو رہی تھی۔ کوٹھے کے دروازے پر ضربیں اب بھی لگ رہی تھیں مگر تشویش کے لمحات گزر چکے تھے۔ ہم رسی کے سہارے مسجد کی چھت سے عقب میں اترے۔

اب غزنوی ہمارا راہبر تھا۔

☆======☆======☆

مختلف گلیوں اور سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم کوئی پندرہ منٹ بعد ایک چھوٹے سے مکان کے دروازے پر کھڑے تھے۔ غزنوی کی پہلی دستک پر ہی دروازہ کھل گیا تھا۔ دروازہ کھولنے والا اسے پہچانتا تھا۔ ''آؤ آؤ، اندر آجاؤ!'' اس نے کہا۔ ''ہم سب تمہاری وجہ سے بہت پریشان تھے۔''

''گویا چھاپے کی اطلاع مل چکی ہے۔'' غزنوی نے دروازے میں داخل ہوتے وقت کہا۔ اس کے پیچھے ہم چاروں بھی اندر پہنچ گئے۔ دروازہ کھولنے والے نے دروازہ بند کر دیا۔

''پولیس کے چھاپے کے پانچ منٹ بعد ہی یہاں خبر آگئی تھی۔'' اس شخص نے ایک سمت بڑھتے ہوئے کہا۔ ''یہ خبر بہت پریشان کن تھی۔ سالار کا کہنا تھا کہ پولیس کے چھاپے کی صورت میں وہ مکان چوہے دان بن گیا ہوگا مگر تم لوگ کیسے نکل آئے؟ سالار نے تمہاری مدد کے لیے کچھ لوگوں کو بھیجا تھا۔''

''بس کسی نہ کسی طرح نکل ہی آئے۔'' غزنوی نے جواب دیا۔ ''سالار کہاں ہیں؟''

''اندر۔'' جواب ملا۔ اس وقت ہم ایک کمرے کے دروازے پر کھڑے تھے۔ اس

کامریڈ نے دروازے پر تین مرتبہ دستک دی، پھر ذرا سے توقف کے بعد دروازہ کھول کر اندر گیا۔ چند لمحے بعد ہی اس نے ہمیں اندر آنے کے لیے کہا۔

ہم سب آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوگئے۔ اس کمرے میں بھی بہت مختصر سامان تھا۔ ایک طرف چند مونڈھے پڑے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں رکھے ہوئے ڈیوٹ پر سرسوں کے تیل کا دیا روشن تھا۔ مونڈھوں کے مقابل کی دیوار کے ساتھ ایک تخت پڑا تھا جس پر اجلی چادر اور گاؤ تکیہ رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ پہلو میں اونچی پشت والا مونڈھا پڑا ہوا تھا۔ کمرہ اس اعتبار سے خالی تھا کہ ہمارے داخل ہونے سے پہلے وہاں کوئی نہ تھا۔

''سالار کہاں ہیں؟'' غزنوی نے پوچھا۔

''پتا نہیں''

''تم تو کہہ رہے تھے اندر ہیں؟'' غزنوی نے سوال کیا۔

''مجھے یہی معلوم تھا۔'' جواب دیا گیا۔ ''آپ لوگ یہیں بیٹھیں، انتظار کریں۔ میں گرم گرم قہوہ تیار کر کے ابھی لاتا ہوں۔'' وہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا اور دروازہ آہستگی سے بند کر دیا۔ پھر اس کے قدموں کی آواز دور ہوتی چلی گئی اور بارش کے مدھم شور میں مدغم ہوگئی۔

''یہ تجربہ بھی یاد رہے گا۔'' اندلسی نے کہا۔ ''مگر کمانڈر!'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''فرار کی راہ تمہیں سوجھی خوب۔''

''ہوں۔'' میں نے یونہی کہا۔

میرے چاروں ساتھی اس مکان سے فرار پر گفتگو کر رہے تھے۔ مگر مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرے ذہن میں تو اس وقت کئی پریشان کن سوالات کے جالے چمٹ کر رہ گئے تھے۔ یہ سوالات اس وقت سے میرے ذہن میں چکرا رہے تھے جب پولیس کا چھاپہ پڑا تھا۔ سب سے بڑا سوال تو یہی تھا کہ آخر پولیس کس بنا پر اس مکان تک پہنچی تھی۔ میرے ذہن میں نت نئے خدشوں نے سر ابھارا تھا۔ شاید ہم میں شامل کسی کالی بھیڑ نے مخبری کی تھی؟ کامریڈ غزنوی، کامریڈ رضیہ یا وہ جس نے سہنا سے بندوقیں چھیننے کی مہم میں غزنوی کا ساتھ دیا تھا؟ یا ان میں سے کوئی جو ہمیں لالہ گوپی ناتھ کے مکان پر پہلی یلغار کے دوران میں ملے تھے؟

ان پریشان کن سوالات کے ساتھ ہی میرے دل میں خوشی کا ایک ننھا سا اکوا بھی پھوٹا تھا، ایسی خوشی کا اکوا جس نے میرے ذہن کو تازگی بخش دی تھی۔ میں اپنے تمام

ساتھیوں کو ایک مایوس کن صورت حال سے بچا کر نکال لایا تھا۔ میرے نزدیک یہ کامیا
سوت ندی کے پل کو تباہ کرنے سے بھی زیادہ بڑی اور اہم تھی کیونکہ اس میں کسی پیش
منصوبے کو دخل نہیں تھا۔ یہ کامیابی صرف میرے مشاہدے اور میرے فیصلوں کا نتیجہ تھی۔

غزنوی، اندلسی، صحرائی اور کوہستانی اب بھی اس فرار پر گفتگو کر رہے تھے۔ میں نے
غزنوی سے پوچھا۔ ''مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ پولیس کو اس مکان کا پتا کیسے چلا؟''

''کچھ نہیں کہا جا سکتا۔'' غزنوی نے کہا۔

اسی وقت، ہمیں مکان میں خوش آمدید کہنے والا کامریڈ ایک ٹرے میں گرم گر
قہوے کے پانچ پیالے لے آیا۔ قہوے سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔

''اس وقت اس سے بہتر اور مناسب تواضع کچھ نہیں ہو سکتی تھی۔'' میں نے قہوے کا
پیالہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''شکریہ!'' اس نے جواب دیا۔ قہوہ دے کر وہ پھر واپس چلا گیا۔

ابھی ہم نے قہوہ پی کر پیالے رکھے ہی تھے کہ کمرے کے ایک کونے میں بنے ہوئے
دروازے پر آہٹ ہوئی۔ ہم سب اپنی جگہ پر چوکنا ہو کر بیٹھ گئے۔ پھر اس قسم کی آوازیں
آئیں جیسے کوئی باہر کنڈی میں لگا ہوا تالا کھول رہا ہو۔ ہم سب اپنی جگہ چوکنا تھے۔ ''سالار
ہیں شاید۔'' غزنوی نے کہا اور میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر کنڈی گرنے کی آواز
آئی۔ اگلے لمحے دروازہ کھلا۔ یہ دروازہ دوسری سمت گلی میں کھلتا تھا۔ پھر سالار اعظم ایک
دبلے پتلے شخص کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا۔ سالار اعظم سیاہ برساتی۔ سیاہ فیلٹ
پہنے ہوئے تھا۔ اس کے چہرے پر اس وقت بھی سیاہ نقاب موجود تھی۔

سالار نے ایک نظر کمرے کا جائزہ لیا۔ دیے کی زرد روشنی میں، نقاب کے سوراخوں
سے سالار اعظم کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں اطمینان کی لہریں کروٹیں لے رہی تھیں۔ اس نے
گہرا سانس لیا، برساتی کو دو تین مرتبہ جھٹکے دے کر پانی کے قطروں کو جھاڑا اور اونچی پشت
والے مونڈھے پر بیٹھتے ہوئے دبلے پتلے شخص سے کہا۔ ''قاسم! تم بھی بیٹھ جاؤ۔''

قاسم ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

''تو تم لوگ وہاں سے نکل آئے۔'' سالار اس مرتبہ ہم سے مخاطب تھا، لہجے سے
مسرت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ''بہت پریشانی ہو گئی تھی۔ میں وہیں سے آ رہا ہوں۔ سہنا پاگل ہو
رہا ہے۔ عقبی حصے کی طرف متعین پولیس والوں کی کمبختی آ گئی ہے۔ میرا خیال ہے تم ادھ
سے فرار نہیں ہوئے۔''

''جی نہیں۔'' میں نے جواب دیا اور پھر سالار کو وہاں سے فرار کی تمام تفصیلات بتا
دیں۔

''خوب۔'' سالار نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ ''عقل سے کام لیا جائے تو ہر مایوسی
کو امید میں اور ہر ناکامی کو کامیابی میں ڈھالا جا سکتا ہے۔''

''مگر جناب!'' میں نے کہا۔ ''آخر پولیس نے کس کی مخبری پر وہاں چھاپا مارا تھا؟''

''یہ سوال میرے لیے بھی پریشان کن ہے۔'' سالار اعظم نے کہا۔ ''کیوں قاسم! تم
کوئی روشنی ڈال سکتے ہو اس پر؟''

''نہیں جناب!'' قاسم نے جواب دیا۔ ''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''اس کا جواب، ہمیں آج دوپہر تک مل سکے گا سعدی!'' سالار اعظم نے خاص طور
پر مجھے مخاطب کیا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم پر جو اعتماد کیا گیا تھا، تم نے خود کو اس کا مکمل طور اہل
ثابت کر دیا ہے۔''

میری جگہ کوئی بھی ہوتا، اس تعریف سے یقیناً خوش ہوتا مگر میں اس تعریف کے
جواب میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ کمرے میں گہرا اور خوشگوار سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ اس سناٹے میں
ایک مرتبہ پھر سالار کی آواز گونجی۔ ''تم سب مجھے بیٹوں کی طرح عزیز ہو۔ یقین کرو، اس
سے پہلے کہ کسی پولیس والے کا ہاتھ تم میں سے کسی پر پڑتا، وہاں خون کی ندیاں بہہ جاتیں۔
کیوں قاسم! میں غلط کہہ رہا ہوں کیا؟''

''جی نہیں جناب!'' قاسم نے کہا۔ اس کے لہجے میں کپکپاہٹ تھی۔

''غزنوی!'' سالار اعظم نے کہا۔ ''قاسم کے لیے قہوہ بناؤ، مسلسل بارش میں بھیگنے
سے اسے سردی لگ رہی ہے۔''

غزنوی اٹھ کر باہر چلا گیا۔

پھر سالار کے ایما پر میں نے گزشتہ شب کی پہلی مہم کی تفصیلات بتائیں جو سہنا سے
بندوقیں چھیننے سے لے کر گوپی ناتھ کی حویلی پر ہماری نئی کارروائی تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس
دوران میں قاسم کے لیے گرم گرم قہوہ بھی آ گیا تھا۔

''ہوں۔'' سالار اعظم نے کہا۔ ''دوستو، مجاہدو! اب ہمیں ایک نئی مہم درپیش ہے۔
یہ مہم اب تک کی ہماری تمام مہموں سے زیادہ خطرناک ہوگی، سعدی!''

''جی جناب!''

''تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو ایک مرتبہ پھر اس خطرناک مہم میں حصہ لینا ہوگا۔''

’’ہم تیار ہیں جناب!‘‘ ہم چاروں نے ایک ساتھ ہی کہا تھا۔

’’یہ نہ سمجھنا کہ میں تم لوگوں کو بلاوجہ مشکلات میں دھکیلتا ہوں یا یہ کہ تم سے بہتر ہماری صفوں میں کوئی اور نہیں ہے۔‘‘ سالارِ اعظم کی آواز گونجی۔ ’’بات صرف اتنی ہے کہ امروہے میں، امروہے کے کسی مجاہد کو استعمال نہیں کرنا چاہتا۔‘‘ میں اس مرحلے پر کچھ کہنا چاہتا تھا مگر سالارِ اعظم نے کہا۔ ’’خاموش رہ کر میری بات سنو! میں تمہارے جذبات سے واقف ہوں۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ یہاں پر اپنی کارروائی کرتے ہوئے صرف خیال ذہن میں رکھو کہ تمہارے شہر میں اگر ضرورت پڑی تو شاید وہاں غزنوی، قاسم، یہاں کا کوئی شخص وہی فرائض انجام دے رہا ہوگا جو تم یہاں انجام دے رہے ہو۔‘‘

’’ہمارے ذہن میں کسی لمحے یہ خیال نہیں آ سکتا جناب!‘‘ اندلسی نے اس مرتبہ ہماری ترجمانی کی۔

’’بہرحال۔‘‘ سالارِ اعظم کی آواز گونجی۔ ’’یہ مہم جو تمہیں سونپی جا رہی ہے، بہت اہم بھی ہے اور خطرناک بھی۔ پل اور ٹرین کی تباہی کی تحقیقات کے لیے مراد آباد سے کلکٹر یہاں پہنچ چکا ہے۔ پولیس کے اعلیٰ حکام بھی آ چکے ہیں۔ شملے سے انٹیلی جنس کا ایک بڑا افسر بھی آیا ہے۔ تمہیں آج رات ان میں سے کم از کم دو افسروں پر حملہ کرنا ہے۔ یہ کام بہت خطرناک ہے۔ یوں سمجھو کہ تم موت کے منہ میں جا رہے ہو۔‘‘ سالارِ اعظم نے کہا۔ ’’کیوں قاسم!‘‘

’’جی ہاں جناب!‘‘ قاسم نے کہا۔

قاسم کون تھا، اس کی اہمیت کیا تھی، میں اس سے واقف نہیں تھا لیکن جس انداز میں سالارِ اعظم اسے مخاطب کر رہا تھا، اس میں مجھے محبت اور پسندیدگی کی بجائے، غصے اور ناپسندیدگی کی غراہٹ گونجتی محسوس ہو رہی تھی۔

’’قاسم! تم آج شام تک ضروری تفصیلات سعدی کو فراہم کر دو گے۔‘‘ سالارِ اعظم نے کہا۔ ’’ہماری یہ مہم خطرناک بھی ہے اور اہم بھی۔ آؤ ہم سب عہد کریں کہ اس سلسلے میں مکمل راز داری سے کام لیں گے۔‘‘

اس کے بعد ہم سب نے حلف اٹھایا۔ سالار نے الماری سے کلام پاک نکال کر تخت پر رکھا تھا، پھر ہم سب نے کلام پاک پر ہاتھ رکھ کر عہد کیا تھا۔ ’’ہم سب جو یہاں موجود ہیں، اللہ کی رضا کے لیے اللہ کی مدد کے بھروسے پر اس مہم میں حصہ لے رہے ہیں اور اللہ ہی سے نصرت طلب کرتے ہیں۔ ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم مکمل راز داری سے کام لیں گے۔ ہم ایک دوسرے پر اعتماد کریں گے، ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور ایک دوسرے کی

حفاظت کریں گے۔ نہ ہم غداری کریں گے نہ غداری کا خیال دل میں لائیں گے اور اگر ہماری صفوں میں سے کسی نے غداری کی، مخبری کی اور ہمارے مقصد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو اسے سخت ترین سزا دیں گے۔ ہم اس سے کوئی رعایت، کوئی نرمی نہیں برتیں گے۔ ہم میں سے ہر شخص غدار کو وہی سزا دے گا جس کا وہ مستحق ہوتا ہے، یعنی سزائے موت! اے اللہ ہمیں اس پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرما۔ ہمیں بدعہدی سے بچا اور بدعہد پر اپنا قہر نازل فرما۔‘‘

ہم مکمل راز داری کا عہد کر چکے تھے۔ سالار نے کلام پاک کو پھر الماری میں رکھ دیا تھا۔

’’اب ہم اطمینان سے اپنی نئی مہم کی طرف بڑھ سکیں گے۔‘‘ سالار نے کہا۔ ہم سب اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے۔ قاسم ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ ’’قاسم!‘‘ سالار نے کہا۔ ’’آج شام تک تمہیں تمام معلومات فراہم کر دینا ہیں۔‘‘ اس نے ٹہلتے ہوئے کہا۔ ’’اب تم جا سکتے ہو۔‘‘

اس وقت سالار، قاسم کے پاس ہی تھا۔ سالار کے ہاتھوں میں رومال کے دو کونے مضبوطی سے لپٹے ہوئے تھے اور رومال، سانپ کی طرح ہاتھوں کی جنبش کے ساتھ حرکت کر رہا تھا۔

’’میں شام تک تمام باتیں بتا دوں گا۔‘‘ قاسم نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

قاسم دروازے کی طرف مڑا ہی تھا کہ سالار کے ہاتھوں میں لپٹا ہوا رومال کا سانپ اپنی کنڈلی کھول کر قاسم کی گردن کے گرد لپٹ چکا تھا۔ ساتھ ہی دونوں ہاتھ ریشمی رومال کو لپیٹے ہوئے قاسم کی گدی پر جم چکے تھے۔ قاسم کی آنکھیں ابل پڑی تھیں۔ ہچکیاں حلق کے ہونٹوں سے نیچے ہی گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا تھا کہ ہم سمجھ ہی نہ سکے تھے لیکن صورتِ حال ایسی تھی کہ ہم اپنی نشستوں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

’’یہ ہے ایک غدار کا انجام۔‘‘ سالار نے کہا۔

ہم سب پر سکوت طاری تھا۔ سالارِ اعظم اپنے ہاتھوں کو زور زور سے جھٹکے دے رہا تھا۔ ہر جھٹکے کے ساتھ قاسم کے ہاتھ ہوا میں اِدھر اُدھر ڈول رہے تھے، جسم جھٹکے کھا رہا تھا۔ ہم سحر زدہ کیفیت میں سب کچھ دیکھتے رہے۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے تمام جسم میں دوڑ گئی۔ قاسم کا بے جان جسم فرش پر گر چکا تھا۔

’’تم پوچھنا چاہتے تھے کہ پولیس نے کس کی مخبری پر چھاپا مارا تھا؟‘‘ سالارِ اعظم نے

کہا۔ ''جواب تمہارے سامنے ہے۔ یاد رکھو، ہر غدار کا تمہارے ہاتھوں یہ
ہونا چاہیے۔''

غزنوی نے بعد میں مجھے بتایا کہ پہلے روز ہم جن تانگوں کے ذریعے لالہ گو
کی حویلی سے فرار ہوئے تھے، ان میں سے ایک تانگا قاسم کا تھا اور وہی اپنا تانگا چلا

☆======☆======☆

رات کی تاریکیاں سمٹ کر صبح کے اجالے میں سما گئی تھیں۔ آسمان پر چھائی
گھٹا کی وجہ سے یہ صبح بڑی اداس تھی۔ کم از کم میں نے اسے ایسا ہی محسوس کیا تھا۔
احساس کا سبب قاسم کی لاش تھی جو اس وقت ایک بنڈل کی صورت میں تانگے کے پچھلے
میں پائیدان پر پڑی تھی۔ قاسم جو ہمارے ہی سامنے ایک زندہ انسان سے بے جان
میں تبدیل ہوا تھا۔

''یہ زندہ بھی ایک بے جان لاشہ تھا، چلتی پھرتی لاش تھا۔'' سالار نے کہا تھا۔
وطن ایسی زندہ لاشوں سے بھرا پڑا ہے۔''

ہاں قاسم کی موت بھی ضروری تھی۔ اگر وہ زندہ رہتا تو ہمیں زیادہ نقصان پہنچ
تھا۔ ویسے تو اب بھی وہ ہمارے لیے نہ معلوم کیا کیا خطرات پیدا کر چکا تھا، ہم ان
ناواقف تھے لیکن ہم سب جانتے تھے کہ قاسم نے ہماری سرگرمیوں کی مخبری کی ہے
ہماری تنظیم اور اس کے اراکین سے کس حد تک واقف تھا، اس کا علم سوائے سالار اعظم
کسی کو نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ شاید ہم سب ہی خطرات کو دبے پاؤں اپنی طرف بڑھتے
کر رہے تھے۔

بہرحال اس وقت میں اور اندلسی تانگے میں کوتوالی کی طرف جا رہے تھے۔
تانگے کے پچھلے حصے میں قاسم کی لاش تھی۔ اندلسی تانگا چلا رہا تھا اور میں اس کے برا
تھا۔ راستے بھر ہماری آپس میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس وقت شاید ہم میں سے کوئی
تفکرات اور خیالات کی اس دنیا سے باہر نہیں آنا چاہتا تھا جو حالات و واقعات کی
آویزشوں نے ہمارے ذہنوں میں تخلیق کر دی تھی۔

کوتوالی سے ذرا آگے پہنچ کر ایک درخت کے نیچے اندلسی نے تانگا روک دیا۔
بالکل ویران پڑی تھی۔ اندلسی نے گھوڑے کے منہ سے دانے کا تھیلا باندھا۔ ہمیں
کو یہیں پر قاسم کی لاش سمیت چھوڑ دینا تھا۔ یہ تانگا بھی قاسم ہی کا تھا۔ قاسم کی لاش
چپٹ لگا دی گئی تھی۔

''کوتوال سہنا کے لیے یادگار تحفہ، وطن پرستوں کی طرف سے!''

ہمارا کام ختم ہو گیا تھا۔ میں نے چادر کو اپنے جسم پر لپیٹا۔ ''خدا حافظ کامریڈ!'' میں
نے اندلسی سے کہا اور ایک گلی میں داخل ہو گیا۔

یہ بات اب بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ آخر سالار اعظم نے اس کام کے لیے
مجھے اور اندلسی ہی کو کیوں منتخب کیا تھا۔ ہمارے سامنے جو واقعات آئے تھے، اس سے یہی
اندازہ ہوتا تھا کہ پولیس کو چند اجنبیوں کی تلاش تھی۔ بظاہر یوں بھی لگتا تھا کہ سہنا دراصل
لالہ گوپی ناتھ کی لڑکیوں کے اغوا کے سلسلے میں ہمیں تلاش کر رہا تھا، اور اس تلاش کا کوئی
تعلق سوت ندی کے پل کی تباہی سے نہ تھا۔ ایسی صورت میں دو اجنبیوں کا، امروہے کے
رہنے والے قاسم کے تانگے میں ایک لاش کے ساتھ جانا خطرے سے خالی نہ تھا مگر ہم نے
بلا تامل یہ ذمے داری قبول کر لی تھی کیونکہ ہمیں معلوم تھا کہ سالار اعظم حالات کو ہم سے
زیادہ بہتر جانتا ہے۔ احتیاطاً ہمیں ایک نئی شناخت بھی دے دی گئی تھی۔ ہم سے یہ کہا گیا تھا
کہ اگر کسی مرحلے پر ہم سے کوئی پوچھ گچھ ہو تو ہم یہی بتائیں کہ ہم فیاض نقوی صاحب کے
ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، ان کے مہمان ہیں۔ بہرحال اب تک ہمیں یہ حوالہ دینے کی
ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔

مختلف کچی پکی اور نیم پختہ گلیوں سے گزرتا ہوا میں اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا تھا۔
دشمنی اب اور بڑھ گئی تھی۔ رات بھر آرام کے بعد زندگی اب انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی
تھی۔ چہل پہل بڑھ گئی تھی مکانوں کے دروازے کھلنے لگے تھے، گھروں سے برتن کھڑکنے
کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ بہشتی، کنویں سے پانی بھر کر مشکیں شانوں سے لٹکائے اور کمر پر
تیزی سے آجا رہے تھے۔ حلوائیوں اور پنساریوں کی دکانیں کھل چکی تھیں۔ گرما
گرم حلوہ پراٹھا بیچنے والے، سروں پر خوان اٹھائے، ہاتھ میں انگیٹھی اور بغل میں
ہانڈھیاں دبائے آجا رہے تھے۔ آوازیں بھی لگا رہے تھے۔ گھروں سے بچوں کے رونے
باتیں کرنے اور روزمرہ کے کاموں کی آوازیں پھیل کر گلیوں، گلیاروں میں آ رہی
تھیں۔ ان تمام حرکات اور صداؤں میں ایک سکون اور نغمگی تھی۔

ایک گلی سے گزرتے ہوئے میں نے ایک حلوے پراٹھے والے کے گرد لوگوں کا
ٹھٹھ لگا دیکھا۔ اس نے انگیٹھی پر حلوے کا تھال جما رکھا تھا اور مونڈھی پر پراٹھوں کی سینی
رکھی ہوئی تھی۔ میں اس کے قریب سے گزر کر تیز تیز قدم اٹھاتا، نکڑ مڑ کر ایک تنگ سی گلی میں
داخل ہو گیا تھا۔ اس وقت میں نے محسوس کیا جیسے کوئی تیزی تیز قدم اٹھاتا ہوا میرے پیچھے

آ رہا ہے۔ میں نے اپنی رفتار اور بڑھا دی لیکن ابھی چند ہی قدم چلا تھا کہ مجھے اپنے
پر ایک ہاتھ کا دباؤ محسوس ہوا، ساتھ ہی آواز بھی آئی۔ ''شنکر جی! منہ چھپائے کہاں
ہو؟''

خون جیسے میری رگوں میں منجمد ہو گیا، یہ آواز گوپی ناتھ کے بھتیجے مہندر ناتھ کی
اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

پلٹ کر اسے جواب دینے کے سوا میرے پاس کوئی چارہ کار نہ تھا۔ مگر اس
میں نے چند ہی ثانیوں میں اس گلی کا جائزہ لے لیا تھا۔ یہ ایک پتلی سی گلی تھی جو
پچاس گز بعد ایک چوڑی سڑک پر نکلتی تھی۔ مجھے اس سڑک کو پار کر کے ایک گلی میں
ہونا تھا اور پھر مختلف گلیوں سے گزرتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچنا تھا مگر اس وقت
میرے لیے چوہے دان بن گئی تھی۔ پتلی سی گلی میں خاصی رونق تھی۔ کئی دروازے
ہوئے تھے جن کی سیڑھیوں پر لوگ بیٹھے منہ ہاتھ دھو رہے تھے یا دانت مانجھ رہے تھے۔

صورت حال کا جائزہ لے کر میں پلٹا۔ ''جی فرمائیے؟'' وہ واقعی مہندر ناتھ ہی
میں نے اپنے لہجے میں تمام حیرتیں انڈیلنے کی کوشش کی تھی۔ ''میں نے آپ کو نہیں پہ
یہ کہتے ہوئے میں نے مہندر ناتھ کے پیچھے نکڑ سے اس گلی کا جائزہ لیا جس سے گزر کر
وہاں اب حلوے پراٹھے والے کے پاس بھیڑ بڑھ چکی تھی۔ گویا فرار کا وہ راستہ بھی
تھا۔

''آپ نے نہیں پہچانا شنکر جی تو کیا ہوا، میں تو پہچان گیا ہوں۔'' مہندر ناتھ کے
میں تمسخر تھا۔

''آپ کو دھوکا ہوا ہے، میرا نام شنکر نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''چاچا گوپی ناتھ کے گھر رات ہی ہماری ملاقات ہوئی ہے۔ آپ نے بتایا
آپ سیٹھ جگدیش کے مہمان ہیں۔'' مہندر ناتھ گویا میری بے بسی سے لطف لے رہا
جانتا تھا کہ میں بھاگ نہیں سکتا۔ خیریت یہ تھی کہ وہ یہ سب گفتگو دھیمی آواز میں کر رہا
ابھی اس نے لوگوں کو مدد کے لیے نہیں بلایا تھا۔

''آپ کو یقیناً دھوکا ہوا ہے جناب!'' میں نے کہا۔

''جھوٹ نہیں شنکر جی!'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''میرا نام شنکر نہیں ہے۔'' اس مرتبہ میں نے کچھ گرم ہو کر کہا تھا۔

''تمہارا نام جو کچھ بھی ہو، میں تمہیں نہیں بھول سکتا۔ تم نے میرے چچا گوپی

کنویں میں اتارا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے ہی شکنتلا اور کامنی کو اغوا کیا تھا۔ زیادہ مت
بنو، میں تمہیں ابھی پکڑوا سکتا ہوں ورنہ سیدھے سیدھے میرے ساتھ چلو!'' یہ کہہ کر اس نے
میری کلائی پر ہاتھ ڈال دیا۔ ''تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔ بولو، چل رہے ہو؟'' اس کے
سوال میں دھمکی کا عنصر شامل تھا۔

اس وقت مجھے کچھ بھی تو سوجھ نہیں رہا تھا۔ فرار ہونا چاہتا تو مہندر شور مچا کر مجھے پکڑوا
سکتا تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں نے یونہی کہا۔

''کہاں چلنا ہے؟''

''میرے گھر۔'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ مجھے زہر معلوم ہوئی۔

''مگر کیوں؟'' میں نے پھر سوال کیا حالانکہ میں جانتا تھا کہ یہ بے مقصد سوال
ہے۔ ''مجھے ایک جگہ جلدی پہنچنا ہے۔'' میں کٹ حجتی پر اتر آیا۔

''بلاوجہ بحث نہ کرو کامریڈ سعدی!'' اس نے ایک اور دھماکا کیا۔

''کیا!'' میں نے اس صدمے کو، جو اس کے منہ سے کامریڈ سعدی سن کر مجھے ہوا
تھا، لہجے کے تاثر سے تعجب میں بدلنا چاہا۔

''میں تمہاری اداکاری سے ویسے بھی کل رات متاثر ہو چکا ہوں۔'' مہندر کے لہجے
میں کاٹ برقرار تھی۔ ''یقیناً تم اس وقت اندلسی، غزنوی، کوہستانی اور کیا نام ہے اس کا، ہاں
یاد آیا صحرائی کے پاس جا رہے ہو گے۔''

حیرتوں کے پہاڑ تواتر کے ساتھ مجھ پر ٹوٹے۔ میں مہندر کا منہ تکتا ہی رہ گیا۔ میں
سوچ رہا تھا کہ شاید مہندر بھی ہماری ہی تنظیم کا کوئی فرد ہے۔ وہ ہم میں سے ہی ہے۔ مگر
میرے مشاہدے کے اعتبار سے ایسا ہونا بعید از امکان تھا۔ اب تک کامریڈوں کے جتنے
اجلاس ہوئے تھے اور جن میں، میں نے شرکت کی تھی، ان میں کبھی کوئی ہندو شریک نہیں ہوا
تھا۔ پھر اکثر سالار اعظم ہمیں مجاہدو اور اسلام کے سپاہیو کے نام سے مخاطب کرتا تھا مگر
ساتھ ہی یہ بات بھی واضح تھی کہ کبھی سالارِ اعظم نے دوٹوک الفاظ میں یا ڈھکے چھپے انداز
میں یہ بھی نہیں کہا تھا کہ ہماری تنظیم میں کوئی ہندو شامل ہی نہیں ہو سکتا۔ یہی سوچ کر میں نے
چاہا تھا کہ مہندر سے اپنی تنظیم کا شناختی جملہ کہوں کہ اس نے میری کلائی پر گرفت مضبوط
کرتے ہوئے کہا۔ ''بولو کامریڈ سعدی! چل رہے ہو یا کرادوں گرفتار؟ ویسے تمہاری
اطلاع کے لیے ایک بات کہہ دوں، رات ختم ہو رہی ہے، صبح ضرور طلوع ہو گی۔''

مہندر ناتھ کا آخری جملہ میرے لیے حیرت انگیز صدمہ تھا۔ وہ یقیناً بہت کچھ جانتا

تھا۔ اس سے اس وقت بھڑنا یا اس کا کہنا نہ ماننا تنظیم کے لیے نقصان دہ ہی ثابت ہوتا
کیونکہ اس کے انداز سے یہ بات عیاں تھی کہ اگر میں نے اس کی بات نہ مانی تو پھر وہ
گرفتار کروا کے ہی چھوڑے گا۔ مہندر ناتھ کے آخری جملے سے یہ بات واضح ہوگئی تھی
ہماری تنظیم کا رکن نہیں تھا۔ اس نے شناختی جواب کا جملہ دہرایا تھا۔ اگر وہ رکن ہوتا تو
اور گیدڑ والا ٹیپو سلطان کا قول دہراتا۔

میں نے ان تمام باتوں پر غور کیا اور اس کے ساتھ ہولیا۔ ''چلو!'' میں نے اس
کہا۔

میں بہرحال گرفتار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ راستے میں اس نے چند باتیں ایسی کہیں
مجھے اس کی نیک نیتی اور خلوص پر یقین آ گیا۔ وہ بہرحال دشمن نہیں تھا۔

☆======☆======☆

ہادی صاحب کے گھر پر اسی روز شام کے وقت امروہے کے سرکردہ ہندو اور مسلمان لیڈروں اور اہم شخصیتوں کا اجتماع تھا۔

سالار اعظم کی سفارش پر اجتماع میں، میں الہ آباد کی حالیہ کانفرنس کے ایک مندوب کی حیثیت سے شرکت کر رہا تھا اور وہاں پہنچنے والوں میں سب سے پہلا شخص تھا۔ میرے سیدھے ہاتھ میں کلائی پر پٹی بندھی ہوئی تھی، حفظ ماتقدم کے طور پر!

ہادی صاحب نے میرا بہت جوشیلے انداز میں استقبال کیا تھا اور دیوان خانے میں لا کر بٹھا دیا تھا۔ فرش پر اجلی جازم اور چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں۔ دیواروں کے ساتھ اجلے گاؤ تکیئے رکھے ہوئے تھے۔ وسط میں چاندی کی فرشی والے بڑے بڑے پیچوان اور گاؤ تکیوں کے ساتھ چاندی کے اگالدان اور خاصدان رکھے ہوئے تھے۔ اگر بتیاں سلگ رہی تھیں اور اور بھینی بھینی خوشبو سے تمام دیوان خانہ معطر تھا۔ دروازوں، الماریوں اور کارنس پر موتیوں اور شیشے کی نلکیوں سے بنی ہوئی جھالریں لٹک رہی تھیں۔ دیواروں پر ہرنوں اور بارہ سنگھوں کے سینگ اور سر ایک ترتیب سے لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف کچھوے کے بڑے سے خول کی ڈھال لٹک رہی تھی۔

میرے بعد وہاں پہنچنے والا مہندر تھا۔ وہ اپنی بہن لالی کے ساتھ آیا تھا۔ میں نے اور ہادی صاحب نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا تھا۔

''ارے ہماری بٹیا لالی بھی آئی ہے۔'' ہادی صاحب نے کہا تھا۔

''سلام چاچا!'' لالی نے جھک کر آداب بجالاتے ہوئے کہا۔

ہادی صاحب نے لالی کے سر پر ہاتھ پھیرا، دعائیں دیں اور لالی کو لے کر اندر چلے گئے۔ ''ارے سنتی ہو بیٹی سلیمہ!'' میں نے ان کی آواز سنی تھی۔ ''یہ لالی بٹیا آئی ہے۔ لو بھئی ہماری بٹی کو سنبھالو۔''

یہ تھے صدیوں کے میل جول سے پروان چڑھنے والے وہ تعلقات جو بعض سیاست

دانوں کی مصلحتوں، اور سیاسی کوتاہ بینیوں کی بھینٹ چڑھ رہے تھے۔ میں نے بڑے
سے سوچا تھا۔

مہندر ناتھ اپنے باپ وشوا ناتھ کی جگہ اس اجلاس میں شریک ہو رہا تھا کیو
وشوا ناتھ ان دنوں بمبئی گیا ہوا تھا۔ وشوا ناتھ اگرچہ لالہ گوپی ناتھ کا سگا بھائی ہی تھا
فکری اعتبار سے وہ اپنے بھائی سے قطعی مختلف تھا۔ دونوں بھائیوں میں ذرا نہ بنتی تھی۔

حقیقت یہ تھی کہ یہ اجلاس مہندر ناتھ ہی کی اطلاع کی بنا پر ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے
اپنے گھر لے جا کر جو کچھ بتایا تھا، اس کے بعد اس اجلاس کی ضرورت اور بڑھ گئی تھی۔ ا
نے کہا تھا۔ ''امروہہ میں ابھی مذہبی جنون زیادہ نہیں بڑھا ہے۔ لوگ اب بھی پرا
تعلقات کو اہمیت دیتے ہیں۔ وہ یقیناً جگدیش جیسے لوگوں کو یہ اجازت نہیں دیں گے
امروہے میں بھی آرہ اور کٹار پور جیسے فسادات ہوں، ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو
کریں، ان کے گھروں کو آگ لگائیں، بچوں کو نیزوں پر چڑھائیں اور عورتوں کی
حرمت کریں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں اس خطرے سے پیشگی خبردار کر
جائے۔''

میرے سیدھے ہاتھ پر پٹی بندھی دیکھ کر مہندر ہنسا تھا، ''خوب! گویا اب کام
سعدی کو شناخت نہیں کیا جا سکے گا۔'' اس نے سرگوشی کے انداز میں مجھ سے کہا تھا۔ میں
محبت سے اس کی کمر پر تھپکی دی۔

''اچھا کیا تم نے۔'' اس نے کہا۔ ''سہنا پاگل ہو رہا ہے۔ ویسے دوست! تمہارا
ہے بہت دھوکے باز۔ کوئی بھی تو یہ شبہہ نہیں کر سکتا کہ اس معصوم چہرے کے پیچھے
خطرناک شخصیت چھپی ہوئی ہے۔'' پھر ہم دونوں ساتھ ساتھ ہی ایک گاؤ تکیے کے سہار
بیٹھ گئے تھے۔ مہندر ناتھ اب سوت کے پل اور ٹرین کی تباہی پر مجھ سے باتیں کر رہا تھا۔

اس کے بعد ہم زیادہ باتیں نہیں کر سکے۔ لوگوں کی آمد کا تانتا بندھ گیا تھا۔ سب
آخر میں آنے والے پنڈت سکھد یو تھے۔ مہندر ناتھ نے جو ہر آنے والے کے بارے
مجھے معلومات فراہم کر رہا تھا، چپکے سے میرے کان میں کہا۔ ''یہ بہت بدبودار شخص ہے
پنڈت سکھد یو عجیب کینڈے اور نرالی شان کے آدمی تھے۔ بڑی بڑی مونچھیں، باہر کو
پڑنے والی گول گول آنکھیں، گنجے سر پر لہراتی ہوئی چوٹی، سفید ململ کا کرتہ، سفید دھوتی
آواز میں بادلوں کی گرج، یہ تھا پنڈت سکھد یو! ہادی صاحب نے نہایت خندہ پیشانی
پنڈت سکھد یو کا استقبال کیا تھا۔

پنڈت جی نے گرج دار آواز میں کہا۔ ''میر صاحب! آج کیسے یاد کر لیا ہم غلاموں
کو؟''

''ارے کیا کہہ رہے ہیں پنڈت جی!'' ہادی صاحب نے کہا۔

''دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے میر صاحب!'' پنڈت سکھد یو نے
کہا تھا۔ ''اور ہمیں تو تم لوگوں نے آٹھ سو برس سے جلایا ہے۔'' پنڈت جی کے لہجے سے
واقعی جلے ہوئے دودھ کی بو آرہی تھی۔

اس مرتبہ ہادی صاحب خاموش ہو گئے۔ پنڈت سکھد یو، دیوان سنگھ کے پاس بیٹھ
چکے تھے۔ اس کے بعد دروازے بند کر دیے گئے۔ شاید اس اجتماع کے تمام مدعوئین آ چکے
تھے۔ ہادی صاحب میرے اور مہندر ناتھ سمیت اس اجتماع میں گیارہ افراد شامل تھے۔ ان
میں مہندر ناتھ سمیت چھ ہندو تھے۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کے طول و عرض میں ہندو
مسلم اتحاد کا بڑا چرچا تھا۔ اگرچہ برطانوی حکومت کے اشارے پر بعض متعصب عناصر اس
اتحاد کو توڑ پھوڑ دینے کے لیے الزامات اور دروغ گوئی کے سہارے ہندوؤں اور مسلمانوں
میں بداعتمادی پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس مخالفانہ مہم کے باوجود ہندو اور مسلمان
اکثر ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع ہو جاتے۔ تحریکِ خلافت اگرچہ قطعی طور پر مسلمان کا مسئلہ تھا
لیکن ہندو بھی اس میں جوش و خروش سے حصہ لے رہے تھے۔ خود گاندھی جی اس تحریک میں
شامل تھے۔ دوسری طرف گاندھی جی کی جانب سے ہندوستان کی آزادی کے لیے جو
پروگرام دیا جاتا تھا مسلمان اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ یہ وہ سال تھا جسے گاندھی
جی نے سوراج کا سال قرار دیا تھا اور ہندوستانیوں کو یہ نوید دی تھی کہ 31 دسمبر 1921ء تک
ہندوستان میں سوراج قائم ہو جائے گا۔ اسی مقصد کے تحت انہوں نے کانگریس کو ہدایت
کی تھی کہ 30 جون کو ختم ہونے والی تین ماہ کی مدت میں ایک کروڑ روپے جمع کیے جائیں،
کانگریس کے ایک کروڑ ممبر بنائے جائیں اور بیس لاکھ چرخے چلانے کا انتظام کیا جائے۔
اس کے ساتھ ہی گاندھی جی کی طرف سے ترک موالات کی مہم بھی جاری تھی اور ہندوستان
کے مسلمان، تحریکِ خلافت کے ساتھ ساتھ گاندھی جی کی طرف سے چلائی جانے والی ان
تمام مہموں میں پورے جوش و خروش سے عملی حصہ لے رہے تھے۔

اجلاس باقاعدگی سے شروع ہو چکا تھا۔ ہادی صاحب صدر مجلس تھے۔ انہوں نے
اس اجتماع کی غرض و غایت بیان کرنے سے پیشتر ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط بنانے کی
ضرورت پر روشنی ڈالی اور پھر کہا۔ ''بھائیو! آج میں نے آپ کو ایک اہم معاملے پر غور

کرنے کے لیے زحمت دی ہے۔'' سب لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ ''یہ ہم سب کا مسئلہ ہے۔ ہندوؤں کا بھی مسلمانوں کا بھی! یہ امروہے میں رہنے والے ہر شخص کا مسئلہ ہے۔ ہمیں چاہیے......''

''رہنے دو میر صاحب!'' پنڈت سکھدیو نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اب ہم ان چکنی، چپڑی باتوں میں نہیں آنے کے۔''

محفل پر سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص پنڈت سکھدیو کی طرف متوجہ تھا۔ مہندر نے میرا ہاتھ دبایا۔ سکھدیو کے جملے میں جو تلخی تھی، لہجے کی رعونت سے دو آتشہ بن گئی تھی۔

''پنڈت جی!'' ہادی صاحب نے کہا۔ ''یہ انگارے کیوں چبا رہے ہیں۔ پہلے میری پوری بات تو سن لیتے۔''

''یہ انگارے چبانے کی بات نہیں ہے میر صاحب!'' پنڈت سکھدیو کے لہجے کی تلخی اور بڑھ گئی تھی۔ ''کان کھول کر سن لو، امروہے کا کوئی ہندو تحریکِ خلافت میں مسلمانوں کا ساتھ نہیں دے گا۔''

''سب ہندوؤں کو بدنام نہ کرو پنڈت جی!'' اس مرتبہ مہندر نے کہا تھا۔

پنڈت سکھدیو نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مہندر کو گھورا۔ ''وشوا ناتھ کے پوت! تُو چپ رہ!''

''مہندر نے ٹھیک کہا ہے۔'' دیوان سنگھ نے کہا۔ ''ہاں میر صاحب! کہو، کیا کہہ رہے تھے؟''

''نہیں دیوان جی!'' اس مرتبہ سیٹھ گنگولی نے بات کاٹی۔ ''پہلے پنڈت جی کو اپنی بات پوری کر لینے دو۔ ہاں پنڈت جی!''

''میں پہلے ایک بات آپ پر واضح کر دوں۔'' ہادی صاحب نے کہا۔ ''میں نے آپ حضرات کو تحریکِ خلافت کے سلسلے میں نہیں بلایا۔ اگر اس محفل کا کوئی تعلق خلافت سے ہوتا تو میں پنڈت جی اور گنگولی کو ہرگز یہاں آنے کی زحمت نہیں دیتا۔ یہاں موجود ہر شخص جانتا ہے کہ تحریکِ خلافت کے سلسلے میں ان حضرات کو کبھی زحمت نہیں دی گئی۔'' ہادی صاحب ذرا دیر کے لیے رُکے۔ ان کے چہرے سے ناگواری عیاں تھی۔ ''میں نے آپ لوگوں کو صرف اور صرف امروہے کے ایک مسئلے پر غور کرنے کے لیے بلایا ہے۔''

''میر صاحب!'' پنڈت سکھدیو پھر تڑخ کر بولے۔ ''آٹھ سو برس سے تم لوگ ہمیں اُلو بناتے آ رہے ہو۔ مختلف بہانوں سے تم نے ہمیں غلام بنا رکھا ہے۔ اب تم لوگ پھر

نیا جال پھیلا رہے ہو۔ مولانا جوہر نے گاندھی جیسے شخص کو بھی شاید اُلو کا گوشت کھلا دیا ہے۔ وہ خلافت کی ڈگڈگی بجائے جا رہے ہیں۔''

''پنڈت جی!'' دیوان سنگھ نے بلند آواز میں تنبیہہ کی۔ ''زبان سنبھال کے بات کرو۔ مولانا جوہر کے بارے میں تمہیں ایسے الفاظ نہیں کہنے چاہئیں ورنہ......''

''ورنہ کیا ہوگا؟'' اس مرتبہ گنگولی بپھر کر بولا۔

''کیوں نہ کریں جی بات؟'' پنڈت سکھدیو نے قہر آلود انداز میں دیوان سنگھ کو گھورتے ہوئے دیکھا۔ ''دیوان جی! سن لو، تم جیسے لوگ سر پکڑ کر روئیں گے۔ تم ان لوگوں کی چالوں کو نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ بڑے پاپی ہیں۔''

''پنڈت جی!'' اس مرتبہ ڈاکٹر بمل رائے بولے تھے۔ ''بڑے شرم کی بات ہے۔ کم از کم اتنا ہی خیال کرتے کہ آپ یہاں مہمان ہیں۔''

''تم جیسے لوگوں کی آنکھوں پر پٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔'' سکھدیو نے کہا۔ ''پائینئر پڑھا کرو۔ مالویہ جی، سپرو اور سوامی آئنگر کی باتوں کو غور سے سنو۔ یہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ مسلمان ہمارے خلاف کیا سازشیں کر رہے ہیں۔ یہ لوگ انگریزوں کو یہاں سے نکالنے کے لیے ہماری مدد حاصل کرنا چاہتے ہیں، سمجھے ڈاکٹر صاحب! پھر یہ ہندوستان پر افغانوں کی حکومت قائم کر دیں گے۔ تمہیں معلوم ہے سردار امان اللہ ہندوستان پر حملے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ پھر یہی محمد علی جوہر تمہاری گردن کاٹے گا۔''

اب مجھ سے خاموش نہیں رہا گیا۔ ''پنڈت جی!'' میں نے کہا۔ ''مولانا جوہر نے ان الزامات کے جواب الہ آباد کانفرنس میں دے دیے ہیں۔ آپ نے وہ جواب بھی پڑھا ہے یا نہیں۔ اگر ہندوستان کے بائیس کروڑ ہندو، ایک کروڑ افغانوں اور سات کروڑ ہندوستانی مسلمانوں سے اتنا ہی ڈرتے ہیں تو پھر ہندوؤں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں پنڈت جی! تم نے جو باتیں کہی ہیں، یہ وہی باتیں ہیں جو انگریزوں کے پٹھو کہتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے پائینئر اینگلو انڈین اخبار ہے، انگریزوں کا کاسہ لیس ہے۔''

میں کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر پنڈت سکھدیو نے کہا۔ ''یہ کون ہے میر صاحب!'' ان کا لہجہ تلخ تھا۔ ''کل کے چھوکرے سے میری بے عزتی کراتے ہو۔ یہ ہمارے لیڈروں کو انگریزوں کا پٹھو کہتا ہے۔ ارے تو کیا جھوٹ صرف ہندو ہی کہتے ہیں اور سچ بولنا صرف مسلمانوں کے حصے میں آیا ہے۔''

''یہ الہ آباد کانفرنس میں مندوب کی حیثیت سے شریک تھے۔'' ہادی صاحب نے

کہا۔ ''عثمان بیٹا! تم خاموش رہو۔'' انہوں نے مجھے ایک نئے فرضی نام سے مخاطب کیا تھا۔

''سنا ڈاکٹر صاحب!'' اس مرتبہ گنگولی نے کہا تھا۔ ''پنڈت جی کی بات غور سے سنو۔'' گنگولی، ہاں میں ہاں ملانے والا اور لوگوں کو آپس میں لڑانے والا شخص معلوم ہوتا تھا۔ ''ہمیں اگر اس دیش میں آزاد رہنا ہے تو ان مسلمانوں کے پھیلائے ہوئے جال سے ہوشیار رہنا ہوگا۔ یہ لوگ ہمارا گلا ہمارے ہی ہاتھوں کٹوانا چاہتے ہیں۔''

''تمہیں تو ایسی بات نہیں کہنی چاہیے گنگولی!'' ڈاکٹر بمل رائے نے کہا۔ ''تمہیں یہ تو خیال کرنا چاہیے کہ آج تم جہاں ہو ایک مسلمان کی بدولت ہو۔''

''یہ میرے دھرم اور میری قوم کا معاملہ ہے ڈاکٹر صاحب!'' گنگولی نے کہا۔ ''میاں جی نے مجھ پر احسان کیا ہے میری قوم پر نہیں کیا۔''

اس کے بعد معاملہ شاید بڑھ جاتا کیونکہ بمل رائے نے پھر گنگولی پر نکتہ چینی کی تھی مگر ہادی صاحب نے معاملے کو نہیں بڑھنے دیا۔ ''چھوڑیے ڈاکٹر صاحب! آپ بھی کہاں کی باتیں لے بیٹھے۔ گنگولی ٹھیک ہی کہتا ہے۔ وہ بات ابا جی اور گنگولی کے درمیان ہے۔'' یہ کہہ کر ہادی صاحب رکے۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا آخر آج گنگولی اور پنڈت جی اتنے برہم کیوں ہیں؟ بہر حال میں اب بھی انہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں۔'' ہادی صاحب پھر تھوڑی دیر کے لیے رکے۔ ''آپ لوگ میری بات سن لیتے تو شاید یہ تلخی نہ ہوتی۔''

''اس سینے میں ہولی پھنک رہی ہے میر صاحب!'' پنڈت نے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''اور میں نے آپ لوگوں کو، امروہے کو اس الاؤ سے بچانے کے لیے بلایا ہے جسے بھڑکانے کی سازش ہو رہی ہے۔'' ہادی صاحب نے کہا۔ ''آپ کو میں نے اس لیے بلایا ہے کہ امروہے کہ اس خون خرابے سے بچانے کی کوشش کی جائے جس کی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ سیٹھ جگدیش کے ہاں جو مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں، ان کا مقصد کیا ہے؟''

''تو یہ بات ہے!'' پنڈت جی نے کہا۔ ''تم نے مسلمانوں کے بچاؤ کے لیے ہمیں بلایا ہے۔''

''میں نے امروہے کو بچانے کے لیے آپ لوگوں کو بلایا ہے۔'' ہادی صاحب نے بڑے مضبوط لہجے میں، ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

پنڈت جی پھر کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ ڈاکٹر بمل رائے نے انہیں روک دیا۔ ''ذرا

چپ بھی بیٹھیے پنڈت جی!'' پھر وہ ہادی صاحب سے مخاطب ہوئے۔ ''ہاں ہاں، ہادی! بتاؤ کیا بات ہے۔''

''میرے پاس آج ایک پرچہ آیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اسی قسم کے پرچے پنڈت جی، وشوا ناتھ، بھگوان داس اور حسن ثنیٰ کے پاس بھی بھیجے گئے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئے اور انہوں نے جیب سے ایک پرچہ نکالا، پھر بولے۔ ''مہندر بیٹے! ذرا یہ پرچہ پڑھ کر سناؤ۔''

مہندر نے ہادی صاحب کے ہاتھ سے پرچہ لے لیا۔ ساتھ ہی اس نے اپنی جیب سے بھی ایک پرچہ نکالا تھا۔ ایک نظر اس نے ہادی صاحب کے دیے ہوئے پرچے کو دیکھا اور اپنا پرچہ ڈاکٹر بمل رائے کو دیتے ہوئے کہا۔ ''ہمارے گھر جو پرچہ آیا ہے، وہ یہ ہے۔''

اس کے بعد مہندر ناتھ نے وہ پرچہ پڑھ کر سنایا۔ یہ پرچہ وطن پرستوں کی طرف سے تھا جس میں انہوں نے جگدیش کے ہاں آنے والوں کی آمد کا مقصد بتایا تھا۔ پرچے میں یہ بھی لکھا تھا کہ جگدیش، لالہ گوپی ناتھ، بدری ناتھ، بھگوان داس، رام پرشاد اور جگ موہن، کوتوال سہنا کی مدد سے، امروہے کے مضافاتی دیہات میں شدھی تحریک کے بہانے مسلمانوں کے قتل عام کا منصوبہ بنا چکے ہیں۔ قاتلوں کو جگدیش نے مختلف علاقوں سے بلایا ہے۔ پرچے میں یہ بھی اطلاع دی گئی تھی کہ سہنا نے ان قاتلوں کو بندوقیں فراہم کی تھیں جنہیں رات کے وقت وطن پرستوں نے اس سے چھین لیا تھا۔ ساتھ ہی خط میں ان خطرات کا بھی مختصراً ذکر کیا تھا جو اس کے نتیجے میں پیدا ہو سکتے تھے اور اپیل کی گئی تھی کہ جن لوگوں کے نام خط لکھے گئے ہیں، وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے امروہے کو آنے والے ہنگاموں اور خون خرابے سے بچانے کی کوشش کریں۔

اس کے بعد ایک اور ہنگامہ شروع ہو گیا۔ پنڈت جی اس ہنگامے کا سبب تھے اور گنگولی اسے ہوا دے رہا تھا۔ پنڈت جی کا کہنا تھا کہ ہندو جو کچھ کر رہے ہیں، اس میں وہ حق بجانب ہیں۔ پھر انہوں نے مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کرتے ہوئے، لالہ گوپی ناتھ کی بیٹیوں کے اغوا کی داستان سنائی۔ اس مرحلے پر مہندر نے کہا۔ ''پنڈت جی! شکنتلا اور کامنی واپس اپنے گھر پہنچ گئی ہیں۔ پھر آپ ان کے اغوا پر تو اتنے چراغ پا ہو رہے ہیں، کبھی یہ بھی سوچا ایسا کیوں ہوا۔ آپ کو علم دین کی بہن کے اغوا کا علم شاید نہ ہو۔ میں بتاؤں علم دین حسمہ پور کا کسان ہے۔ لالہ گوپی ناتھ نے اس کی بہن کو اغوا کیا تھا۔ پھر اس سے منہ کالا کرنے کی کوشش کی تھی۔ تمہیں تو شاید یہ علم بھی نہیں پنڈت جی کہ علم دین کی بہن کا کیا

ہوا۔ میں بتاتا ہوں آپ کو پنڈت جی! اس دیوی نے خود کو لالہ گوپی ناتھ کی ہوس سے بچانے کے لیے کنویں میں چھلانگ لگا کر جان دے دی تھی اور راموں نے اس کی لاش کو ٹھکانے لگایا تھا۔'' مہندر ناتھ بولتا ہی چلا گیا۔ بیچ میں پنڈت جی اور گنگولی نے دو تین بار اسے ٹوکنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ اپنی بات ختم کر کے ہی رکا۔ ''مجھے بتائیں پنڈت جی! اگر شکنتلا اور کامنی کا اغوا اتنی ہی بری بات ہے تو علم دین کی بہن کا اغوا بھی بری بات نہیں؟ میں یقین دلاتا ہوں پنڈت جی کہ شکنتلا اور کامنی اس وقت بھی اتنی ہی پوتر ہیں جتنی وہ اغوا کے وقت تھیں۔''

''تُو...... تُو...... مہندر!'' پنڈت جی نے غصے سے کہا۔ ''بہت بے غیرت ہو تُو ہے۔'' وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے۔

''شاید۔'' مہندر ناتھ نے کہا۔ ''کیونکہ میں اپنے چاچا کو آج بھی برا نہیں کہہ سکتا۔'' اس کی آواز درد میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''تُو، تیری بہن اور تیرا باپ سب دھرم کے باغی ہیں۔'' پنڈت جی پھر مہندر پر برس پڑے۔ ''تُو تو کمیونسٹ ہے۔ تو ایسی باتیں نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا۔''

پھر کچھ دیر تک تلخ اور ترش باتیں ہوتی رہیں۔ آخری ہادی صاحب نے غصے سے کہا تھا۔ ''پنڈت جی! ہمیں بھی کمزور نہ سمجھیں۔ دباؤ میں آ کر چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے۔ ہمیں تر نوالہ نہ سمجھیں، ہم آپ کے منہ سے بہت بڑا لقمہ ہیں۔'' وہ ذرا دیر کے لیے رُکے۔ ''میں اب بھی آپ سے اپیل کروں گا کہ اس آگ کو بھڑکنے نہ دیجئے۔ یہ آگ بھڑک اٹھی تو پھر آپ کے گھر بھی نہ بچ سکیں گے۔''

''تم اپنے گھروں کی فکر کرو میر صاحب!'' پنڈت جی نے کہا۔ ''تم لوگوں کو اپنا بویا کاٹنا ہی پڑے گا۔ سمجھ لو میر صاحب! اب ہمارے تمہارے راستے الگ ہو چکے ہیں۔ جب تم ہندوؤں کو مسلمان بنا... تھے تو اس پر تمہیں کوئی دکھ نہیں ہوتا تھا۔ اب شدھی بنانے کے سے کیوں ڈرتے ہو۔'' یہ کہہ کر پنڈت جی اٹھ کھڑے ہوئے، ان کے ساتھ ہی گنگولی بھی اٹھ گیا۔ ڈاکٹر بمل رائے اور دیوان سنگھ نے ان دونوں کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ رکے۔

میں سوچ رہا تھا کہ مذہبی منافرتوں اور عداوتوں کا جو لاوا بھڑکانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اس کے نتائج کیا ہوں گے؟ جب یہ عداوتیں اور نفرتیں سیلِ تند کی صورت اختیار کر لیں گی تو میں اور مہندر جیسے لوگ کب تک انہیں روکنے کے لیے بند باندھتے رہیں

گے، اگر باندھ بھی دیے تو وہ بند کب تک اس کے سامنے ٹھہر سکیں گے؟ مگر مجھے گنگولی، پنڈت سکھدیو، جگدیش اور گوپی ناتھ کے مقابلے میں بمل رائے اور دیوان سنگھ جیسے لوگوں پر بھروسا تھا۔ جب تک یہ لوگ زندہ ہیں ہندوستان کو مذہبی جنون کی قربان گاہ نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ وہ لوگ تھے جو انسانیت اور بھائی چارے پر یقین رکھتے تھے اور جن کی وجہ سے انسانوں کے جنگل میں، انسانیت کا بھرم قائم تھا۔

ان دونوں کے جانے کے بعد باقی ماندہ لوگوں نے سر جوڑ کر اس خطرے پر غور کیا تھا اور یہی فیصلہ کیا تھا کہ امروہے کو اس آگ سے بچانے کے لیے وہ ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس کے بعد امروہے کے وہ بزرگ اپنا لائحہ عمل طے کرنے کے لیے آپس میں مصروفِ گفتگو ہو گئے میں اور مہندر وہاں سے اٹھ کر باہر آ گئے۔

''دیکھا تم نے!'' مہندر نے کہا تھا۔ ''نفرتوں نے ذہنوں کو کتنا مفلوج کر دیا ہے۔'' میں نے اس کے لہجے میں انہی خطروں کی بازگشت سنی جو میرے ذہن میں پیدا ہوئے تھے۔ پھر دیر تک ہم ہندوستان کے سیاسی حالات پر گفتگو کرتے رہے۔ چلتے وقت مہندر نے مجھے یاد دلایا تھا۔ ''تمہیں اپنا وعدہ یاد ہے نا!''

''ہاں بھئی یاد ہے۔ آج رات نو بجے، مراد آبادی دروازے پر!''

☆======☆======☆

آج اُس زمانے کی باتیں بتاتے ہوئے، میں اس دور میں ہندو مسلم کشیدگی کی نشاندہی کرتے ہوئے یہ بتانا بھی بھول گیا کہ اس دن صبح گلی میں مہندر سے ملاقات کا عہد ہوا تھا۔ میں یہ پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اس وقت صورتِ حال میں، میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ مہندر ناتھ کے ساتھ اس کے گھر چلا جاؤں کیونکہ مجھے اپنی کلائی پر اس کی گرفت کسی وقت بھی اپنی ہتھکڑیوں کی ٹھنڈی گرفت میں تبدیل ہو جانے کا خطرہ تھا۔

'مہندر ناتھ کے گھر کا دروازہ لالی نے کھولا تھا۔ ''پہچانتی ہو انہیں؟'' مہندر ناتھ نے اپنی بہن سے پوچھا تھا۔

''شنکر جی!'' اس نے حیرانی سے کہا تھا۔

دونوں بھائی بہن کے لہجے میں غصے یا دشمنی سے زیادہ دوستی کی جھلک تھی اور اب مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے گلی میں مہندر ناتھ نے میرے ساتھ جو رویہ اختیار کیا تھا، اس کا مقصد یقیناً مجھے خوفزدہ کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ تھوڑی دیر میں ہم بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے اور لالی ناشتے کا انتظام کرنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ میں نے لاکھ منع کیا مگر مہندر نہ

مانا۔ ''میں جانتا ہوں کامریڈ سعدی!'' اس نے کہا تھا۔ ''تم نے ابھی ناشتہ نہیں کیا؟ محض تکلفاً منع کر رہے ہو۔''

''میں تکلفات کا عادی نہیں ہوں۔ جو زندگی میں نے اختیار کی ہے اس میں تکلفات کا گزر نہیں۔''

''تو شاید اس لیے منع کر رہے ہو کہ تم ایک ہندو کے گھر کا کھانا، کھانا نہیں چاہتے۔'' اس کے بعد انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

''پتا ہے کل رات تمہارے جانے کے بعد کیا ہوا؟'' مہندر ناتھ نے کہا۔ میں خاموش رہا مگر میرے ذہن میں ایک خلش تھی۔ اس کا اندازِ گفتگو مجھے یہ یقین دلا رہا تھا کہ اس کے دل میں میرے لیے کوئی کھوٹ نہیں ہے لیکن جن حالات سے میں گزر رہا تھا ان کی بنا پر میرا ذہن اس کی طرف سے صاف نہیں تھا۔

حالات کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ مجھے فوراً پولیس کے حوالے کر دیتا۔ آخر گوپی ناتھ اس کا چچا تھا۔ شکنتلا اور کامنی اس کی چچازاد بہنیں تھیں۔ اگر میں اس کی جگہ ہوتا تو یقیناً وہ اب تک پولیس کی حراست میں ہوتا یا میرے ہاتھ سے قتل ہو جاتا۔ جذباتی اور مذہبی وابستگیوں کا منطقی تقاضا یہی ہوتا ہے۔ تو کیا مہندر ناتھ میرے گرد کوئی جال بُن رہا تھا۔ میں نے بے چین ہو کر ادھر اُدھر دیکھا۔ شاید میں اس چوہے دان سے نکل بھاگنے کی کوئی راہ تلاش کر رہا تھا۔

مہندر ناتھ نے میری بے چینی اور اضطراب کو تاڑ لیا تھا۔ ''تم ابھی تک مجھ سے خطرہ محسوس کر رہے ہو۔'' اس نے کہا تھا۔ ''مگر جب تم یہاں سے اٹھو گے تو تمہیں خود یقین آ جائے گا کہ تمہارے یہ خدشات قطعی غلط تھے۔ بے فکر رہو، میں تمہیں پولیس کے حوالے نہیں کروں گا لیکن تمہیں میرا ایک کام کرنا ہوگا۔''

''وہ کام کیا ہے، یہ تو بتاؤ؟'' میں نے زچ ہو کر پوچھا۔

''وہ کام میں تمہیں لالی کے سامنے ہی بتاؤں گا۔'' مہندر نے کہا۔ ''فی الحال تم بالکل بے فکر ہو کر میری بات سنو!''

تن بہ تقدیر ہو کر میں اطمینان سے بیٹھ گیا۔ پریشان ہونے سے کوئی فائدہ نہ تھا۔

''رات تمہارے وہاں سے جانے کے بعد......'' مہندر ناتھ کہہ رہا تھا۔ ''جگدیش کے آدمی پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے ہی ہمیں رہائی دلائی تھی اور چاچا کو کنوئیں سے نکالا تھا۔ پھر کوتوالی میں اطلاع کرائی گئی اور کوئی گھنٹے بھر بعد ہی سہنا کو تلاش کر لیا گیا۔''

وہ کہانی سناتا رہا کہ تقریباً ایک گھنٹے بعد ہی شکنتلا اور کامنی بھی گھر پہنچ گئی تھیں۔ اس وقت سہنا بھی گھر پر موجود تھا۔ اس نے شکنتلا اور کامنی سے بیان لے کر کچھ سوالات کیے تھے اور فوراً ہی وہاں سے چلا گیا تھا۔ پھر کوئی دو گھنٹے بعد وہ دوبارہ آ کر، شکنتلا اور کامنی کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ مہندر بھی ان ساتھ گیا تھا۔ وہ دراصل ان سے اس مکان کی شناخت کرانا چاہتا تھا جہاں ہم نے انہیں رکھا تھا۔ مکان کو تو وہ شناخت نہیں کر سکی تھیں البتہ اس کمرے کو انہوں نے پہچان لیا تھا جہاں دونوں بہنوں کو پہلی رات ٹھہرایا گیا تھا اور جس میں وہ سوئی تھیں۔

''تو یہ کہانی ہے کامریڈ سعدی!'' مہندر نے کہا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم یہ سب باتیں مجھے کیوں بتا رہے ہو۔ نہ میں شنکر ہوں، نہ کامریڈ سعدی! میرا نام شمیم ہے اور میں فیاض نقوی صاحب کا مہمان ہوں۔''

''اسی لیے تم گرفتاری سے بچنے کے لیے میرے ساتھ چلے آئے۔'' مہندر ناتھ نے کہا۔ ''تم جیسے لوگوں کے لیے نام کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ ویسے کامریڈ سعدی، یا شنکر جی، یا شمیم صاحب! میں نے ان تینوں شخصیتوں کو اس پدم سے پہچانا ہے جو تمہاری سیدھی کلائی کے نیچے پر ہے۔ شکنتلا اور کامنی نے اپنی بپتا سناتے ہوئے کہا تھا کہ انہیں اغوا کرنے والے ایک دوسرے کو کامریڈ سعدی، غزنوی، اندلسی، کوہستانی اور صحرائی کہتے تھے اور ان میں کامریڈ سعدی کی دائیں کلائی پر بڑا سا سرخ پدم ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے شنکر جی یاد آ گئے، ان کی کلائی پر بھی میں نے پدم دیکھا تھا۔ پھر میرے لیے اس نتیجے پر پہنچنا کوئی مشکل نہیں تھا کہ شنکر جی اور کامریڈ سعدی ایک ہی شخصیت کے دو روپ ہیں۔'' وہ رکا اور مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ''اب کلائی چھپانے سے کیا فائدہ کامریڈ! بہرحال میں نے نہ معلوم کیوں سہنا یا کسی اور کو یہ نہیں بتایا۔ میرا خیال ہے اس راز سے میرے اور لالی کے سوا کوئی اور واقف نہیں۔''

پھر اس نے کہا تھا کہ دونوں بہنوں نے ہی یہ بھی بتایا تھا کہ ہم آپس میں شناخت کے لیے مخصوص جملے کہتے ہیں۔ یہ اندازہ انہوں نے اغوا کی رات لگایا تھا جب رامو پر حملہ کرنے والے نے کوئی جملہ کہا تھا مگر انہیں وہ جملہ یاد نہیں رہا تھا البتہ میرا جواب ان کے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔

''اب کہو کامریڈ! کیا اب بھی تم انکار ہی کرو گے؟''

میرے پاس نفی میں جواب دینے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ ''ٹھیک ہے۔'' میں نے مختصر

جواب دیا۔

’’تمہارا ذہن شاید اب بھی میری طرف سے شک و شبہے میں مبتلا ہے۔‘‘ مہندر نے کہا۔ ’’ہونا بھی چاہیے۔‘‘

پھر لالی ناشتہ لے کر آ گئی ہے۔ ہم سب نے بیٹھ کر، ناشتہ کیا۔ ان کے حسن سے میرے دل کے وسوسے تقریباً ختم ہو گئے تھے۔ ’’شکنتلا نے تمہاری شرافت اور کی بڑی تعریف کی ہے۔ اس پر اسے چاچا گوپی ناتھ اور چاچی کو جھڑکیاں بھی سنی تھیں۔‘‘ مہندر ناتھ نے کہا۔

’’ہم نے انہیں صرف اس لیے اغوا کیا تھا کہ لالہ گوپی ناتھ کو احساس ہو دوسروں کی بہو، بیٹیوں کو اغوا کرنا کتنی شرمناک حرکت ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’ہماری صاف تھی۔ ہم نے لالہ گوپی ناتھ کی طرح ان کی پاکدامنی کو داغدار کرنا نہیں چاہا تھا۔‘‘

’’پتھر میں جونک نہیں لگتی، کامریڈ!‘‘ لالی نے کہا تھا۔ ’’چاچا گوپی ناتھ ایسے میں سے نہیں ہیں جو راہِ راست پر آ سکیں۔‘‘

’’خیر چھوڑو ان باتوں کو۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’مجھے بتاؤ تم لوگ کیا چاہتے ہو مجھ

’’ہم لوگ کیا چاہتے ہیں؟‘‘ لالی نے کہا۔ ’’یہ تو ہم بعد میں بتائیں گے لیکن سے پہلے ہم تمہیں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہم کیا ہیں؟‘‘

میں ہنسا۔ ’’تم، تم لالی ہو اور یہ تمہارا بھائی مہندر۔ تم وشوا ناتھ کی اولاد ہو۔ گوپی تمہارا چاچا ہے، اس کے بعد بتانے کو کیا رہ گیا ہے؟‘‘

’’یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔‘‘ مہندر ناتھ نے کہا۔ ’’مگر ہم، لالی اور مہندر ناتھ کے بھی کچھ اور ہیں، جس طرح تم شنکر، سعدی اور شمیم کے علاوہ بھی کچھ اور ہو۔‘‘

’’ہاں ہم اس کے علاوہ بھی کچھ اور ہیں جو کچھ تم نے کہا۔‘‘ اس مرتبہ لالی نے تھا۔ ’’میرا بھائی مہندر، گوپی ناتھ کا بھتیجا ہے مگر اس نے اپنے چاچا کے پاپ کی معا دین سے جا کر مانگی تھی اور اسی نے علم دین کو اس کی بہن کے کنویں میں ڈوبنے کی دی تھی۔‘‘

یہ واقعی میرے لیے انکشاف تھا۔ ’’مگر اس معافی کا علم دین کو کیا فائدہ ہوا؟‘‘ نے پوچھا۔

’’کامریڈ!‘‘ اس مرتبہ مہندر ناتھ کا لہجہ سخت تھا۔ ’’انسانی جذبات اور اقدار بیوپاریوں کی طرح نفع نقصان میں ہی ناپنا چاہتے ہو تو یہ بتاؤ کہ اس سے مجھے کیا

پہنچا؟‘‘ اس کے لہجے میں کپکپاہٹ تھی۔ ’’مجھے تم سے ایسی بات کی توقع نہ تھی۔‘‘

خود مجھے بھی احساس ہوا تھا کہ میں نے اس جواب سے مہندر کی دل آزاری کی ہے۔

’’میں معافی چاہتا ہوں مہندر! میرا مقصد ہرگز یہ نہ تھا۔‘‘

’’بہرحال میں نے اپنی دانست میں کوشش کی تھی کہ اس دیس میں صدیوں سے بھائیوں کی طرح رہنے والوں کے درمیان نفرتوں کی دیواریں نہ اٹھنے پائیں۔‘‘ مہندر نے کہا۔ ’’میں نے ایسا کرتے ہوئے اپنے ذاتی فائدے یا نقصان کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ میں نے صرف یہ سوچا تھا کہ میں ایک اچھا کام کر رہا ہوں۔‘‘ اس کے لہجے سے اس کا دکھ عیاں تھا۔

’’میں معافی چاہتا ہوں میرے دوست!‘‘ میں نے اسے گلے لگا لیا۔ ’’مجھے معاف کر دو مہندر! میں نے واقعی ایک گھٹیا بات کہی تھی۔‘‘

اپنے شانے پر مہندر کی تھپکی مجھے اس وقت بہت کیف آگیں محسوس ہوئی۔ ’’مجھے تمہاری دوستی ہی کی ضرورت ہے کامریڈ! بولو اس دوستی کو نبھاؤ گے؟‘‘

’’ضرور نبھاؤں گا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’مگر پہلے تم زبان سے کہو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا۔‘‘

’’چلو معاف کر دیا۔ بھگوان کی قسم، اللہ کی قسم۔‘‘ مہندر نے کہا۔ ’’انسان کی قسم۔‘‘

اعتماد، محبت، دوستی اور خلوص کی ایک نرم و گرم فضا قائم ہو گئی تھی۔ ہم تینوں اس دھیمی دھیمی گرمی سے پگھل رہے تھے۔ لگتا تھا کہ ہم صدیوں سے ایک دوسرے سے واقف ہیں، ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہیں۔ پھر ہم میں ڈھیروں باتیں ہوئیں لیکن یہ باتیں محض وقت گزاری کی باتیں نہ تھیں۔ یہ باتیں ایک دوسرے کو زیادہ بہتر طور پر جاننے کی باتیں تھیں۔

مہندر نے کہا تھا۔ ’’میں نے اور لالی نے اندازہ لگایا ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی نوجوانوں کے ایک ایسے گروہ سے تعلق رکھتے ہو جو نیک مقاصد کے تحت معاشرے کی برائیوں کے خلاف نبرد آزما ہے۔ کیوں کیا میں نے غلط اندازہ لگایا ہے؟‘‘

’’بڑی حد تک تمہارا اندازہ درست ہی ہے۔‘‘

’’ہم دونوں ایسے ہی ساتھیوں کی تلاش میں تھے۔‘‘ لالی نے کہا۔ ’’مگر ہم اپنی جدوجہد کا رخ انگریزوں کے خلاف رکھنا چاہتے ہیں۔ ہم امریکیوں کی طرح جدوجہد چاہتے ہیں۔ کاش یہاں بھی کوئی جارج واشنگٹن ہوتا، کوئی لینن ہوتا۔‘‘

''مگر ہم خالی ہاتھ ہیں۔ ہم کس طرح ایسی جدوجہد شروع کر سکتے ہیں۔'' یہ
کہا تھا۔ میں ابھی یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ ہماری جدوجہد دراصل انگریزوں ہی کے
ہے۔

''یہ ہم بعد میں سوچیں گے۔'' مہندر ناتھ نے کہا تھا۔ ''فی الحال میں کھیتوں
کھلیانوں میں کام کر رہا ہوں۔ میرے ساتھ چند اور ساتھی ہیں۔ لالی بھی ہمارے
ہوتی ہے لیکن نتائج بڑے حوصلہ شکن ہیں۔ صدیوں سے زمینداری اور جاگیر
معاشرے کے جبر میں جکڑے ہوئے مجبور اور بے بس کاشتکار یہ بھی بھول گئے ہیں
انسان ہیں۔ غربت، بھوک، افلاس اور جہالت کو وہ اپنی تقدیر اور زندگی کی ضرورت
ہیں۔''

''تو پھر؟'' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے دل میں کیا ہے اور وہ مجھ
چاہتا ہے؟

''پچھلے چند دنوں سے میں سوچ رہا ہوں کہ اپنی ان کوششوں کو کارخانوں
مزدوروں کی طرف منتقل کر دوں۔ روس کا انقلاب بھی کھیتوں سے نہیں پھوٹا تھا۔ کارخا
کی مشینوں میں ڈھلا تھا۔'' مہندر ناتھ نے کہا۔

''مگر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' میں نے آخر پوچھ ہی لیا۔

''تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے بارے میں ہم دونوں نے......'' لالی
اپنے بھائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کافی گفتگو کی ہے۔ ہم نے سوچا تھا کہ
ہمیں تمہارا تعاون حاصل ہو جائے، اگر ہم اور تم مل جل کر کام کریں تو بہتر نتائج حاصل
سکتے ہیں۔ اتفاق ہے کہ آج ہی تم مہندر ناتھ کو مل گئے۔''

اس کے بعد ہماری گفتگو کا رخ آپس میں تعاون اور مل جل کر کام کرنے کی طرف
گیا مگر میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ میں تنہا اس بارے میں فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس کے
مجھے اپنے گروپ کے قائد سے اجازت لینا ہوگی جو امروہے میں نہیں ہے۔ میں نے
یہ بھی بتایا کہ میرا اور میرے ساتھیوں میں سے کسی کا بھی تعلق امروہے سے نہیں مگر اس
ساتھ ہی میرا ذہن اس تجویز کو قبول کر لینے پر آمادہ تھا کیونکہ ان دونوں بھائی بہنوں کے
سے ہماری اطلاعات کے ذرائع وسیع ہو سکتے تھے۔ وہ ہندو ہونے کی وجہ سے ہندو حلقو
سوچ اور فکر سے ہمیں آگاہ کر سکتے تھے اور ان کے تعاون کی بنا پر ہماری جدوجہد ایک
قومی جدوجہد بن سکتی تھی۔ گو ابھی ہماری تعداد کم تھی لیکن اس میں اضافے کے امکا

تھے۔

''میں جانتا ہوں، تم اب بھی میری طرف سے مطمئن نہیں ہو گے۔'' مہندر نے کہا۔
''اور ایک طرح یہ ٹھیک بھی ہے۔ کسی پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کرنے میں ہی ہم جیسے
لوگوں کی بچت ہے۔ آج رات میں تمہیں اپنی نیک نیتی، خلوص اور وفاداری کا ثبوت دے
دوں گا۔'' اس کے لہجے اور انداز میں قطعیت بھی تھی اور اعتماد بھی۔ ''وہ ثبوت ایسا ہوگا جسے
تم میرے خلاف بھی استعمال کر سکو گے۔''

''نہیں میرے دوست!'' میں نے کہا تھا۔ میں اس کے اندازِ گفتگو سے بے حد متاثر
ہو گیا تھا۔ ''میں تم پر اعتماد کرتا ہوں، مجھے کسی ثبوت کی ضرورت نہیں۔'' اور یہ حقیقت بھی
تھی۔ میں نے مہندر اور اس کی بہن پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ مجھے یقین آ گیا تھا کہ
ان کے دلوں میں کوئی کھوٹ نہیں ہے۔

''وہ ثبوت میں اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے لیے پیش کروں گا۔'' مہندر نے کہا
تھا۔ ''مگر آج مجھے ایک اور کام بھی کرنا ہے۔ سیٹھ جگدیش نے امروہے کے دیہات میں
مسلمانوں کو شدھی کرنے اور ان کا قتل عام کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ یہ منصوبہ تمہاری رات
کی کارروائی کے باوجود قائم ہے۔ اسی ہفتے کسی بھی وقت اس منصوبے کو عملی جامہ پہنا دیا
جائے گا۔ میں آج اپنے طور پر کوشش کروں گا کہ سرکردہ افراد سے مل کر اس آفت کو ٹالنے
کی کوئی صورت نکالوں۔ اس میں میرے لیے کافی مشکلات ہیں۔ انتہا پسند ہندو، مجھے، لالی
کو اور میرے والد کو پسند نہیں کرتے۔ وہ ہمیں کمیونسٹ کہتے ہیں، دھرم کا غدار کہتے ہیں،
مسلمانوں کا وظیفہ خوار کہتے ہیں۔''

''ویسے یہ بات کچھ اچھی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مہندر ناتھ! تمہیں کوشش کرنی
چاہیے کہ تم اس انتہا پسند گروہ کا اعتماد حاصل کر لو۔ یہ بہت ضروری ہے۔ اس طرح تم ان
کے اصل عزائم سے ہر وقت واقف رہو گے۔''

لالی اور مہندر ناتھ نے میری اس تجویز کو پسند کیا تھا۔ مگر سوال یہ تھا کہ ایسا کس طرح
ہو؟ اچانک مہندر ناتھ پُر جوش انداز میں چیخ اٹھا۔ ''وہ مارا! آ گیا سمجھ میں، سنو!''
پھر وہ مجھے تفصیل بتاتا رہا۔ اس نے جو ترکیب سوچی تھی قابلِ عمل تھی جس میں ناکامی
کے امکانات کم تھے۔

''تو پھر، رات کو نو بجے، مرادآبادی دروازے پر مل رہے ہو نا؟''
''یقیناً'' میں نے جواب دیا تھا۔

جب میں وہاں سے چلا تھا تو عجیب سے مخمصے میں مبتلا تھا۔ میں نے مہندر ناتھ
ساتھ اشتراک کا جو فیصلہ کیا تھا، وہ میرا اپنا تھا۔ مہندر سے میں نے جو وعدہ کیا تھا، اسے
ہر قیمت پر پورا کرنا چاہتا تھا۔ سو میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ سالارِ اعظم کو میں اس
بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا لیکن میں نے سالارِ اعظم کو سیٹھ جگدیش کے منصوبے
بارے میں بتانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ سالارِ اعظم سے کہوں گا کہ قاسم
تانگے کو چھوڑ کر میں ہندوؤں کے محلے سے گزرتا ہوا واپس آ رہا تھا تو ایک گلی میں کھڑ
ہوئے چند لوگوں کی باتیں میرے کان میں پڑی تھیں۔‘‘

میں نے ایسا ہی کیا تھا جس کے بعد سالارِ اعظم نے ہادی صاحب کے ہاں
اجتماع کا اہتمام کیا تھا اور یقیناً سالارِ اعظم ہی نے مختلف سرکردہ افراد کو محبانِ وطن کی طر
سے ہماری کارروائیوں کے متعلق پرچے بھی بھجوائے تھے۔

☆======☆======☆

ہادی صاحب کے گھر سے ابھی میں تھوڑی ہی دور آیا تھا کہ عقب سے آواز آ
’’عثمان، عثمان بیٹے!‘‘ آواز ہادی صاحب ہی دے رہے تھے۔ میں پلٹ کر ان کی طر
بڑھا۔ ان کا سانس پھول رہا تھا اور چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ ’’بیٹے! تمہارے
ایک ضروری پیغام ہے۔‘‘ انہوں نے جلدی جلدی اس طرح کہا گویا مجھے کسی قریبی
کے انتقال کی اطلاع دینے والے ہوں۔

’’فرمایئے!‘‘ میں نے کہا۔ ان کی حالت دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ
اچھی خبر نہیں دیں گے۔

’’تمہیں واپس نہیں جانا ہے۔‘‘ انہوں نے کہا۔ ’’اس مسجد میں چلے جاؤ۔ عصر کی
تک تمہیں وہیں ٹھہرنا ہے۔‘‘ ہادی صاحب نے ایک مسجد کی طرف اشارہ کرتے ہو
کہا۔

’’کیوں، کیا بات ہے؟‘‘ میں نے پوچھا تھا۔

’’مجھے اس سے زیادہ کچھ علم نہیں، صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ وہاں جانا خطرے
خالی نہیں ہے۔‘‘

’’کیسا خطرہ؟‘‘

’’مجھے نہیں معلوم، تم مسجد میں جاؤ۔‘‘ ہادی صاحب نے کہا۔ ’’خدا حافظ! اللہ تمہ
حفاظت کرے۔‘‘ انہوں نے مجھے دعا دی اور واپس چلے گئے۔ ان کا انداز ایسا ہی تھا

وہ میرے پاس سے جلد از جلد چلے جانا چاہتے ہوں یا یہ کہ میرے ساتھ دیکھ لیے جانے
سے خود خطرے میں پڑ سکتے ہوں۔ بہر حال یہ طے تھا کہ اس وقت خطرہ میرے گرد منڈلا رہا
تھا مگر میں خطرے کی نوعیت سے آگاہ نہ تھا۔

میں تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مسجد کی طرف بڑھ گیا۔ مؤذن کی آواز گونج رہی تھی۔ میں
نے مسجد میں داخل ہو کر صحنِ مسجد کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ وضو کرنے کے بعد میں مسجد
کے اندرونی حصے میں چلا گیا۔ نمازیوں کی آمد شروع ہوگئی تھی اور وہ آپس میں سرگوشیاں کر
رہے تھے۔ موضوعات مختلف تھے اور ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ سوت کے پل
کی تباہی، قاسم تانگے والے کی لاش، ہندوؤں کے ہاتھوں قاسم تانگے والے کا قتل! (یہ
میرے لیے انکشاف بھی تھا لطیفہ بھی) اس کے ساتھ ہی محبانِ وطن کے تذکرے، گوپی ناتھ
کی بیٹیوں کے اغوا کے ساتھ حسمہ پور کے علم دین کی بہن کی موت کے حوالے بھی دیے
جا رہے تھے۔ میں خاموشی سے یہ باتیں سنتا رہا۔ ان باتوں میں ایک تلخی سی تھی جو سیٹھ
جگدیش کے گھر آنے والے مہمانوں اور ان کے عزائم سے متعلق افواہوں کی وجہ سے
پیدا ہوئی تھی۔ لوگ مشتعل بھی تھے اور غصے میں بھی، پریشان بھی تھے اور مضطرب بھی! میں
خاموشی سے یہ تمام باتیں سنتا رہا۔ ساتھ ہی میری نظر ہر آنے جانے والے کا جائزہ بھی لے
رہی تھی کہ شاید کوئی ایسا شخص بھی آ جائے جو میرے لیے پیغام لایا ہو مگر ایسا نہ ہوا۔ پھر
جماعت کھڑی ہوگئی۔ میں نے باجماعت نماز پڑھی۔ دعا سے فارغ ہوتے ہی لوگ ایک
ایک کر کے مسجد سے نکلنے لگے لیکن اس دوران میں بھی گفتگو کے موضوعات وہی تھے۔

اور پھر میرا انتظار ختم ہوگیا۔ اندلسی ایک شخص کے ساتھ صحن مسجد سے اندر آیا۔ وہ
دونوں ایک نظر جائزہ لے کر میری طرف بڑھے تو میں کھڑا ہوگیا۔ پھر ہم خاموشی کے ساتھ
آگے پیچھے صحن مسجد سے باہر آ گئے۔ باہر ایک بگھی کھڑی تھی۔ اندلسی کے بعد میں بگھی میں
بیٹھا، پھر اجنبی بھی بیٹھ گیا اور بگھی چل پڑی۔ ابھی تک ہم میں کوئی گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ پانچ
منٹ بعد ہمارا یہ سفر تمام ہوا۔ ہماری بگھی ایک بڑی سی حویلی میں پہنچ کر رک گئی تھی۔

پھر اس اجنبی نے ہمیں حویلی کے مہمان خانے میں ٹھہرایا۔ ’’مطلوب کے دوست
میرے لیے میرے بیٹے ہی جیسے ہیں۔‘‘ اجنبی نے کہا۔

میں نے سوالیہ انداز میں اندلسی کی طرف دیکھا۔ ’’بھئی یہ مطلوب کے والد ہیں،
مشہود صاحب!‘‘

’’اوہ! اچھا اچھا، بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر!‘‘ حالانکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ

مطلوب کون تھا۔

کامریڈ اندلسی، اجنبی سے مخاطب ہوا۔ ''مطلوب جتنی تعریف آپ کی کرتا تھا، ہم نے آپ کو اس سے بڑھ کر پایا۔'' کامریڈ اندلسی نے کہا۔ ''اگر شجاعت اس مصیبت میں گرفتار نہ ہوتا تو ہمیں آپ کو زحمت نہ دینا پڑتی۔ بس ہم کل صبح روانہ ہو جائیں گے۔ اس زحمت کے لیے معذرت خواہ ہیں۔''

''ارے نہیں بیٹا بہزاد۔'' مشہود صاحب نے کہا۔ ''یہ بھلا کیا زحمت ہے، تم مطلوب کے دوست ہو، میرے بیٹے ہو، جیسے مطلوب ویسے تم! کیوں جمیل میاں!'' انہوں نے مجھ سے کہا تھا، گویا کامریڈ اندلسی یہاں بہزاد تھا اور میں جمیل!

''جی آپ کی شفقت اور محبت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو اس بات کے حق میں ہی نہیں تھا کہ آپ کو زحمت دی جائے مگر بہزاد نہیں مانا۔ یہ اڑ گیا کہ آئے ہیں تو شجاعت سے مل کر ہی جائیں گے۔'' ویسے میرا خدا جانتا ہے کہ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ شجاعت کون ہے اور کس مصیبت میں گرفتار ہے۔ میں نے کامریڈ غزنوی کے جملے کے سہارے ہی تکے سے یہ بات کہہ دی تھی۔ میری بات کس حد تک موزوں تھی، یہ مجھے معلوم نہ تھا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ مشہود صاحب کچھ مضطرب اور بے چین سے تھے۔ چند باتیں کر کے وہ چلنے لگے۔ ''اچھا بیٹا بہزاد! میں چلتا ہوں۔ مجھے ایک جگہ ضروری کام سے جانا ہے۔ امروہے میں ان دنوں ہندو مسلم کشیدگی بڑھ رہی ہے۔ اسی سلسلے میں ایک میٹنگ ہے۔ تم یہاں اطمینان سے آرام کرو، میں ملازمین کو ہدایت کر جاؤں گا، وہ تمہارا ہر طرح خیال رکھیں گے، بالکل مطلوب کی طرح!''

''یہ تم نے کہاں لا پھنسایا؟'' میں نے کامریڈ اندلسی سے سوال کیا۔

''میں نے جو کچھ کیا ہے، سالارِ اعظم کی ہدایت کے مطابق کیا ہے۔'' کامریڈ اندلسی نے کہا۔ ''امروہے کے حالات اچانک ہی ہمارے لیے بگڑ گئے ہیں۔''

''یعنی اتنے مختصر سے عرصے میں؟'' میں نے کہا۔ ''ہادی صاحب کے ہاں اجلاس سے ڈھائی گھنٹے سے زیادہ کا عرصہ تو نہیں لگا ہوگا۔''

''ہاں۔'' کامریڈ اندلسی نے کہا۔ ''حالات نے اچانک ایسی کروٹ لی ہے کہ سالارِ اعظم کا تمام پلان درہم برہم ہو گیا ہے۔''

''مگر مجھے تو حالات اور آثار یہاں بھی کچھ اچھے نہیں لگتے۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''یہ مشہود صاحب کون ہیں؟ مطلوب کون ہے؟ بہزاد، جمیل اور شجاعت کون ہیں؟ میں

نے جو گفتگو کی ہے وہ صحیح بھی تھی یا نہیں؟''

''مطلوب، مشہود صاحب کا لڑکا ہے، رڑکی میں پڑھتا ہے۔ آج کل دہلی گیا ہوا ہے۔ سالارِ اعظم اسے جانتے ہیں۔ وہ شجاعت کا بھی دوست ہے۔ وہ بھی رڑکی میں پڑھتا تھا۔ بہزاد اور جمیل کی حیثیت سے ہم بھی وہیں پڑھتے ہیں، یوں سمجھو گویا ہم دونوں شجاعت اور مطلوب کے دوست ہیں۔ ہم شجاعت سے ملنے آئے تھے مگر اسے آج پولیس نے گرفتار کر لیا لہٰذا ہمیں مشہود صاحب کے ہاں ٹھہرنے پر مجبور ہونا پڑا کیونکہ شجاعت کے ہاں کوئی مرد نہیں ہے۔''

''مگر اتنے ہیر پھیر کی کیا ضرورت تھی، ہم سیدھے مطلوب ہی کے پاس کیوں نہیں گئے؟''

''صرف حقیقت کا رنگ گہرا کرنے کے لیے۔'' کامریڈ اندلسی نے کہا۔ ''ہم دہلی سے آ رہے ہیں۔ سوت کا پل تباہ ہونے کی خبر سن کر امروہے آئے ہیں۔ مطلوب سے ہماری ملاقات دہلی میں ہوئی تھی۔ یہ تمام باتیں ثابت کرتی ہیں کہ مطلوب ہمارا گہرا دوست ہے۔ کیا سمجھے؟''

''اور اگر میرے منہ سے کوئی غلط سلط بات نکل جاتی تو؟''

''دیکھا جاتا۔'' کامریڈ اندلسی نے کہا۔ ''لیکن مجھے اپنے کمانڈر سے ایسی توقع نہیں تھی۔''

''تو یہ تمام کچھ سالارِ اعظم کی ہدایت پر ہوا ہے۔''

''ہاں۔'' کامریڈ اندلسی نے جواب دیا۔

''مگر مجھے یہاں حالات کچھ اچھے نظر نہیں آ رہے۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم کسی مصیبت میں پھنسنے والے ہیں۔'' میں نے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔

''لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے۔'' اندلسی نے کہا۔ ''مشہود صاحب کا رویہ بڑا پُراسرار رہا ہے۔ وہ کچھ تذبذب اور پریشانی کا شکار معلوم ہوتے ہیں۔ لگتا ہے جیسے وہ ہماری طرف سے مطمئن نہیں ہیں۔''

''میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں۔ ان کا انداز سراسر بناوٹی معلوم ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''مگر سالارِ اعظم کی ہدایت یہی تھی۔'' کامریڈ اندلسی نے بے بسی سے کہا۔

''میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ تم سے غلطی ہوئی ہے۔'' میں نے کامریڈ اندلسی کو جواب

دیا۔ ''میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں بہت چوکنا رہنا چاہیے۔ سالارِ اعظم کے
اندازوں کی غلطی ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ بتاؤ، کچھ سامان بھی تمہارے ساتھ ہے یا نہیں؟''

''نہیں۔''

''تو کیا یہ بات مشہود صاحب کو شک میں مبتلا نہیں کر سکتی کہ دہلی سے آنے وا
دونوں جوان بغیر کسی سامان کے امروہے آئے ہیں۔ نہیں اندلسی مجھے یقین ہے کہ انہیں شُ
ہو گیا ہے۔ یقیناً انہیں شبہ ہو گیا ہے۔ امروہے کے بچے بچے کی زبان پر ان چار اجنبیوں
تذکرہ ہے جن کی پولیس کو تلاش ہے اور جو محبانِ وطن نامی تنظیم سے تعلق رکھتے ہیں۔''

''پھر کیا کیا جائے؟'' اندلسی نے پوچھا۔

''ہوشیار اور چوکنا رہو۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے بتاؤ کہ حالات کے بگڑنے کا احسا
سالارِ اعظم کو کیسے ہوا؟''

اس کے جواب میں اندلسی کے پاس کئی پریشان کن اطلاعات تھیں پہلی خبر یہ تھی کہ
کامریڈ غزنوی کو پولیس نے گرفتار کر لیا تھا۔ دوسری خبر یہ تھی کہ رئیس تانگے والا پولیس کی
حراست میں تھا۔ یہ دوسرا تانگے والا تھا جو ہمیں پہلے روز لالہ گوپی ناتھ کی حویلی سے لے
گیا تھا۔ تیسری خبر یہ تھی کہ سخاوت حسین کے صاحبزادے شجاعت حسین کو بھی پولیس نے
پوچھ گچھ کے لیے روک لیا تھا۔ گرفتاری تو سخاوت حسین ہی کی ہوتی مگر ان دنوں وہ اپنی
زمینوں پر گئے ہوئے تھے۔ ان کی گرفتاری کا سبب یہ تھا کہ جس مکان میں ہم نے شگفتہ اور
کامنی کو رکھا تھا، وہ سخاوت حسین ہی کا تھا۔ ایک پریشان کن خبر یہ تھی کہ پولیس کو قاسم کی
لاش تو مل گئی تھی لیکن اس لاش کے ساتھ منسلک محبانِ وطن کے پیغام کو پولیس نے چھپالیا
تھا، ساتھ ہی یہ افواہ بھی پھیلا دی گئی تھی کہ قاسم کو ہندوؤں نے قتل کیا تھا کیونکہ اس نے گوپی
ناتھ کی لڑکیوں کے اغوا میں حصہ لیا تھا۔ یہ افواہ ہندوؤں کے ایما پر بعض مسلمان لفنگوں اور
غنڈوں نے پھیلائی تھی۔ مقصد صرف اس کا یہ تھا کہ اس بہانے ہندو مسلم منافرت کو ہوا
دے کر مسلمانوں کے اس قتل عام کی راہ ہموار کی جائے جس کا منصوبہ جگدیش کی حویلی
میں بنایا گیا تھا۔ پھر ایک خبر یہ بھی تھی کہ مراد آباد سے پولیس کی بھاری جمعیت امروہے
طلب کر لی گئی ہے، فوج کا بھی ایک دستہ امروہے پہنچ گیا ہے۔ امروہے کی ناک بندی کر
دی گئی ہے اور امروہے سے جانے والی ہر گاڑی، مسافروں اور سواریوں کو چیک کیا جا رہا
ہے۔ یہ بات عام تھی کہ پولیس چار اجنبیوں کی تلاش میں ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ چار اجنبی ہم
ہی ہو سکتے تھے۔

اور ایک دل شکن خبر یہ تھی کہ ہماری کارروائی سے جو ٹرین تباہ ہوئی تھی، انگریز فوجی
جماعت اس میں سفر نہیں کر رہی تھی۔ اس جماعت کی روانگی کا پروگرام آخری وقت میں
تبدیل کر دیا گیا تھا گویا ہماری یہ مہم کامیاب ہونے کے باوجود ناکام ہی رہی تھی۔

آخری خبر یہ تھی کہ اب وہ مکان بھی ہمارے لئے خطرناک ہی سمجھا گیا تھا جہاں ہم
سخاوت حسین صاحب کے گھر سے پولیس چھاپے کے موقع پر فرار ہو گئے تھے۔ اندازہ یہ تھا
کہ رئیس تانگے والے اور کامریڈ غزنوی کی گرفتاری شاید قاسم ہی کی فراہم کردہ اطلاعات
کی بنا پر عمل میں آئی، پھر قاسم اس مکان سے بھی واقف تھا جہاں ہم نے پناہ لی تھی لہٰذا
احتیاطاً اسے بھی خالی کر دیا گیا تھا۔ کامریڈ کوہستانی اور کامریڈ صحرائی کو امروہے کی حدود
سے نکال دیا گیا تھا اور وہ بخیریت اپنی اپنی منزلوں کو روانہ ہو چکے تھے۔

''اور ہمیں آج رات امروہے سے چلا جانا ہے۔'' اندلسی نے بتایا۔ ''یہاں سے
نکلنے کے لیے ہمیں کیا طریقے اختیار کرنے ہیں اس کا فیصلہ تم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اس وقت
تک کے لیے ہم مشہود صاحب کے مہمان رہیں گے۔'' اندلسی نے اپنی بات ختم کی۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ سالارِ اعظم یہاں نہیں ہیں؟'' میں نے سوال کیا۔

''یہ مطلب کیسے نکال لیا آپ نے؟''

''ایسے کہ اب امروہے میں ہماری ان سے ملاقات نہیں ہوگی۔'' میں نے سمجھاتے
ہوئے کہا۔ ''اگر وہ امروہے میں ہوتے تو ملاقات ضرور ہوتی اور اگر ملاقات ہو سکتی تو یقیناً
فرار کے لیے ہمیں اپنے طور پر فیصلے نہ کرنے ہوتے یا یوں کہہ لو کہ اب ہم اپنے ہر عمل میں
خود مختار ہیں۔ ہمیں خود اپنی حفاظت بھی کرنا ہے اور اپنے لیے پناہ بھی تلاش کرنی ہے۔ ان
کی طرف سے ہمارے لیے یہ آخری انتظام تھا۔''

''ہو سکتا ہے۔'' اندلسی نے غیر یقینی انداز میں کہا۔

''ہو نہیں سکتا بلکہ ایسا ہی ہے۔'' میں نے قطعیت سے کہا۔

اس کے بعد کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ میرے ذہن میں مشہود صاحب کا رویہ بُری
طرح کھٹک رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں بڑھتے ہوئے خطروں کی دھمک ہو
رہی تھی، پھر میں نے باہر بگھی چلنے کی آواز سنی میں نے لپک کر کھڑکی سے جھانکا۔ وہی بگھی
جس میں ہم یہاں آئے تھے پھاٹک سے نکل رہی تھی۔

میں کھڑکی سے پلٹا ہی تھا کہ ایک ملازم چاندی کے برتنوں میں چائے لے کر آ گیا۔
ٹرے اس نے میز پر رکھ دی اور کمرے کے باہر برآمدے میں ایک کرسی پر براجمان ہو گیا۔

میں نے کمرے سے نکل کر اس سے دریافت کیا۔ ''مشہود صاحب کہیں گئے ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''کہاں گئے ہیں؟''

''مجھے نہیں معلوم صاحب۔'' ملازم نے جواب دیا۔

''کب تک آئیں گے؟'' میں نے پھر سوال کیا۔

''معلوم نہیں صاحب۔''

''ہم سے تو کہہ رہے تھے ڈاکٹر کے پاس دوا لینے جا رہے ہیں، پندرہ منٹ میں آ جائیں گے۔''

''اوہ، جی ہاں! دوا ہی لینے گئے ہیں۔'' ملازم نے گڑبڑا کر کہا۔ ''بیگم صاحبہ کی طبیعت خراب ہے ناجی۔''

''بیگم صاحبہ کی!'' میں نے کہا۔ ''مگر وہ تو کہہ رہے تھے کہ خود ان کی طبیعت خراب ہے۔''

''جی ہاں۔'' ملازم نے کہا۔ ''ان کی طبیعت بھی خراب ہے۔'' وہ ہکلا کر رہ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ایسا کرو کہ تم ایک گلاس ٹھنڈا پانی لے آؤ۔''

اور ملازم وہاں سے دوڑ لیا۔ شاید وہ میرے مزید سوالات سے بچنا چاہتا تھا۔ اس کے جاتے ہی میں نے اندلسی سے کہا۔ ''اندلسی، فوراً نکل لو۔ ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا ہے۔''

میں اور اندلسی آگے پیچھے کمرے سے نکلے اور تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے پھاٹک سے گزر گئے۔ قسمت ہمارے ساتھ تھی۔ ہمیں کسی نے وہاں سے نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ پھاٹک سے نکلتے ہی ہماری رفتار اور بڑھ گئی تھی۔ حویلی کی چار دیواری کا موڑ گھوم کر ہم ایک نیم پختہ گلی میں آ گئے تھے۔ گلی سنسان تھی۔ ہم تقریباً دوڑتے ہوئے اس گلی میں بڑھتے چلے گئے۔ تھوڑی دور جا کر ہم ایک تنگ گلی میں مڑ چکے تھے۔ شام کی مٹیالی روشنی رفتہ رفتہ مدھم ہوتی جا رہی تھی۔

''اب کہاں کا ارادہ ہے؟'' اندلسی نے پوچھا تھا۔

مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ اب کہاں جانا ہے؟ میرے ذہن میں ہادی صاحب کا نام گونجا تھا مگر پھر میں نے اس خیال کو ترک کر دیا تھا۔ ہادی صاحب نے جس انداز میں مجھے مسجد میں جانے کا پیغام دیا تھا، اس سے ان کی پریشانی تو عیاں تھی ہی لیکن یہ بات بھی

صاف صاف ظاہر تھی کہ وہ جلد از جلد مجھ سے پیچھا چھڑا لینے کے خواہاں تھے۔

''چلے چلو۔'' میں نے اندلسی سے کہا۔

میرے ذہن میں اچانک مہندر کا خیال آیا تھا۔ میرے دل اور ذہن دونوں نے مہندر کے گھر پناہ لینے کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے راستہ بدل دیا۔ اب ہمارا رخ مہندر کے گھر کی طرف تھا۔ رات کی تاریکی کا افقی روشنی کی آخری کرن کو نگل چکا تھا۔ بوندا باندی شروع ہو گئی تھی۔

دس منٹ بعد ہم مہندر ناتھ کے مکان میں تھے۔ دونوں بھائی بہنوں نے ہمارا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا تھا۔ ہماری تمام کہانی سننے کے بعد مہندر ناتھ نے کہا تھا۔

''کامریڈ! تم نے ٹھیک فیصلہ کیا۔ ویسے مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ تم نے مجھ پر ایک دوست کی طرح اعتماد کیا ہے۔''

''مگر اب آپ کے دوسرے دو ساتھی کہاں ہیں؟'' لالی نے پوچھا۔

''وہ دونوں امروہے سے جا چکے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر میں نے مہندر ناتھ سے وعدہ نہ کیا ہوتا تو ہم دونوں بھی جا چکے ہوتے۔''

''میرا خیال ہے تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی معلوم کر کے آتا ہوں، مشہود صاحب کے ہاں سے کہ کیا ہوا تھا۔'' مہندر نے کہا تھا۔ ''کامریڈ اندلسی! تم میرے ساتھ چل رہے ہو۔''

''تو پھر میں؟'' میں نے اٹکتے ہوئے کہا۔

''تم یہیں ٹھہرو۔ لالی بڑی اچھی اور پُرلطف باتیں کرتی ہے، تمہیں کوفت محسوس نہیں ہونے دے گی۔''

''میرا مطلب......'' میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ ''لالی اکیلی ہے۔''

''اکیلی کہاں ہے، تم جو ہو۔'' مہندر ہنسا۔ ''ویسے مجھے تم پر بھی اعتماد ہے اور لالی پر بھی۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تم لڑکیوں سے اتنے ڈرتے ہو تو پھر شکنتلا اور کامنی کو کیسے اغوا کیا تھا۔'' لالی نے شرارت سے کہا۔

''شکنتلا اور کامنی نے جس انداز میں تمہارا ذکر کیا ہے، اس کے بعد کون کافر تم پر اعتماد نہیں کرے گا۔'' مہندر نے کافر کے لفظ پر بطور خاص زور دیا تھا۔

پھر مہندر، اندلسی کے ساتھ چلا گیا۔ جانے سے قبل اس نے اندلسی کو اپنا ایک جوڑا دے دیا تھا۔ یہ لباس پہن کر وہ وضع قطع کے اعتبار سے ہندو ہی معلوم ہوتا تھا۔

لالی واقعی بہت خوبصورت گفتگو کرتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں میری جھجک ختم ہو گئی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ہم دونوں عرصے سے ایک دوسرے کو جانتے تھے اور ایک خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ لالی بڑی اچھی لڑکی تھی۔ اس کا باطن اس کے ظاہر سے زیادہ حسین تھا۔ آج بھی لالی کی یاد میرے ذہن میں خوشبو گھول دیتی ہے۔ اس کا تصور میرے خیالوں میں رنگ ہی رنگ، خوشنما اور دلآویز رنگ بکھیر دیتا ہے۔ کتنی عجیب لڑکی تھی کومل کومل، نازک سی لیکن اس کے سینے میں شیر کا دل تھا۔ وہ مصائب اور شدائد سے ٹکرانے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ اب تک اس کی یاد کا کانٹا میرے دل میں پیوست ہے۔ ایسی صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں، اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں۔

ہم باتیں کرتے رہے، اجنبیت شناسائی میں بدل گئی۔ دوریاں قربتوں میں ڈھل گئیں۔ اس کی قربت کی گرمی، اس کے سانسوں کی مہک اور آنکھوں کے جگنو میرے ارد گرد خوابناک ماحول تعمیر کرتے رہے۔

اب وہ مجھے البم دکھا رہی تھی۔ میں تصویریں دیکھتا رہا۔ اس دوران میں ہماری انگلیاں کئی مرتبہ مس ہوئیں، کئی مرتبہ اس کے لانبے لانبے سیاہ بال میرے چہرے سے ٹکرائے۔ میری رگ رگ میں چنگاریاں سی بھر گئی تھیں۔ میری نسیں کھنچنے لگی تھیں اور خون کی گردش تیز ہو گئی تھی۔ میرے چہرے سے لو سی اٹھنے لگی تھی اور دماغ پر خواب آور نشہ سا چھا گیا تھا۔

’’یہ دیکھو کامریڈ سعدی!‘‘ اس نے کہا۔ ’’مجھے یہ تصویر بہت پسند ہے۔ یہ میری سب سے اچھی سہیلی نے اتاری ہے۔‘‘

لالی اس تصویر میں ایک درخت کی ٹہنی پکڑے کھڑی تھی۔ تیز ہوا کے سبب ساڑھی اس کے شانوں، اس کے پیٹ اور سینے سے بالکل چپکی ہوئی تھی۔ درختوں کے پس منظر میں اس کا جسم گلاب کی مانند تھا اور چہرہ کھلے ہوئے تر و تازہ گلاب کی مانند! میں اس تصویر کو دیکھتا رہا اس کے حسن کو ذہن میں پینٹ کرتا رہا۔

’’کیوں کامریڈ؟‘‘ مجھے لالی کی آواز کہیں دور سے آتی سنائی دی۔ ’’کہاں کھو گئے؟‘‘

’’خوابوں میں۔‘‘ میں نے آہستگی سے کہا۔

اس کی آنکھوں میں ستارے جھلملا اٹھے۔ ’’میرا مذاق اڑا رہے ہو؟‘‘

’’میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا لالی!‘‘ میں نے کہا تھا۔ ’’اس وقت میں دنیا کی

سب سے اچھی بات سوچ رہا ہوں۔‘‘

’’مجھے بتاؤ کامریڈ!‘‘ لالی نے کہا۔ ’’کیا سوچ رہے ہو؟‘‘

’’بُرا مان جاؤ گی۔‘‘ میں نے کہا تھا۔

اس نے بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اس کے گالوں کا گلال گہرا ہو گیا تھا، آنکھیں بھیگ سی گئی تھیں اور ان کی چمک مزید تیز ہو گئی تھی۔ ’’کیسی باتیں کرتے ہو کامریڈ! میں تمہاری کسی بات کا بُرا نہیں مان سکتی۔‘‘ اس کے لہجے میں لرزش مجھے اچھی لگی تھی۔ اس کے گرم سانس میری پیشانی کو چوم گئے تھے۔ تیز تنفس سے اس کا سینہ مرتعش تھا۔

میں خاموش ہو گیا تھا۔ ’’بولو سعدی! چپ کیوں ہو؟‘‘ لالی نے بوجھل سے لہجے میں کہا۔ ’’سچ سچ بتاؤ کیا سوچ رہے ہو؟‘‘

’’ہمت نہیں ہے لالی!‘‘ میرا لہجہ لکنت آمیز تھا۔ ’’ہم دونوں بہت دور ہیں۔ اتنی دوری سے آدمی چیخ کر تو دوسرے کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے، سرگوشی سے نہیں اور میں جو بات کہنا چاہتا ہوں، وہ سرگوشی میں ہی اچھی لگتی ہے۔‘‘

’’ہائے سعدی جی! دور کہاں ہیں، اتنے قریب تو ہیں ہم!‘‘ اس نے کہا۔ ’’لو میں اور پاس آئے جاتی ہوں۔‘‘ وہ مجھ سے سے چپک کر بیٹھ گئی۔

’’میں جو بات کہنا چاہتا ہوں، نہیں کہہ سکتا۔ تم ناراض ہو جاؤ گی اور تمہاری ناراضگی مجھے پسند نہیں۔‘‘

اس نے اپنا سر میرے شانے سے ٹکا دیا۔ ’’سعدی جی! بعض باتیں اَن کہی ہی اچھی لگتی ہیں پھر بھی آدمی انہیں اپنے کان سے سننا پسند کرتا ہے۔ میں بھی یہی چاہتی ہوں۔‘‘

’’تو تم سمجھ گئیں۔‘‘ میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

’’ہوں۔‘‘ اس نے کہا۔ اس کی انگلیاں میرے دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں پھنس گئی تھیں۔

پھر ہم بڑی دیر تک اسی کیفیت میں بیٹھے رہے۔ اچانک وہ جھرجھری لے کر الگ ہو گئی۔ میں نے اسے دیکھا۔ وہ ذرا الگ ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

’’ناراض ہو گئیں؟‘‘

اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ’’تم میرے بھگوان ہو۔ کوئی پجارن اپنے بھگوان سے ناراض نہیں ہو سکتی۔‘‘

’’نہیں لالی! مجھے یہ درجہ مت دو، تم میری دیوی ہو‘‘ میں نے اسے کھینچ کر اپنے

سینے سے لگالیا۔ کیسا سرور تھا، کیسا نشہ تھا۔ ہم دونوں ہی دھواں دھواں ہو رہے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں بہت دور نکل جاتا، میں نے کپکپا کر اسے الگ

''لالی، لالی! مجھے برا نہ کہنا۔ نہ معلوم مجھے کیا ہو گیا تھا۔''

اس نے اپنی لرزتی ہوئی مخروطی انگلیاں میرے ہونٹوں پر رکھ دیں۔ ''بُری نہیں۔'' اس نے کہا۔ ''میں تمہیں کیوں بُرا سمجھوں گی۔ تم بُرے ہو تو شاید میں بھی ہوں۔''

''نہیں لالی! تم بہت اچھی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے مجھے وہ خوشی دی ہے سے میں ناآشنا تھا۔''

''میرے دیوتا، میرے دیوتا!'' اس کے ہونٹ لرزے اور وہ پھر میرے سینے لگ گئی۔ کچھ دیر یونہی گزر گئی۔ ''اب تم چلے جاؤ گے اور میں جلتی رہوں گی۔''

''میں بھی تمہیں کبھی نہیں بھلا نہیں سکوں گا۔'' میں نے کہا۔

وہ میرے سینے سے الگ ہو گئی پھر اس نے البم سے اپنی گلاب ایسی تصویر نکا مجھے دے دی۔ ''یہ تصویر تمہیں میری یاد دلاتی رہے گی۔''

میں نے اس تصویر کو اپنے ہونٹوں سے لگالیا۔ وہ ایک بڑا سا کاغذ لے کر آئی۔ میں نے اس کاغذ میں لپیٹی اور اپنی قمیض کی جیب میں رکھ لی۔ ''شکریہ۔'' میں نے ''پانی پلاؤ گی؟''

وہ پانی لے آئی۔

''پہلے تم پانی پیو۔'' میں نے اس سے کہا۔

''کیوں؟'' یہ کہہ اس نے گلاس سے تھوڑا سا پانی پی لیا اور گلاس میری طرف دیا۔

میں نے بڑی احتیاط سے گلاس لیا اور ٹھیک اس جگہ اپنے ہونٹ رکھے جہاں اس نے پانی پیا تھا اور پانی غٹاغٹ چڑھا لیا، پھر گلاس میز پر رکھ کر سر صوفے کی پشت سر ٹکا دیا۔ اس کا چہرہ میرے چہرے پر جھک آیا، میں نے دونوں ہاتھ اس کی گردن ڈال دیے۔

''اب ہم نہ جانے کب ملیں گے، مل بھی سکیں گے یا نہیں۔'' اس نے کہا۔ اس کا مزید قریب آ گیا۔

''میں تم سے ملنے پھر آؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''مجھے یہی امید ہے۔'' اس کی انگلیاں میرے ہونٹوں پر لرز رہی تھیں۔ ''اس پہلی ملاقات کی یاد کے طور پر!'' اس نے کہا اور پھر اس کے ہونٹوں نے میری آنکھوں کو چوم لیا۔

اس کے بعد ہم ہوش میں آ گئے تھے۔ لالی سے اس ملاقات کی یاد آج بھی میرے ذہن میں پھلجھڑیاں سی چھوڑ جاتی ہے۔ آج میں سوچتا ہوں تو وہ سب ایک ناممکن واقعہ محسوس ہوتا ہے جس کا کوئی شخص شاید خواب میں بھی تصور نہیں کر سکتا۔ شاید ہم دونوں نے ایک ہی لمحے میں ایک دوسرے کو پسند کر لیا تھا۔ شاید ہم دونوں کی بے قراری کا سبب صرف یہ تھا کہ ہمیں مستقبل میں زندگی کے کسی مرحلے پر پھر ملاقات کا یقین نہ تھا۔ شاید جذبات کی اسی شدت اور حالات کی بے یقینی کے سبب ہی ہم دونوں نے اپنی محبت کے کئی مرحلے اور کئی چھلانگیں اسی پہلی ملاقات میں مکمل کر لی تھیں۔

''میں ہمیشہ تمہارا انتظار کروں گی۔'' لالی نے کہا تھا۔

''اور میں بھی۔'' میں نے کہا۔ ہم نے اپنے اس عہد پر بوسے کی مہر ثبت کی تھی۔

اس لذت اس سرور اور سرمستی کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ مگر آج یہ سب ایک خواب ہے۔ لالی آج وہاں ہے جہاں اپنے جسدِ خاکی سمیت اس سے نہیں مل سکتا۔

جس وقت مہندر اور اندلسی واپس آئے ہم دونوں البم دیکھ رہے تھے۔ میں نے البم سے مہندر کی بھی ایک تصویر لے لی تھی، ساتھ ہی لالی سے ان کے گھر کا پتا بھی لے لیا تھا اور لالی سے وعدہ کیا تھا کہ گھر واپس جا کر سب سے پہلا کام یہی کروں گا کہ اپنی چند تصویریں اسے بھیج دوں گا۔

''تو تصویریں دیکھی جا رہی ہیں۔'' مہندر نے کھلے البم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لالی! اپنی وہ تصویر بھی دکھائی جو رجنی نے کھینچی تھی؟''

''ہاں۔'' لالی نے کہا۔ ''اور کامریڈ نے وہ تصویر لے بھی لی ہے۔''

''بہت اچھی تصویر ہے۔'' مہندر نے کہا۔ ''اب تمہیں رجنی سے وہ تصویر منگانی پڑے گی۔''

''منگوالوں گی۔'' لالی نے کہا۔

''اندلسی کو بھی دکھاؤ۔'' مہندر نے کہا۔ ''میں نے جیب سے لالی اور مہندر کی تصویریں نکال کر اندلسی کی طرف بڑھا دیں۔

مہندر اور اندلسی کی رپورٹ کے مطابق، مشہود صاحب کے گھر سے فرار ہونے کا منصوبہ صحیح ہی تھا۔ مہندر ناتھ اندلسی کو لے کر پولیس تھانے ہی گیا تھا اور وہاں اسے پتا چلا تھا

کہ سہنا، مشہود صاحب کے ساتھ ہی ان کے گھر گیا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد سہنا وا
آ گیا تھا۔ اس نے مجھے اور اندلسی کو بہت گالیاں دی تھیں۔

اس کے بعد ہم سب اس مہم کی تفصیلات طے کرنے لگے تھے جو مہندر ناتھ کے
میں تھی اور جس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مہندر ناتھ نے رات نو بجے مجھے مرا
دروازے پر بلایا تھا۔

ہمارا پہلا شکار سہنا تھا، اس کے بعد بدری ناتھ، بھگوان داس رام پرشاد او
موہن۔

☆======☆======☆

سہنا دو کانسٹیبلوں سمیت مہندر کے گھر آیا تھا۔ اس وقت میں اور اندلسی ایک ک
میں چھپے ہوئے تھے۔

پروگرام کے مطابق مہندر نے واپس جا کر سہنا کو اطلاع دی تھی کہ اس کی بہن
اغوا کر لیا گیا ہے۔ اغوا کرنے والے محبانِ وطن ہی ہیں۔ محبانِ وطن کے الفاظ
انگریزی اخبار کی سرخیوں کے الفاظ سے کاٹ کر ایک کاغذ پر چپکا کر لکھے تھے۔ ظاہر
اس رپورٹ کے بعد سہنا کو آنا ہی تھا۔ لالی اس وقت باغ میں تھی۔ احتیاطاً ہم نے
ایک درخت سے باندھ دیا تھا اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔

''اور کوئی چیز تو غائب نہیں ہے؟'' سہنا نے مہندر سے پوچھا تھا۔

''بظاہر کوئی چیز غائب نہیں ہے۔'' مہندر نے کہا۔ ''بس لالی غائب ہے۔''

پھر وہ دونوں کانسٹیبلوں کو وہیں بیٹھنے کی ہدایت دے کر مہندر کے ساتھ ا
کمرے میں آ گیا۔ وہ لالی کا کمرہ دیکھنا چاہتا تھا جس میں ہم نے بے ترتیبی پھیلا کر
دینا چاہا تھا کہ لالی نے اغوا کے موقع پر خاصی جدوجہد کی تھی۔

آگے آگے مہندر تھا۔ پہلے وہ کمرے میں داخل ہوا، اس کے پیچھے سہنا، اس کے
میں بندوق ہاتھ میں لیے داخل ہوا۔ میرے پیچھے اندلسی تھا۔

اس وقت ہمارے جسم پر سیاہ پتلونیں اور سیاہ قمیصیں تھیں۔ یہ لباس ہمیں مہند
ہی فراہم کیے تھے۔ ہمارے پیروں میں کرمچ کے جوتے تھے اور چہروں پر سیاہ نقابیں
تھیں۔ ''ہاتھ اٹھا دو، شور نہ مچانا ورنہ......'' میں نے بے حد خونخوار لہجے میں اپنا جملہ
چھوڑ دیا تھا۔

دونوں چونک کر پلٹے تھے، پھر مہندر نے ہاتھ اٹھا دیے تھے، ساتھ ہی سہنا

ہاتھ اٹھا دیے۔ اندلسی نے پیچھے جا کر بندوق کے بٹ کا بھرپور ہاتھ سہنا کے سر کے پچھلے
حصے میں مارا تھا اور وہ بغیر آواز نکالے لڑکھڑایا۔ مہندر نے اسے سنبھال لیا اور آہستگی سے
فرش پر لٹا دیا پھر اس نے جلدی سے سہنا کے ہولسٹر سے پستول نکال دیا۔

''اب؟'' میں نے کہا۔

''ترپاٹھی!'' مہندر نے آواز لگائی۔ اس نے سہنا کی آواز کی نقل اتاری تھی۔

''یس سر آیا۔'' ترپاٹھی کی آواز آئی۔ ترپاٹھی کا بھی وہی حشر ہوا اور اس کے بعد
دوسرے کانسٹیبل، ورما کو بے بس کر دینا کوئی مشکل نہ تھا۔ جس وقت ہم اسے لالی کے
کمرے میں لائے تھے تو سہنا اور ترپاٹھی کے ساتھ ہم نے مہندر کے ہاتھ پیر بھی باندھ کر
زمین پر ڈال دیا تھا۔ اس کا مقصد صرف یہی تھا کہ اگلے روز جب وہ بیان دے تو مہندر کی
کیفیت بھی بتائے اور یہ ثابت ہو سکے کہ مہندر کا محبانِ وطن سے کوئی تعلق نہ تھا۔

پھر ہم نے ان تینوں کو بیہوشی کی حالت میں اٹھا کر باغ میں تین مختلف درختوں سے
باندھ دیا۔ ان تینوں کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیے گئے تھے تاکہ ہوش میں آنے کے بعد وہ
شور نہ مچا سکیں۔ ساتھ ہی ہم نے ان کی آنکھوں پر پٹیاں بھی باندھ دیں مگر اس سے قبل
دونوں کانسٹیبلوں کی وردیاں ہم نے اتار لی تھیں کیونکہ اس مہم کا اگلا حصہ انہی وردیوں کے
سہارے تکمیل کو پہنچنا تھا۔

مہم کا یہ حصہ بنیادی طور پر مہندر اور اندلسی کو انجام دینا تھا۔

انہوں نے کانسٹیبلوں کی وردیاں پہن لی تھیں۔ اب وہ سہنا کی بگھی میں بدری ناتھ،
بھگوان داس، رام پرشاد اور جگ موہن کے گھروں کا چکر لگانا چاہتے تھے۔ ان سب کے
مکانات قریب ہی تھے۔ مہندر ناتھ کو صرف بگھی چلانا تھی۔ اسے پوری مہم کے دوران میں
بس کوچوان کی سیٹ پر بیٹھے رہنا تھا، باقی کام اندلسی کو انجام دینا تھا۔ یہ کام میں بھی کر سکتا تھا
لیکن شاید مہندر ناتھ میرے سوا کسی اور پر بھروسا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ لالی کے پاس کسی اور
کو نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

اندلسی کا کام اتنا تھا کہ وہ ان لوگوں کے پاس جائے جو ہمارے ہدف تھے اور ان
کے نام مہندر ناتھ کا پرچہ دکھائے جس کا مضمون ہم سب نے اس مہم کے آغاز سے قبل ہی
تیار کر لیا تھا۔ یہ دو خط تیار کیے گئے تھے۔ ایک خط بدری ناتھ اور بھگوان داس کے نام
مشترک تھا، دوسرا بھگوان داس اور رام پرشاد کے نام۔ دونوں کا مضمون ایک ہی تھا۔

چاچا! میں یہ خط بہت جلدی میں لکھ رہا ہوں۔ لالی کو انہی لوگوں نے

اغوا کر لیا ہے جنہوں نے شکنتلا اور کامنی کو اغوا کیا تھا۔ انہوں نے لالی کی رہائی کے لیے دس ہزار روپے کا مطالبہ کیا ہے۔ چھ ہزار میرے پاس تھے جو میں دے چکا ہوں۔ اگر آپ دو دو ہزار روپے دے دیں تو لالی رہا ہو جائے گی۔ انہوں نے ایک گھنٹے کا وقت دیا ہے۔ انہیں رقم نہ ملی تو وہ لالی کو قتل کر دیں گے۔ آپ یہ رقم لے کر میرے گھر آ جائیں۔ سہنا جی یہیں موجود ہیں۔ امید ہے آپ مایوس نہیں کریں گے۔ پتا جی کے واپس آتے ہی میں یہ رقم آپ کو دلا دوں گا۔

پہلے پھیرے میں بدری ناتھ اور بھگوان داس آئے۔ مہندر ناتھ کو چوان کی ... ہی بیٹھا رہا جبکہ اندلسی انہیں لے کر اندر آیا اور ہم نے انہیں دھر لیا۔ بندوقیں اور ... دیکھتے ہی ان کی سٹی گم ہو گئی۔ ایک ایک کر کے ان کے ہاتھ پیر باندھے گئے اور ان ... میں کپڑا ٹھونس دیا گیا۔ ان کی یہ درگت لالی کے کمرے میں بنائی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ... کی آنکھوں پر پٹی بھی باندھ دی گئی تھی۔

اگلے پھیرے میں صرف رام پرشاد آیا تھا کیونکہ اسی کو اندلسی نے بتایا تھا کہ ... موہن دن ہی میں مراد آباد جا چکا تھا لیکن وہ جگ موہن کے حصے کی رقم بھی دینے پر آ... گیا تھا اور اپنے ساتھ چار ہزار روپے کی رقم لے کر آیا تھا۔ رام پرشاد کا حشر بھی وہی ... اس کے پہلے دونوں ساتھیوں کا ہوا تھا۔ ان سے ہمیں آٹھ ہزار روپے کی رقم مل گئی تھی۔ مہندر ناتھ اپنے خلوص کا ثبوت دینے کا وعدہ پورا کر چکا تھا۔

اس کارروائی سے فارغ ہو کر ہم چاروں، یعنی میں، اندلسی، مہندر ناتھ اور ... بیٹھک میں آ گئے۔ مہندر وہ تمام رقم ہمیں دینا چاہتا تھا لیکن میں نے سختی سے انکار کر ...

آخر اندلسی نے تجویز پیش کی کہ اس مہم میں ہم چاروں شریک تھے لہٰذا ہر ایک کو دو دو ... روپے ملنے چاہئیں۔ اس پر لالی نے کہا۔ ''اس طرح رقم کی تقسیم کا مطلب تو یہ ہوا کہ گ... نے ڈاکا مارا ہے۔''

''پھر کیا کیا جائے؟'' مہندر نے زچ ہو کر پوچھا۔

''ایسا کرو۔'' لالی نے کہا۔ ''کامریڈ سعدی! چار ہزار روپے تم اپنے پاس رکھ... چار ہزار مہندر اپنے پاس رکھے گا۔ ہم یہ رقم یہاں کسی اناتھ آشرم کو دے دیں گے ... کامریڈ، کسی یتیم خانے کو دے دینا۔''

''یہ ٹھیک ہے۔'' مجھے لالی کی یہ تجویز بہت پسند آئی تھی۔

اب ہمیں رخصت ہونا تھا لیکن روانگی سے قبل مہندر نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ اگر آئندہ ہم کسی ایسی ہی مہم پر نکلیں تو اسے بھی ضرور اپنے ساتھ لیں گے۔ اس کے لیے طے ہوا تھا کہ جب بھی ایسا موقع آیا میں اسے شنکر کے نام سے یہ اطلاع دوں گا کہ ہم شکار پر جا رہے ہیں اور جس تاریخ کو اسے پہنچنے کے لیے کہا جائے، اس دن وہ مراد آباد پہنچ کر مسافر خانے میں قیام کرے گا۔

چلتے وقت مہندر ناتھ نے ہمیں نہایت گرمجوشی سے سینے لگایا تھا۔ ہم چاروں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ لالی نے اندلسی کی طرف ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا تھا۔ اس کے بعد اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں جانتا تھا کہ لالی نے اندلسی سے ہاتھ ملا کر دراصل مجھ سے ہاتھ ملانے کا موقع نکالا تھا۔ اس کا نرم و گداز ہاتھ، میرے ہاتھ میں تھا۔ اس کی گرفت بہت معنی خیز تھی۔ اس میں محبت اور چاہت کی گرمی تھی۔

یہاں میں پھر یہ بتانا بھول گیا کہ اس دوران میں جبکہ مہندر اور اندلسی، بدری ناتھ، بھگوان داس اور رام پرشاد کو لینے گئے تھے تو ہم دونوں کو اپنی محبت مزید مستحکم کرنے کے چند لمحے اور میسر آ گئے تھے۔ جدائی کے لمحات جوں جوں قریب آ رہے تھے ہماری بے قراریاں بڑھتی جا رہی تھیں اور ان بے قراریوں کو ہم نے اپنے گرم، خشک اور پیارے ہونٹوں سے سکون دینا چاہا تھا مگر ہر مرتبہ ہمارے اضطراب، بے قراری اور بے کلی میں اضافہ ہی ہو جاتا تھا۔ جب مہندر اور اندلسی، رام پرشاد کو لینے گئے تھے تو ایک مرحلہ ایسا آیا تھا کہ ہم بڑی دیر تک ایک دوسرے کو دیوانوں کی طرح چومتے رہے تھے۔ بس یہی خواہش تھی کہ کسی طرح ہونٹوں کے لمس کے توسط سے ہم ایک دوسرے کے وجود میں تحلیل ہو جائیں۔

''میرے دیوتا، میرے دیوتا!'' آخر لالی رو پڑی تھی۔ ''میں کیا کروں؟ میں کیا کروں گی!'' اس نے میرے دونوں ہاتھوں کو اپنے سینے سے لگا رکھا تھا اور انہیں بے تحاشا چوم رہی تھی۔ اس کا سینہ تنفس کی تیز رفتاری سے دھونکنی بنا ہوا تھا۔

''میری دیوی، میری دیوی!'' میں نے اس کے جسم پر بوسے دیتے ہوئے کہا۔ ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔ جدائی ہماری قسمت بن چکی تھی۔

''مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے؟'' لالی نے کہا۔

''تم میری زندگی کا سب سے حسین حادثہ ہو، سب سے خوبصورت دریافت ہو۔ تمہاری یاد سے میری راتیں مہکتی رہیں گی۔'' میں نے کہا تھا۔

"میں کتنی خوش قسمت ہوں، میں کتنی بدنصیب ہوں۔" اس نے کہا تھا۔

میں خاموش رہا۔ میں کہہ بھی کیا سکتا تھا۔

پھر ہم وہاں سے رخصت ہو گئے لیکن رخصت ہونے سے قبل ہم نے مہندرا بھی درختوں سے باندھ دیا اور ان کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیے۔

☆======☆======☆

مراد آباد پہنچ کر میری اور اندلسی کی راہیں الگ الگ ہو گئیں۔ میں نے ایک آباد میں قیام کیا۔

تیسرے دن میں لکھنؤ پہنچ گیا، اپنے شہر!

امی مجھے دیکھ کر لپٹ ہی تو گئی تھیں۔ زیب نے مجھے تانگے سے اترتے دیکھ دیا تھا۔ "بھیا آ گئے، بھیا آ گئے۔"

امی اس کی آواز سن کر ہانپتی کانپتی ڈیوڑھی میں آ گئی تھیں۔ جب میں تانگے کرایہ دے کر اندر پہنچا تو وہ مجھ سے لپٹ گئیں۔ "ارے تو ٹھیک تو ہے، کہاں تھا تو کی آواز میں رقت تھی، آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ اس طرح لرز رہی تھی تیز ہوا میں نازک سا پودا۔

"خیریت تو ہے امی؟" میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے؟" میں انہیں سہارا اندر لے آیا۔

"یہاں دل پر قیامتیں ٹوٹ گئیں۔" امی بولیں۔

"ہوا کیا امی؟" میں نے انہیں پلنگ پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں مراد آباد تھا۔ آپ کو بتا کر ہی گیا تھا۔"

"ارے یہ تو مجھے بھی معلوم ہے۔" انہوں نے میرے چہرے کو دونوں ہاتھ لے کر کہا۔ ننھی زیب میری گود میں آ بیٹھی تھی۔

"معلوم ہے بھیا!" زیب نے کہا۔ "ابا اتنے پریشان ہیں، اتنے پریشان اس نے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

"بات کیا ہے امی؟" میں نے پھر کہا۔ "آخر کچھ پتا تو چلے کہ اس پریشانی کیا ہے؟"

"تیرے ابا کل ہی شملے سے آئے تھے۔" امی نے کہا۔ "انہیں کسی نے خبر دی امروہے میں ہے اور پولیس تیری تلاش میں ہے۔"

"پولیس میری تلاش میں ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں، کس لئے؟"

"ارے میں کیا جانوں؟" امی نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔ "تیرے ابا نے بھی کوئی بات پوری طرح بتائی بھی ہے۔ کہہ رہے تھے تم نے آفاق کو تباہ کر دیا ہے۔ تبھی اسے ہتھکڑیاں پہناؤ گی۔"

"مگر امی! میں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔" میں نے امی کو یقین دلایا۔ "میں امروہے گیا ضرور تھا۔ وہاں سوت ندی کا پل ٹوٹ گیا ہے نا!" میں نے کہا۔ "سوچا، میں بھی دیکھ آؤں، مراد آباد سے ہے ہی کتنی دور! امی پوری گاڑی ندی میں جا گری تھی، صرف دو ڈبے بچے تھے۔"

"ہوگا، ہوگا، تو آ گیا، میرے لیے یہی کافی ہے۔" امی نے کہا۔ "چل کپڑے بدل، منہ ہاتھ دھو۔"

"ابا جان کہاں ہیں؟"

"تیرے لیے ہی پریشان ہیں۔" امی نے کہا۔ "اسی چکر میں کہیں گئے ہیں۔"

نہا دھو کر، کھانا کھا کر، میں اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ ابا جان ابھی تک نہیں آئے تھے۔ میں نے آنکھیں بند کیں تو لالی کا چہرہ میرے تصور میں چکرانے لگا۔ لالی جو میری طوفانی زندگی کے آغاز میں مجھے ایک خوش رنگ بلبلے کی مانند ملی تھی اور چند گھنٹوں کی رفاقت میں میرے لیے زندگی کا سب سے حسین خواب بن گئی تھی۔ ایسا خواب جس کا شرمندۂ تعبیر ہونا میری سب سے بڑی خواہش تھی لیکن میں اس سے قبل اپنی زندگی کے لیے جو راہ اختیار کر چکا تھا، وہ ایک عظیم تر مقصد کی طرف جانے والی راہ تھی۔ اس راہ میں آسائشیں نہیں تھیں، مشکلات تھیں مگر خوابوں کا کوئی گزر نہ تھا، صرف سنگین اور بے ہنگم حقیقتوں کے پتھر تھے جن سے اپنا سر پھوڑنا تھا۔ اس راہ میں سکون نہیں تھا۔ صرف تلاطم اور طوفان تھے۔

میں اس راہ کو نہیں چھوڑ سکتا تھا لیکن ساتھ ہی لالی کے خیال کو ذہن سے کھرچ ڈالنا بھی میرے لیے ناممکن تھا۔ اس دن مجھے احساس ہوا تھا کہ محبت کتنی بڑی قوت ہوتی ہے، محبت میں کتنی زبردست کشش ہوتی ہے جو نہ مذاہب کے اختلافات کو خاطر میں لاتی ہے نہ اجنبیت کی پروا کرتی ہے۔ محبت، جذبات کا ایسا سیل ہوتی ہے جس میں تمام مصلحتیں بہہ جاتی ہیں۔ محبت، ہیجان کا ایسا آتش فشاں ہوتا ہے جس میں زندگی کے تمام مقررہ اور متعینہ معیار اور اقدار پگھل جاتے ہیں۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ کئی دن کی بے
کے بعد مجھے گھر کا سکون اور چین میسر آیا تھا۔ مجھے خوب گہری نیند آئی اور اس نیند نے
خوابوں میں آ کر اور حسین بنا دیا۔

زیب نے مجھے جھنجھوڑ کر جگایا تھا۔ ''بھیا! اٹھیے مغرب کی اذان ہو رہی ہے۔''

''ابا جان آ گئے؟'' میں نے اس سے پوچھا تھا۔

''آ گئے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''انہوں نے ہی تو کہا تھا جگانے کے لیے۔''

میں منہ ہاتھ دھو کر ابا جان کے کمرے میں گیا۔ میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کتاب بند کر کے ایک طرف رکھ دی اور آنکھوں سے چشمہ اتارا۔ ''آؤ آفاق ادھر آ کر بیٹھو۔''

یہ کسی طوفان کی آمد کا پیش خیمہ تھا۔ جب کبھی وہ غصے میں ہوتے تھے، اپنا غصہ مطالعے پر اتارتے تھے۔ وہ کوئی نہ کوئی کتاب لے کر بیٹھ جاتے تھے ورنہ عام طور پر ان کے مطالعے کا وقت عشاء کی نماز کے بعد تھا۔ اس کے علاوہ دن کے کسی بھی حصے میں، اگر ان کے ہاتھ میں کوئی کتاب ہوتی تو گھر والوں کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوتا کہ اس وقت وہ سخت طیش کے عالم میں ہیں اور اپنا غصہ پی جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر وہ شخص ان کے سامنے آ جاتا جس پر انہیں غصہ ہوتا تو اس کی شامت ہی آ جاتی۔

میں اس شامت کے استقبال کے لیے جل تو جلال تو کا وظیفہ پڑھتے ہوئے ان کے قریب ہی ایک مونڈھے پر بیٹھ گیا۔

ابا جان نے دو تین مرتبہ حقے کے لمبے لمبے کش لگائے اور پھر مجھ سے کہا۔ ''تو آ گئے آفاق صاحب آپ! کہاں کہاں کی سیر کی؟''

''مراد آباد گیا تھا اور امروہے۔'' میں نے کہا۔

''امروہے!'' وہ پھٹ پڑے۔ ''امروہے!'' ان کی خان بہادری جاگ گئی تھی۔ ''کیا لینے گئے تھے امروہے؟''

''جی وہ سوت کا پل......''

''کیا ہو گیا سوت کے پل کو؟''

''ٹوٹ گیا تھا، اسے دیکھنے گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اسے دیکھنے گیا تھا یا ڈاکے مارنے اور گوپی ناتھ کی لڑکیوں کو اغوا کرنے؟''

''جی کیا کہہ رہے ہیں آپ؟'' میں حیرانی کے سبب کچھ نہ کہہ سکا۔

''تو آپ نے انجمن محبانِ وطن بنا ڈالی ہے۔'' خان بہادری جلال پورے جوش پر آ چکا تھا۔

''ابا جان!'' میں نے کہا۔ ''آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے۔''

''جھوٹ مت بولو!'' خان بہادر شیرازی شیر کی طرح دہاڑے۔ ''مجھے سب کچھ معلوم ہے۔''

''آپ کو جو کچھ معلوم ہوا ہے غلط معلوم ہوا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے بتائیے آپ کو یہ سب کچھ کس نے بتایا ہے؟''

''تمہارا کیا خیال ہے، یہ خان بہادری مجھے یونہی دے دی گئی ہے!''

''میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ حکومتِ انگلشیہ صرف وفاداروں کو ایسے خطابات سے نوازتی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اپنا لہجہ درست کرو آفاق!'' خان بہادر شیرازی نے بڑے طنطنے سے کہا۔ ''تم اپنے باپ سے گفتگو کر رہے ہو۔ حبِ وطن کے نام پر تمہیں ڈکیتیاں کرتے اور لڑکیوں کو اغوا کرتے شرم نہیں آئی۔''

''آپ مجھ پر الزام لگائے جا رہے ہیں ابا جان!'' میں نے کہا۔ ''مجھے بتائیے کہ آپ کو یہ سب کچھ کس نے بتایا ہے؟''

''بتا دوں گا۔'' خان بہادر صاحب نے کچھ نرم پڑتے ہوئے کہا۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ جو جو کچھ میں نے کہا، سچ کہا ہے؟''

''آپ نے کچھ سچ کہا ہے، کچھ غلط کہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''سچ حکومتِ برطانیہ اور ہندوؤں کے نقطۂ نظر سے کہا ہے اور غلط اس بنا پر کہ آپ نصف حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔''

''موٹے موٹے الفاظ اور اصطلاحات سے تمہارے جرائم کی سنگینی کم نہیں ہو سکتی۔'' خان بہادر شیرازی نے خالص افسرانہ شان سے کہا۔

''میں نے کوئی جرم نہیں کیا ابا جان!'' میں نے کہا۔ ''مجھ پر اغوا اور ڈکیتی کے الزامات نہ لگائیے۔ اگر آپ ہندوستانی ہیں اور مسلمان ہیں اور تمام حالات سے واقف ہیں تو مجھ پر یہ گھناؤنے الزام نہ لگائیے۔ اگر میں نے کوئی جرم کیا ہے تو اس کی نوعیت وہی ہے جو ماضی میں سلطان ٹیپو اور سراج الدولہ سے سرزد ہوئے ہیں۔ حال ہی میں جو غازی

مصطفےٰ کمال پاشا ترکی میں کر رہے ہیں۔ اگر آپ مولانا محمد علی جوہر اور گاندھی پر اغوا
ڈکیتی کے الزام لگا سکتے ہیں تو پھر مجھ پر بھی لگائیے۔'' میں جوش میں کہتا ہی چلا گیا۔

''اپنے جرائم کا اتنی بڑی اور عظیم ہستیوں کے کارناموں سے موازنہ مت کرو آفاق
تم تاریخ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔''

''جی ہاں میں کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔'' میں نے دکھ سے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ میں
کوئی حیثیت نہیں رکھتا لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ ان عظیم آدمیوں کو عظیم بنانے میں مجھ
جیسے ہی حقیر اور گمنام آدمیوں کا ہاتھ ہوتا ہے۔ غازی مصطفےٰ کمال پاشا آج ایک مینارۂ نور
بن گیا ہے۔ وہ مینارۂ نور کا روشن چراغ ہے مگر مجھ جیسے لوگ اس مینارۂ نور میں پتھروں کی
مانند چنے گئے ہیں۔''

''آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' خان بہادر صاحب نے کہا۔ ''کیا تم نے گوپی ناتھ کی
بیٹیوں کو اغوا نہیں کیا، اس کے ہاں ڈاکا نہیں مارا؟''

''جوان لڑکیوں کو اغوا کرنے کا مقصد ان کی عزت لوٹنا ہوتا ہے۔ ڈکیتی کا مقصد دوسرا
کی دولت ذاتی تصرف میں لانا ہوتا ہے ابا جان!'' میں نے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ میں
نے یہ گناہ نہیں کیے۔''

''اخلاقی تاویلات سے کام نہیں بنتا آفاق!'' ابا جان نے کہا۔ ''قانون اخلاقیات
سے بحث نہیں کرتا۔ قانون کی نظر میں لڑکیوں کو ان کی مرضی کے بغیر اٹھا لے جانا، کسی
دوسرے کی تجوری طاقت کے بل پر خالی کر کے لے جانا اغوا اور ڈکیتی ہی ہیں۔'' ابا جان
کے لہجے کی درشتی قدرے ختم ہو گئی تھی۔

''میں اس قانون ہی کو نہیں مانتا جو مولانا محمد علی جوہر کی جدوجہد کو جرم اور موجودہ
حکومت کی سخت گیریوں کو جائز قرار دیتا ہے۔''

''تم مباحثہ اچھا کر لیتے ہو آفاق!'' ابا جان نے کہا۔ ''مگر مجھے تمہاری ان حرکتوں
سے بہت دکھ پہنچا ہے۔''

''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے کوئی غلط حرکت نہیں کی۔'' میں نے ایک
ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

شاید میرا لہجہ کچھ کڑوا تھا کہ ابا جان کی خان بہادری پھر جاگ گئی۔ ''تم نے لڑکیوں
کو اغوا کیا، اسے تم غلط حرکت نہیں کہتے، تم نے گوپی ناتھ کی تجوری لوٹی اسے بُرا نہیں
کہتے!''

اس مرتبہ مجھے بھی کچھ غصہ آ گیا۔ میں بہر حال ان کا بیٹا تھا۔ میری رگوں میں انہی کا
خون گردش کر رہا تھا۔ ''گوپی ناتھ کے جرائم ایسے تھے کہ اسے اس سے زیادہ سزا ملنی چاہیے
تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اس نے حسمہ پور کے کسان علم دین کی بہن کو اغوا کیا تھا۔ ایک
مسلمان لڑکی کو اغوا کیا تھا، پھر اس پر دست درازی کی کوشش بھی کی تھی۔ اس عفت مآب
لڑکی نے کنویں میں کود کر جان دے دی تو گوپی ناتھ نے ایک غنڈے سے اس کی لاش
ٹھکانے لگوا دی۔ ابا جان علم دین سے پوچھیے اس کے دل پر کیا بیت رہی ہو گی۔ گوپی ناتھ کی
لڑکیوں کو اگر اغوا کیا گیا تھا تو محض اس لیے کہ گوپی ناتھ کو پتا چل سکے کہ علم دین پر اپنی بہن
کے اغوا سے کیا بیتی ہو گی۔ گوپی ناتھ کو تو اس کی بیٹیاں اسی طرح مل گئیں۔ ان کی طرف کسی
نے بری آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ پھر گوپی ناتھ نے امروہے کے سرکردہ ہندوؤں سے مل
کر مسلمانوں کو قتل کرنے اور انہیں شدھی کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس کے لیے اس نے
امروہے کے ہندوؤں سے رقم بٹوری تھی اس لیے اس کی تجوری خالی کر دی گئی۔ اب وہ
دولت اس سے بہتر کام پر صرف ہو گی۔'' میں ایک لمحے کے لیے رکا۔ ''یقین جانیے ابا
جان! میں نے اس میں سے ایک پائی بھی نہیں لی۔''

''اور یہ محبانِ وطن کیا چیز ہے؟'' ابا جان نے نرم پڑتے ہوئے کہا۔

''محبانِ وطن کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ ایک فرضی نام ہے اور اسے صرف اس لیے
استعمال کیا گیا تھا کہ امروہے کے سرکردہ ہوشمند افراد کو یہ سمجھایا جا سکے کہ بعض، تنگ دل اور
جنونی افراد، امروہے کی پُرسکون زندگی کو کس طرح متلاطم کر دینا چاہتے ہیں۔''

''مگر تمہیں اتنے ساتھی کیسے مل گئے؟ تمہاری کارروائیوں سے تو پتا چلتا ہے کہ تم نے
جو کچھ کیا تھا، طے شدہ منصوبے کے تحت کیا تھا۔'' ابا جان نے پوچھا۔

''ہم چار ساتھی سیر کے لیے امروہے گئے تھے۔ راستے میں علم دین سے ملاقات ہو
گئی۔ پھر جو کچھ ہوا اس میں تائید ایزدی شامل حال رہی۔''

''تم اب بھی مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔'' ابا جان نے کہا۔ ''بہر حال مجھے تمہاری یہ
روش پسند نہیں ہے۔ تمہیں پتا نہیں، جب سے مجھے یہ علم ہوا ہے کہ تم امروہے میں ہو اور
پولیس تمہاری تلاش میں ہے، میری کیا حالت تھی، تمہاری ماں کی کیا حالت تھی۔''

''مگر آپ کو یہ کیسے علم ہوا کہ پولیس میری تلاش میں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جہاں تک میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔''

''جس شخص نے مجھے یہ اطلاع دی کہ تم نے امروہے میں ہادی کے گھر ایک اجلاس

میں الہ آباد کانفرنس کے مندوب کی حیثیت سے شرکت کی تھی، اسی نے مجھے امروہے میں پیش آنے والے واقعات کی تفصیل بھی بتائی تھی، ساتھ ہی یہ بھی بتایا تھا کہ پولیس ایک ایسے شخص کی تلاش میں ہے جس کی سیدھے ہاتھ کی کلائی کے پیچھے پر سرخ پدم ہے۔ سرخ پدم کے حوالے کے بعد مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ پولیس کو تمہاری تلاش ہے، کامریڈ سعدی کی حیثیت سے!'' ابا جان خاموش ہو گئے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد بولے۔ ''بہر حال جو کچھ ہوا سو ہوا۔ میں اب تمہاری یہ خرافات مزید برداشت نہیں کروں گا، سمجھے!''

''مگر ابا جان!'' میں نے نہایت مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ ''آپ یہی مشورہ کیا مولانا جوہر اور گاندھی جی کو نہیں دے سکتے؟''

''زبان مت چلاؤ۔'' ابا جان نے کہا۔ ''آئندہ تم ان خرافات میں حصہ نہیں لوگے۔ چلے ہیں بڑے محبِ وطن بننے! جاؤ۔''

انہوں نے چشمہ پھر آنکھوں پر لگا لیا اور کتاب کو اٹھا کر الماری میں رکھ دیا۔ ان کا غصہ ختم ہو چکا تھا۔ میں کمرے سے نکل آیا۔

اگلی صبح میرے لیے نئی پریشانیاں لے کر آئی۔ رات کو شاید ابا جان اور امی جان کی اس مسئلے پر گفتگو ہوئی تھی اور ابا جان نے امی کو خاصا ہولا کر رکھ دیا تھا۔ ناشتے پر امی نے دھماکا کیا۔ ''آفاق اب میں تیری شادی ہی کر کے چھوڑوں گی۔''

''جی!'' میں نے حیرانی سے کہا۔ ''شادی، میری؟''

''ہاں ہاں تیری شادی!'' امی نے کہا۔ ''اب مجھ سے تیرے باپ کی باتیں نہیں سنی جاتیں۔''

''مگر میں شادی نہیں کروں گا۔''

''کیا کہا؟'' امی نے کہا۔ ''شادی نہیں کرے گا۔ آوارہ گردی کرتا پھرے گا!''

''میں آوارہ گردی نہیں کرتا۔'' میں نے کہا۔ ''میں شادی نہیں کروں گا۔''

''کرے گا کیسے نہیں!'' امی نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''ماں باپ کی پریشانی تو تجھے کچھ لگتی ہی نہیں۔ اپنے بیوی بچے ہوں گے تو ان کا ہی خیال آئے گا، یوں جان کو ہتھیلی پر تو نہیں لیے پھرے گا۔ میری جان تو سولی پر نہیں لٹکی رہے گی، ٹھکانے سے تو لگ جائے گا۔''

''میں آپ سے کہے دیتا ہوں امی جان......'' میں نے کہا۔ ''شادی نہیں کروں گا، ہرگز نہیں کروں گا! آپ نے زیادہ مجبور کیا تو میں گھر چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔''

''کیا کہا تو نے؟'' امی نے کہا۔ ''گھر چھوڑ کے چلا جائے گا!''

''ہاں امی!'' میں نے کہا۔

''دیکھوں گی کیسے چھوڑ کر جائے گا!'' امی نے کہا۔

بات اس وقت ختم ہو گئی لیکن میں اپنی امی کے مزاج سے خوب واقف تھا۔ وہ جو کچھ سوچ لیتی تھیں کر گزرتی تھیں۔ بعض معاملات میں تو ابا جان بھی ان کی ضد کے سامنے مجبور ہو جاتے تھے حالانکہ امی جان ان سے بہت ڈرتی تھیں اور یہ معاملہ بھی ایسا ہی تھا جس میں ابا جان کوئی مداخلت نہیں کر سکتے تھے۔ پھر اس کے لیے تو خود انہوں نے ہی راہ ہموار کی تھی۔ ابا جان نے رات انہیں یقیناً میری سرگرمیوں کو بڑھا چڑھا کر دہلا دیا ہو گا اور انہوں نے میری سلامتی کا یہی طریقہ سوچا تھا۔

اس نئی پریشانی اور الجھن سے نمٹنا میرے لیے خاصا مشکل تھا۔ کامریڈ سعدی کو اس مرحلے پر یقیناً پسینے آ گئے تھے۔

اب صبح شام امی کی زبان پر بس ایک ہی تذکرہ تھا۔ وہ روزانہ کسی عزیز رشتے دار کی لڑکی کا تذکرہ لے بیٹھتیں۔ فلاں کیسی ہے؟ فلاں مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔ فلاں میں یہ خوبی ہے، فلاں میں وہ خوبی ہے اور میں ہر لڑکی میں کوئی نہ کوئی کیڑے نکال دیتا۔ وہ ہنستی ایسے ہے، روتی ایسے ہے، ناک اس طرح سکوڑتی ہے، آنکھیں اس طرح مچکاتی ہے، چلتی یوں ہے۔ اس کی آواز پھٹا بانس ہے، کھانا پکانا نہیں جانتی۔

''اب تیرے لیے آسمان سے حور تو ٹپکے گی نہیں۔'' تنگ آ کر ایک دن امی نے مجھ سے کہا تھا۔

''حور کی تلاش میں تو آپ ہیں امی جان۔'' میں نے کہا تھا۔ ''مجھے تو صرف ایک گھڑ لڑکی کی ضرورت ہے۔''

''تو کیا تو سمجھتا ہے میں تیرے لیے پھوہڑ لڑکی لاؤں گی۔'' انہوں نے جل کر کہا تھا۔

''ایک بات بتاؤں امی جان!'' میں نے ان کے گلے میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

''بتا!'' امی نے کہا تھا۔

''ابا جان کو نہ بتائیے گا ابھی۔'' میں نے کہا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ آج میں اس قصے کو ختم ہی کر دوں گا۔

''نہیں بتاؤں گی۔'' امی جان نے کہا۔

"میں نے آپ کے لیے بہو تلاش کر لی ہے۔ آپ دیکھیں گی تو پھڑک اٹھیں گ
میں نے کہا۔

"کون ہے؟ کہاں ہے؟ خاندان کیسا ہے؟" انہوں نے اشتیاق میں پے د
سوالات کر ڈالے۔

"جب وقت آئے گا تو بتا دوں گا۔" میں نے کہا۔ "بس آپ ذرا انتظار کر لیں

"ٹھیک ہے۔" امی نے کہا تھا۔ "مجھے بتا لڑکی کہاں ہے؟ میں اس کے گھر وا
سے ملتی ہوں، لڑکی کو بھی دیکھ لوں گی، بات بھی پکی کر لوں گی۔"

"بات پکی سمجھو۔" میں نے امی سے کہا تھا۔ "آپ سے ملوا بھی دوں گا۔ آج کل
اپنے ماں باپ کے ساتھ باہر گئی ہوئی ہے۔" میں نے بات ٹالنے کو کہا۔

"دیکھ آفاق! مجھے ٹال مت۔" امی شاید میرا مقصد سمجھ گئی تھیں۔ "بس ایک مہین
دے رہی ہوں تجھے۔"

☆======☆======☆

امروہے سے آئے ہوئے مجھے ساتواں دن تھا۔ لکھنؤ پہنچنے کے دوسرے ہی دن
نے مہندر ناتھ کے پتے پر اپنی تصویر بھیج دی تھی اور تاکیداً اسے لکھ دیا تھا کہ اس تصو
احتیاط سے رکھے، شکنتلا، کامنی یا لالہ گوپی ناتھ کی نظر اس پر نہ پڑے۔ تصویر کے ساتھ
نے مہندر اور لالی کے نام خط بھی لکھے تھے اور اب میں اپنے اس خط کے جواب کا منتظر
پھر تین دن قبل میں نے چار ہزار روپے ایک اناتھ آشرم میں چندے دے کر اس کی رسی
بھیج دی تھی حالانکہ طے یہ ہوا تھا کہ میں چار ہزار کی رقم کسی یتیم خانے کو دوں گا مگر میں
سوچا تھا کہ اس رقم پر اناتھ آشرم کا حق ہے کیونکہ یہ رقم ہندوؤں سے حاصل کی گئی تھی۔

اس دن میرا انتظار ختم ہو گیا۔ میں نے ڈاکیے سے اپنے نام رجسٹری وصول کی۔
پر مہندر کا نام دیکھ کر ہی میرے دل میں مسرتوں کا تلاطم آ گیا۔ مہندر اور لالی، دونوں ہی
مجھے خط لکھے تھے۔ مختصر سے خط تھے لیکن لالی نے اپنے مختصر سے خط کے بین السطور
بہت کچھ کہا تھا۔

"آپ کے ساتھ جو یادگار لمحات گزرے ہیں، وہ میرے جیون کا سب سے
سرمایہ ہیں۔" اور ان الفاظ میں، میں نے لالی کو اپنے چہرے پر جھک کر دیکھا تھا۔ "آپ
باتیں رہ رہ کر یاد آتی ہیں۔" لالی نے لکھا تھا۔ "چند گھنٹوں کا وہ ساتھ کون، کافر
سکتا ہے۔ اس مختصر سی ملاقات میں ہم نے ایک بہترین دوست پایا ہے اور مجھے یقین

وقت کے ساتھ ساتھ یہ دوستی زیادہ مضبوط ہوتی جائے گی۔" ان الفاظ میں لالی نے شاید اس پیمان کی طرف اشارہ کیا تھا جو ہم نے رام پرشاد کے آنے سے قبل کیے تھے۔

"کیسی عجیب رات تھی وہ، مانو طوفان آ گیا ہو اور میں اس طوفان میں گھر گئی ہوں۔ اب پھر دل چاہتا ہے کہ کوئی ایسی ہی مہم پھر سامنے ہو اور ہم سب اس مہم میں شریک ہوں۔"

میں نے اپنے چہرے پر لالی کے گرم گرم سانسوں کی حدت، اس کے نفس کی خوشبو اور اپنے ہونٹوں پر پھول سے ناچتے محسوس کیے۔

میں نے کئی مرتبہ اس خط کو پڑھا، کئی مرتبہ اسے چوما، اس کے بعد مہندر کا خط پڑھا۔ اس میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ اس خط کے ساتھ ایک رسید بھی تھی۔ مہندر نے چار ہزار روپے کی رقم ایک یتیم خانے کو چندے کے طور پر دی تھی۔ اس رسید پر وہی تاریخ تھی جس تاریخ کو میں نے لکھنؤ کے ایک اناتھ آشرم میں رقم چندہ دی تھی۔ کیا عجیب اتفاق تھا۔ ہم لوگوں کے سوچنے کے انداز میں کتنی یکسانیت تھی۔

دن گزرتے رہے۔ یہ جولائی کا آخری ہفتہ تھا۔ ایک دن مجھے بندو حلوائی سے پیغام ملا۔ "سالار صاحب یہ خط آپ کے نام دے گئے ہیں۔" اس نے ایک بند لفافہ میری طرف بڑھایا۔

سالارِ اعظم کی طرف سے پیغامات مجھے بندو حلوائی کے توسط سے ہی ملا کرتے تھے۔ یہ پیغامات بہت مختصر ہوتے تھے۔ میں وہ لفافہ لے کر آگے بڑھ گیا۔ لفافہ چاک کر کے پرچہ نکالا، پیغام تھا۔ "امین پارک میں ملو۔ دس۔"

رات کو دس بجے امین پارک میں ملنے کا مطلب یہی تھا کہ امین پارک کے ایک مخصوص گوشے میں سالارِ اعظم میرے منتظر ہوں گے۔ وقت کے اختلاف کے ساتھ مجھے سالارِ اعظم سے امین پارک کے مختلف گوشوں میں ملنا ہوتا تھا اور ملاقات کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ اب پھر کوئی مہم درپیش تھی۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ شاید ایک مرتبہ پھر مجھے مہندر ناتھ اور لالی سے ملاقات کا موقع ہاتھ آنے والا تھا۔ پیغام کا یہی پہلو میرے لیے زیادہ خوش کن تھا۔

حسب ہدایت میں رات کو سالارِ اعظم سے ملا۔ اس موقع پر سالار نے مجھے امروہے کی مہم میں کامیابی پر شاباش دی، مشہود صاحب کے ہاں سے فرار کے فیصلے کو سراہا اور موقع محل کے تقاضوں کے مطابق فیصلے کرنے کی تعریف کی۔ پھر مہندر ناتھ کے گھر پیش آنے والے واقعات پر قیاس آرائی کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بھی تمہاری ہی حرکت معلوم ہوتی

ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم نے مہندر ناتھ سے مل کر وہ سب ڈراما کیا تھا۔"

میں نے جب اثبات میں جواب دیا تو سالارِ اعظم نے برہمی کا اظہار کیا۔ "
ایک بات گرہ میں باندھ لو۔ اپنی سرگرمیاں صرف اپنی مہم کی حد تک محدود رکھو! تمہیں ان
ہو جانا چاہیے کہ امروہہ مہم میں محض گوپی ناتھ کے خلاف اپنے طور پر کارروائی کر کے تم
پوری تنظیم کو کتنے خطرات میں ڈال دیا تھا! ہمیں بہت نقصان اٹھانا پڑا ہے۔"

"کامریڈ غزنوی اور رئیس تانگے والے کا کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"دونوں چھوٹ گئے ہیں۔ واردات کے وقت اور دن بھر کامریڈ غزنوی
موجودگی دوسری جگہ ثابت ہوگئی جبکہ رئیس اور قاسم دونوں میں پرانی دشمنی تھی لہٰذا یہ مؤ
اختیار کیا گیا تھا کہ قاسم نے رئیس کا نام محض دشمنی کی بنا پر لیا تھا۔" سالارِ اعظم نے بتا
"اور تمہاری کوششوں کا مثبت نتیجہ یہ نکلا ہے کہ امروہے پر سے وہ بلا ٹل گئی ہے جس کی تیا
سیٹھ جگدیش نے کی تھی۔"

یہ تمام باتیں میرے لیے اطمینان کا سبب تھیں۔ "اور اب ......" سالارِ اعظم
کہا۔ "مجھے بتاؤ کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے؟" میں سوچتا رہا لیکن میری سمجھ میں
نہیں آیا۔ "سنو، اگلے مہینے پرنس آف ویلز ہندوستان کے دورے پر آ رہا ہے۔ وہ
اترے گا۔ تمہیں یکم اگست تک بمبئی پہنچنا ہے، تیار ہو؟"

"ہر وقت تیار ہوں جناب!" میں نے کہا۔

"مگر تمہارے گھر تو تمہاری شادی کے چرچے ہیں۔" سالارِ اعظم نے کہا۔

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔ "میری والدہ کی ضد ہے۔"

"پھر تمہارے کیا ارادے ہیں؟"

"میں ہندوستان کی آزادی تک، شادی نہیں کروں گا۔" میں نے عزم کے سا
کہا۔

"شاباش!" سالارِ اعظم نے کہا۔ "تم نے لیلیٰ آزادی کو اپنی دلہن بنایا ہے۔ سمجھو
تمہاری شادی ہوگئی ہے۔ بہرحال اس وقت صرف یہی اطلاع دینی تھی بمبئی جانے کے
تیار رہو۔ باقی ہدایات بعد میں ملیں گی۔ اچھا خدا حافظ!"

پھر میں وہاں سے چلا آیا تھا۔

میں نے اگلے دن ہی مہندر کو اطلاع دے دی تھی کہ ہم دوستوں نے بمبئی کی
پروگرام بنایا ہے۔ وہ چلنا چاہے تو تیار رہے۔ قطعی پروگرام کی بعد میں اسے اطلاع

چار دن بعد سالارِ اعظم سے میری پھر ملاقات ہوئی۔ مجھے چار دن بعد بمبئی روانہ ہونا
تھا۔ روانگی سے ایک دن پہلے مجھے سالارِ اعظم کی طرف سے آخری اور قطعی ہدایات ملنا
تھیں۔

میری قسمت دیکھیے کہ اگلے دن ہی ابا جان کے نام بمبئی سے ان کے ایک دوست کا
خط آیا۔ ان کے لڑکے کی شادی تھی اور انہوں نے ابا جان کو بمبئی آنے اور ان کے لڑکے کی
شادی میں شرکت کرنے پر زور دیا تھا۔ وہ ابا جان کے لنگوٹیے یار تھے مگر ابا جان کئی دن پہلے
ہی شملہ جانے کا پروگرام بنا چکے تھے، سو، قرعۂ فال میرے نام نکلا۔ اندھا کیا چاہے، دو
آنکھیں! میں بخوشی راضی ہوگیا۔ یہ ایک پنتھ دو کاج والا معاملہ تھا۔ اسی دن میں نے مہندر
کو بذریعہ تار پیغام بھیجا۔ "شکار کا پروگرام طے ہوگیا ہے۔ 2 اگست کو مراد آباد پہنچو، شنکر۔"

امی کو اس موقع پر ایک مرتبہ پھر اپنے بیٹے کی شادی یاد آ گئی۔ انہوں نے پھر ہنگامہ
شروع کر دیا مگر اب فی الحال تو یہ بات ٹل ہی گئی تھی۔ میں ان کی پریشانی پر ہنستا ہی رہا۔

مجھے اگلے ہی دن بمبئی کے سفر سے متعلق مزید اطلاعات ملی تھیں۔ اطلاعات یا
ہدایات یہ تھیں کہ بمبئی ہی میں مجھ سے میرے باقی کامریڈ آ ملیں گے۔ میں نے اس پر
سالارِ اعظم سے کہا تھا، بہتر ہوگا کہ اس مہم میں بھی میرے ساتھ وہی رفیق ہوں جنہوں نے
امروہہ مہم میں میرے ساتھ کام کیا تھا۔ اس پر مجھے جواب دیا گیا تھا کہ کس مہم میں کون شخص
زیادہ مفید اور کارآمد ہوگا، اس کا فیصلہ کرنا سالارِ اعظم کی ذمے داری ہے۔

بہرحال مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس مہم میں کون میرے ساتھ ہوگا لیکن مجھے اس کی
زیادہ پروا بھی نہیں تھی۔ پھر سالارِ اعظم نے مجھے ہدایت دی تھی کہ بمبئی میں مجھے حاجی
اسماعیل کے مسافر خانے میں ٹھہرنا ہے۔ میرے باقی ساتھی وہیں مجھ سے ملیں گے۔ ساتھ
ہی سالارِ اعظم نے سختی سے مجھے ہدایت کی تھی کہ بمبئی میں میری سرگرمیاں صرف اس مہم تک
محدود رہنی چاہئیں جو میرے سپرد کی گئی تھی۔ میری اس مہم کا آغاز 19 اگست کو ہونا تھا۔ مجھے
پہنچنے سے قبل اس لیے بمبئی بھیجا جا رہا تھا کہ میں بمبئی کے گلی کوچوں سے واقف ہو جاؤں،
اپنی مہم کے لیے فضا سازگار کروں اور وہاں کے لوگوں سے تعلقات قائم کروں۔

سالارِ اعظم نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ میں بمبئی میں اس قسم کی امداد اور تعاون کی
توقع نہ کروں جو امروہے میں بعض مواقع پر مجھے فراہم کی گئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔ "میں
دو دن بعد ہی صوبہ سرحد روانہ ہو رہا ہوں۔ وہاں مجھے بعض ساتھیوں نے یقین دلایا ہے کہ وہ

مجھے ضروری اسلحہ دلا دیں گے۔ تم لوگوں نے گوپی ناتھ کے ہاں سے جو دولت حا
وہ اسی اسلحہ کی خریداری پر خرچ ہوگی۔''

''گویا آپ اس موقع پر بمبئی میں نہیں ہوں گے۔'' میں نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ میں نے یہ بات بہت واضح طور پر بتا دی ہے۔'' سالارِ
کہا۔

میں خاموش ہو گیا۔ ظاہر ہے میرا سوال محض حماقت ہی تھا۔

''اور سنو، یہ لو!'' سالارِ اعظم نے مجھے ایک بند لفافہ دیا۔ ''یہ لفافہ تمہیں عمر
پہنچانا ہے۔''

''عمر سوبانی!'' میں نے حیرانی سے کہا۔ ''وہی عمر سوبانی جو بمبئی کے تاجر ہیں
کھول کر چندہ دیتے ہیں؟''

''ہاں وہی۔'' سالارِ اعظم نے کہا۔ ''تم بمبئی پہنچتے ہی یہ خط انہیں پہنچا دینا۔
کے بعد تمہاری ان سے ملاقات مہم کی تکمیل کے بعد ہوگی۔''

''آپ نے مجھے ابھی تک اس مہم کی نوعیت نہیں بتائی۔'' میں نے کہا۔

''اب میں وہی تمہیں بتانے جا رہا ہوں۔ 19 اگست کو پرنس آف ویلز جہاز
پہنچ رہا ہے۔ وہ اس کے بعد پورے ہندوستان کا دورہ کرے گا۔ آل انڈیا کانگر
لیگ اور خلافت کمیٹی نے پرنس آف ویلز کے اس دورے کا مقاطعہ کرنے کا فیصلہ
یہ مہم اس مقاطعے کا آغاز ہوگی۔''

''کیا اس سلسلے میں آپ نے کانگریس، لیگ اور خلافت کمیٹی سے گفتگو کی ہے

''سنو آفاق!'' سالارِ اعظم نے کہا۔ ''ہمارا کسی سیاسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں
کمیٹی سے ہمارا کوئی رابطہ نہیں۔ ہمارا ان کا راستہ الگ ہے۔ ہماری تنظیم ان سے
نہیں رکھنا چاہتی۔'' سالارِ اعظم نے کہا۔ ''اس وقت ہندوستان میں ہندو مسلم
بڑے چرچے ہیں مگر یہ اتحاد مصنوعی ہے۔ یہ اتحاد سیاسی مصلحتوں کی بنا پر وجود میں
جلد یا بدیر اسے ٹوٹنا ہے۔ ہر چند کہ کانگریس ہندوستان کی سب سے بڑی پارٹی
بنیادی مزاج ہندو ذہنیت ہی کا عکاس ہے۔ چند دنوں کی بات ہے اس کا یہ مزاج
سامنے آ جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ کانگریس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہند
اکثریتی آبادی کے عفریت کو اس حد تک مضبوط کر دیا جائے کہ وہ ہندوستان کی
ہڑپ کر لے۔ مسلم لیگ ابھی تک ایک شیر خوار تنظیم ہے جو نوابوں اور جاگیر

آغوش میں پرورش پا رہی ہے۔ خلافت کمیٹی کا وجود آج نہیں تو کل بے معنی ہو جائے گا۔
تاریخ کے حالات کا اونٹ جب بھی کسی کروٹ بیٹھا، حالات کی کف بر دوش لہروں پر پیدا
ہونے والا یہ بلبلہ پھوٹ کر رہ جائے گا۔'' سالارِ اعظم خاموش ہو گیا۔

''پھر، ہمیں کیا کرنا ہے؟''

''میں نے تمہیں بتایا نا کہ ہندوستان کی ان بڑی جماعتوں نے پرنس آف ویلز کے
دورۂ ہند کے مقاطعے کا فیصلہ کیا ہے۔ ہم اس مقاطعے کو عملی شکل دیں گے۔ پورے ہندوستان
میں ہم اس موقع پر ہنگامے برپا کر دینا چاہتے ہیں۔''

''اور اس کا آغاز بمبئی سے ہوگا؟''

''ہاں! تمہیں بمبئی میں پرنس آف ویلز کی آمد کے موقع پر زبردست مظاہرے کا
اہتمام کرنا ہے، ایسا مظاہرہ جس سے ہندوستان دہل اٹھے۔''

اس کے بعد امین پارک میں ایک گمبھیر سناٹا پھیل گیا۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا

☆======☆======☆

امین آباد پارک سے واپسی پر میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔

میرے تصور میں بھی یہ بات نہیں آ سکتی تھی کہ سالارِ اعظم اس نوعیت کی مہم میرے
سپرد کر دیں گے۔ سوت ندی کے پل کی تباہی ایک مختلف بات تھی۔ وہاں ایک متعینہ ہدف
تھا اور میں یہ جانتا تھا کہ اس مہم میں مجھے کتنے ساتھیوں کی مدد حاصل ہے لیکن پرنس آف
ویلز کی آمد کے موقع پر بمبئی میں ایک مظاہرے کا اہتمام کرنا قطعی مختلف بات تھی۔ اس مہم
میں جو ہدف مقرر کیا گیا تھا، اس کا تعلق سراسر انسانی نفسیات سے تھا۔ اس قسم کے مظاہروں
سے قبل لوگوں کے جذبات کو محبت اور نفرت کی آگ پر انگیخت کرنا ضروری تھا۔ انہیں ایک
بڑے مقصد کی روشنی دکھا کر، آس دلا کر جوش میں لانا ضروری تھا تاکہ وہ جذبات کا ایک
ایسا کھولتا ہوا لاوا بن جائیں جو زمین کے تمام طبقات توڑتا ہوا ابل پڑتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے
کہ اس وقت ہندوستان میں چلنے والی مختلف تحریکوں کے سبب اس مقصد کے لیے فضا ساز
گار ہو چکی تھی، لوگوں میں برطانوی حکومت کے خلاف اشتعال تھا مگر اس اشتعال، اس
نفرت اور اس آگ کو ایک مخصوص رخ پر موڑنے کے لیے ضروری تھا کہ وہ شخص جو یہ کام
کرے، وہ وہاں کے لوگوں میں جانا پہچانا ہو۔ لوگ اس پر اعتماد کرتے ہوں۔ یہ کام بمبئی
کا کوئی شخص جتنی آسانی سے کر سکتا تھا، میں نہیں کر سکتا تھا۔ بمبئی ہر اعتبار سے میرے لیے

ایک اجنبی اور انجانا شہر تھا۔ میں وہاں کے گلی کوچوں سے ہی واقف نہ تھا بلکہ
لوگوں سے بھی ناواقف تھا، ان کے مزاج اور نفسیات سے ناآشنا تھا۔
میں نے اس بارے میں سالارِ اعظم سے کہا بھی تھا تو انہوں نے جواب
''انگریزی کی ایک مثل ہے، اسے یاد رکھو۔ وہیر دیر ازاے ول دیر ازے وے
اگر تمہارا عزم راسخ ہے تو اس کی تکمیل کی راہیں خود بخود کھل جاتی ہیں۔''
اس جواب پر میں اس وقت خاموش ہو گیا۔ ظاہر ہے خاموش ہی ہونا تھا
کے جواب میں اگر کچھ کہتا تو مطلب یہی ہوتا کہ میرا عزم متزلزل ہے جبکہ حقیقت
میں پوری دیانتداری اور خلوصِ عزم کے ساتھ اس مہم کو تکمیل تک پہنچانا چاہتا تھا۔ اس
جبکہ میں امین آباد پارک سے واپس آ رہا تھا، میرا ذہن مسلسل اسی ادھیڑبن میں مصر
کہ بمبئی میں اس مہم کی تکمیل کے لیے مجھے کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ وہاں کے
میں، اس مختصر سے عرصے میں کس طرح گھل مل جانے کی سبیل پیدا کرنی چاہیے۔
میرے پاس اس مقصد کو حاصل کرنے کے دو ذریعے ہو سکتے تھے۔ پہلا ذریعہ عمر
سکتے تھے جو بمبئی کے بہت بڑے مسلمان تاجر تھے جن کی دریادلی کے افسانے زبانِ
خاص وعام تھے۔ تحریک خلافت کے لیے وہ دل کھول کر چندہ دیتے تھے۔ مجھے عمر
سالارِ اعظم کا خط پہنچانا تھا مگر سالار نے یہ شرط لگا دی تھی کہ خط دینے کے بعد میں ان
دوسری ملاقات مہم کی تکمیل کے بعد کروں گا، گویا میں انہیں اس سلسلے میں اپنا وسیلہ
سکتا تھا۔ دوسرا ذریعہ واحد صاحب بن سکتے تھے، یعنی ابا جان کے وہ دوست جن کے
خالد کی شادی میں مجھے شریک ہونا تھا لہٰذا میں نے سوچا تھا کہ بمبئی میں اپنی مہم کی تیاری
لیے واحد صاحب اور ان کے لڑکے ہی کو وسیلہ بناؤں گا۔ کیسے، اس کا فیصلہ مجھے بمبئی
ہی کرنا تھا۔ پھر میرے ذہن میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ بمبئی میں جو کامریڈ میرا ساتھ
والے تھے شاید ان میں کوئی ایسا ہو گا جو میرے لیے آسانیاں فراہم کر سکے گا۔ مجھے
زیادہ قرین قیاس اس لیے معلوم ہوئی تھی کہ جن مشکلات کا میں نے ذکر کیا ہے، وہ
تھیں کہ سالارِ اعظم انہیں نظرانداز کر دیتے۔
مہندر! اچانک میرے ذہن میں یہ نام گونجا۔ اب تک میں مہندر کو بھولا
حالانکہ میں اسے بھی بمبئی چلنے کی دعوت دے چکا تھا اور اس سے ملاقات کے لیے
روز مراد آباد بھی جانے والا تھا۔ مہندر کا خیال آتے ہی گویا مجھے اپنی پریشانیاں دھند
مانند تحلیل ہوتی نظر آئیں۔ مہندر کے توسط سے میں بمبئی میں بہت کچھ کر سکتا تھا۔

اس کے والد کا کاروبار بمبئی میں ہی تھا۔ مہندر اکثر بمبئی آتا جاتا رہتا تھا اور مجھے
یقین تھا کہ مہندر یقیناً بمبئی چلے گا۔ وہ ایک انقلابی نوجوان تھا۔ بغاوت اس کے ریشے
ریشے میں بھری تھی۔ وہ اپنی اس آتش نفسی کے بھرپور اظہار کا متمنی تھا۔ اس مقصد کے لیے
اس نے مجھے وسیلہ بنانا چاہا تھا۔
مہندر کے ساتھ ہی لالی کا تصور بھی میرے ذہن میں ابھرا تھا اور میرے دل میں ایک
ہوک سی اٹھی تھی۔ وہ میرے کتنے قریب تھی اور کتنی دور! اس وقت اس کا خیال مجھے یوں لگا
جیسے میں کسی قلعے کی شکستہ اور جلتی ہوئی فصیل کے کنگورے پر کھڑا دشمن کی منجنیقوں سے ابلتے
ہوئے پتھروں اور جلتے نیزوں کی بارش کو اپنے سینے پر روک رہا ہوں اور لالی بہت دور کسی
پرسکون وادی میں بنی ہوئی کٹیا کے دروازے پر جلتا ہوا دیا لئے کھڑی ہے تاکہ اندھیری رات
میں، میں رستہ نہ بھول جاؤں۔ لالی میرے لیے دھنک کے خوشنما رنگوں کی کمان تھی جسے میں
دیکھ سکتا تھا، جس کے رنگوں میں میرا ذہن نہا سکتا تھا لیکن جسے میں چھو نہیں سکتا تھا۔
کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ سوچتا ہے، وہ پورا بھی ہو جاتا ہے۔ یہی اس
رات بھی ہوا۔ سالارِ اعظم سے ملنے کے بعد رات گئے جب میں گھر پہنچا تو اطلاع ملی کہ
امروہے سے مہندر آیا ہوا ہے۔ شام سے وہ دو مرتبہ مجھ سے ملنے آ چکا تھا۔ رات کو کسی وقت
پھر مجھ سے ملنے آئے گا۔ وہ چھیدی لال کی دھرم شالہ میں ٹھہرا ہوا ہے۔ آخری مرتبہ دو گھنٹے
قبل آیا تھا اور اس نے دو گھنٹے بعد ہی آنے کے لیے کہا تھا۔ میرا جی تو چاہ رہا تھا کہ فوراً ہی
وہاں سے چھیدی لال کی دھرم شالہ پہنچ جاؤں لیکن اس انتظار کے سوا میں کیا کر سکتا تھا۔
ابھی میں نے دو چار الٹے سیدھے لقمے ہی کھائے تھے کہ ملازم نے آکر اطلاع دی،
خلیق الزماں کے پاس سے کوئی آدمی آیا ہے اور مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔
خلیق الزماں نے کسی کو بھیجا ہے، یہ بات ہی میرے لیے تعجب خیز تھی۔ خلیق الزماں
لکھنؤ کا نوجوان سیاسی کارکن تھا لیکن میرے اس سے اختلافات تھے۔ لکھنؤ میں بھی اور علی
گڑھ میں بھی میری اس سے ٹھنی رہتی تھی اور اس کا سبب بنیادی طور پر اس کی سیاسی روش
تھی۔ اگرچہ وہ اسی سیاسی رو میں شامل تھا جو اس وقت پورے ہندوستان میں جاری تھی۔
خلیق الزماں مجھے اپنے گروپ میں شامل کرنے کی کوششیں کر رہا تھا لیکن وہ صرف وکالت چھوڑ
دینے کو یہ سمجھتا تھا گویا اس نے انگریزوں کی حکومت کو اس اقدام سے کمزور کر دیا ہے۔ وہ
پرجوش نوجوان تھا لیکن اس کا جوش وجذبہ خود اپنے آپ ہی کو کھائے جا رہا تھا۔ وہ ایسا
طوفان تھا جس میں وہ خود ہی ہچکولے کھا رہا تھا۔ میں جب بھی اس سے انگریزوں کے

خلاف مسلح بغاوت یا سبوتاژ کی مہم چلانے کی بات کرتا وہ ہمیشہ یہ کہہ کر کنی کترا جاتا
خلافت کمیٹی اور کانگریس کی پالیسیوں سے انحراف نہیں کرسکتا''۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا خلیق!'' میں نے ایک مرتبہ خلیق الزماں سے کہا تھا۔
یہ بتاؤ کہ ملازمتیں چھوڑنے یا تعلیمی اداروں کا مقاطعہ کرنے سے تم لوگ کر
انگریزوں کو ہندوستان سے نکال سکتے ہو؟''

''ہم اس طرح ان کا نظام درہم برہم کر سکتے ہیں'' خلیق الزماں نے کہا۔

''تم سب خودرحمی کے جذبات کے اسیر ہو۔'' میں نے کہا تھا۔

''یہ خودرحمی نہیں ہے۔'' خلیق الزماں نے کہا۔ اس کے لہجے میں غصہ تھا۔

''یہ نہ صرف خودرحمی ہے بلکہ خودفریبی بھی ہے۔ یہ کمزوری کا اظہار ہے۔
سامنے اپنی مظلومیت کا اظہار جرأت کی بات نہیں ہے۔'' میں نے غصے سے کہا۔ ''یہ
کمزوری کا بدترین اظہار ہے۔ یہ سوچ کر کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے! خود اپنا ہی گلا کا
کہاں کی دانشمندی ہے؟''

''ہم اپنا گلا نہیں کاٹ رہے ہیں بلکہ انگریزی حکومت کی شہ رگ کاٹنے کی کو
رہے ہیں۔'' خلیق الزماں نے کہا۔

''یہی خودفریبی ہے خلیق!'' میں نے کہا۔ ''انگریزوں کے چنگل سے چھٹکارا
کرنا ہے تو ہمیں امریکہ کی طرح آزادی کی جنگ لڑنی ہوگی۔''

''تم احمقوں کی جنت میں رہتے ہو۔'' خلیق نے کہا۔ ''ہندوستان کے حالات
ہیں جن میں ہم ایسی جدوجہد کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''یہ اندازِ فکر بزدلوں کا ہے، ایسے لوگوں کا ہے جو بےعملی کا شکار ہوتے ہیں
نے تلخی سے جواب دیا۔ ''تم لوگ تقریریں کرنے کو، جیل جانے کو ہی بہت بہاد
ہو۔ یہ تن آسانی کی انتہا ہے۔''

''آفاق شیرازی!'' خلیق الزماں نے بڑی ناگواری سے کہا۔ ''بزدل
جیسے لوگ ہیں جو ملازمتیں چھوڑنے سے ڈرتے ہیں۔''

''مجھے بتاؤ اب تک جن لوگوں نے ملازمتیں چھوڑی ہیں، وکالت کو ت
عدالتوں کا بائیکاٹ کیا ہے، ان سے تمہاری جدوجہد کو کیا فائدہ پہنچا؟ انگریزوں
کیا نقصان ہوا؟'' میں نے کہا۔ ''خلیق! آخر تم لوگ سمجھتے کیوں نہیں! یہ رویہ
چھاؤنیوں پر حملے کرو، سڑکیں تباہ کرو، بینکوں کو لوٹو اور جب بھی موقع ملے انگریز

پاک کرو۔ یہ انداز ہوتے ہیں زندہ قوموں کے۔ تم جیسے افراد ہندوستان کے لوگوں سے
دشمنی کر رہے ہیں۔ تم جو کچھ کر رہے ہو، اس کا فائدہ صرف انگریزوں کو پہنچے گا۔ تمہارے
تمام اقدامات ہندوستان کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے، کانگریس اور خلافت کمیٹی کے تمام لیڈر محض حماقت کر رہے
ہیں؟'' چودھری خلیق الزماں نے کہا۔

''وہ کیا کر رہے ہیں، کیا نہیں، اس سے مجھے غرض نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں صرف
یہ جانتا ہوں کہ اس وقت ہم جیسے نوجوان کو وہی کرنا چاہیے جس سے آزادی کی جدوجہد
جنگ آزادی میں بدل جاتی ہے۔''

''یار تم خوابوں کی دنیا میں کیوں رہتے ہو؟'' خلیق الزماں نے کہا۔ ''مجھے بتاؤ اسلحہ
کہاں سے آئے گا؟''

''لوگ خلافت فنڈ میں چندے دیتے ہیں، کانگریس کی اپیلوں پر چندے دیتے
ہیں۔ تم اپنے لیڈروں کو یہ باتیں کیوں نہیں سمجھاتے۔ تم تو ان میں سے بعض کے بہت
قریب ہو۔ موتی لال نہرو تمہیں بہت عزیز رکھتے ہیں۔ مولانا محمد علی جوہر سے بھی تمہارے
اچھے تعلقات ہیں۔ تم ان سے کہو کہ وہ چندے کی اس رقم سے کچھ حصہ مسلح جدوجہد کے لیے
بھی نکالیں۔ آزادی کی جدوجہد دو سطحوں پر ہوتی ہے، ایک سیاسی سطح پر دوسری مسلح
جدوجہد کی صورت میں۔ یہ دونوں کوششیں جب تک شانہ بہ شانہ نہ چلیں، آزادی کی منزل
حاصل ہونے میں خاصی رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ جب ہم لوگ مسلح جدوجہد شروع کریں
گے اور ان کے نتائج بھی سامنے آنے لگیں گے تو لوگوں کی ہمدردیاں ہمارے ساتھ ہوں
گی۔ پھر ہمیں شاید اتنی مشکلات کا سامنا بھی نہ کرنا پڑے۔ یاد رکھو خلیق! ایک انگریز افسر کو
قتل کر کے اور اس کے قتل کی ذمے داری قبول کر کے تم راتوں رات دیوتا کا درجہ حاصل کر
سکتے ہو۔ سو جگہ سو تقریریں کر کے بھی تم لوگوں میں یہ مقبولیت حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر ساتھ
ہی یہ مسلح جدوجہد بھی شروع ہو تو تمہاری سیاسی مہم از خود مہمیز پا لے گی۔'' میں بس کہتا ہی چلا
گیا۔

''مگر کیا یہ بددیانتی نہیں ہوگی کہ ہم جس مقصد کے نام پر چندہ لیں، اس چندے کی
رقم کسی اور مقصد پر خرچ کریں۔''

خلیق کی اس بات پر مجھے غصہ ہی تو آ گیا۔ ''تم...... تم لوگ بزدل ہو۔ جب بات
جان پر کھیلنے کی آتی ہے تو بغلیں جھانکنے لگتے ہو۔ تم لوگ بس فیشن کے لیے سیاست کرتے

ہو۔ تم صرف سیاسی اداکار ہو، صرف مکالمے بولنے کے ماہر ہو، صرف مصنوعی
قائل ہو۔''

خلیق کو بھی میری اس بات پر غصہ آ گیا تھا۔ اس نے بھی بہت سخت باتیں کی
میری اس سے آخری ملاقات تھی، اس کے بعد نہ میں نے اس سے ملنا چاہا تھا نہ اس
اس موقع پر چلتے ہوئے میں نے اس سے کہا تھا۔ ''خلیق! یاد رکھو، انگریز
وقت تمہیں اور تمہارے لیڈروں کو ڈھیل دے رہا ہے، کچھ وعدے وعید کر رہا ہے
سبب صرف یہ ہے کہ وہ جنگ میں الجھا ہوا ہے، اس کی تمام تر توجہ مشرقِ وسطیٰ پر مرکوز
جونہی اسے ادھر سے فرصت ملی، وہ تم سب کو جبڑے کھول کر ہڑپ کر لے گا۔''

''ہم اس کے لیے تیار ہیں۔'' خلیق نے کہا۔

''خودکشی ہوگی، حرام موت!'' میں نے کہا تھا اور چلا آیا تھا۔

اس ناخوشگوار ملاقات کے بعد ہم دونوں میں آج تک کوئی بات نہیں ہوئی تھی
اکثر ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر کترا جاتے تھے۔ سو، اس دن جب ملازم نے بتایا کہ خلیق
میرے نام کوئی پیغام بھیجا ہے تو میرا حیران رہ جانا لازمی تھا۔ میں جلدی سے باہر آیا۔

باہر حبیب موجود تھا۔ میں نے اسے اندر آنے کی دعوت دی تو وہ بولا۔ ''او
آفاق!'' اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

''کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟ خلیق تو ٹھیک ہے؟'' میں اس کے ساتھ ساتھ
ہوا بولا۔

حبیب تانگے پر آیا تھا۔ ہم تانگے سے تھوڑی دور نکل آئے تو حبیب نے کہا۔ ''خلیق
نے تمہارے نام پیغام بھیجا ہے۔''

''آخر بات کیا ہے؟ پیغام کیا ہے؟''

''اس نے کہا ہے، تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ اور کہیں چھپ جاؤ۔'' حبیب نے

''مگر کیوں؟ آخر بات کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''خلیق کہاں ہے؟''

''خلیق اس وقت راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں ہے۔'' حبیب نے سرگوشی میں

''وہیں سے اس نے مجھے اطلاع بھجوائی ہے کہ میں تمہیں بتاؤں کہ تم خطرے میں ہو۔ مراد
آباد اور امروہے سے پولیس پارٹیاں آئی ہیں۔ آج رات کسی وقت بھی چھاپا پڑ سکتا ہے۔''

''میں نے کیا کیا ہے؟'' میں نے حبیب سے سوال کیا۔

''مجھے اس سے زیادہ کچھ معلوم نہیں۔ تمہیں تو پتا ہی ہے کہ حکومت ان دنوں

زیادہ ہی سنک گئی ہے۔ دھڑا دھڑ گرفتاریاں ہو رہی ہیں۔'' حبیب نے کہا تھا۔

''مگر میرا سیاست سے کیا تعلق؟ مراد آباد، امروہے سے کیا تعلق؟'' میں نے اپنا اصرار جاری رکھا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' حبیب نے کہا۔ ''تمہیں یہ پیغام پہنچانا میرا کام تھا۔ آگے تم جانو، تمہارا کام!''

''خلیق راجہ صاحب کے ہاں سے کب آئے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''شاید اتنی دیر میں کہ پھر تم پولیس کے چھاپے سے نہ بچ سکو اسی لیے اس نے تمہیں پیغام بھجوایا ہے ورنہ وہ خود ہی آتا۔'' حبیب نے کہا۔ ''اچھا اب میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ تانگے کی طرف بڑھا۔ ''میرا خیال تو یہی ہے کہ تم فوراً یہاں سے رفوچکر ہو جاؤ۔''

''ٹھیک ہے، خدا حافظ۔'' میں نے کہا۔

حبیب تانگے میں سوار ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں تانگا دور چلا گیا اور میں حالات کی اس نئی کروٹ پر غور کرتا رہا۔

یہ اطلاع بہت پریشان کن تھی۔ اس اطلاع کے صحیح ہونے کا یقین اس لیے تھا کہ خلیق نے یہ پیغام راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں سے بھجوایا تھا جو ان دنوں ہوم ممبر تھے۔ خلیق کو یہ اطلاع یقیناً وہیں سے ملی ہوگی اور اس نے فوراً ہی مجھے اس سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا تاکہ میں مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے بچاؤ کی کوئی صورت نکال لوں۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ آخر وہ کیا اسباب ہیں جن کی بنا پر پولیس میرے پیچھے لگی تھی۔ وہ کون تھا جس نے میری نشاندہی اس انداز میں کی کہ امروہے اور مراد آباد سے پولیس پارٹیاں میری گرفتاری کے لیے لکھنؤ آ پہنچی تھیں۔ پھر مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ پولیس امروہے میں میری مختلف سرگرمیوں میں سے کس واردات کے سلسلے میں میرے پیچھے پڑی ہے۔ یہ تمام سوالات یکے بعد دیگرے میرے ذہن میں چمگادڑوں کی طرح پھڑ پھڑائے تھے مگر ان میں سے کسی سوال کا جواب میرے پاس نہ تھا۔

پھر اچانک ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔

مہندر! تو کیا مہندر نے میرے بارے میں مخبری کی ہے؟ میرے ذہن نے اس سوال کا جواب اثبات میں دیا۔ آج ہی مہندر یہاں پہنچا تھا اور آج ہی پولیس میرے گھر چھاپا مارنے والی تھی۔ میرے دل نے ذہن کے اس فیصلے کو قبول نہیں کیا۔ پھر بھی دل زخمی سا ہوا۔ شکوک اور وسوسوں کے کئی تیر دل میں پیوست ہو گئے۔ ایک خوبصورت آئینہ تھا کہ

کرچی کرچی ہوگیا۔

بہرحال اب مجھے فوراً گھر چھوڑ دینا تھا۔ میں پولیس کے ہتھے نہیں چڑھنا چاہتا تھا۔ میں آزاد رہنا چاہتا تھا تاکہ انگریزوں کے خلاف وہ جدوجہد جاری رکھنے میں معاونت کرتا رہوں جس نے غلامی کی شورزدہ زمین میں جڑ پکڑ لی تھی۔ میں جدوجہد آزادی کے نخلِ تازہ کی آبیاری چاہتا تھا مگر اس مرحلے پر میں اس نخلِ تازہ کی حفاظت کے لیے اپنی زندگی ضروری سمجھتا تھا۔ گرفتار ہونا کوئی مشکل بات نہ تھی لیکن پھر میں جدوجہد کے اس دھارے سے کٹ جاتا جس کا سفر ابھی بہت طویل تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں نے جو راہ اختیار کی ہے، اس کا اختتام قیدوبند کی صعوبتوں پر بھی ہوسکتا ہے اور دار کی خشک ٹہنی پر بھی۔ ذہنی طور پر میں اس کے لئے تیار بھی تھا پھر بھی اس طرح اس موقع پر میں گرفتار نہیں ہونا چاہتا تھا۔

میں بہت عجلت میں تیار ہوا، پھر امی کو اکیلے میں پولیس کے اس متوقع چھاپے کے بارے میں بتایا۔ وہ ایک لمحے کو بھونچکا سی رہ گئیں۔ انہوں نے مجھے برا بھلا کہنا شروع کیا ہی تھا کہ میں نے انہیں وقت کی نزاکت کا احساس دلایا۔ وہ ماں تھیں، خاموش ہوگئیں اور میں ان کی ڈھیروں دعاؤں کی حفاظت میں مکان سے باہر آگیا۔ لکھنؤ اب میرے لیے شہرِ ممنوعہ بن چکا تھا۔ میں اپنے ہی وطن میں اجنبی بن گیا تھا۔ اب یہاں میری آزادی سلب ہوگئی تھی۔ میں اپنے شہر میں غریبِ شہر بن گیا تھا۔

اگر مہندر لکھنؤ نہ آگیا ہوتا تو میں اسی وقت لکھنؤ سے نکل جاتا مگر میں مہندر سے بھی ملنا چاہتا تھا۔ مہندر کسی وقت بھی میرے گھر آسکتا تھا لہٰذا میں نے چھیدی لال کی دھرم شالہ کی طرف جانے کا ارادہ ترک کردیا اور منصور کے گھر کی طرف چل دیا۔

منصور میرا لنگوٹیا یار تھا۔ وہ ایسے لوگوں میں سے تھا جن کی دوستی بہت بڑا سرمایہ ہوتی ہے اور جو ہر مصیبت میں دوستوں کے کام آتے ہیں۔ اس کا گھر میرے گھر کے قریب ہی تھا۔ میں اس کے گھر کی بیٹھک سے اپنے گھر کے دروازے پر بھی نظر رکھ سکتا تھا۔ گھر سے باہر آکر میں نے دائیں بائیں دیکھا۔ وہی مانوس ماحول جس سے میں بچپن سے واقف تھا، رات کے اندھیرے میں پھیلا ہوا تھا۔ میں مکانات کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا منصور کے گھر پہنچ گیا۔ منصور کو میں نے مختصراً ضروری تفصیلات بتائیں تو وہ بھی پریشان سا ہوگیا۔

میرا اندازہ درست تھا۔ ابھی مجھے یہاں آئے دس منٹ بھی نہ گزرے ہوں گے کہ مہندر کو میں نے اپنے گھر کی طرف بڑھتے دیکھا۔ منصور کے مکان کی بیٹھک کا دروازہ

ہمارے گھر کے سامنے ہی تھا۔ میں نے منصور کو دوڑایا۔ چند لمحوں بعد مہندر میرے سامنے موجود تھا۔

"شکر ہے، تم سے ملاقات تو ہوئی۔" مہندر مجھے گلے سے لپٹاتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے میں محبت اور خلوص کی وہی گرمی تھی جو میں نے اس سے پہلی ملاقات کے موقع پر محسوس کی تھی۔

"آخر بات کیا ہے، تمہیں تو کل مراد آباد پہنچنا تھا۔" میں نے پوچھا۔

"بات ہی ایسی تھی کہ مجھے سیدھا یہیں آنا پڑا۔" مہندر نے کہا۔ "اس وقت تم نہ ملتے تو تمہارے گھر پہ ڈیرا ڈال دیتا مگر یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے گھر کی بجائے مجھ سے یہاں اس طرح ملنا کیوں پسند کیا؟"

"یہ بھی بتادوں گا۔" میں نے مہندر کو جواب دیا۔ "پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ تم کیوں یہاں آئے ہو؟"

مہندر نے میرے اس سوال پر منصور کی طرف اس انداز میں دیکھا گویا وہ منصور کی موجودگی میں مجھے کچھ نہ بتانا چاہتا ہو۔

"یار منصور!" میں نے کہا ہی تھا کہ منصور خود ہی اٹھ گیا۔

"ٹھیک ہے۔" منصور نے کہا۔ "تم لوگ باتیں کرو، میں چائے بنواتا ہوں۔"

"چائے وغیرہ کا تکلف چھوڑو۔" میں نے منصور سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ تم خلیق کے گھر چلے جاؤ۔ وہ گھر پر ہو تو اس سے کہنا کہ میں رات ہی میں کسی وقت اس سے ملوں گا۔ اگر وہ گھر پر نہ ہو تو اس کے گھر پر کسی کو یہ پیغام دے دینا۔"

"میرا خیال تھا چائے وغیرہ تو پی ہی لیتے۔ کیوں مہندر صاحب!"

"چائے پھر کبھی سہی، یار زندہ صحبت باقی!" مہندر ناتھ نے جواب دیا۔

"اچھا تو میں چلتا ہوں۔" منصور نے کہا۔ "میں سائیکل پر جاؤں گا۔ دس پندرہ منٹ میں واپسی ہوگی۔ اس دوران میں اگر تم جانا چاہو تو میرا خیال ہے احتیاطاً پچھلا دروازہ استعمال کرنا۔ میں بابا سے کہے جاتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔

"اب بتاؤ کیا پریشانی تمہیں کھینچ کر یہاں لائی ہے؟" منصور کے جاتے ہی میں نے مہندر سے کہا تھا۔

"پریشانی صرف تم ہو۔"

"کیا مطلب؟"

''مجھے کل ہی اطلاع ملی تھی کہ پولیس کو تمہاری تلاش ہے، مراد آباد سے ایک پارٹی تمہاری گرفتاری کے لیے یہاں آنے والی ہے بلکہ میرا خیال ہے یہاں آ بھی چکی ہے۔ میں نے سوچا کہ فوراً یہاں پہنچ کر تمہیں خبردار کر دوں۔ شکر ہے میں بروقت یہاں پہنچ گیا۔'' مہندر نے مجھے بتایا۔

''مگر یار!'' میں نے کہا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر میری نشاندہی کس نے کی ہے؟''

''میں نے بھی یہ بات معلوم کرنا چاہی تھی۔'' مہندر نے جواب دیا۔ ''مجھے قطعیت سے تو کچھ معلوم نہیں ہو سکا لیکن خیال یہی ہے تمہاری مخبری یا تو مشہود صاحب نے کی ہے یا ہادی صاحب نے!''

''مگر ان میں سے کسی صاحب کو بھی میرا اصلی نام معلوم نہیں!''

''ہو سکتا ہے۔'' مہندر نے کہا۔ ''بہر حال تمہاری، نشاندہی خان بہادر شیرازی صاحب کے لڑکے کی حیثیت سے کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اسے بھی تمہارا نام معلوم نہیں تھا۔''

''مگر یار!'' میں نے کہا۔ ''ہادی صاحب مجھے ایسے آدمی معلوم نہیں ہوتے۔''

''تمہیں معلوم نہیں کہ ہادی چچا سے ہمارے گھر والوں کے تعلقات کیسے ہیں۔'' مہندر نے کہا۔ ''مجھ سے اور لالی سے وہ بالکل اپنے بچوں کی طرف محبت کرتے ہیں اور لالی تو ان کی منہ بولی بیٹی ہے۔ ایک مرتبہ لالی کو معیادی بخار ہوا تھا، کچھ نہ پوچھو ہادی صاحب کی کیا حالت ہوئی تھی۔ بہر حال، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے جو کچھ علم ہوا ہے۔ اس کے مطابق ہادی صاحب یا مشہود صاحب انہی دونوں میں سے کسی نے مخبری کی ہے۔''

مہندر کی گفتگو سے شک کا وہ کانٹا میرے ذہن سے نکل گیا جو تھوڑی دیر پہلے تک میرے دل میں چبھا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''اکیلے ہو یا لالی بھی آئی ہے؟''

''وہ بھی ساتھ ہے، دھرم شالہ میں ٹھہری ہوئی ہے۔''

''اسے بھی لے آتے شام کو میرے گھر۔'' میں نے کہا۔

''لے آتا مگر حالات ایسے تھے کہ میں نے مناسب یہی سمجھا کہ پہلے تم سے مل لوں۔ پھر میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا، اس وقت کسی کو پتا چلے کہ کوئی امروہے کا باشندہ تم سے ملنے آیا ہے۔''

''میرا خیال ہے تم نے ٹھیک ہی کیا۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے بھی یہ

خبر مل چکی ہے کہ پولیس مجھے گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ آج رات کسی بھی وقت چھاپا پڑ سکتا ہے اسی لیے تم مجھے یہاں دیکھ رہے ہو، اب خلیق سے ملنے کے بعد ہم رات ہی کو لکھنؤ چھوڑ دیں گے۔ بمبئی ہماری منزل ہے۔''

''مگر یار! بمبئی! اتنی دور؟''

''کیوں کیا ہم بمبئی میں اپنا کام نہیں کر سکتے؟'' میں نے الٹا اسی سے سوال کیا۔ ''بمبئی بھی تو ہندوستان میں ہی ہے۔''

''مجھے کچھ یوں لگ رہا ہے جیسے اب تم لوگ صنعتی مزدوروں میں کام کرنا چاہتے ہو۔'' مہندر نے کچھ خوابیدہ لہجے میں کہا۔ ''یہ میرا خیال بلکہ یقین ہے کہ ہم صنعتی اور کاروباری زندگی مفلوج کر کے ہی اس غیر ملکی حکومت کو جھکا سکتے ہیں۔''

''فی الحال اس سے بھی بڑا اور اہم کام درپیش ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اچھا اب تم دھرم شالہ جاؤ۔ خلیق سے ملنے کے بعد میں تمہیں اطلاع دوں گا کہ ہم کس وقت یہاں سے روانہ ہوں گے۔''

ابھی میں نے اپنی بات ختم کی ہی تھی کہ بیٹھک کے باہر مجھے غیر معمولی سرگرمیاں محسوس ہوئیں۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا، سامنے ہمارے گھر کو جانے والی گلی کے نکڑ پر دو تانگے رکے تھے جن میں پولیس کے مسلح سپاہی بھرے ہوئے تھے۔ مہندر بھی میرے ساتھ ہی آ کھڑا ہوا تھا۔

''اب کیا ہوگا؟'' مہندر نے سرگوشی میں مجھ سے پوچھا تھا۔

''ہوگا کیا، پوچھ پاچھ کر چلے جائیں گے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''گھر سے یہی جواب دیا جائے گا کہ میں بارہ بنکی گیا ہوا ہوں۔''

اسی وقت منصور بھی واپس آ گیا تھا اور وہیں کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک تانگے سے پانچ پولیس والے اترے تھے اور پھر دونوں تانگے آگے چلے گئے تھے۔ پولیس کی وہ جماعت وہیں ٹھہر گئی تھی۔ ان سب کی نظریں منصور کی بیٹھک پر لگی ہوئی تھیں جہاں اس وقت میں اور مہندر تھے۔ لگتا تھا انہیں میرے گھر سے دلچسپی نہیں تھی۔

''کیا بات ہے تنظیم؟'' ایک سپاہی سے منصور نے پوچھا۔ تنظیم سے میں بھی واقف تھا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ اسکول میں پڑھ چکا تھا مگر تیسری جماعت کے بعد اس نے اسکول چھوڑ دیا تھا۔

''مجھے معلوم نہیں۔'' تنظیم نے روکھا سا جواب دیا۔ ظاہر ہے وہ کچھ بتانا نہیں چاہتا

تھا۔

پولیس پارٹی کا رویہ میرے لیے پریشان کن تھا۔ لگتا تھا کہ انہیں یہ یقین کہ میں اس وقت منصور کے گھر میں ہوں۔ چند منٹ بعد اس خیال کی تصدیق ہو گئی ذرا ہی دیر میں پولیس پارٹی کا سربراہ گھوڑے پر وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس نے گھوڑ اترتے ہی پوچھا تھا۔ ''کون سا مکان ہے؟''

''یہ والا!'' تنظیم نے منصور ہی کے گھر کی طرف اشارہ کیا تھا۔

میں نے کھڑکی کے پٹ کو آہستہ سے بند کیا۔ اسی لمحے میں نے منصور کی آواز

''کیا مطلب، یہ میرا مکان ہے۔''

''آپ کون ہیں؟''

''منصور، میں یہیں رہتا ہوں۔''

''یہ مجھے بھی پتا چل گیا ہے۔'' پولیس افسر نے رعب جھاڑا۔ ''ہمیں آفاق شیر کی تلاش ہے۔ ہماری اطلاع کے مطابق وہ تھوڑی دیر پہلے آپ کے مکان میں داخل تھا۔''

''وہ آفاق میرا دوست ہے۔ وہ سامنے والے مکان میں رہتا ہے۔''

''رہتا ہوگا۔'' پولیس افسر نے اسی رعب دار لہجے میں جواب دیا۔ ''اس وقت آپ کے مکان میں ہے۔ اسے یہاں سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ اسے نکال کر لا

''آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟'' منصور نے کہا۔

''بہتر یہی ہے کہ آفاق کو باہر لے آؤ ورنہ پھر مجبوراً ہم خانہ تلاشی لیں گے۔''

''خانہ تلاشی!'' منصور نے حیرت سے کہا۔ ''خانہ تلاشی ضرور لیجیے گا مگر ا وارنٹ؟'' اس نے حجت کی۔

''زیادہ قانون داں نہ بنو۔'' پولیس افسر کا لہجہ اور سخت ہو گیا تھا۔ ''ہمیں سب معلوم ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ آفاق شیرازی کے بعد ایک اور شخص بھی اس مکان میں آیا تھا اسے تمہی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ پھر کچھ دیر بعد تم یہاں سے کہیں گئے تھے۔''

گویا پولیس پہلے ہی سے یہاں نگرانی کر رہی تھی۔ میں نے سوچا تھا اور پھر مہندر کہا تھا۔ ''تم اپنے بارے میں یہ نہیں بتانا کہ امروہے سے آئے ہو۔ اول تو انہیں تم سے غرض نہیں ہوگی، پھر بھی پوچھیں تو یہی کہہ دینا کہ تم یہیں قیصر باغ میں رہتے ہو، تلا کا......''

''میری فکر نہ کرو۔'' مہندر نے کہا۔ ''یہ بتاؤ اب کرنا کیا ہے؟''

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں اپنے گھر میں ہوتا تو شاید اتنی آسانی سے ہار نہیں مانتا مگر میں اب کچھ نہیں کر سکتا۔ میں منصور اور اس کے گھر والوں کو مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتا۔''

''تلاشی کا وارنٹ!'' پولیس افسر کہہ رہا تھا۔ ''گویا تم پولیس کے ساتھ تعاون سے انکار کر رہے ہو؟''

''ایسی بات نہیں ہے۔'' منصور نے کہا۔ ''ایک قانون پسند شہری کی حیثیت سے اپنے حقوق کے تحفظ کی بات کر رہا ہوں۔''

منصور جس انداز میں پولیس افسر سے مباحثہ کر رہا تھا، اس سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ اس کا مقصد صرف یہی ہے کہ میں اس دوران میں وہاں سے فرار کی سبیل نکال لوں۔

''آفاق شیرازی کے لیے ہمارے پاس خصوصی احکام ہیں۔'' پولیس نے افسر کا لہجہ اس مرتبہ دھمکانے والا تھا۔ ''اسے ہر قیمت پر گرفتار کرنے کی ہدایت ہے۔ بہتر یہی ہے کہ آفاق کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ ہم زبردستی گھر میں گھس کر اسے برآمد کر لیں گے۔ کارِ سرکار میں مداخلت بے جا کے مرتکب نہ ہو۔''

خصوصی احکام کے حوالے پر میں چونک گیا تھا۔ ان دنوں ناپسندیدہ سیاسی کارکنوں اور لیڈروں کو گرفتار کرنے کے لیے جو خصوصی طریقہ اختیار کیا جاتا تھا اس کا مجھے علم تھا۔ پولیس افسر ٹھیک کہہ رہا تھا، وہ تلاشی کے وارنٹ کے بغیر بھی گھر میں گھس سکتا تھا۔

''آپ بلاوجہ ناراض ہو رہے ہیں۔'' منصور نے کہا۔ ''میں بیٹھک کھلواتا ہوں۔ آفاق تھوڑی دیر پہلے آیا ضرور تھا، مجھ سے اس کی ملاقات بھی ہوئی تھی، اس کے بعد میں ایک ضروری کام سے چلا گیا تھا اور اب آپ کے سامنے ہی واپس آیا ہوں۔ ممکن ہے وہ اب بھی گھر میں ہو، ممکن ہے نہ ہو۔ بہرحال دیکھتا ہوں۔''

''وہ گھر میں ہی ہے۔'' پولیس افسر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''دھوکا دینے کی کوشش بے سود ہے۔ ہم نے مکان کو گھیر رکھا ہے۔ اسے یہاں سے بھگانے کی کوشش مت کرنا! ایسی کوشش اعانتِ جرم خیال کی جائے گی۔ جاؤ آفاق کو اندر سے بھیج دو۔''

پھر منصور کی سائیکل کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز ابھری تھی۔ اسے گھر کے اس دروازے سے گزرنا تھا جو بیٹھک کے پہلو میں بنی ہوئی گلی میں تھا۔ یہ گلی بھی منصور کے مکان ہی کا

حصہ تھی۔

میرے لیے اب باہر جانے کے سوا کوئی راستہ نہ تھا۔ ''اچھا دوست!'' میں نے مہندر سے کہا۔ ''میں دروازہ کھولتا ہوں۔ اگر میں بچ نکلا تو رات میں کسی وقت بھی شالہ پہنچوں گا۔''

مہندر بھی اس وقت عالم گومگو میں تھا۔ وہ نہ کچھ کر سکتا تھا نہ کہہ سکتا تھا۔ اس وقت پولیس کے چنگل سے نکلنے کی ایک ترکیب میرے ذہن میں آئی تھی۔ اس میں کامیابی کے امکانات ایک فیصد تھے اور میں نے یہی داؤ کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔

میں نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ''آپ کو آفاق شیرازی کی تلاش ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''یہی ہے سر، آفاق شیرازی!'' ایک پولیس والے نے گویا میری شناخت کر دی۔

میں دروازے سے نکل کر دوسری سیڑھی پر آ گیا۔ مہندر میرے پیچھے دروازے پر تھا۔ بابا اور منصور بھی بیٹھک میں آ چکے تھے۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے پولیس افسر سے پوچھا۔ ''آپ کو میری تلاش کیوں ہے؟ میں نے کیا کیا ہے؟''

''یہ سب مجھے معلوم نہیں۔'' پولیس افسر نے کہا۔ ''آپ کو تھانے چلنا ہے۔''

''گرفتاری کا وارنٹ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جب گرفتاری کی جائے گی تو وارنٹ پیش کر دیا جائے گا۔'' پولیس افسر نے کہا۔ ''فی الحال کچھ پوچھ گچھ کرنا ہے۔''

''کس سلسلے میں؟'' میں نے کہا۔ ''سیاست سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ نہ میں نے کوئی جرم کیا ہے۔'' میں گفتگو کو طول دے رہا تھا۔

''کہہ تو دیا مجھے کچھ معلوم نہیں۔'' پولیس افسر نے اس مرتبہ جھلا کر کہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں چلتا ہوں۔ اجازت دیں تو میں اپنی والدہ سے مل لوں۔ میرا گھر وہ سامنے ہے۔''

میری اس درخواست پر پولیس افسر تذبذب میں پڑ گیا۔ وہ تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے۔ میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ آپ چلے چلیے۔'' اس مرتبہ پولیس افسر کا رویہ نرم تھا۔ ''جاؤ تنظیم تانگے لے آؤ۔'' پولیس افسر نے سپاہی سے کہا۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ پھر یہ تمام کارروائی بھی بہت اطمینان سے ہوئی تھی، کوئی شور غوغا نہیں ہوا تھا اس لیے وہاں ابھی تک لوگوں کا جمگھٹا نہیں ہوا تھا البتہ منصور کے گھر کی خواتین بیٹھک میں آ گئی تھیں۔ ان کی کھسر پھسر کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

تنظیم اس سمت بڑھا تھا جدھر تانگے گئے تھے لیکن دس قدم بعد ہی وہ چیخ مار کر دہرا ہو گیا تھا۔ تمام سپاہیوں کی توجہ اسی کی طرف ہو گئی تھی۔ دو سپاہی اس کی طرف لپکے تھے۔ وہ بھی چیخ مار کر سڑک پر گر گئے۔ اسی وقت پولیس افسر اور ایک سپاہی جو میرے پاس موجود تھا دہاڑے تھے۔ میں نے ہوا میں صرف سنسناہٹ سنی تھی اور ایک دھبا سا گزرتے دیکھا تھا۔ اگلے ہی لمحے آخری سپاہی بھی چیخا تھا۔

غلیل! میرے ذہن میں یہ لفظ گونجا تھا۔

تو کیا میرے کامریڈ، میرے ساتھی، میری تنظیم کے رفیق، حرکت میں آ گئے تھے۔ یقیناً ایسا ہی تھا اسی لیے غلیل کا تصور میرے ذہن میں آیا تھا۔ ''غلیل ایک بے ضرر سی چیز ہے لیکن بعض حالات میں ایک مؤثر ہتھیار بھی ثابت ہوتا ہے لہٰذا دوستو! میرا مشورہ ہے کہ تم ایک غلیل ضرور اپنے ساتھ رکھا کرو۔'' سالارِ اعظم نے ایک مرتبہ ہم سے کہا تھا۔ میں نے ابھی تک اس مشورے کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا مگر اس وقت میں غلیل کے مؤثر ہونے کا ثبوت دیکھ رہا تھا۔ سنسناہٹ کی آواز کے ساتھ ایک ثانیے کے لیے میں نے جو دھبا دیکھا تھا، وہ یقیناً غلے کا تھا جو غلیل سے چلایا گیا ہوگا۔ میں نے اب فیصلہ کر لیا تھا کہ آئندہ سالارِ اعظم کے مشورے پر عمل کروں گا۔

روشنی کی ایک لہر کی مانند یہ سب باتیں میرے ذہن میں آئی تھیں۔ پھر ایک مرتبہ اور وہی سنسناہٹ ہوا میں تیر گئی تھی۔ یکے بعد دیگرے پولیس افسر اور وہ دونوں سپاہی جو میرے قریب تھے، پھر چیخے اور تڑپے تھے۔ اس کے ساتھ ہی میں حرکت میں آ گیا تھا۔ میں لپکا اور پولیس افسر کے گھوڑے کی راس کھینچ لی۔ اگلے لمحے میں گھوڑے پر سوار ہو کر اسے سرپٹ دوڑا چکا تھا۔ پولیس افسر اور سپاہیوں نے میرے ارادے بھانپتے ہوئے میری طرف لپکنا چاہا تھا مگر ایک مرتبہ پھر انہیں دہرا ہو جانا پڑا تھا۔

☆======☆======☆

خلیق میرا منتظر تھا وہ مجھے اپنے مکان کے احاطے کے باہر ہی مل گیا تھا اور پھر گرمجوشی سے مجھے سینے سے لگا کر اپنے کمرے میں لے گیا تھا۔

پولیس کے نرغے سے فرار ہو کر میں نے امین آباد پاک کے پاس گھوڑے کو چھوڑ دیا

تھا اور ایک گھنٹہ امین آباد پارک کے آس پاس کے علاقے میں گزار کر خلیق کی طرف
اس وقت میں اپنے کسی دوست یا اپنی تنظیم کے کسی رکن کے گھر جانا نہیں چاہتا
خدشہ تھا کہ پولیس، میرے دوستوں کے گھر بھی، میری تلاش میں چھاپے مار
اگرچہ خلیق کا مکان بھی میرے لیے زیادہ محفوظ نہیں تھا کیونکہ خود خلیق بھی حکومت
ناپسندیدہ افراد کی فہرست میں شامل تھا لیکن فی الحال اس کی گرفتاری یا اس
چھاپے کا کوئی امکان نہ تھا۔

''مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ ابھی بیس پچیس منٹ ہوئے کہ میں واپس آیا
خلیق نے کہا۔ ''پھر منصور کی زبانی بھیجا ہوا تمہارا پیغام ملا۔''

''میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے قبل از وقت اطلاع دے دی۔''

''ہاں، پولیس آج رات ہی تمہارے گھر چھاپا مارنے والی ہے۔''

''چھاپا پڑ چکا ہے میرے دوست!'' میں نے کہا اور پھر خلیق کو، پیش آئے
تمام واقعات سے آگاہ کر دیا۔

خلیق الزماں یہ تمام واقعات حیرت و استعجاب سے سنتا رہا جب میں نے
ختم کی تو اس نے کہا۔ ''مگر شیرازی! آخر وہ کون لوگ تھے جن کی مدد سے تم پولیس
نرغے سے فرار ہوئے؟''

''یہ بات مجھے بھی معلوم نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بہر حال وہ جو کوئی
میرے لیے فرشتۂ رحمت ہی ثابت ہوئے۔''

''میں کچھ کچھ اندازہ کر رہا ہوں۔'' خلیق نے کہا۔ ''تم نہیں بتانا چاہتے تو
میں اصرار بھی نہیں کروں گا۔''

پھر میرے پوچھنے پر خلیق الزماں نے بتایا کہ اسے میرے گھر پر پولیس چھ
اطلاع نواب صاحب محمود آباد کے یہاں ہی ملی تھی۔ انہوں نے اسے بتایا تھا کہ خان
شیرازی کا لڑکا یعنی میں، آفاق شیرازی خطرناک راہوں پر چل نکلا ہے۔ یہ بات
انٹیلی جینس کے ایک اعلیٰ افسر سے معلوم ہوئی تھی جو شملے سے سوت ندی کے پل کی
تحقیقات کے لیے امروہے پہنچا تھا۔ میرے ذہن میں آج اس اعلیٰ افسر کا نام نہیں آ
شاید مصدق حسین تھا یا تصدق حسین یا پھر اس سے ملتا جلتا کچھ نام۔ پھر اس کی تحقیق
سلسلہ لالہ گوپی ناتھ، علم دین اور امروہے میں ہادی صاحب کے گھر ہونے والے
تک پھیلا تھا۔ اسی اجلاس میں موجود کسی شخص نے میری نشاندہی کی تھی۔ نشاندہی

والے کا نام معلوم نہیں ہو سکا تھا یا بتایا نہیں گیا تھا۔ پھر اس انٹیلی جینس افسر نے مشہود
کے گھر پناہ لینے والے دونوں جوانوں کا ذکر بھی اپنی رپورٹ میں کیا تھا۔ مشہود
صاحب نے ان کا جو حلیہ بتایا تھا، اس میں سے ایک کا حلیہ مجھ سے یا اس شخص سے ملتا جلتا تھا
جس نے ہادی صاحب کے گھر ہونے والے اجلاس میں شرکت کی تھی۔

میں یہ تمام باتیں سنتا رہا، خلیق ایک ایک بات مجھے بتاتا رہا، پھر اس نے مجھ سے
کہا۔ ''مراد آباد اور امروہے سے آنے والی پولیس پارٹی کے ساتھ تین افراد بھی ہیں۔ علم
دین، مشہود اور ایک وہ شخص جس نے خان بہادر شیرازی کے لڑکے کی حیثیت سے تمہیں
پہچانا ہے۔ اس شخص کا نام صیغۂ راز میں رکھا گیا ہے۔ انٹیلی جینس کا وہ اعلیٰ افسر بھی پولیس
پارٹی کے ساتھ ہے۔''

''مگر انہیں میری تلاش کیوں ہے؟'' میں نے خلیق سے پوچھا۔

خلیق الزماں نے جواب دیا۔ ''بنیادی طور پر یہ تمام تحقیقات سوت ندی کے پل کی
تباہی کے سلسلے میں ہو رہی ہیں۔ اگرچہ حکومت نے اس پل کی تباہی کو بارش اور سیلاب کا
نتیجہ قرار دیا ہے لیکن یہ اعلان، لوگوں کو محض غلط تاثر دینے کے لیے ہے۔ انجمن محبانِ وطن کا
نام حکومت کے لیے پریشانی کا سبب ہے۔ وہ اس نام کو عام نہیں کرنا چاہتی۔''

''مگر سوت کے پل کی تباہی سے میرا کیا تعلق؟'' میں نے پوچھا۔

''تعلق ہے یا نہیں، مجھے کچھ پتا نہیں۔ اس کا علم یا تو تحقیقات کرنے والوں کو ہوگا، یا
تمہیں۔'' خلیق الزماں نے کہا۔ ''ویسے مجھے یہ بتاؤ کہ تم پچھلے دنوں امروہے گئے تھے یا

''نہیں۔'' میں نے جھوٹ بولا۔

''پھر تمہاری شناخت کیسے کی گئی؟'' خلیق نے کہا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''انجمن محبانِ وطن کیا چیز ہے؟'' خلیق نے پھر سوال کیا۔ اس کی ذات میں چھپا ہوا
... بیدار ہو چکا تھا۔

''مجھے علم نہیں۔'' میں نے پھر جھوٹ بولا۔

''تم نہیں بتانا چاہتے نہ بتاؤ۔'' خلیق پھر ایڈووکیٹ کی بجائے دوستانہ روپ میں
''لیکن اتنا اندازہ میں بھی لگا سکتا ہوں کہ تم نے اپنی راہِ عمل متعین کر لی ہے۔ یہ ضرور
راستہ ہے جس کے تم مبلغ رہے ہو۔ اس وقت پولیس کے نرغے سے بچ نکلنا بھی اس

امر کی دلیل ہے۔ کیوں کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' خلیق الزماں کے چہرے
تھی۔

''شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے پھر گول مول سا جواب دیا۔

''ہم سب کی راہیں ایک ہی منزل کی طرف جاتی ہیں۔'' خلیق نے کہا۔
صحیح راہ اختیار کی ہے، اس کا فیصلہ وقت اور تاریخ کریں گے۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''اور شاید تاریخ تمہارے حق میں ہی فیصلہ دے
وقت کچھ جذباتی سا ہو گیا تھا۔

''کون کہہ سکتا ہے!'' خلیق نے کہا۔ ''بہر حال میری دعائیں تمہارے
ویسے چھوڑو ان باتوں کو، یہ بتاؤ اب تم کیا کرو گے؟''

''میں آج رات ہی لکھنؤ چھوڑ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''جاؤ گے کہاں؟'' خلیق نے کہا۔

''میرے لیے پورا ہندوستان دارالجہاد ہے۔ میں جہاں بھی جاؤں گا
میرے ساتھ ہو گا۔''

''اس وقت تک میرا خیال ہے، لکھنؤ کی تمام پولیس تمہاری تلاش کے
میں آ چکی ہو گی۔ جس انداز میں تم پولیس کے نرغے سے فرار ہوئے ہو اس کے
گرفتاری کے لیے اب تک خصوصی تیاریاں کی جا چکی ہوں گی۔ انٹیلی جینس کا
شملے سے آیا ہے، بہت کائیاں اور تیز ہے۔ اس کے اختیارات بہت وسیع ہیں
واحد ہندوستانی ہے جو ہر وقت وائسرائے سے مل سکتا ہے۔ لکھنؤ سے تمہارا جانا
نہیں ہو گا۔''

''یہ میں بھی جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن مجھے بہر حال یہاں سے
آج رات ہی۔''

''میں تمہیں لکھنؤ سے نکالنے کا بندوبست کرتا ہوں۔'' خلیق نے کہا تھا۔

''میرے لئے خود کو پریشانیوں میں نہ ڈالو خلیق!'' میں نے کہا۔ ''میں
راہ نکال لوں گا۔''

''اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔'' خلیق نے پُرخلوص لہجے

''میرے ذہن میں جو ترکیب ہے، میرا خیال ہے کسی کو شبہ تک نہ ہو گا اور تم
لکھنؤ کو خیر باد کہہ دو گے۔ کیا خیال ہے، کاکوری تک اگر تمہیں پہنچا دیا جا

ہے؟''

میں خلیق کی اس پیشکش کو نہ ٹھکرا سکا۔ ''مگر تم کس طرح یہ انتظام کرو گے؟'' میں نے
اس سے سوال کیا۔

''میرا خیال ہے، میں اس سلسلے میں یقیناً کچھ کر سکوں گا۔'' خلیق نے کہا۔ ''مجھ پر
اعتماد کرو۔''

''مگر میں تنہا نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میرے ساتھ دو افراد اور بھی ہیں۔'' میں
نے اب خلیق پر پورا اعتماد کر لیا تھا کہ وہ مجھے دھوکا نہیں دے گا۔ اگر اسے دھوکا دینا ہی ہوتا تو
پھر وہ مجھے قبل از وقت خطرے سے کیوں آگاہ کرتا۔ پھر وہ خود بھی اسی مقصد کو حاصل کرنے
کی جدوجہد میں شامل تھا جو ہمارا مطمع نظر تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہماری راہیں جدا جدا
تھیں۔

''کیا مطلب؟'' خلیق نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔ ''کون سے دو افراد؟''

اس کے بعد میں نے اسے جتنا کچھ ضروری تھا، وہ بتا دیا۔ میری گفتگو سننے کے بعد
ایک لمحے کے لیے خلیق سوچ میں پڑ گیا، پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے، تم فکر نہ کرو۔ وہ بھی تمہارے
ساتھ ہوں گے۔'' اس کے لہجے میں عزم اور صداقت کی جھلک تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا،
اس پر عمل کرنے کا بھی ارادہ رکھتا تھا۔

مجھے خلیق الزماں کا وہ سلوک آج بھی یاد ہے اور مرتے دم تک یاد رہے گا۔ کیسے کیسے
لوگ تھے کہ ذاتی اختلافات کو کبھی کسی بڑے مقصد کی تکمیل میں آڑے نہ آنے دیتے تھے۔
میں نے اس سے قبل خلیق الزماں کو کتنا کچھ سخت سُست نہ کہا تھا لیکن اس دن جب میں
پریشانیوں میں گھرا ہوا تھا، وہ یہ سب کچھ بھول گیا تھا اور اسے صرف یہی ایک خیال تھا کہ
کسی طرح مجھے اس مصیبت سے نکالنے کے لیے میری مدد کرے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ خود
بھی خطرات مول لے رہا تھا، یہ بات مجھے اچھی طرح معلوم تھی۔ ایک ایسے آدمی کی مدد کرنا
جس کی پولیس کو تلاش تھی، ظاہر ہے حکومت اور اس کی مشینری کی نظر میں اچھی بات نہ تھی۔
اگر اس کوشش میں ناکامی ہوتی تو میرے ساتھ اس کا نتھی ہونا بھی لازمی تھا۔ اس وقت
مجھے خلیق بہت پیارا انسان لگا تھا اور میں خود اپنے آپ سے نادم تھا کہ کیوں میں نے ماضی
میں اسے برا بھلا کہا تھا۔

''خلیق! میرے دوست!'' میں نے کہا۔ ''میں اپنی سابقہ زیادتیوں پر نادم ہوں۔''

''کون سی زیادتیاں؟'' خلیق الزماں نے کہا تھا۔ ''تم کیا پچھلی ملاقات کی بات کر

رہے ہو! سنو، ان باتوں کو بھول جاؤ! اس کے بعد میں نے اکثر تمہارے نقطۂ نظر
بارے میں سوچا ہے۔ میں نے اس نقطۂ نظر کو غلط نہیں پایا لیکن اب بھی میرا خیال
ہندوستان کے لیے اس لائحۂ عمل کے لیے فضا سازگار نہیں ہے۔ یہ اندازِ فکر کا اختلاف
حصولِ مقصد پر تو کوئی اختلاف نہیں۔ اب جبکہ تم اس راہ پر کافی آگے نکل چکے ہو، میں تم
روکنا بھی نہیں چاہتا۔ میری اب یہی کوشش ہوگی کہ اپنی موجودہ حیثیت میں جس طرح
ہوسکے تمہاری مدد کروں گا۔''

''تم واقعی بہت بڑے آدمی ہو۔'' میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

''آدمی مقصد سے وابستگی کی بنا پر بڑا بنتا ہے۔'' خلیق نے انکسارانہ لہجے میں
''اور یہی بات تمہیں بھی اتنا ہی بڑا بناتی ہے جتنا میں ہوں، اگر واقعی میں بڑا ہوں۔''

پھر خلیق مجھے وہیں چھوڑ کر چلا گیا۔ چلتے وقت اس نے کہا تھا۔ ''اچھا آفاق!
لکھنؤ سے تمہاری روانگی کا انتظام کرتا ہوں۔ تم انتظار کرو۔''

میں اس وقت اسی کمرے میں تھا جہاں چند برس پہلے اخبار ''نیوایرا'' کا دفتر ہوا
تھا جس کے مدیر پنجاب کے جیالے سپوت غلام حسین تھے اور ان کے بعد جس کی ادار
شعیب نے سنبھالی تھی۔ اس کمرے سے کئی یادیں وابستہ تھیں۔ میں نیوایرا کے دنوں
اکثر یہاں آیا کرتا تھا۔ خوب بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ پھر حکومت نے پے در پے اس
سے ضمانتیں طلب کیں۔ حکومت کی پالیسیوں پر تنقید کرنے والے قوم پرست اخباروں
ساتھ برطانوی حکومت کی یہ استعماری پالیسی ناقابلِ فہم نہیں تھی۔ بہر حال خلیق الزماں
عرصے تک تو یہ ضمانتیں مختلف ذرائع سے جمع کراتے رہے، پھر ان کی ہمت جواب
گئی۔ غلام قوموں کی بھی کیا قسمت ہوتی ہے؟ میں آج بھی اکثر سوچتا ہوں۔ انہیں اظ
رائے کی اجازت ہوتی ہے نہ بنیادی شہری حقوق حاصل ہوتے ہیں، نہ حکومت کے ظا
اقدامات پر تنقید تبصرے کی اجازت۔ گو استعماری طاقتیں ہمیشہ غلاموں کو تعمیری تنقید
دینے کا تو دعوی کرتی ہیں لیکن تعمیری تنقید ایک ایسی مضحکہ خیز اصطلاح ہے جس کے ذیل
صرف تعریف و توصیف کے ڈونگرے برسانا ہی درست ٹھہرتا ہے۔ اگر انگلستان کا کو
اخبار بند کیا جاتا، جس طرح نیوایرا بند ہوا تھا تو انگلستان میں ہاہا کار مچ جاتی، ہنگ
ہوتے، اسے آزادیٔ صحافت پر ضرب قرار دیا جاتا، برطانوی پارلیمنٹ میں حکومت
پرخچے اڑا دیے جاتے مگر نیوایرا تو ایک غلام ملک کی غلام رعایا کی ترجمانی کر رہا
غاصب حکمرانوں میں اتنا ظرف کہاں کہ غلاموں کو بولنے کا حق دیں۔ ان کا بس چلے

الفاظ لکھنے والوں کی انگلیاں اور حق بات کہنے والی زبانوں کو قلم کر ڈالیں۔

تقریباً نصف گھنٹے بعد خلیق کی واپسی ہوئی۔ اس مرتبہ وہ کار میں آیا تھا۔ یہ کار میری
کیا لکھنؤ بھر میں جانی پہچانی تھی۔ میں جب کار میں بیٹھا تو خلیق نے ڈرائیور سے کہا تھا۔
''یہاں سے تمہیں مصرا کے گھر جانا ہے۔ وہاں سے دو مہمان اور بیٹھیں گے، ان سب کو
کاکوری چھوڑ آنا۔'' اس کے بعد خلیق نے مجھ سے کہا تھا۔ ''مہندر کو آگے بٹھانا، تم پیچھے ہی
بیٹھنا، یہی بہتر ہے۔'' خلیق نے اس کے بعد مجھے بتایا تھا کہ یہ کار حاصل کرنے سے پہلے
اس نے مہندر اور لالی کو ہرکرن ناتھ مصرا کے گھر منتقل کر دیا تھا۔

پنڈت ہرکرن ناتھ مصرا کے گھر سے مہندر اور لالی بھی کار میں بیٹھ گئے۔ لالی کو دیکھ
کر میری مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔

''سلام شیرازی جی!'' اس نے میرے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا تھا۔ ساتھ ہی اپنا ہاتھ
میری طرف بڑھا دیا تھا۔

اس کا نرم و نازک ہاتھ میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس ہاتھ کے لمس سے ایک
نشہ ایک سرور میرے رگ و پے میں گھل گیا۔ ''نمستے!'' میں نے اسی اپنائیت سے جواب
دیا۔

''ہائے شیرازی جی!'' اس نے کہا۔ ''آپ تو بڑے ہی بے مروت ہیں۔''

''ارے، ارے بھئی یہ الزام تو نہ لگاؤ۔'' میں نے کہا۔

''اور بہت کنجوس بھی!'' لالی نے کہا۔

اس مرتبہ مہندر ہنس پڑا۔ ''شیرازی جی! تم نہیں سمجھو گے۔'' اس نے کہا۔ ''یہ سب
تمہارے خطوط پر تبصرہ ہو رہا ہے۔''

لالی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ''اور نہیں تو کیا۔ اب اتنی بھی بے مروتی کیا کہ خط میں جتنی
بات لکھو صرف اسی کا جواب ملے، وہ بھی روکھا، پھیکا۔''

''بھئی میں نہ شاعر، نہ ادیب؟'' میں نے کہا۔ ''باتیں تو مجھے بنانی ہی نہیں آتیں۔''

''خط تم مختصر لکھتے تھے اور یہ مجھ سے لڑتی تھی۔'' مہندر نے کہا۔ ''تمہارے دوسرے
خط پر تو یہ اتنی تلملائی تھی کہ کچھ نہ پوچھو۔ کہہ رہی تھی، اب کے پوری کاپی لکھ کر بھیجوں گی، پھر
دیکھتی ہوں حضرت کیسے لمبا خط نہیں لکھتے۔''

گویا جو تشنگی میں اس کے خط پڑھ کر محسوس کرتا تھا، اسی تشنگی کا وہ بھی شکار تھی۔ ''بات
یہ ہے کہ لالی کہ تم نے ہی مجھے کون سے تفصیلی خط لکھے تھے۔''

''چلو میں نے نہیں لکھے تو کیا ہوا شیرازی جی! تمہیں تو منع نہیں کیا تھا میرے
خط لکھنے سے۔'' لالی نے میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ''کیوں مہندر بھیا ٹھیک کہہ رہی
نا میں؟''

''بھئی یہ تمہارا اور شیرازی جی کا معاملہ ہے، مجھے بیچ میں مت لاؤ۔'' مہندر نے
جواب دیا۔

''مگر بھئی اس میں بے مروتی کی کیا بات ہوئی۔ ہاں اگر میں جواب نہ دیتا تو
ہوتی بے مروتی کی۔'' میں نے کہا۔

''بے مروتی کی بات نہیں کر رہی ہوں شیراز جی!'' لالی نے شوخی سے کہا۔ ''یہ
آپ کی کنجوسی کی باتیں کر رہی ہوں۔''

''بے مروتی میں نے کیا دکھائی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''یہ بتاؤ۔''

''بے مروتی کی بات یہ ہے کہ ہم تو اپنے دیوتا جی کے درشن کے لیے اتنی دور
آئے......'' لالی کے لہجے میں دنیا کے حسین ترین جذبے کی لرزش تھی۔ ''اور دیوتا جی
ہمیں اپنے گھر بھی نہیں بلایا۔'' دیوتا جی کہتے ہوئے اس کی آواز میں شوخی اور اپنائیت
اور اس بات کا اظہار بھی کہ وہ اس ملاقات کو نہیں بھولی تھی جب ہم نے ایک دوسرے کو
جاں کے تمام رشتوں سے جانا اور پہچانا تھا۔

''ہاں لالی!'' میں اس خوشی کے باوجود کچھ افسردہ سا ہو گیا جو الفاظ کے استعمال
لالی کے حسن انتخاب کی بنا پر میں نے اپنے دل میں اترتی محسوس کی تھی۔ ''میں تم
سے شرمندہ ہوں مگر یقین کرو لالی، تم دونوں کو اپنے گھر میں بلا کر، اپنے گھر میں دیکھ کر
اتنی خوشی ہو گی جتنی خوشی مجھے کسی کو مہمان بنا کر نہیں ہو سکتی۔''

لالی کے ہونٹوں سے جلترنگ کی کیف آور نغمگی پھوٹی۔ ''ہائے شیرازی جی!
میں تمہیں بے مروت نہ کہوں تو کیا کہوں۔ ابھی تک ہمیں مہمان ہی سمجھتے ہو اور ہم تو
تمہیں اپنا چکے ہیں۔'' یوں لگا تھا جیسے یاقوت کی سل چیر کے جھرنا پھوٹ بہا ہو اور میرے
پیاسے ہونٹوں کی مانند اس جھرنے کے خنک پانی سے اپنی پیاس بجھا رہا ہو۔

اس مرتبہ مہندر نے قہقہہ لگایا۔ ''اے باتونی لڑکی!'' اس نے کہا تھا۔ ''تم
ایک سیدھے سادے آدمی کو پریشان کر رہی ہو۔''

''اے مہندر بھیا!'' اس کی گفتار کا ترنم پھر گونجا۔ ''سیدھے تو آپ ہیں کہ
خطرناک آدمی کو سیدھا کہہ رہے ہیں جو پہلی ہی ملاقات میں لوگوں کی نیندیں چرالیتا

اپنا گرویدہ بنالیتا ہے۔''

لالی، نیندیں تو تم نے بھی میری چرالی ہیں، میں نے دل ہی دل میں سوچا لیکن میں
یہ بات نہ کہہ سکا، کہا تو صرف اتنا۔ ''اگر تمہارے نزدیک خطرناک ہونے کا معیار یہی ہے تو
پھر تم دونوں مجھ سے زیادہ خطرناک ہو کہ مجھ جیسے خطرناک آدمی اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔''

''ہم اپنی بات تو کر ہی نہیں رہے شیرازی جی!'' لالی نے کہا۔ ''ہم تو دوسروں کی
باتیں کر رہے ہیں۔''

''کون دوسرے؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''ہم شکنتلا کی بات کر رہے ہیں جناب!'' لالی نے کہا۔ ''وہ آج تک یاد کرتی ہے
جناب کو، تعریف کرتے نہیں تھکتی۔''

''ہاں یار شیرازی!'' مہندر نے کہا۔ ''شکنتلا پر تو تم نے واقعی جادو کر دیا ہے اور اس
لالی کی بچی نے اس کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ جہاں اس نے تعریف کی اور اس نے لیا اسے
الٹے ہاتھوں۔ پھر یہ تمہاری ایسی ایسی برائیاں کرتی ہے، ایسے ایسے کیڑے نکالتی ہے تم میں
کہ توبہ ہی بھلی۔ بیچاری شکنتلا روہانسی ہو جاتی ہے۔''

''کیوں بھئی یہ کیا بے ایمانی ہے لالی!'' میں نے کہا۔ ''تم ہماری تعریف میں ڈنڈی
کیوں مارتی ہو؟''

''جس طرح ہر چیز کے دو رخ ہوتے ہیں، اسی طرح اس مسئلے کے بھی دو پہلو
ہیں۔'' لالی نے اس مرتبہ ایسا انداز اختیار کیا گویا وہ کلاس روم میں لیکچر دے رہی ہو۔

''یعنی!'' میں نے اسی انداز میں کہا جیسے میں کوئی طالب علم ہوں۔

''اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ جب ہم تمہاری برائی کرتے ہیں تو شکنتلا اور زیادہ
تعریف کرتی ہے جو ہمیں اچھی لگتی ہے۔'' لالی نے کہا۔ ''اور اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہمیں
کسی کے منہ سے تمہاری اچھائی اور تعریف اچھی نہیں لگتی۔''

کاکوری تک کا تمام راستہ ایسی ہی باتوں میں کٹ گیا۔ اس دن میں واقعی مہندر کے
اس جملے کا قائل ہو گیا تھا کہ لالی بہت اچھی گفتگو کرتی ہے۔ اس نے کاکوری تک کے سفر
میں پہلی ملاقات کے بعد سے اب تک کی وہ تمام بے چینیاں، اضطراب اور کشمکش اس گفتگو
میں سمو دیے تھے جن سے وہ گزری تھی۔ اس نے اس گفتگو میں اس جذبے کا تمام کیف اور
نشہ انڈیل دیا تھا جو صرف ہم دونوں کا راز تھا جس میں ہم کسی تیسرے کو شریک نہ کر سکتے تھے
نہ کرنا چاہتے تھے۔

گفتار کے حسن اور آواز کی نغمگی کا یہ جادو اس وقت ٹوٹا جب ڈرائیـ
دی کہ کاکوری آ گیا ہے اور وہ کار کدھر موڑے۔ تب مجھے خیال آیا کہ میں کن خـ
بچ کر لکھنؤ سے نکلا ہوں۔ اس وقت رات کے تقریباً تین بج رہے تھے۔ میں
سے کہا کہ وہ کار سیدھا اسٹیشن لے چلے۔ پہلے میں نے سوچا کہ ہم رات کاکوری
کے ہاں گزاریں گے لیکن اب میں نے یہی سوچا کہ ہمیں جلد از جلد لکھنؤ سے جتنی
ہے نکل جانا چاہیے۔

وہ کار، جس میں ہم نے کاکوری تک کا سفر کیا تھا، خلیق نے کیا ٹپس لڑا کر
اس کا مجھے آج تک علم نہیں ہو سکا۔ بہر حال اس کار میں سفر کی وجہ سے ہم کی
پڑے بغیر لکھنؤ سے نکل آئے تھے۔ اگر اس رات وہ کار نہ ہوتی تو شاید ہم اس
وہاں سے نہ نکل پاتے۔ شاید اس ڈرائیور کو جو اس رات ہمیں کاکوری لے گیا تھا،
خلیق کس بہانے وہ کار لے کر آیا تھا مگر کون جانے وہ ڈرائیور زندہ بھی ہے یا نہیں
18 مئی 1973ء کو انتقال کر گیا۔ اس رات کے بعد میری خلیق سے کئی ملاقاتیں
بھی اور کراچی میں بھی ہوئی تھیں۔ کئی مرتبہ میں نے اس سے پوچھا۔ ''یار خلیق!
اس رات تو نے وہ کار کیسے حاصل کی تھی؟'' مگر ہر مرتبہ وہ اس ذکر کو ٹال گیا۔ نہ
مصلحت تھی اور کیا سبب تھا؟

آج میں آپ کو بتا دوں، وہ کار راجہ صاحب محمود آباد کی تھی اور ان دنوں جب
بات ہے خلیق، راجہ صاحب سے کسی بھی معاملے میں امداد و تعاون حاصل کرنے
سبکی محسوس کرتا تھا۔ حد یہ ہے کہ نیوا یرا کی ضمانت جمع کرانے کے لیے ایک مرتبہ
رقم لے کر آیا تھا لیکن راجہ صاحب سے اس سلسلے میں اس نے کبھی رجوع نہیں کیا تھا۔

☆======☆======☆

ٹرین بہت تیزی سے بمبئی کی طرف اڑی جا رہی تھی۔

فرسٹ کلاس کے اس چھوٹے سے کمپارٹمنٹ میں بس ہم تینوں ہی تھے، میں
مہندر! منصور کے گھر سے، پولیس کے نرغے سے فرار ہونے کے بعد یہ پہلا موقع
مجھے قدرے اطمینان محسوس ہوا تھا۔ فی الحال میں پولیس کی دسترس سے محفوظ ہو
مہندر نے مجھے بتایا تھا کہ میرے وہاں سے فرار کے بعد بھی غلیلوں سے غلے باز
رہی تھی۔ اسی دوران منصور بھی ایک غلے کا شکار ہو چکا تھا لیکن اس سے قبل ہی
مہندر ناتھ سے کہا تھا کہ وہ اس کے گھر سے سیدھا دھرم شالہ پہنچے اور میرا انتظار کرے

چند منٹ بعد جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تھا تو پولیس افسر کی پریشانی اور غصہ قابلِ دید تھا۔
منصور کے گھر سے میرے فرار کے لیے یہ موقع فراہم کرنا یقیناً میری تنظیم کے
کارکنوں اور خاص طور پر سالارِ اعظم کا کام تھا۔ مجھے اس کا پکا یقین تھا کہ کیونکہ سالارِ اعظم
کے وسائل کا اندازہ مجھے کچھ کچھ ہو چکا تھا۔ تنظیم اور اس کے سرگرم اراکین سے متعلق انہیں
ہر بات کی اطلاع ہو جاتی تھی۔ یہ کیا ذرائع تھے، اس کا علم صرف سالارِ اعظم ہی کو تھا۔ لکھنؤ
میں میرے خلاف پولیس کی کارروائی کے بارے میں جب خلیق کو علم ہو سکتا تھا۔ تو یقیناً انہیں
بھی علم ہو گیا ہوگا اور پھر ان کا حرکت میں آنا اور مجھے پولیس کے چنگل سے بچانا ضروری تھا
لیکن اگر یہ کارروائی نہ ہوتی تب بھی مجھے فرار کی کوشش تو کرنا ہی تھی۔ اس بات کا بھی
امکان تھا کہ خود منصور ہی شاید ہماری تنظیم میں شامل ہو گیا اور اس نے خلیق کے گھر جاتے
ہوئے اور وہاں سے واپسی کے دوران میں یہ انتظام کیا ہو۔

لیکن اب سب کچھ قصہٴ پارینہ بن چکا تھا۔ اس وقت میں، مہندر اور لالی کے ساتھ
ٹرین میں سوار تھا۔ پیش قدمی کرنے والے فوجی کبھی پلٹ کر یہ نہیں دیکھتے کہ پیچھے کیا ہوا،
کون دشمن کی چلائی ہوئی گولی سے شکار ہوا، انہیں تو بس سامنے اپنے ہدف پر نظر رکھتے
ہوئے بڑھنا ہوتا ہے۔ میرا ذہن اب بمبئی کی مہم کو کامیاب بنانے کی ادھیڑ بُن میں مصروف
تھا۔ بمبئی جو میرے لیے ایک قطعی اجنبی شہر تھا۔

''مگر یار مہندر!'' میں نے اس سے کہا تھا۔ ''تم نے ابھی تک یہ نہیں پوچھا کہ بمبئی
ہم کیوں جا رہے ہیں؟''

''میرا خیال تھا کہ تم خود ہی بتا دو گے۔'' مہندر نے کہا۔ ''ظاہر ہے تم نے مجھے یونہی
اپنے ساتھ نہیں لیا۔''

پھر جب میں نے اسے بمبئی کی مہم کے بارے میں بتایا تو وہ اچھل پڑا۔ ''یہ ہوئی نا
بات! ہمیں ایسی کارروائیاں کرنی چاہئیں جن سے انگریزوں کے خلاف ہماری نفرتیں
پوری شدت سے ظاہر ہوں۔''

''اور تمہیں میں نے اس لیے ساتھ لیا ہے کہ بمبئی میرے لیے قطعی اجنبی شہر ہے۔''
...ل نے مہندر سے کہا۔ ''تم بمبئی سے واقف ہو تو وہاں کے لوگوں سے بھی واقف ہو گے
لیکن تم اکثر یہاں آتے رہتے ہو۔''

''میں تمہارے ساتھ ہوں۔ یہ مہم صرف تمہاری ہی نہیں میری بھی ہے۔ بے فکر رہو
...اس مہم کو کامیاب بنا کر رہیں گے۔''

پھر اس نے بتایا تھا کہ بمبئی میں اس کے تعلقات ایسے افراد اور ایسے حلقوں
ہیں جنہیں باغی اور انقلابی کہا جاسکتا ہے۔

''میرا بھی یہی اندازہ تھا۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارا اندازِ فکر اسی امر کا متقاضی
''کیا مطلب؟'' مہندر نے کہا۔

''تمہارے شریر میں ایک بے چین آتما ہے۔'' میں نے اس وقت نہ معلوم
ہندی الفاظ استعمال کیے تھے۔ ''یہ بے چین آتما کبھی ایسے لوگوں کو دوست نہیں بنا
بے حس اور راضی بہ رضا ہوں۔''

''مگر یار!'' مہندر نے بے حد سنجیدگی سے کہا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ ہماری
جہد کامیاب ہوگی۔''

''یہ جدوجہد ضرور کامیاب ہوگی۔ ہماری زندگی میں نہیں تو آنے والی نسل کی
میں۔'' میں نے کہا تھا۔ ''مجھے صرف اتنا یقین ہے کہ میں اور میرے ساتھی اس
آزادی کا ہراول ہیں جو لڑی جانے والی ہے۔ اگر ہم نے اپنا فرض دیانتداری سے
دیا تو ہمارے پیچھے آنے والوں کو بڑھنے میں آسانی ہوگی میرے دوست!''

''کبھی کبھی میرا دل ڈوب سا جاتا ہے۔ میں مایوسیوں کا شکار ہو جاتا ہوں۔''
نے کہا۔

''وہ کیوں؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''وہ اس لیے شیرازی جی کہ میں اپنے لوگوں کو بٹتے اور تقسیم ہوتے دیکھ رہا ہوں۔
ہندوستان ایک ملک ہے مگر یہاں کے لوگ گروہ در گروہ بٹ رہے ہیں۔ سب سے پہلی
ہندو اور مسلمان کی ہے، پھر ہندو اور مسلمان مزید ٹکڑیوں میں منقسم ہیں۔ ٹھیک ہے،
وقت ہندو مسلم ایکتا کا بڑا چرچا ہے۔ گاندھی اچھوتوں کی دلجوئی میں مصروف ہیں۔
کے لیے بڑی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اس اتحاد کے مظاہرے بھی جاری ہیں مگر اس
ساتھ ہی اس اتحاد کو مستحکم ہونے سے پہلے ہی بکھیر دینے کی کوششیں بھی ہو رہی ہیں۔''

''یہ دنیا اسی آویزش اور تصادم کا نام ہے میرے دوست! میں سوچتا ہوں کہ
تصادم سے ایک نئی قوت اور نئی توانائی جنم لے گی۔''

''میں اتنی خوش فہمیوں کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا۔'' مہندر نے کہا۔ ''میں اس
ایک بھیانک انجام دیکھ رہا ہوں۔ اتحاد اور ایکتا کی باتیں جو اس وقت ہو رہی ہیں
سب مجھے مصنوعی معلوم ہوتی ہیں، بے سود معلوم ہوتی ہیں۔''

''کیوں؟'' میں نے سوال کیا تھا۔

''ایک طرف ہم ایکتا کی باتیں کرتے ہیں۔ دوسری طرف ہم آپس کی تقسیم اور
تفریق کو گہرا کرتے جارہے ہیں۔ ہر اسٹیشن پر ہندو پانی اور مسلمان پانی کی آوازیں جب
میں سنتا ہوں تو چونک اٹھتا ہوں۔ جب ہم پانی کو ہندو اور مسلمانوں میں تقسیم کرسکتے ہیں تو
پھر کیا نہیں کرسکتے۔ یہ آواز سن کر میرے ذہن سے یہ آواز ابھرتی ہے کہ ایک دن ہندو
ہندوستان اور مسلمان ہندوستان کی صدائیں بھی لگیں گی اور پھر ہندوستان کی تقسیم کو کوئی
نہیں روک سکے گا۔'' مہندر کی آواز بھرا گئی تھی۔

میں سوچتا رہا۔ واقعی مہندر سچ کہہ رہا تھا۔ میں نے اس انداز میں آج تک نہیں سوچا
تھا۔

''اور جب یہ آوازیں لگیں گی تو ہندو اور مسلمان دونوں ہندوستان کے لیے سوتیلی
ماں بن جائیں گے۔'' مہندر نے کہا۔ ''وہ اس کو تقسیم کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اس
وقت ہندوستان کی کوئی سگی ماں نہ ہوگی۔ جو بڑھ کر یہ کہے کہ نہیں اس کے ٹکڑے نہ کرو۔ یہ
دوسرے کو دے دو۔''

''یار، تم تو بہت ہولناک تصویر دکھا رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''یہ تصویر میں اکثر اپنے تصور میں دیکھتا ہوں۔ دونوں قوموں کے افراد میں چھپا ہوا
انسان مر رہا ہے۔ آخر ہمارے یہ لیڈر جو اتحاد اور ایکتا کے بڑے پرچارک بنتے ہیں،
ہندو پانی اور مسلمان پانی کی تفریق ختم کیوں نہیں کرتے۔ ایک پلیٹ فارم سے لمبے
چوڑے دعووں سے پُرتقریریں کرنے والے لیڈر اسٹیشنوں پر آکر ہندو پانی اور مسلمان پانی
کو ملا کیوں نہیں دیتے؟''

لالی جو اب تک خاموشی کے ساتھ اس گفتگو کو سن رہی تھی بولی۔ ''بھیا! اس انداز میں
سوچنے سے فائدہ! تمہیں تو بس اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جو مقصد تمہارے سامنے
ہے اسے حاصل کیا جائے۔ کیا اس وقت اس کمپارٹمنٹ میں ہندو مسلمان پانی ایک نہیں ہو
گیا۔ اگر کسی وقت، ہندوستان اور مسلم ہندوستان کا نعرہ زبانِ خلق بن گیا بھیا تو کوئی اسے
نہیں روک سکے گا۔''

''یہ میں بھی جانتا ہوں۔'' مہندر نے کہا۔ ''اور مجھے یقین ہے ایسا ضرور ہوگا۔ جو
لنگڑی لولی ہندو مسلم ایکتا اس وقت قائم ہوئی ہے، انگریز اسے تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔
اس کے اشارے پر بہت سے ہندو اور مسلمان اس ایکتا کو ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔''

''کیوں شیرازی جی!'' لالی بولی۔ ''اگر ایسا ہوا تو کیا تم ہمیں مسلم ہندوستان کا
مہمان بناؤ گے؟'' لالی یقیناً اس موضوع کو بدلنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' میں نے اسی سے الٹا سوال کر دیا۔ ''تمہارا دل کیا
ہے؟''

''ہمارا دل!'' لالی ہنسی تھی، اس کی ہنسی میں اداسی بھی تھی اور نغمگی بھی۔ ''ارے
بڑا بے ایمان ہے۔ کبھی کچھ سوچتا ہے کبھی کچھ لیکن سچی بات تو یہ ہے ہم تمہیں کبھی نہیں جانے
دیں گے۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ایسے کہ تمہارا مسلم ہندوستان تو ہم نے اپنے دل کو بنا لیا ہے۔ تم یہاں سے کہاں
نکل سکتے ہو!''

مہندر نے اس کی کمر پر دھپ مارا تھا۔ ''باتوں کی شہزادی!'' اس نے کہا تھا۔ ''یہ
باتیں تُو نے کہاں سے سیکھی ہیں؟''

''آپ ہی سے۔'' لالی نے اپنے بھائی کے شانے پر سر ٹکا دیا اور ٹکر ٹکر مجھے دیکھنے
لگی۔

یہ کیسی لڑکی ہے میرے خدا، میں نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔ یہ تو میرے حواس پر
چھائی چلی جا رہی ہے۔ کاش میرے پاس بھی اس کا سا اندازِ بیان ہوتا۔

بمبئی تک کا یہ سفر بڑا یادگار سفر تھا۔ مہندر کی رفاقت اپنی جگہ مگر لالی جیسی شریکِ سفر کی
وجہ سے تو وہ گزرتا معلوم ہی نہیں ہوا۔ میں آج بھی یہی سوچتا ہوں، کاش وہ ٹرین بمبئی نہ
جا رہی ہوتی اور اگر بمبئی ہی جا رہی تھی تو بمبئی اتنی دور ہوتا کہ تمام عمر اسی سفر میں کٹ جاتی۔
اس کی باتوں کی خوشبو میں میرا جسم، میرا ذہن اور میری روح غسل کرتے رہتے۔

آج یہ سب باتیں عذاب ہیں۔ یادوں کے ایسے سانپ ہیں جنہوں نے میرے
وجود کو اپنے حلقوں میں کس لیا ہے اور ہر یاد ایک سانپ بن کر مجھے ڈس رہی ہے۔ لالی!
لالی! تم کہاں ہو؟ تم نے تو کہا تھا کہ تم نے اپنے دل کو میرے لیے مسلم ہندوستان بنا دیا
ہے۔ تم تو کہتی تھیں کہ مجھے کبھی اپنے دل سے نہیں نکلنے دو گی۔ وہ وعدے کیا ہوئے لالی؟
بتاؤ بے مروت میں ہوں یا تم؟

وہ دونوں بضد تھے کہ میں بمبئی میں انہی کے گھر قیام کروں مگر میں ایسا نہیں کر سکتا
تھا۔ سالارِ اعظم کی ہدایت تھی کہ مجھے حاجی اسماعیل کے مسافر خانے میں قیام کرنا ہے۔

یہیں دوسرے کامریڈ بھی مجھ سے ملنے والے تھے، پھر ان کے ساتھ ہی ہمیں بمبئی کی مہم کی
تیاری کرنا تھی۔ بہر حال میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ جونہی مجھے حاجی اسماعیل کے مسافر
خانے سے منتقل ہونے کی اجازت ملی، میں ان کے ہاں چلا آؤں گا، سو وہ مجھے حاجی
اسماعیل کے مسافر خانے پر اتار کر اپنے گھر چلے گئے تھے۔ ان کا گھر کرلا میں تھا، جس کا پتا
مہندر نے مجھے دے دیا تھا اور یہ کہتے ہوئے دیا تھا۔ ''ویسے تو میں کل صبح خود آؤں گا پھر بھی
احتیاطاً یہ پتا پاس رکھو۔ دن رات، کسی بھی سمے آؤ، تمہارا گھر ہے۔''

لکھنؤ سے فرار کا یہ تیسرا دن تھا جب ہم بمبئی پہنچے تھے۔ میں اپنے پروگرام سے تین
دن پہلے بمبئی آ گیا تھا۔

☆======☆======☆

میرا یہ فیصلہ کہ مجھے بہر حال حاجی اسماعیل کے مسافر خانے میں ٹھہرنا چا
درست ثابت ہوا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا تھا کہ میں کیونکہ تین دن پہلے بمبئی
گیا ہوں تو پھر کیوں نہ مہندر کے گھر ہی قیام کروں اور پروگرام کے مطابق مقررہ دن حا
اسماعیل کے مسافر خانے پہنچ جاؤں۔ یہ میرے دل کی آواز تھی جو لالی کے قرب کا خواہش
تھا مگر میرے ذہن نے دل کی اس خواہش پر فرض کو ترجیح دی۔

مجھے ابھی مسافر خانے میں آئے ہوئے نصف گھنٹہ ہی گزرا ہوگا کہ میرے کمر
کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ایک اجنبی شخص درواز
کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ٹیپو سلطان کا مشہور قول دہرا دیا۔ میں نے جواب م
کہا۔ ''رات ختم ہو رہی ہے، صبح ضرور طلوع ہوگی۔''

وہ اندر آ گیا۔ میں حیران تھا کہ یہ کامریڈ اس وقت کیوں اور کیسے میرے پاس پہ
گیا جبکہ میں تین دن پہلے بمبئی آ گیا ہوں۔ ''مجھے حیرت ہے، میرا خیال تھا مجھے تین د
انتظار کرنا پڑے گا۔'' میں نے آنے والے سے کہا تھا۔

''مجھے رات ہی تار مل گیا تھا کامریڈ سعدی!'' اس نے کہا۔ ''ورنہ ہمارے پاس تو
یہ اطلاع تھی کہ آپ یکم کو یہاں پہنچیں گے۔'' اس نے جیب سے تار نکالا۔ ''یہ لو، دیکھو
تار لکھنؤ سے دیا گیا تھا۔ تار کا وہ حصہ پھاڑ دیا گیا تھا جس پر تار وصول کرنے والے کا
اور پتا لکھا تھا۔ تار کا مضمون یہ تھا۔ ''سعدی 30 کو بمبئی پہنچ رہا ہے۔ مال کی بکنگ منسوخ ہو گ
ہے۔ مزید دو کریٹ نہیں بھیجے جا سکتے۔'' میں نے تار کا مضمون پڑھ کر تار اسے واپس کر دیا۔

''دیکھا آپ نے!'' نووارد نے کہا۔ ''اس طرح ہمیں آپ کے آنے کی اطلا
ہوئی تھی''۔

''باقی اور جملوں کا مطلب کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا مطلب ہے، مہم منسوخ، مزید دو کامریڈ نہیں آئیں گے۔''

''مہم کیوں منسوخ کر دی گئی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ مجھے نہیں معلوم کامریڈ!'' آنے والے نے کہا۔ ''مجھے آپ کو صرف یہ اطلاع
دینا ہے کہ اگلے ہفتے، آج کے دن شام، ٹھیک تین بجے، بائی کلہ کلب کے سامنے، میرا
مطلب ہے کلب کے مین گیٹ کے سامنے موجود ہوں۔ آپ کے ہاتھ میں گاندھی جی کے
اخبار ینگ انڈیا کا تازہ شمارہ ہونا چاہیے۔ ٹھیک تین بجے جب آپ مین گیٹ کے سامنے
سڑک کی دوسری جانب سے گزریں تو جھک کر اپنے جوتے کا فیتہ کھول کر باندھیں، گویا
آپ فیتہ کس رہے ہوں۔ فیتہ کسنے کے بعد آپ ینگ انڈیا کا شمارہ موڑ کر دائیں بغل میں
دبالیں اور رومال سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے آگے چلے جائیں۔ سمجھے گئے نا آپ! اگلے
ہفتے آج ہی کے دن، شام تین بجے بائی کلہ کلب اور ینگ انڈیا کا تازہ شمارہ! کلب کے مین
گیٹ کے سامنے سے سڑک کے دوسرے کنارے پر جب آپ گزریں گے تو جھک کر
جوتے کا فیتہ اس طرح کھول کر باندھیں گے جیسے فیتہ کس رہے ہوں، پھر جب آپ کھڑے
ہوں گے......''

''تو میں ینگ انڈیا کا شمارہ موڑ کر دائیں بغل میں دبالوں گا اور جیب سے رومال
نکال کر ہاتھ صاف کرتا ہوا بڑھتا چلا جاؤں گا۔'' میں نے کہا، پھر پوچھا۔ ''کیا یہ ضروری
ہے کہ میں یہیں اسی مسافر خانے میں مقیم رہوں۔''

''یہ مجھے معلوم نہیں۔'' اس کامریڈ نے کہا۔ ''البتہ ہدایت ضرور ہے کہ اس عرصے
میں آپ بمبئی کے محلوں اور سڑکوں سے جتنا زیادہ سے زیادہ واقف ہو سکتے ہیں، واقف ہو
جائیں۔''

''اور کچھ؟''

''فی الحال اور کچھ نہیں۔ اب کوئی آپ سے رابطہ قائم نہیں کرے گا۔'' کامریڈ نے
کہا۔ ''اچھا میں چلتا ہوں، خدا حافظ۔''

میں نے پھر دروازہ بند کر لیا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ
اچانک یہ مہم منسوخ کیوں کر دی گئی ہے۔ میں نے اس سلسلے میں اس کامریڈ سے پوچھا تھا
لیکن جب اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تو میں نے بھی اصرار کرنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ یہ بات
تنظیم کے بنیادی اصولوں کے منافی تھی۔ تنظیم کی ایک طے شدہ پالیسی تھی کہ کسی بھی مہم کے
بارے میں صرف اتنے ہی کامریڈوں کو علم ہوتا جنہیں متعلقہ مہم میں براہ راست حصہ لینا
ہوتا یا مہم کے کسی مرحلے پر ان کی مدد کرنا ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی کسی کامریڈ کو کوئی مہم

سونپی جاتی اس سے رازداری کا حلف بھی لیا جاتا۔

کامریڈ مجھے اطلاع دے کر بھی کا جا چکا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ میرا بمبئی آ
سود ہی رہا لیکن شاید اب مجھے بمبئی میں ہی کوئی اور مہم سونپی جانی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ 4 اگست
کو مجھے بائی کلہ کلب کے سامنے پہنچنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ اصل مہم کیوں ملتوی کی گئی، یہ
سوال جیسے میرے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ کیا حکومت کو ہمارے ارادوں کا علم ہو گیا
تھا؟ یہ امکان اپنی جگہ قوی تھا۔ کالی بھیڑیں کہاں نہیں ہوتیں، تو پھر وہ کالی بھیڑ کون تھی؟

اب میرے لیے مسافر خانے میں مزید رکنا محال تھا۔ میں نے فوراً ہی مہندر کے ہاں
منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا واحد سبب یہ تھا کہ میں نہ صرف اس مسئلے پر مہندر سے گفتگو
کرنا چاہتا تھا بلکہ آج رات ہی عمر سوبانی سے مل کر سالارِ اعظم کا خط انہیں پہنچانا چاہتا تھا۔
پھر مجھے خالد صاحب کے گھر جا کر بھی انہیں اپنی آمد کی اطلاع دینا تھی اور یہ اندازہ لگانا تھا
کہ اگر مجھے بمبئی میں ہی کوئی اور مہم سونپی جانا ہے تو پھر میں ان کے توسط سے اپنے لیے
کیا کیا آسانیاں فراہم کر سکتا ہوں۔

مہندر اور لالی مجھے دیکھ کر حیران ہی تو رہ گئے۔ ''خیریت؟'' مہندر نے چھوٹتے ہی
پوچھا تھا۔

''ہاں خیریت ہے۔'' میں نے کہا اور ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

''ہائے شیرازی جی!'' لالی نے کہا۔ ''یقین نہیں آ رہا ہے آنکھوں پر۔''

''اشنان کرو گے؟'' مہندر نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں وہاں سے فوراً ہی
بھاگنا پڑا ہے۔''

''پہلے میری بات سن لو۔'' میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے مہندر سے کہا۔

''کہو، کہو۔'' مہندر نے جواب دیا۔ ''گھر میں کوئی نہیں ہے۔''

''بمبئی میں ہماری مہم منسوخ ہو چکی ہے اسی لیے میں یہاں منتقل ہو گیا ہوں۔''

''مہم کی منسوخی کی اطلاع مجھے ہو چکی ہے۔'' مہندر نے کہا۔ ''اس پر ہم بعد میں ابھی
بات کر لیں گے، فی الحال تم نہا دھو کر تازہ دم ہو جاؤ۔''

غسل کر کے اور کپڑے تبدیل کر کے جب میں باتھ روم سے آیا تو ڈرائنگ روم میں
لالی اور مہندر چائے پر میرا انتظار کر رہے تھے۔ ''کیوں، یہاں تمہارے پتا جی کے ساتھ
کوئی اور نہیں رہتا؟''

''دو ملازم ہیں۔'' مہندر نے جواب دیا تھا۔ ''اور ہفتے میں تین چار دن کوئی نہ کوئی

مہمان آتا جاتا ہی رہتا ہے۔'' وہ ہنستا تھا۔

''کوئی بہت ہی راز کی بات ہے تو بتاؤ، باہر چلے چلتے ہیں۔'' اس نے لالی کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔

''سوچ لو مہندر بھیا!'' لالی نے کہا۔ ''جب تک شیرازی جی یہاں ہیں، تم کوئی بات
مجھ سے چھپ کر نہیں کر سکتے۔''

چائے پیتے ہوئے میں نے پوچھا تھا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا تھا کہ ہماری مہم منسوخ ہو
چکی ہے؟''

''اخبارات سے۔'' مہندر نے کہا۔

''اخبارات سے؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا مطلب؟ کیا ہماری تنظیم کے بارے میں
کوئی خبر شائع ہوئی ہے؟''

''ہاں۔'' لالی نے کہا۔ ''ایسی ویسی خبر، بہت بڑی خبر شائع ہوئی ہے۔ بھیا نے
پڑھتے ہی کہا تھا، لو بھئی تمہارے کامریڈ سعدی، عرف شنکر جی شیرازی اور عرف نہ معلوم کیا
کیا، کا تو بمبئی آنا ہی بیکار ہو گیا۔''

''مجھے دکھاؤ اخبار۔'' میں نے پیالی رکھتے ہوئے کہا۔ ''کچھ گرفتاریاں بھی عمل میں
آئی ہیں؟''

''جی ہاں صرف ایک۔'' لالی نے کہا۔ ''کامریڈ سعدی کی، جو اس وقت مہندر لاج،
کرلا میں مقید ہیں۔''

''سچ بتاؤ مجھے اخبار دکھاؤ۔'' میں نے بے صبری سے کہا۔

''ارے یار تم چائے پیو، اخبار بھی دیکھ لینا۔ کل کے اخبار میں کانگریس کا ایک
ریزولیوشن چھپا ہے، اس سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ تمہاری مہم منسوخ ہو گئی ہے۔ اس
ریزولیوشن میں کانگریس نے ہندوستان کے عوام سے ایک مرتبہ پھر پرنس آف ویلز کے
دورے کا بائیکاٹ کرنے کی اپیل کی ہے۔ اسی ریزولیوشن میں لکھا ہوا ہے کہ پرنس،
نومبر میں ہندوستان کے دورے پر آئیں گے۔''

چائے پینے کے بعد میں نے اخبارات دیکھنے شروع کیے۔ میں نے چار پانچ دن
سے اخبارات نہیں دیکھے تھے اور اب یوں لگ رہا تھا جیسے وہ دن میرے زندگی میں آئے ہی
نہیں تھے۔ مہندر نے مجھے پچھلی تاریخوں کا ایک اخبار دیا۔ وہ غالباً بمبئی کرانیکل تھا۔ ''لو یہ
دیکھو'' اس نے کہا۔ ''یہ کانگریس کے تازہ ریزولیوشن پڑھو۔'' وہ اخبار دے کر ڈرائنگ

روم سے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا تو میں ریزولیوشن پڑھ چکا تھا اور دوسرا اخبار دیکھ رہا تھا۔

"پڑھ لیے؟" اس نے کہا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے کہا۔ "اب کیا خیال ہے؟"

"انتہائی مایوس کن ریزولیوشن ہیں۔" میرا تبصرہ تھا۔ "بلکہ میرے خیال میں ریزولیوشن شرمناک پسپائی کے مترادف ہیں۔"

"اس سے بھی زیادہ شیرازی جی!" مہندر ناتھ نے کہا۔ "یہ ریزولیوشن ہندوستان سے غداری ہیں، اس کی جنتا سے غداری ہیں۔ ان کے ذریعے اس اصل بڑی تحریک کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کے نتیجے میں کراچی خلافت کانفرنس نے بعض ایسے اہم اور انقلابی ریزولیوشن پاس کیے تھے جو ایک طرح سے برطانوی حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ تھے۔ کانگریس کے ان ریزولیوشنوں میں ایک جھنکار تو سنائی دیتی ہے مگر جھنکار جنگ کے نقارے کی نہیں، بھڑکتے الاؤ پر پانی ڈالنے سے پیدا ہونے والی سنسناہٹ کی آواز ہے۔"

اب مجھے یاد آیا، مہندر کس بات کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

مہندر اپنی رو میں کہے جا رہا تھا۔ "کراچی خلافت کانفرنس نے اعلان کیا تھا کہ ہندوستان کے عوام، پولیس اور فوج کی ملازمتوں کا بائیکاٹ کریں گے۔ محمد علی جوہر نے اس کانفرنس میں تقریر کی تھی، وہ ایک باغیانہ تقریر تھی، وہ پورے ہندوستان کی آواز تھی مگر ان ریزولیوشنوں سے ایسا لگتا ہے کہ کانگریس کو وہ طبل جنگ ہی نہیں سنائی دیا جس پر کراچی میں تھاپ پڑی تھی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کانگریس سے یہ چوک کیسے ہو گئی۔" میں نے کہا۔

"یہ بھول چوک کی بات نہیں ہے میرے دوست! یہ ایک سوچی سمجھی حرکت ہے۔ گاندھی جی نے سوراج کے قیام کے لیے ایک سال کی مدت دی تھی۔ انہوں نے یہ دعوے کیے تھے کہ اس سال یکم اگست کو ہندوستان میں سوراج قائم ہو جائے گا، پھر انہوں نے مدت جنوری تک بڑھا دی۔ اسی سوراج کے قیام کا تیسرا مرحلہ انہوں نے فوج اور پولیس کی ملازمتوں کا مقاطعہ قرار دیا تھا۔ اس اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو گاندھی جی اور کانگریس کا یہ فرض تھا کہ وہ اس ضمن میں کوئی ریزولیوشن پاس کرتے، کراچی خلافت کانفرنس سے بڑھ کر ریزولیوشن پاس کرتے مگر انہوں نے تو خلافت کانفرنس کے اس ریزولیوشن کی حمایت

میں بھی ایک کلمۂ خیر نہیں کہا۔ پھر یہ کوئی زیادہ پرانی بات بھی نہیں ہے۔ کراچی خلافت کانفرنس اسی مہینے تو ہوئی ہے، پندرہ بیس دن ہی تو گزرے ہیں۔ کانگریس اور گاندھی جی کا یہ رویہ ایک مجرمانہ رویہ ہے۔" مہندر خاموش ہو گیا۔

"ہو سکتا ہے کہ کانگریس نے اس معاملے میں خلافت کمیٹی سے مشورہ کر کے یہ روش اپنائی ہو۔" میں نے کہا۔

"کیا باتیں کرتے ہو شیرازی جی!" اس مرتبہ مہندر کا رویہ بہت تیکھا تھا۔ "تم شاید کھل کر کچھ کہنے سے اس لیے بچ رہے ہو کہ تم مسلمان ہو اور میں ہندو۔" ایک لمحے کے لیے وہ خاموش ہوا۔ بات واقعی کچھ ایسی ہی تھی مگر پھر بھی میں نے اظہار نہیں کیا۔ مہندر کہہ رہا تھا۔ "مگر میں، میں تمہیں بھی اور خود کو بھی صرف ہندوستانی سمجھتا ہوں، انسان سمجھتا ہوں۔ انسانیت میرے نزدیک سب سے بڑا مذہب ہے۔ مجھے بتاؤ شیرازی جی! کیا تمہاری جدوجہد صرف مسلمانوں کے لیے ہے یا پھر ہندوستان کے تمام لوگوں کے لیے؟"

"ہماری جدوجہد کا مقصد ہندوستان کی آزادی ہے، ہندوستان کے تمام لوگوں کی آزادی!" میں نے کہا۔

"اگر میرا یہ خیال نہ ہوتا تو میں کبھی تمہارے ساتھ نہ ہوتا شیرازی جی!" مہندر نے کہا۔ "اسی وجہ سے میں یہ تلخ انداز اختیار کر رہا ہوں۔ تمہیں یاد ہے، خلافت کانفرنس نے اعلان کیا تھا کہ فوج اور پولیس کے مقاطعے کی تحریک پورے ہندوستان کی امنگوں اور خواہشوں کی مظہر ہو گی۔ اب اگر کانگریس نے اس ریزولیوشن کی حمایت نہیں کی تو اس کا مطلب یہی ہے کہ کانگریس، فوج اور پولیس کے مقاطعے کی حمایت میں نہیں ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ کانگریس اس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی ہے۔ اس پر ہندوؤں کا قبضہ ہے جبکہ خلافت تحریک کا تعلق خاص طور پر مسلمانوں سے ہے۔ کانگریس نے خلافت کانفرنس کی اس قرارداد کی حمایت نہ کر کے مسلمانوں کو اس تحریک سے الگ کرنے کی سازش کی ہے جس میں وہ آج تک ہندوؤں کے ساتھ شریک رہے ہیں۔ اس کا مقصد صرف یہ باور کرانا ہے کہ پولیس اور فوج کی ملازمتوں کے مقاطعے کی تحریک صرف مسلمانوں تک محدود ہے۔ پتا ہے اس طرح ہم پھر اٹھارہ سو ستاون میں آ گئے ہیں اور ہم آزادی سے اتنی ہی دور چلے گئے ہیں۔ جتنے اٹھارہ سو ستاون میں تھے۔ کتنی ہولناک پسپائی ہے یہ!"

مہندر جو کچھ کہہ رہا تھا صحیح تھا۔ کانگریس نے اس مرحلے پر مولانا محمد علی، مولانا

شوکت علی اور خلافت تحریک کو چھوڑا تھا جبکہ انگریز حکومت نے ان رہنماؤں پر نہ الزام میں مقدمہ چلانے کے عزائم کے اظہار میں کوئی تکلف برقرار نہیں رکھا تو والے کہتے ہیں کہ اگر کانگریس نے اپنے اس اجلاس میں کراچی خلافت کانفر باغیانہ قرارداد کی حمایت کردی ہوتی تو شاید ہندوستانیوں کو وہ تمام مراعات مل جاتیں وہ مطالبہ کر رہے تھے اور شاید ہندوستان تقسیم بھی نہ ہوتا۔ انگریز حکومت شاید تحریک کے لیڈروں کو گرفتار کرنے اور ان پر مقدمہ چلانے سے قبل کانگریس کے اسی اجلاس انتظار کر رہی تھی۔

"میں نے کہا تھا کہ کانگریس کے ان ریزولیشنوں کی جھنکار بھڑکتی آگ پر پانی چھینکنے کی آواز ہے۔" مہندر کہہ رہا تھا۔ "اس کا ثبوت بدیسی کپڑوں کو نذرِ آتش کر ریزولیشن ہے، گویا یہ اقدام فوج اور پولیس کے بائیکاٹ سے زیادہ اہم ہے۔ لوگوں معاملے میں پاگل بنانے کے لیے کل کا دن بھی مقرر کردیا گیا ہے تاکہ وہ یہ سوچ بھی کہ کانگریس انہیں دھوکا دے چکی ہے۔ یہ ہے سیاسی پینترے بازی! اب عالم یہ سیاسی کارکنوں، رضا کاروں اور طلبہ کو اس کام پر لگا دیا گیا ہے۔ وہ بمبئی کے گلی کوچوں گھوم رہے ہیں، ہر گھر اور ہر در کو کھٹکھٹا رہے ہیں اور بدیسی کپڑے جمع کر رہے ہیں ہیں کہ اصل تحریک کو بھول گئے ہیں۔ انہیں یہ احساس بھی نہیں ہے کہ وہ پسپائی اختیار کر ہیں۔ وہ اصل تحریک سے ہٹ کر اس کے صرف ایک محدود حصے ہی کو اصل تحریک سمجھ ہیں۔ پولیس اور فوج کے مقاطعے کو تو چھوڑو، وہ تو یہ بھی بھول گئے ہیں کہ سوراج کی تحریک کیا ہے۔ کانگریس نے بہت بڑا ظلم کیا ہے۔ اگر وہ کراچی خلافت کانفر ریزولیشن کی حمایت کرتی تو یہ آزادی کی سمت ایک لمبی چھلانگ ہوتی مگر کانگریس وقت ہندوستانیوں کی ٹانگ کھینچ لی ہے جبکہ وہ لمبی چھلانگ لگانے ہی والے تھے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا آخر ان سیاستدانوں کو کیا ہو گیا ہے۔ سوچنے کی بات کہ بدیسی کپڑوں کا بائیکاٹ کرنے سے کیا فائدہ! برطانیہ سے صرف تین کروڑ پاؤنڈ ہندوستان آتا ہے۔ اگر ہم مقاطعہ کر کے اپنی ضرورت کا تمام کپڑا یہیں تیار کر کیا اس نقصان سے برطانوی استعمار کا ہندوستان سے خاتمہ ہو جائے گا۔ کیا شہنشاہیت اس سے ختم ہو جائے گی۔ برطانیہ یہاں سے جتنی دولت سمیٹ رہا کروڑ پاؤنڈ اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔"

"کانگریس نے جو رویہ اختیار کیا ہے، بہت افسوسناک ہے، مجھے تو یوں لگ

ہندو پانی اور مسلمان پانی کا نعرہ سیاست میں بھی داخل ہو گیا ہے۔ ہندوستان کی سیاست اب ہندو سیاست اور مسلمان سیاست میں تقسیم ہو چکی ہے۔ جب سیاست بٹ جاتی ہے تو لوگوں بٹ جاتے ہیں، جب لوگ بٹ جاتے ہیں تو ملک تقسیم ہو جاتے ہیں۔ کانگریس نے بہت نقصان کیا ہے۔ اس نقصان کی تلافی ناممکن ہو گی۔"

مجھے مہندر کی یہ گفتگو آج بھی لفظ بہ لفظ یاد ہے۔ کتنی سچی اور کھری باتیں کرتا تھا وہ، کتنے صحیح تجزیے ہوا کرتے تھے اس کے! واقعی 1921ء کا وہ مہینہ ہی ہندوستان کی سیاست کا وہ مہینہ تھا جب ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کو مخالف سمتوں میں کھڑا ہوا دیکھا تھا۔

ہماری یہ گفتگو بہت دیر جاری رہی۔ معاً باہر سے موٹر کے ہارن کی آواز آئی اور لالی یہ کہتی ہوئی باہر لپکی۔ "پتاجی آگئے۔"

سیٹھ وشوانا تھ اس مخلوط ہندو مسلم تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھے جو ہندوستان میں صدیوں کے میل ملاپ سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ اپنے بھائی گوپی ناتھ سے قطعی مختلف تھے۔ مہندر اور لالی ان کی تربیت اور ان کے مزاج کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ مجھے اپنے گھر میں دیکھ کر انہوں نے بے پناہ مسرت کا اظہار کیا تھا۔ پھر وہ بھی ہماری اس گفتگو میں شریک ہو گئے تھے۔

دن ڈھل چکا تھا اور شام کے سائے گہرے ہو گئے تھے۔ میں نے مہندر سے کہا تھا کہ میں عمر سوبانی کے گھر جانا چاہتا ہوں جن کو مجھے ایک خط دینا تھا اور سیٹھ وشوانا تھ نے کہا تھا۔ "ضرور جاؤ، کار لیتے جاؤ مہندر! تمہیں وہاں بمبئی اور ہندوستان کی سیاست کا رخ دیکھنے کو بھی ملے گا۔"

"میں بھی چلوں گی۔" لالی نے کہا تھا۔ "کیوں پتاجی! چلی جاؤں؟"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے بٹو۔" سیٹھ وشوانا تھ نے کہا تھا۔ "مہندر اور شیرازی جی سے پوچھ لو۔"

تھوڑی دیر بعد ہم تینوں عمر سوبانی کے گھر جا رہے تھے۔ میں مہندر کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھا تھا اور لالی پچھلی نشست پر موجود تھی۔ اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا۔ بمبئی کی سڑکیں روشنی میں نہائی ہوئی تھیں۔ یہ ہندوستان کا وہ شہر تھا جہاں کبھی رات نہیں ہوتی۔ جب ہم عمر سوبانی کے گھر پہنچے تو وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ لان میں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ بمبئی کے سیاسی کارکن اور رضا کار ان کرسیوں پر بیٹھے تھے، گھاس پر بیٹھے تھے

اور اِدھر اُدھر کھڑے تھے۔ سب کا موضوعِ گفتگو بدیسی کپڑوں کا بائیکاٹ تھا۔ ا
بمبئی میں تاریخ کی سب سے بڑی ہولی جلائی جانے والی تھی۔

ہم تینوں ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف
ڈرائنگ روم میں اس وقت اجلاس ہو رہا تھا۔ اس اجلاس میں بمبئی کے مقامی سیاس
کے علاوہ کانگریس کی مرکزی کمیٹی میں شرکت کے لیے بمبئی آنے والے دوسرے سیا
بھی تھے۔ عمر سوبانی نے ان سب کو ڈنر پر مدعو کر رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ہم ا
جا سکتے تھے۔ میں نے جیب سے لفافہ نکالا اور دروازے پر موجود ملازم کو دیتے ہو
''عمر سوبانی صاحب کو یہ لفافہ دینا، ان سے کہنا کہ میں لکھنؤ سے آیا ہوں اور ان
چاہتا ہوں۔''

ملازم وہ لفافہ لے کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ملازم پھر باہر آیا۔ ''اِدھر آ
اس نے کہا۔

ہم تینوں اس کے پیچھے چلتے ہوئے بنگلے کے پہلو میں آ گئے۔

''آئیے!'' ملازم نے ایک دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

مہندرا اور لالی وہیں رک گئے۔ ''ٹھیک ہے، تم جاؤ، ہم یہیں کھڑے ہیں۔''

''ارے نہیں یار!'' میں نے کہا۔ ''تم بھی آ جاؤ، اب تم سے کیا پردہ رہا ہے۔''
نے مہندر کا ہاتھ پکڑ لیا، پھر ہم آگے پیچھے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ہم جس کمرے میں
تھے، وہ لائبریری معلوم ہوتا تھا۔ ہر طرف دیواروں کے ساتھ الماریاں کھڑی تھیں
الماریوں میں قرینے سے کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ وسط میں پڑی ہوئی میز پر اخبارات
رسائل قرینے سے رکھے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں رکھی ہوئی میز پر کاغذات اور قلم
موجود تھے۔

''آپ لوگ یہاں انتظار کریں، صاحب ابھی آتے ہیں۔'' ملازم نے کہا اور
وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔

ہم تینوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد عمر سوبانی کمرے میں
ہوئے۔ وہ چھریرے بدن کے نوجوان تھے۔ ان کے چہرے پر وہ سنجیدگی اور وقار تھا
سیاسی دباؤ کا عطیہ تھا جس میں وہ زندگی گزار رہے تھے۔ قومی سیاست کی ذمے داری
نے انہیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔

''معاف کیجیے شیرازی صاحب!'' عمر سوبانی نے کہا۔ ''میٹنگ آخری دور

اس لیے مجھے دیر ہو گئی۔'' پھر انہوں نے مہندر ناتھ سے کہا۔ ''اور سناؤ مہندر! تمہارے پتا کا کیا حال ہے؟''

''ٹھیک ہیں جناب! دعا ہے آپ کی۔'' مہندر نے کہا۔

''شیرازی صاحب! میں نے خط پڑھ لیا ہے۔'' عمر سوبانی پھر مجھ سے مخاطب تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ خط میں کیا لکھا تھا۔ ''بے فکر رہیں، آپ کو جب بھی، جس وقت بھی اور جس قسم کی بھی مدد درکار ہو، میں حاضر ہوں۔ دن رات جب چاہیں آپ یہاں آ سکتے ہیں۔ آپ جیسے ہی سرفروش ہندوستان کی امید ہیں۔ کاش میں بھی آپ لوگوں کی صفوں میں ہوتا۔''

''آپ اب بھی ہماری صفوں میں ہیں جناب!'' میں نے کہا۔ ''آپ جس انداز میں ہندوستان کی خدمت کر رہے ہیں، ہم سب اس سے واقف ہیں۔ اگر ہمارے دوسرے سرمایہ دار بھی آپ کی راہ پر چلنے لگیں تو ہم اپنی جنگ بہت جلد جیت سکتے ہیں۔''

''میں کیا کر رہا ہوں بھئی۔'' عمر سوبانی نے کہا۔ ''یہ تو کچھ بھی نہیں ہے، اپنا سر دینے سے زیادہ آسان یہی بات ہے کہ آدمی اپنی جیب خالی کر دے۔ تم لوگوں نے قوم کے لیے اپنا سر دینے کی پیشکش کی ہے، میں شاید بزدل ہوں، ایسا نہیں کر سکتا۔''

''نہیں جناب!'' میں نے کہا۔ ''مجھے بتائیے کہ آخر آپ ہی اس سلسلے میں، سرمایہ داروں میں سرفہرست کیوں ہیں؟''

''ہاں میرا نام......'' عمر سوبانی نے کہا۔ ''مگر بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنا نام بھی نہیں آنے دیتے۔ سیٹھ وشوا ناتھ ہی کو لے لو، اس جیسے لوگ میرے ساتھ ہوں تو میری کوششیں اور میری خدمات بے معنی ہو جائیں۔''

''آپ بلاوجہ پتاجی کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں۔'' مہندر نے کہا۔

''یہ بلاوجہ نہیں ہے مہندر!'' عمر سوبانی نے کہا۔ ''خیر چھوڑو، کبھی موقع آیا تو بتاؤں گا کہ تمہارے پتاجی کے ہم پر کیا کیا احسانات ہیں۔ ہاں تو شیرازی صاحب!'' اب عمر سوبانی پھر مجھ سے مخاطب تھے۔ ''بمبئی میں جب تمہارا کام ختم ہو جائے تو مجھ سے مل لینا۔ ویسے تم اس سے قبل بھی مجھ سے مل سکتے ہو۔ یہ بات میں نے اس خط کی روشنی میں کہی تھی۔ میرے یار نے لکھا ہے کہ شیرازی اپنا کام ختم کرنے کے بعد مجھ سے ملے گا، کیونکہ میں بہت مصروف رہتا ہوں۔'' عمر سوبانی نے یہ جملے ڈرامائی انداز میں کہے۔ ''میرے یار کو یہ نہیں معلوم کہ عمر سوبانی کیا ہے۔ تم جیسے سرفروشوں کی خدمت کے لیے میں ہر مصروفیت قربان

کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

پھر عمر سوبانی نے ہمیں کھانے کی دعوت دی جس پر میں نے کہا۔" اس تکلف کی ضرورت نہیں۔ آج رات میں بمبئی کی سیر کرنا چاہتا ہوں، پھر شاید فرصت نہ ملے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" عمر سوبانی نے کہا۔" تم لوگوں کی زندگی ہر وقت داؤ پر لگی رہتی ہے۔ اس پُر خطر زندگی میں فرصت کے جو لمحات مل جائیں غنیمت ہیں۔ میرا خیال ہے شیرازی صاحب! آپ کھانا کھا کر ہی جائیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ کو آدھا گھنٹہ لگے گا فارغ ہونے میں!"

اس پُر خلوص اصرار پر انکار کرنا بداخلاقی تھی۔

کھانے پر میں نے ہندوستان کے تقریباً تمام لیڈروں کو دیکھا جن کے نام کا شہرہ ان دنوں ہندوستان بھر میں تھا۔ ڈنر پر بھی سیاست کی باتیں ہونے لگیں مگر تمام گفتگو کا محور بدیسی کپڑوں کا بائیکاٹ تھا۔ گاندھی جی بہت خوب تھے۔ جب بھی گفتگو کا موضوع بدلتا وہ پھر بدیسی کپڑوں کے بائیکاٹ کے کسی نئے پہلو کو چھیڑ دیتے۔

"دیکھ رہے ہو تم گاندھی جی کو!" مہندر نے کہا تھا۔" کتنی چالاکی سے بدیسی کپڑوں کے بائیکاٹ کو سب سے بڑا سیاسی مسئلہ بنائے ہوئے ہیں؟"

کھانا کھانے کے بعد عمر سوبانی پھر ہمارے پاس آئے اور کہا۔" شیرازی صاحب! میرا خیال ہے کل صبح آپ سیدھے یہیں آجائیں، پھر ہمارے ساتھ ہی پریل چلئے گا۔" پھر وہ مہندر سے مخاطب ہوئے۔" کل پریل تو آرہے ہونا!"

"جی ہاں! ہم سیدھے پریل ہی پہنچیں گے۔" مہندر نے کہا۔

"بہر حال وہاں ضرور آنا۔" عمر سوبانی خاص طور پر مجھ سے مخاطب تھے۔" وہاں ایک خوشگوار تحیر تمہارا منتظر ہوگا۔" پھر انہوں نے ایک نوجوان کو اشارے سے بلایا۔" یہ ہمارے ایک بہت ہی عزیز مہمان ہیں۔ شیرازی نام ہے ان کا! لکھنؤ سے آئے ہیں۔ کل پریل آئیں گے، مہندر اور لالی کے ساتھ! تمہیں ان تینوں کو اسٹیج پر جگہ دینی ہے۔ یہ تمہاری ذمے داری ہے۔"

اس کے بعد ہم وہاں سے مہندر کی کار میں چوپاٹی آئے تھے۔ چوپاٹی پر رات بہت ہی حسین لگی۔ وہاں لوگوں کا اژدہام تھا۔ ہر مذہب اور ملت کے لوگ کنارِ سمندر کی ہوا سے لطف اٹھا رہے تھے۔ حسین قدرتی مقامات بھی کتنے مقدس ہوتے ہیں، میں نے سوچا تھا۔ ان کے حسن سے ہر شخص لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہ انسان کو سکون سا بخشتے ہیں۔ یہ

مقامات، فطرت کی تخلیق کی ہوئی وہ عبادت گاہیں ہیں جہاں ہر انسان سکون اور خوشی حاصل کرنے کے لیے جا سکتا ہے۔

پُر شور لہریں بار بار ساحل سے آ کر سر ٹکرا رہی تھیں۔ تیز ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ ہم نے بھیل پوری کھائی، چاٹ اڑائی، سوڈے کی بوتلیں پیں، گفتگو کرتے رہے اور سیر کرتے رہے۔ ایک جگہ مہندر کا ایک دوست آ ٹکرایا۔ مہندر اس سے باتیں کرنے لگا۔ ہم تھوڑا سا آگے آ کر ٹھہر گئے۔ کتنی دیر بعد ہمیں ایسا موقع ملا تھا۔ میں نے اور لالی نے اس دوران میں وہ باتیں کیں جن میں ہم کسی بھی شریک نہیں کر سکتے تھے۔

پہل لالی ہی نے کی تھی۔" دیوتا جی! تمہیں وہ رات یاد ہے نا!" اس کے لہجے میں یادوں کا دھواں سا تھا۔

"وہ رات میری زندگی کا حاصل ہے لالی! میں اسے بھول سکتا ہوں!" میں نے کہا تھا۔

"اپنے وعدے بھی یاد ہیں؟" لالی نے بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر کہا تھا۔

"وہ وعدے اب میرا ایمان ہیں۔"

"تم کتنے اچھے ہو۔" لالی کے ہونٹوں سے پھول سے جھڑنے لگے۔"" مگر دیوتا تو ہوتے ہی اچھے ہیں۔"

"ایک بات بتاؤں لالی!" میں نے آہستگی سے کہا۔" میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں۔ تم نے مجھے زندگی کی حسین خوشی سے ہمکنار کیا ہے۔"

"ہائے شیرازی جی!" اس کے ہونٹوں سے ایک نغمہ تھا کہ پھوٹ بہا تھا۔" ہم تو اپنے دیوتا کے سیوک ہیں۔ میں تمہارے لیے خوشی کا باعث ہوں، میرے لیے یہی بہت بڑی بات ہے۔"

"تم مجھے دیوتا نہ کہا کرو لالی!" میں نے کہا تھا۔" میں یہیں زمین پر تمہارے پاس رہنا چاہتا ہوں۔"

"مجھ پر یہ پابندی نہ لگاؤ شیرازی جی!" لالی نے گلابوں کی خوشبو پھیلائی۔" تمہیں دیوتا کہہ کر بھی میری پیاس نہیں بجھتی۔ میں تمہیں جو کہنا چاہتی ہوں، تم سے جو کچھ کہنا چاہتی ہوں، شاید انسان کی ایجاد کردہ کسی بھی زبان میں آج تک وہ الفاظ ہی پیدا نہیں ہوئے۔ پھر شیرازی جی! تم ان دیوتاؤں میں سے نہیں جو آسمانوں میں رہتے ہیں۔ وہ جو نہ باتیں کرتے ہیں نہ تسلی دیتے ہیں، نہ خوشی بخشتے ہیں۔ شیرازی جی! تم میرے من میں رہتے ہو۔

تم تو میرے من سے باتیں کرتے ہو۔''

''لالی! تم مجھ پر زیادہ ہی مہربان ہو گئی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''اور میں اتنا تنگ دست ہوں کہ تمہارے احسانات کو اتار بھی نہیں سکتا۔''

وہ کوئی جواب نہ دے سکی تھی کیونکہ مہندر اپنے دوست کو رخصت کر کے ہمارے پاس آ گیا تھا۔

لالی نے میرے اس جملے کا جواب اس وقت دیا تھا جب مہندر کا ایک اور دوست اس سے آ ٹکرایا تھا۔ ہم دونوں ذرا بڑھ کر ایک طرف ہو گئے تھے۔

''دیکھو شیرازی جی! اب ایسی باتیں نہ کرنا۔'' اس کے لہجے میں ناراضگی تھی۔ ''بھلا میں نے کیا احسانات کیے ہیں؟''

''اس رات تم نے مجھ پر احسانات اور کرم کیے۔ جتنے پھول نچھاور کیے تھے لالی، میں انہیں کیا نام دوں؟'' میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اپنا مطلب کیسے واضح کروں مگر لالی میرا مطلب سمجھ گئی تھی۔

''اس رات میں نے اپنے دیوتا کے حضور عقیدت کے کچھ پھول اس کے قدموں میں رکھے تھے اور میرا دیوتا اتنا سخی ہے کہ اس نے اسی رات میرے گلے میں اپنے پیار کی مالا ڈال دی تھی۔'' لالی کی آواز بوجھل تھی۔ ''میں نے اس رات ایک خواب سا دیکھا تھا اور فوراً ہی وہ خواب تعبیر میں ڈھل کر مجسم ہو گیا تھا۔ کرم تو تم نے کیا ہے شیرازی جی! تم نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ ان بلندیوں سے اتر کر تم میری سطح پر آ گئے جہاں تم تھے، جہاں تم ہو۔''

''بلندیوں پر تم ہو لالی!'' میں نے کہا تھا۔ ''میں نہیں تم کچھ نیچے اتری ہو۔''

''ارے تمہیں کیا پتا شیرازی جی! تم کن بلندیوں پر ہو۔ وہ بلندیاں میں نے شکنتلا کے حوالے سے جانی ہیں۔'' لالی نے کہا۔ ''مجھے یاد ہے تم کتنے پشیمان ہو گئے تھے۔''

''سنو لالی! میں سوچ رہا ہوں، ہم جو اس دنیا کی بنائی ہوئی دیواروں میں قید ہیں، ہم جو اس دنیا کی تراشی ہوئی مذہبی بھول بھلیوں میں پھنسے ہوئے ہیں، اچانک ہی آ ملے ہیں مگر یہ ملاپ محض ایک سراب ہے۔ جب ہم حقیقت کی دنیا میں لوٹیں گے تو الگ الگ ہوں گے، شاید کبھی نہ مل سکیں گے۔''

اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ ''کل کیا ہو گا شیرازی جی! کسی کو معلوم نہیں۔ میں تو آج میں زندہ ہوں اور آج کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ تم میرے پاس ہو۔''

''اور آج کی سب سے بڑی حقیقت ایک اور بھی ہے۔'' میں نے کہا تھا۔ ''میری آج کی زندگی طوفانی زندگی ہے۔ یوں سمجھو آج میں ایک لق و دق صحرا میں بھاگ رہا ہوں۔ جنگلی کتے میرے تعاقب میں ہیں۔ آج ہی یا کل کسی وقت......''

''بس شیرازی جی!'' لالی نے جلدی سے کہا تھا۔ ''آگے کچھ مت کہو! میں سمجھ گئی، تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ یہ بات مجھے اس وقت بھی معلوم تھی جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ بات مجھے اس رات بھی معلوم تھی جب میرے ہونٹوں پر پیار کی سلگتی ہوئی گرمی اتری تھی۔ میں نے اس وقت تمہیں اپنا دیوتا بنایا تھا جب مجھے یقین بھی نہیں تھا کہ تم سے پھر ملاقات ہو گی۔''

''لالی، میری لالی، میری اچھی لالی!'' میں جھنجلا سا گیا۔ میرے دل میں اس وقت کیا کیا تھا، اسے کہنے کے لیے مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ ''میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں۔ جی یہی چاہتا ہے کہ تمہیں دیکھتا رہوں۔ تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہو اور تم مجھ سے یونہی اسی طرح باتیں کرتی رہو۔ میں...... میں...... مجھے تم سے پیار ہے لالی! پیار ہے...... پیار ہے۔''

''ہائے شیرازی جی! کیا بات کہہ دی تم نے۔'' لالی کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کی نمی میں نے شبنم کی طرح چمکتی دیکھی تھی۔ ''کیسی خوشی دی ہے تم نے اس وقت! میں تھک سی گئی ہوں۔''

لالی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ کوئی مسرت سی مسرت تھی وہ! شراب کے نشے کی مانند نس نس میں اترتی جا رہی تھی۔ جسم اور ذہن بوجھل سے ہو گئے تھے۔ بعض خوشیاں کتنی گراں بار ہوتی ہیں، اس کا اندازہ اس دن مجھے ہوا تھا۔

وہ رات، لالی کی انہی باتوں کی وجہ سے آج بھی میرے ذہن میں جاگتی رہتی ہے، میں نے اس رات چوپاٹی کی سیر نہیں کی تھی، اس دنیا کی سیر کی تھی جو لالی نے اپنی پھول باتوں سے سجائی تھی۔

☆======☆======☆

صبح بہت روشن اور چمکیلی تھی۔ ہم لوگ ناشتہ کر رہے تھے کہ سیٹھ وشوا ناتھ تیار ہو کر ڈائننگ روم میں آ گئے۔ ''اچھا بچو! میں چل رہا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔ ''گاڑی تو نہیں چاہیے، ضرورت ہو تو بھجوا دوں گا؟''

''نہیں پتا جی!'' مہندر نے کہا۔ ''آج گاڑی نہیں چاہیے۔''

''کیوں کیا آج شیرازی کو سیر نہیں کراؤ گے؟''

''سیر ہی تو کرانی ہے۔'' مہندر نے کہا۔ ''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں،
ہمارا ارادہ پریل جانے کا ہے۔ ٹرین سے ہی چلے جائیں گے۔''

''اچھا تو میں چلتا ہوں۔'' یہ کہہ کر دشواناتھ وہاں سے چلے گئے۔

ناشتے کے بعد ہم سب تیار ہوئے اور مکان سے نکل آئے۔

بمبئی کتنا بڑا شہر ہے، اس کا احساس مجھے اسی دن ہوا تھا۔ یہ شہر بس شیطان
کی طرح کھنچتا ہی چلا گیا ہے۔ ہم کرلا اسٹیشن سے ٹرین میں سوار ہوئے تھے۔
ماٹونگا اور دادر کے اسٹیشنوں پر تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے رکتی ہوئی پریل پہنچ گئی۔
اترے، ہم ہی کیا بہت سے لوگ اترے۔ لگتا تھا ٹرین ہی خالی ہو گئی ہو۔ تمام بمبئی
پریل میں امنڈ آیا تھا۔ پریل اس دن بمبئی کا مرکز بن گیا تھا۔ اسٹیشن سے باہر آئے
بھی لوگوں کے غول کے غول جتھے کے جتھے متحرک نظر آئے۔ لوگ دس دس، پانچ پانچ
ٹکڑیوں میں ایک ہی سمت میں رواں تھے، نعرے لگ رہے تھے، تمام پریل ایک
گیا تھا۔ جوں جوں ہم بڑھتے رہے، بھیڑ میں اضافہ ہوتا رہا۔ الفنسٹن اسٹریٹ پر
تھا کہ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ لالی میرے اور مہندر کے درمیان میں تھی۔

ہر شخص کھدر کا لباس پہنے ہوئے تھے۔ ایک جگہ ایک شخص کو لوگوں نے گھیر رکھا
اس کی قمیص بدیسی کپڑے کی تھی البتہ پاجامہ کھدر کا تھا۔ لوگوں کا اصرار تھا کہ وہ یہ قمیص
دے اور وہ کہہ رہا تھا۔ ''اے بھیا! میرے پاس اور کرتہ نہیں ہے، پاجامہ تو کھدر کا
ہوئے ہوں۔''

پھر کسی نے اس کے سر پر چپت ماری تھی۔ ایک نے اس کے گریبان پر ہاتھ
قمیص جھیر جھیر کر دی۔ ذرا ہی دیر میں اس کی قمیص اس کے جسم سے الگ کر دی گئی۔
اس کی پھٹی ہوئی قمیص کو سوکھی سی شاخ پر ٹانگ کر سروں سے بلند کیا۔

''انگریز حکومت!'' ایک نعرہ ابھرا۔

''مردہ باد!'' جواب دیا گیا۔

''انگریز کے پٹھو!'' پھر نعرہ ابھرا۔

''ہائے ہائے!''

''بول بجرنگ بلی کی!''

''جے!''

''نعرۂ تکبیر!''

''اللہ اکبر!''

''بے نا پاگل پن!'' مہندر بڑبڑایا تھا۔

''آہستہ بھیا!'' لالی نے کہا۔

اب میں، مہندر اور لالی ایک احاطے کے گیٹ میں داخل ہو رہے تھے۔ اسی احاطے
میں بدیسی کپڑوں کی ہولی جلائی جانے والی تھی۔ احاطے میں لوگوں کا اژدہام تھا کہ میدانِ
حشر کا گمان ہوتا تھا۔ گیٹ پر ہی ہمیں احمد مل گیا جسے عمر سوبانی نے خاص ہمارے لیے
ہدایات دی تھیں۔ ''آئیے شیرازی صاحب!'' اس نے ہمیں دیکھتے ہی کہا۔ ''آپ اچھے
موقع پر آ گئے۔''

پھر ہم اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ایک اسٹیج پر آ گئے۔ بمبئی کے کئی سرکردہ لیڈر اسٹیج
کے پاس موجود تھے۔ احمد نے ہمیں اسٹیج پر لے جا کر بٹھا دیا جہاں دو ایک آدمی پہلے ہی
کرسیوں پر براجمان تھے۔ ایک بچہ اسٹیج پر مائک کے سامنے کھڑا ترانہ پڑھ رہا تھا۔

وسیع و عریض احاطے میں ہر طرف آدم ہی آدم تھا۔ سروں کا سیلاب آیا ہوا تھا۔
احاطے کے وسط میں بدیسی کپڑوں کا ڈھیر تھا۔ ڈھیر کیا، مینار تھا اور اس مینار کی بلندی میں
اضافہ ہو رہا تھا۔ کارکن اور رضا کار آتے تھے اور کپڑوں کے اس ڈھیر پر مزید کپڑے ڈال
دیتے تھے۔ دو تین آدمی تو بس کپڑوں کے اس مینار کو درست کرنے میں مصروف تھے۔
جب بھی اس ڈھیر پر بدیسی کپڑوں کی کوئی پوٹلی پھینکی جاتی، فضا مردہ باد کے نعروں سے گونج
اٹھتی۔

ذرا ہی دیر بعد لوگوں میں اضطراب اور بے چینی پھیل گئی۔ ''گاندھی جی آ گئے،
گاندھی جی آ گئے۔'' آواز کی ایک لہر، مختلف آوازوں کے سمندر میں جیسے لوٹ لگاتی ہوئی
اس کنارے سے اس کنارے تک پھیل گئی۔ اسی راستے سے جہاں سے ہم داخل ہوئے
تھے، گاندھی، عمر سوبانی کے ساتھ اور مختلف لیڈروں کے جلو میں، احاطے میں آئے اور
لوگوں کے درمیان سے ہو کر اسٹیج پر پہنچے۔ ہم تینوں اور وہ بھی جو پہلے مرتبہ اسٹیج پر موجود
تھے، احتراماً کھڑے ہو گئے۔

فضا ایک مرتبہ پھر نعروں سے گونج اٹھی۔ جب گاندھی جی اپنی نشست پر بیٹھ گئے تو
ان نعروں میں کمی آئی۔ پھر عمر سوبانی مائک کے سامنے آئے۔ چند مختصر سے تعارفی جملے
انہوں نے اس دن کی اہمیت اور بدیسی کپڑے کے مقاطعے کے بارے میں کہے اور پھر

انہوں نے ایک دھماکا کیا۔

کم از کم میرے لیے تو یہ ایک دھماکا ہی تھا۔ عمر سوبانی نے گزشتہ روز مجھے پر...
آنے کی دعوت دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''وہاں ایک خوشگوار تحیر تمہارا منتظر ہوگا۔'' اس جملے...
معنی مجھے اس وقت سمجھ میں آئے تھے۔ عمر سوبانی کہہ رہے تھے۔ ''اس سے پہلے کہ...
جی سے درخواست کروں، ایک ایسے نوجوان کو تقریر کے لیے بلا رہا ہوں جس کی زند...
میں اپنے لیے مشعل راہ سمجھتا ہوں۔ یہ ان لوگوں کے قبیلے سے ہے جو کسی بھی قوم کا باز...
شمشیر زن ہوتے ہیں۔ یہ نوجوان لکھنؤ سے آیا ہے۔ اس کی فطرت سیمابی ہے، آزادی...
لیے یہ پارے کی مانند تڑپتا رہتا ہے، دریا کی مانند محوِ سفر رہتا ہے۔ اس کا نام ہے شیراز...
آفاق شیرازی! یہ ان نوجوانوں میں سے ہے جو اپنے خون سے قوموں کی تاریخ رقم کر...
ہیں۔''

نہ جانے عمر سوبانی کی ان مختصر جملوں میں کیا تاثیر تھی کہ لوگوں نے پھر پُر جوش نعر...
لگانے شروع کر دیے۔ مجھے اس دوران میں یوں لگا گویا میں ایک کھلے میدان میں...
اور شدید آندھی سن سن چل رہی ہے۔ میں تقریری مقابلوں میں کئی مرتبہ حصہ لے چکا...
لیکن کسی سیاسی جلسے میں تقریر کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ میں نے عمر سوبانی سے معذرت چاہی...
مگر عمر سوبانی کا اصرار اور پھر لوگوں کے نعرے، مجھے مائک پر آنا ہی پڑا۔ لالی نے بھی کہا...

''کیوں پریشان ہوتے ہو شیرازی جی! تم تو من موہ لینے والی باتیں کرتے ہو، تقریر نہ...
کرو، لوگوں سے باتیں کرو۔''

میں نے تقریر کی اور خوب تقریر کی۔ بعد میں مہندر اور لالی نے میری تقریر کی...
تعریف کی لیکن اس وقت میرا عالم یہ تھا کہ سارا خون جیسے میرے چہرے پر سمٹ آیا...
میرے چہرے سے چنگے سے نکل رہے تھے، دماغ میں گرمی کی لو دوڑ آئی تھی۔ ابتدائی...
منٹ میں ٹھہر ٹھہر کر سوچ سوچ کر بولتا رہا، پھر میرا حجاب کھل گیا اور میں بولتا ہی چلا گیا۔

''مت سوچیے۔'' میں نے کہا تھا۔ ''کپڑوں کے اس بڑے سے ڈھیر کو جلانے...
آپ اس حکومت کو ہلا دیں گے جس نے دو سو برس سے اس دیس کو، ہمارے پیارے...
ہندوستان کو الاؤ بنا رکھا ہے۔ جس نے ہماری جنم بھومی کو ہمارے لیے چتا، قبر...
گھاٹ اور قبرستان بنا دیا ہے۔ اب یہاں آزاد انسان نہیں غلام اور مزدور بستے...
ہیں۔'' میں نے اور بھی نہ معلوم کیا کہا تھا۔ ایسا بھیانک نقشہ کھینچا تھا کہ لوگ رو پڑے...
اور پھر میں آزادی کی جدوجہد کی طرف آیا تھا۔ ''آگ ہی لگانی ہے تو ملوں کو لگاؤ۔ بنیوں...

...کو لگاؤ۔ کپڑوں کے اس ڈھیر کو علامت بنا لو اس بات کی کہ اس ڈھیر سے بلند
ہونے والے شعلوں کو تم بجھنے نہیں دو گے جب تک سات سمندر پار سے آنے والے دشمن کو
...نہیں کر دو گے جس نے تمہاری رگوں سے لہو نچوڑ لیا ہے، تمہیں غلامی کی زنجیریں
...پہنا کر انہیں زیور کا نام دیا ہے۔''

لوگوں نے پھر نعروں سے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔

میں نے دوبارہ تقریر شروع کی۔ ''ایسے ظالم دشمن سے، سفاک اور بے رحم قاتل
سے تم اہنسا سے جنگ نہیں جیت سکتے۔ اہنسا شریفوں اور مہذب لوگوں کا اصول ہے۔ تم
...کمین فطرت شخص کو اس اصول سے زیر نہیں کر سکتے۔ تم ایک پیشہ ور قاتل کے سامنے یہ
اصول اپناؤ گے تو قتل ہو جاؤ گے، قتل ہوتے رہو گے اور وہ قتل کرتا رہے گا۔ تمہیں اس کا
...کاٹنے کی حکمت عملی اختیار کرنی چاہیے۔''

لوگوں نے پھر نعرے لگائے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا، گاندھی جی نے عمر سوبانی
...کے کان میں کچھ کہا تھا۔ میں نعروں کے ختم ہونے کے انتظار میں تھا کہ عمر
سوبانی اٹھ کر میرے پاس آئے اور چپکے سے انہوں نے مجھے تقریر ختم کرنے کے لیے کہا۔
...واپس اپنی نشست پر آنے لگا تو مجمع بگڑ گیا۔ ''اور۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔''

''اب گاندھی جی۔۔۔۔۔'' عمر سوبانی نے کچھ کہنا چاہا۔

مگر اب احاطے میں وہ شور و غوغا تھا کہ کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ عمر سوبانی
...پہلے میری طرف، پھر گاندھی جی کی طرف بے بسی سے دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ اب اس
...ہوئے مجمعے کو آسانی سے نہ سنبھالا جا سکے گا۔ سو میں بڑھا۔ میں نے پھر مائک
سنبھال لیا۔ ''دوستو! مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا۔ آخر میں صرف ایک اور بات کہنا چاہتا تھا
وہ بھی سن لو۔ آزادی اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ کپڑوں کے اس ڈھیر میں آگ
...تمہیں آزادی نہیں مل سکتی۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے تلوار اٹھانی پڑتی ہے۔ ظالم
...وہ ہاتھ کاٹنے پڑتے ہیں جن سے وہ ظلم کرتا ہے۔ تم نے کانگریس کے حالیہ ریزولیشن
...ہوں گے۔ ان ریزولیشنوں میں ایک ریزولیشن کی کمی ہے۔ آؤ آج ہم اس
...میں اعلان کریں کہ آج سے، ٹھیک اس وقت سے جب کپڑوں کے اس ڈھیر سے
...گا، ہم ہندوستان کے طول و عرض میں، چپے چپے میں، فوج اور پولیس کی
...کا بائیکاٹ کریں گے۔''

...بڑی دیر تک نعرے لگاتا رہا۔ میں اپنی نشست پر آ بیٹھا اب گاندھی جی تقریر کر

رہے تھے۔ ان کی تقریر بڑی مختصر تھی، لیکن ایسے پینترے سے کی گئی تھی کہ لوگو
سے میری تمام باتوں کا اثر زائل ہوگیا تھا۔

گاندھی جی کہہ رہے تھے۔ ''ابھی تھوڑی دیر میں، کپڑوں کے اس ڈھیر
شعلہ بھڑکے گا، دھواں اٹھے گا، آگ کی لپٹیں نکلنے لگیں گی اور اس شعلے کے ساتھ
غلامی کی بیڑیاں کٹ جائیں گی۔'' اس کے بعد انہوں نے اسٹیج سے اتر کر کپڑو
مینار میں آگ لگا دی تھی۔

سو میں نے اس دن سب سے بڑی ہولی کو پھنکتے ہوئے دیکھا۔

مگر اس وقت مجھے یہ احساس نہ تھا کہ اس دن وہ تقریر کر کے میں نے ا
کیا خطرات مول لیے تھے۔ اگر آج بھی اس ہولی میں شرکت کرنے والے کچھ لو
ہیں اور یقیناً زندہ ہوں گے تو انہیں میری تقریر یاد ہوگی۔ وہ لکھنؤ کے اس نوجو
بھولے ہوں گے جس کی تقریر کے ہر ہر جملے پر انہوں نے فلک شگاف نعرے لگا
جس کی زبان اس دن ان کے دل کی ترجمان بن گئی تھی اگرچہ میری اس تقریر کو
نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی بلکہ بعض اخبارات نے تو سرے سے میری تقریر کا ذکر
تھا البتہ کچھ اخبارات نے میرے بعض جملوں کو گاندھی جی سے منسوب کر کے ر
کیونکہ گاندھی جی نے تقریر شروع کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''میں اس نوجوان کی
سے اتفاق کرتا ہوں۔'' یہ ایک بڑا محتاط جملہ تھا۔ اگر وہ میری پوری تقریر
جاتے تو اخبارات میری تمام تقریر کو ان سے منسوب کر دیتے۔ یہی وجہ تھی کہ بعض
نے میرے جو جملے ان سے منسوب کیے تھے وہ صرف اس دن کے واقعے
کپڑوں کے بائیکاٹ سے متعلق تھے۔

لیکن ان اخبارات کے مقابلے میں سی آئی ڈی کے لوگوں نے میری
ایک ایک لفظ نوٹ کیا تھا۔ اخبارات نے تو اس تقریر کو اس لیے اہمیت نہ دی کہ
غیر معروف اور گمنام شخص نے کی تھی لیکن سرکاری مشینری میری اس تقریر کو ہضم نہ
وقت مجھے اس بات کا قطعی احساس نہ تھا۔ بہرحال اس تقریر کا مجھے ایک بہت
پہنچا کہ میں ایک ہی دن ہی بمبئی کے سیاسی حلقوں کا جانا پہچانا آدمی ہوگیا۔
اور رضا کاروں میں میری دھوم مچ گئی۔ ایک تو عمر سوبانی کے تعارفی جملے، پھر میر
ایسا موقع کہ جب بمبئی اور ہندوستان کی تمام سیاست اس احاطے میں سمٹ
تینوں نے مجھے جانی پہچانی شخصیت بنا دیا۔

جب گاندھی جی بدیسی کپڑوں کی ہولی پھونک رہے تھے اور تمام لیڈران کے گرد جمع تھے تو عمر سوبانی لپک کر میرے پاس آئے اور صرف اتنا کہا۔ ''آج شام مجھ سے ضرور ملنا، میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

''مگر......'' میں نے کچھ کہنا چاہا۔

''آج شام ضرور ملنا۔'' عمر سوبانی نے کہا۔ ''تم نے اپنے لیے پریشانیاں مول لے لی ہیں۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم میں اتنی آگ اور اتنا زہر بھرا ہوا ہے تو میں کبھی تمہیں تقریر کے لیے نہ بلاتا مگر اب کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال آج شام ضرور ملنا، شام چار بجے کے بعد میں تمہارا منتظر رہوں گا۔ میں اپنے دوست سے شرمندہ نہیں ہونا چاہتا۔'' یہ کہہ کر عمر سوبانی پھر وہیں چلے گئے جہاں گاندھی جی دوسرے لیڈروں کے ساتھ کھڑے تھے۔

بدیسی کپڑوں کا الاؤ خوب بھڑک اٹھا تھا اور گاندھی جی دوسرے لیڈروں کے ساتھ واپس جا رہے تھے۔ میں، لالی اور مہندر اس وقت سیاسی کارکنوں اور رضا کاروں کے درمیان گھرے کھڑے تھے۔ ہر شخص مجھ سے تعارف چاہتا تھا، میرے شانے، ہاتھ ملاتے ملاتے تھک گئے۔ وہ مجھ سے مختلف نوعیت کے سوالات کر رہے تھے۔ ''آپ کیا کرتے ہیں؟ کہاں رہتے ہیں؟ کس تحریک سے متعلق ہیں؟ کس قسم کی جدوجہد کے قائل ہیں؟'' میں انہیں گول مول جواب دے رہا تھا۔ عمر سوبانی کے اس جملے کے بعد کہ میں نے اپنے لیے بہت سی پریشانیاں مول لے لی ہیں، میں بہت محتاط اور چوکنا ہوگیا تھا۔ اس مرحلے پر احمد فرشتۂ رحمت بن کر آیا۔ وہ مجھے ان لوگوں کے نرغے سے نکال لایا۔ ہم اس کے ساتھ باہر آئے اور ایک کار میں وہاں سے مہندر کے گھر کی طرف چل دیے۔

راستے میں احمد نے مجھے بتایا تھا کہ اس وقت، جب وہ مجھے لوگوں کے نرغے سے نکال کر لایا تھا، میرے گرد سی آئی ڈی کے کئی افراد موجود تھے۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں عمر سوبانی کے وہ الفاظ گونجے تھے کہ میں نے اپنے لیے پریشانیاں مول لے لی ہیں۔ یہ پریشانیاں اور خطرات خلاف توقع نہ تھے۔ میں نے جس دن تنظیم میں شرکت اختیار کی تھی۔ مجھے اسی روز سے علم تھا کہ میں کیا خطرات مول لے رہا ہوں۔ ہماری تنظیم ہی حکومت کے خلاف تھی۔ ایسی صورت میں پولیس، خفیہ اور فوج، غرض ہر اس ادارے سے ہمیں خطرہ تھا جس کا مقصد ایک غاصب حکومت کی حاکمیت قائم کرنا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے جب غلام اپنی آزادی کے لیے جدوجہد کرتا ہے تو حکمراں اپنے اس شکار کو راضی خوشی تو اپنے چنگل سے نہیں نکلنے دیتا۔

سو یہ بات تو میرے لیے پریشان کن نہیں تھی کہ پولیس یا خفیہ کے لوگ ہمارے پیچھے لگ جائیں گے۔ میری پریشانی کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ ہماری تنظیم کی ہدایت تھی کہ تنظیم کے کارکنوں کو اپنی عام زندگی میں کسی سیاسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے کیونکہ ہماری تنظیم کو آگے چل کر ہندوستان کی فوجِ آزادی کی شکل اختیار کرنی تھی۔ میں نے بمبئی میں ایک سیاسی اسٹیج سے تقریر کی تھی جس پر تنظیم مجھ سے پوچھ گچھ بھی کر سکتی تھی۔ تنظیم مجھے رکنیت سے معطل بھی کر سکتی تھی جس کا مطلب یہی تھا کہ تنظیم میرا مواخذہ بھی کر سکتی تھی۔ آج تک کبھی ایسا ہوا تو نہیں تھا اس لیے کہ ابھی ہماری یہ تنظیم بالکل نئی تھی۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ جب بھی اس قسم کی کوئی تنظیم بنتی ہے، ابتدائی مراحل میں اس کے قوانین اور اصول وضوابط کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے۔

میں اسی پہلو پر سوچ رہا تھا کہ مہندر کا گھر آ گیا۔ احمد ہمیں وہاں اتار کر چلا گیا۔

احمد کے جاتے ہی مہندر نے پوچھا۔ "کیوں شیرازی! کچھ چپ چپ ہو گئے ہو۔ کیا ڈر گئے ہو گئے خفیہ کے لوگوں کی اطلاع سن کر؟"

"نہیں، یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔" میرا جواب تھا۔ "ہماری تنظیم کا جو رخ ہے، اس میں ہمارا مقابلہ فوج، پولیس اور خفیہ سے ہی ہو گا۔"

"پھر کیا وجہ ہے؟" مہندر نے پوچھا۔

"پریشانی کا سبب یہ ہے کہ مجھ سے ایک حماقت ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ یہ کہ میں نے اپنی تنظیم کا ایک اصول توڑ دیا ہے۔ تنظیم کی طرف سے ہم پر پابندی ہے کہ ہم کسی بھی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہ رکھیں۔"

"مگر تمہیں تو مجبور کر دیا گیا تھا۔ پھر وہ موقع بھی ایسا نہ تھا کہ تم انکار کر سکتے۔" مہندر نے گویا تاویل پیش کی۔ "ویسے بھی تم نے کانگریس کے اسٹیج سے کانگریس ہی کی مخالفت کی ہے۔ تم نے کانگریس کی پالیسی سے تو اتفاق نہیں کیا۔"

"یہ سب کچھ درست سہی، پھر بھی مجھ سے حماقت تو ہو ہی گئی ہے۔"

"پھر کیا ہو گا؟" لالی نے دریافت کیا۔

"مجھے سزا دی جائے گی۔" میں نے جواب دیا۔

"سزا!" لالی نے حیرت سے کہا۔ "کس قسم کی سزا؟"

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں، سزا کا فیصلہ تنظیم کے بڑے کریں گے۔" میں

"خیر دیکھا جائے گا۔ آدمی کو اپنی حماقت کا نتیجہ تو بھگتنا ہی پڑتا ہے۔" میں نے ماحول کی سنجیدگی ختم کرنا چاہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ انہیں اپنی حماقت کی سزا اور نوعیت بتاؤں۔

"مگر شیرازی جی!" لالی نے کہا تھا۔ "تم نے بھی تو حد کر دی تھی۔ اتنی سخت تقریر تو ہندوستان میں مولانا جوہر کے سوا کوئی کرنے کا حوصلہ بھی نہیں رکھتا۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" مہندر بولا۔ "عمر سوبانی ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ تمہاری تقریر بہت زہریلی تھی۔ عام گفتگو میں تو پتا نہیں چلتا کہ تم اتنے آتش نفس اور شعلہ بیان مقرر بھی ہو سکتے ہو۔ تم میں واقعی بہت زہر بھرا ہوا۔"

"یہی زہر اس غلام ملک کے لوگوں کی غلامی کا تریاق ہے میرے دوست!" میں نے کہا تھا۔

میں اور مہندر اس روز ٹھیک چار بجے عمر سوبانی کے گھر پہنچ گئے تھے۔ لالی ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ وہ اپنے پتا وشوا ناتھ کے ساتھ کہیں گئی تھی۔

عمر سوبانی برآمدے میں ہی ہمارے منتظر تھے۔ پریشانی ان کے چہرے ہی سے عیاں تھی۔ "آؤ، آؤ!" انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی کہا۔ "میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" پھر وہ ہمیں ڈرائنگ روم سے اسی کمرے میں لے آئے تھے جہاں گزشتہ روز ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے ملازم کو ہدایت کی تھی کہ اگر کوئی ملنے آئے تو اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اسے انتظار کرنے کے لیے کہہ دے۔

"تم نے مجھے پریشانیوں میں مبتلا کر دیا ہے شیرازی!" عمر سوبانی نے کہا۔

"میں شرمندہ ہوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن اس میں میرا قصور نہیں ہے۔"

"تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" عمر سوبانی نے کہا۔ "غلطی میری ہی تھی کہ تمہیں تقریر کی دعوت دے بیٹھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں بمبئی میں تمہارے تحفظ کا انتظام کروں، تمہیں مدد فراہم کروں مگر میں نے تمہیں الٹا خطرات میں ڈال دیا ہے اور اپنے لیے بھی پریشانیاں مول لے لی ہیں۔"

"پھر آپ کو مجھے یہاں نہیں بلانا چاہیے تھا۔ میں اپنی ذات کو اپنے کسی بھی خیر خواہ کے لیے مصیبت کا باعث نہیں بنانا چاہتا۔" میں نے کہا۔

"احمقانہ باتیں مت کرو۔" عمر سوبانی نے کہا۔ "میری پریشانیوں کا تعلق دوسرے معاملے سے ہے۔ کانگریس کے بعض اہم لیڈر مجھ سے ناراض ہیں کہ میں نے کل کے ایک

لونڈے سے بھرے جلسے میں ان کی کرکری کرادی ہے۔ گاندھی جی بھی بہت برہم تھے۔ انہوں نے انہیں بہت سمجھایا ہے لیکن وہ میری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے کیونکہ کانگریس نے خلافت کانفرنس کے ریزولیوشن کی حمایت نہیں کی۔''

''اگر بات یہ بھی ہے تو بھی کیا غلط ہے۔'' مہندر نے کہا۔ ''کانگریس نے ایسا کر کے بہت بددیانتی کی ہے۔''

''بہر حال شیرازی!'' عمر سوبانی نے کہا۔ ''تم بہت خطرات میں گھر چکے ہو۔ [illegible] نے تمہاری تقریر کا ایک ایک لفظ نوٹ کیا ہے۔''

''مجھے بھی معلوم ہے جناب! اور میں اس صورتِ حال سے پریشان نہیں ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''مگر تمہیں ایک اور خطرہ بھی ہے۔'' عمر سوبانی نے کہا۔ ''اس کا تعلق پولیس یا حکومت کے کسی اور محکمے کی طرف سے نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے تمہیں سزا دینے کے احکام بھی جاری کر دیے گئے ہوں۔'' عمر سوبانی نے کہا۔ ''لہٰذا اب تمہیں دو طرف سے ہوشیار رہنا ہوگا۔''

''یہ دوسرا دشمن کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ مجھے بھی معلوم نہیں۔'' عمر سوبانی نے کہا۔ ''اس کے بارے میں مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے تک کوئی علم نہیں تھا۔ تمہارے آنے سے ذرا دیر قبل ہی مجھے اطلاع ملی تھی۔ دیکھو۔''

عمر سوبانی نے وہ کاغذ میری طرف بڑھا دیا جوان کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے [illegible] کھول کر پڑھا۔ یہ ایک خط تھا۔ خط لکھنے والے نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔ پیغام صرف یہ تھا۔ ''سوبانی صاحب! اگر آپ لکھنؤ کے شیرازی صاحب کی قیام گاہ سے واقف ہیں تو انہیں بتا دیں کہ ان کی جان خطرے میں ہے۔ بعض لوگ ان کی آج کی تقریر کے بعد ٹھکانے لگانے کی باتیں کر رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے اب تک انہیں قتل کر دینے کا فیصلہ بھی ہو۔''

''مگر یہ لوگ کون ہوسکتے ہیں جو میری اس تقریر سے اتنے برافروختہ ہوگئے؟'' میں نے پھر دریافت کیا۔

''یہ بات میرے لیے بھی پریشان کن ہے۔'' عمر سوبانی نے کہا۔ ''یہ پہلا موقع ہے کہ مجھے اس قسم کی اطلاع ملی ہے۔ بہر حال میں نے صبح تم سے یہاں آنے کے لیے

اس بنا پر کہا تھا کہ تمہارے لیے کسی ایسی جگہ کا انتظام کر دوں جہاں تم پولیس اور خفیہ کے چھپے سے بے نیاز ہو کر ٹھہر سکو۔ میں نے اس کا انتظام کر لیا ہے۔''

''میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں جناب!'' میں نے کہا تھا۔ ''اب میں اپنے بچاؤ کا خود ہی انتظام کروں گا۔ میں اپنے اصولوں سے انحراف نہیں کر سکتا۔'' میرے لیے عمر سوبانی کی یہ پیشکش منظور کرنا ممکن نہ تھا تنظیم کی ہدایت تھی کہ خطرات میں کبھی کسی سے مدد نہ لو۔ خطرات میں ہمارے بہترین محافظ صرف ہمارے کامریڈ ہی ہوسکتے ہیں لہٰذا اس وقت جب حالات خطرناک ہوں، کسی سے مدد یا تعاون حاصل نہیں کرنا چاہئے، خواہ وہ رشتے دار ہی کیوں نہ ہو۔

''میں تمہاری طرف سے بہت پریشان ہوں۔'' عمر سوبانی واقعی پریشان تھے۔ ''میں اپنے دوست سے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا۔''

''آپ فکر نہ کریں جناب!'' میں نے انہیں تسلی دی۔ ''یہ خطرات ہی تو ہماری زندگی ہیں۔ ہم ان سے نمٹنا جانتے ہیں۔ آپ کا یہی بہت کرم ہے کہ آپ نے مجھے دوسرے خطرے سے قبل از وقت ہی آگاہ کر دیا۔ آپ نہ بتاتے تو میں اس کی طرف سے لاعلم ہی رہتا ہے اور انجانے میں نقصان اٹھا سکتا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔'' عمر سوبانی نے کہا۔ ''اپنی حفاظت کرنا، تمہاری زندگی بہت قیمتی ہے۔'' انہوں نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا، اس میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔ ''یہ رکھو! شاید تمہیں اس کی ضرورت پڑے۔''

میں نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ وہ لفافہ لینے سے انکار کر دیا۔ مجھے رقم کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ سالارِ اعظم نے اس مہم کے لیے مجھے معقول رقم دی تھی۔

اس کے بعد ہم وہاں سے چلے آئے تھے۔ باہر آتے ہی مہندر نے پوچھا تھا۔ ''اب کیا پروگرام ہے شیرازی؟''

''میں آج رات ہی تمہارے گھر سے منتقل ہو جاؤں گا۔'' میں نے جواب دیا تھا۔ ''اب میرا وہاں رہنا مناسب نہیں۔''

''جاؤ گے کہاں؟'' مہندر نے کہا۔ ''بمبئی میں تم بالکل نئے ہو، مناسب سمجھو تو مجھے بتا دو۔''

''کیا بات کرتے ہو مہندر!'' میں نے جواب دیا۔ ''میں تم پر اتنا اعتماد کرتا ہوں جتنا خود پر اعتماد کر سکتا ہوں۔ میں تمہیں خود سے علیحدہ نہیں سمجھتا۔ آئندہ ایسی بات نہ کرنا۔ سنو،

میں تمہارے گھر سے حاجی اسماعیل کے مسافر خانے جاؤں گا رات کو سب سے چھپ
''مگر میرے ذہن میں ایک اور ترکیب ہے۔'' مہندر نے کہا۔ ''تمہیں ہمارے
سے چھپ کر نہیں جانا چاہیے۔ تمہیں دن دہاڑے جانا چاہیے اور آج نہیں کل جانا
تاکہ کسی کو شبہ بھی نہ گزرے کہ تمہیں خطرے کا احساس ہو گیا ہے۔ میں تمہارے
ٹھہرنے کا ایسی جگہ انتظام کر سکتا ہوں کہ کسی کو شبہ بھی نہیں ہو سکتا۔ وہ میرا دوست ہے
نظریاتی شخص ہے وہ۔ کل دن میں تم میرے گھر سے اسی کے گھر چلے جانا۔ پھر رات
وقت چھپ کر ہمارے گھر آ جانا اس طرح تم ہمارے گھر سے چلے جانے کے بعد
ہمارے گھر میں ہی رہو گے۔''

مہندر کی تجویز اچھی تھی، میں اس پر راضی ہو گیا۔ عمر سوبانی کے گھر سے نکلنے
میں نے ماحول پر اس طرح نظر ڈالی جیسے میں اس دنیا پر الوداعی نظر ڈال رہا ہوں اور
اس دنیا کو دوبارہ دیکھنے کا موقع نہیں ملے گا۔

''گھر چلنا ہے یا گھومو گے؟'' مہندر نے کار میں بیٹھنے کے بعد کہا۔

''ذرا گھوم ہی لیں۔'' میں نے کہا۔ ''بائی کلہ کلب کی طرف چلو۔ ذرا میں
دیکھوں اس کلب کی عمارت کو جس میں ہندوستانیوں کا داخلہ ممنوع ہے۔''

مہندر نے کار اسٹارٹ کر دی۔

میں نے سوچا تھا کہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ کلب دیکھ لینا چاہیے جہاں
ہفتے مجھے شام کو تین بجے پہنچنا تھا۔

☆======☆======☆

اس رات جب ہم بمبئی شہر کی سیر سے واپس گھر پہنچے تو ایک عجیب صورت
ہماری منتظر تھی۔ سیٹھ وشوانا بڑی بے قراری سے لان میں ٹہل رہے تھے۔ جونہی کار
احاطے میں داخل ہوئی وہ لپک کر کار طرف آئے۔ ''مہندر...... مہندر!'' وہ اس سے
کچھ نہ کہہ سکے اور بے قراری سے اپنے ہاتھ ملنے لگے۔ گھر کے دونوں ملازم برآمدے
کھڑے تھے۔

سیٹھ وشوانا تھ کے لہجے میں ایسی بات تھی کہ میں سمجھ گیا کہ کوئی بہت ہی پریشان
واقعہ رونما ہو چکا ہے۔ مہندر تیزی سے باہر آیا اور میں بھی کار سے نکلا۔

''ادھر آؤ۔'' وہ بنگلے کی طرف بڑھ گئے۔ مہندر اور میں، دونوں ان کے پیچھے
تھے۔

مجھے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ جو میری جان کے دشمن ہو گئے تھے اتنی جلدی
حرکت میں آ جائیں گے۔ انہوں نے لالی کو اغوا کر لیا تھا اور مطالبہ کیا تھا کہ اگر میں خود کو ان
کے حوالے کر دوں تو وہ لالی کو چھوڑ دیں گے۔

لالی کے اغوا کی کہانی بہت مختصر تھی۔ وہ لالی کے ساتھ رات آٹھ بجے گھر واپس آئے
تھے۔ ابھی ان کا دوست انہیں کار سے اتار کر گیا ہی تھا اور وہ سڑک پار کر کے اپنے بنگلے کی
طرف آ رہے تھے کہ ان کے بنگلے کے دروازے سے تھوڑے ہی فاصلے پر کھڑی ہوئی کار
کے پاس سے تین نوجوان ان کی طرف بڑھے۔ اس کار کے پاس دو افراد اور اس طرح
کھڑے تھے جیسے وہ کار کی کوئی خرابی دور کر رہے ہوں۔ ان کے پاس آنے والے نوجوان
میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول تھا۔ ''ادھر آ جائیے سیٹھ صاحب اور دیوی جی آپ بھی!''
پستول والے شخص نے اشارہ کیا تھا اور دو نوجوان ان کے دائیں بائیں آ گئے تھے۔ پھر
انہوں نے لالی کو کار میں بٹھایا تھا۔ پستول والا شخص اور ایک نوجوان وہیں رہ گئے تھے۔
انہوں نے سیٹھ وشوانا تھ سے کہا تھا۔ اگر آج رات تک انہوں نے مجھے ان کے حوالے کر دیا
تو وہ لالی کو رہا کر دیں گے۔ پھر یہ دھمکی دیتے ہوئے وہ دونوں چلے گئے تھے۔ ''سیٹھ جی!
شور مچانے یا ہنگامہ کرنے کی ضرورت نہیں، ایسا کیا تو ہمارے ساتھی آپ کی بیٹی کو ہلاک کر
دیں گے۔ اب آپ گھر جائیے اور اطمینان سے بیٹھئے۔ ہم رات کو دو بجے آئیں گے۔ اگر
آپ نے اپنا مہمان ہمارے حوالے کر دیا تو آپ کی بیٹی واپس مل جائے گی۔ پولیس کو خبر
کرنے کی ضرورت نہیں ورنہ ہم کسی بات کے ذمے دار نہیں ہوں گے۔''

اور یوں لالی کو اغوا کیا گیا۔ ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا مہندر!'' سیٹھ وشوناتھ نے
مضطربانہ لہجے میں کہا تھا۔ ''تمہی بتاؤ میں کیا کروں؟''

''آپ مطمئن رہیے پتا جی!'' اس مرتبہ میں نے کہا تھا۔ ''دو گھنٹے ہی کی بات ہے۔
دو گھنٹے بعد لالی آپ کے پاس ہو گی۔'' اس وقت رات کے بارہ بج کر دس منٹ ہوئے
تھے۔

''میرا خیال ہے ہمیں اس سلسلے میں پولیس کو اطلاع دے دینا چاہیے۔'' مہندر نے
کہا تھا۔

''نہیں میرے دوست!'' میں نے کہا۔ ''لالی کو میری وجہ سے یرغمال بنایا گیا ہے۔
میں خود کو ان غنڈوں کے حوالے کر دوں گا۔''

''یہ بات میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔'' وشوانا تھ نے کہا۔ ''ایسا نہیں ہو

سکتا۔"

"ایسا ضرور ہوگا۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "میرے لیے بھی ناقابل برداشت ہے کہ میری وجہ سے آپ لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچے۔"

ابھی مہندر کوئی جواب ہی دینے والا تھا کہ ڈرائنگ روم کے دروازے لمبا چوڑا، بڑی بڑی مونچھوں والا سیاہ فام شخص نمودار ہوا۔ اس کے چہرے سے سختی ٹپک رہی تھی۔ "تمہارے دونوں ملازم اس وقت ہمارے قبضے میں ہیں۔" خونخوار شخص نے کہا۔ "آیئے شیرازی صاحب!"

"کون ہو تم؟" اس مرتبہ مہندر نے کہا تھا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔" اس شخص نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "اتنا جا کہ تمہاری بہن، لالی ہمارے قبضے میں ہے۔ بولو سودا کرتے ہو؟ لالی کے بدلے کو دے رہے ہو؟" وہ رکا۔ "حیران ہو رہے ہو، ہم اتنی جلدی کیسے آگئے! ہم تو واپس آنے کا ہی انتظار کر رہے تھے۔"

"میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔" اس مرتبہ میں نے کہا تھا۔ "دیوی کہاں ہیں؟"

"بڑے جیالے ہو۔" اس نے کہا۔ "تم چلے چلو، تمہارے اس گھر سے نکلنے پانچ منٹ کے اندر لالی یہاں آجائے گی۔"

میں صوفے سے اٹھا ہی تھا کہ مہندر نے بڑھ کر کہا۔ "سنو شیرازی! میری ایک سنو۔"

"واپس آکر سن لوں گا۔" میں نے کہا تھا۔ اسی وقت میں نے دروازے ایک اور شخص کی جھلک دیکھی تھی۔

پھر میں دروازے سے نکلا۔ وہاں ایک اور شخص پستول تانے کھڑا ہوا تھا۔ پستول کے اشارے سے مجھے بڑھنے کے لیے کہا۔

"اگر تم میں سے کسی شخص نے شور مچایا یا اس کے گھر سے نکلنے کی کوشش کی تو ہم واپس نہیں کریں گے۔ تم اس بنگلے سے باہر نہیں آؤ گے البتہ دروازے پر کھڑے ہو انتظار کر سکتے ہو، گیٹ سے باہر قدم رکھا تو ہم لالی کو واپس نہیں کریں گے۔"

"فکر نہ کرو مہندر!" میں نے پلٹ کر کہا تھا۔ "زندہ رہا تو پھر ملاقات ہوگی۔" سیٹھ وشوناتھ اور مہندر اب ڈرائنگ روم سے باہر برآمدے میں آگئے تھے۔

"چلتے رہو!" پستول والے نے کہا۔

جس وقت ہم گیٹ باہر آئے، میں نے مہندر اور وشوناتھ کو برآمدے سے اتر کر لان تے دیکھا۔ گیٹ سے نکل کر ہم دائیں طرف بڑھے تھے۔ کوئی بیس قدم چلنے کے بعد ہم ایک درخت کے نیچے کھڑی کار کے پاس پہنچے۔ اسی وقت کار کا دروازہ کھلا۔ لالی کار سے اتری۔ تاریکی کی وجہ سے اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور دی اترا تھا۔

اب پستول کا رخ لالی کی طرف ہو گیا تھا۔ "تمہاری ذرا سی حرکت سے لالی مر سکتی ہے۔" پستول والے نے سرد لہجے میں کہا۔ پھر لالی کے ہاتھ کھول کر میرے ہاتھ باندھ دیے گئے۔ اس کے بعد لالی کا منہ بھی کھول دیا گیا اور میرا منہ بند کر دیا گیا تھا۔ "چلو اندر بیٹھو!" جس شخص نے میرے ہاتھ اور میرا منہ باندھا تھا، اس نے مجھے کار کی طرف دھکا دیا۔ میں تیار نہ تھا، لڑکھڑا گیا۔ پھر میں کار میں بیٹھ گیا۔

"جاؤ، دیوی جاؤ!" پستول والے نے کہا۔ "چلو تمہارے پتا بہت پریشان ہیں۔"

"میں تمہارا انتظار کروں گی شیرازی جی!" لالی کی کپکپاتی ہوئی آواز میں جو کرب تھا، وہ میں نے اپنے دل کی گہرائی میں محسوس کیا۔

اسی دوران میں کار کا انجن جاگ اٹھا۔ پستول والا بھی کار میں میرے پاس آبیٹھا تھا۔ اب میں دو افراد کے درمیان تھا۔ اگلے لمحے کار حرکت میں آچکی تھی۔

پھر میری آنکھیں بھی باندھ دی گئی تھیں۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا تھا۔ کار پندرہ بیس منٹ تک چلتی رہی۔ راستے میں کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں انہی لوگوں کے چکر میں پھنس چکا ہوں جن سے مجھے عمر سوبانی نے ہوشیار رہنے کے لیے کہا تھا مگر یہ بات میرے لیے پریشان کن تھی کہ آخر میرے دشمن کون تھے۔ وہ کیوں میرے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔ جن دو افراد کو میں نے مہندر کے گھر میں دیکھا تھا، وہ میرے لیے قطعی اجنبی تھے۔ زندگی کے کسی موڑ پر وہ میرے سامنے نہیں آئے تھے مگر مجھے خوشی میں نے خود کو ان لوگوں کے حوالے کر دیا تھا اور لالی کو ان کے چنگل سے نجات دلا دی میں لالی کو ہر مصیبت سے بچانے کے لیے، ہر مصیبت سے گزرنے کے لیے تیار تھا۔

کار رک گئی تھی۔

"اترو!" کسی نے مجھ سے کہا۔ اس سے پہلے میری دائیں جانب بیٹھا ہوا شخص جس میں پستول تھا، کار سے اتر چکا تھا۔

میں کار سے اتر آیا۔ اس کے بعد میرا ہاتھ پکڑ لیا گیا اور ہم تقریباً تین منٹ تک چلتے رہے۔ اس دوران میں کئی جگہ مجھے مڑنا پڑا۔ کوئی سنسان سا مقام تھا۔ ہم کسی پختہ فرش پر نہیں چل رہے تھے۔ ہمارے قدموں کے نیچے کچی اور ناہموار زمین تھی۔ پھر مرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں کسی دروازے میں داخل ہو رہا ہوں۔ دروازے سے گزر کر ہم شاید صحن سے گزر رہے تھے۔ یہ کچا صحن تھا۔ پھر تین سیڑھیاں چڑھ کر برآمدہ آ گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد ہم شاید ایک کمرے میں آ گئے تھے۔ یہاں آ کر مجھے زور سے دھکا دیا گیا تھا۔

ذرا ہی دیر بعد مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر میری ٹانگیں کرسی کے پیروں سے باندھ دی گئیں۔ پھر میری کمر کے گرد بھی رسی باندھ دی گئی۔ اب میری کمر کرسی کی پشت سے بندھی ہوئی تھی۔ اس تمام کارروائی کے دورن میں کسی نے کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ سب کچھ نہایت خاموشی کے ساتھ میکانکی انداز میں ہو رہا تھا۔

پھر میں نے کمرے سے واپس جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ اس کے بعد دروازہ بھی بند کر دیا گیا۔

''سونی!'' میں نے آواز سنی۔ ''تمہیں یہیں رہنا ہے۔ تم اس کی نگرانی کرو۔ ہم آتے ہی ہوں گے۔ ہمارا کام ختم ہو گیا ہے۔''

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ میں حالات کی اس ستم ظریفی پر غور کر رہا تھا۔ اس کے باوجود کہ مجھے اس خطرے سے آگاہ کر دیا گیا تھا، میں اس سے نہ بچ سکا تھا۔ یہ تمام اسکیم بہت تیزی سے اور نہایت ذہانت سے بنائی گئی تھی۔ وقت کا عنصر اس اسکیم کا سب سے اہم جزو تھا۔ پہلے انہوں نے سیٹھ وشوا ناتھ کو اس دھمکی کے ساتھ خاموش کر دیا تھا کہ اگر اس نے پولیس یا کسی اور کو اطلاع دی تو وہ لالی کو ختم کر دیں گے، پھر جب میں اور مہندر واپس پہنچے تو انہوں نے فوراً ہی اپنی اسکیم کے آخری اور فیصلہ کن مرحلے پر عمل کیا تھا۔ انہوں نے دن کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ یقیناً وہ اس عرصے میں وشوا ناتھ کے بنگلے کی نگرانی کرتے رہے ہوں گے۔

میں نے کرسی کی پشت سے سر ٹکایا اور دائیں کونے کی طرف جھکا، پھر آنکھوں پر بندھی پٹی کو کرسی کے کونے سے اٹکا کر اوپر کی جانب جنبش دی۔ نتیجہ نہ قطعی مایوس کن تھا نہ قطعی حوصلہ افزا۔ آنکھوں سے پٹی ذرا سی سرکی تھی لیکن اب بھی میری آنکھیں بندھی تھیں۔ میں نے یہی عمل بار بار دہرایا۔ میری یہ کوشش بار آور ثابت ہوئی۔ پٹی اب میری آنکھوں

سے ہٹ چکی تھی ناک کے بانسے پر آ کر رک گئی تھی مگر مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔

کمرہ چھوٹا سا اور تاریک تھا۔ ایک کونے میں مٹی کے تیل کا لمبا چمنی والا لیمپ جل رہا تھا۔ بتی کو اچھی طرح نہیں تراشا گیا تھا اس لیے اس کی لو ایک طرف سے بڑھی ہوئی تھی اور اس کی چمنی اوپر تک کالی ہو گئی تھی۔ کمرے میں سامان بھی بہت مختصر تھا، چند ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، ایک طرف میز جس پر نہ معلوم کیا کیا الا بلا رکھا ہوا تھا۔ کمرے کے فرش پر سگریٹوں اور بیڑیوں کے ٹوٹے پڑے ہوئے تھے۔ ہر چیز گرد آلود تھی۔

باہر سے کسی قسم کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کمرے میں گھٹن تھی کیونکہ اس میں نہ کوئی روشندان تھا نہ کھڑکی۔ میں نے جس طرح آنکھوں کی پٹی اتاری تھی اس طرح منہ کی پٹی بھی اتارنے کی کوشش کی تھی لیکن اپنی اس کوشش میں ناکام رہا تھا۔

میں نے دو تین مرتبہ اپنے پیروں کو فرش پر جما کر کرسی کے پچھلے پیر اٹھائے اور انہیں زمین پر مارا۔ رات کے سناٹے میں یہ آواز بھی خاصی تھی۔

''اے بابو!'' باہر سے آواز آئی۔ ''یہ کیا گھپلا کر یلا ہے!'' آواز قدرے نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

میں نے پھر وہی عمل دہرایا۔ اس مرتبہ آواز زیادہ سخت تھی۔ ''ملّج پھر یلا ہے کیا! چپکا بیٹھ!''

مگر میں نے کرسی کے پچھلے پیر پھر فرش پر مارے۔ دوبارہ وہی آوازیں ہوئیں۔ اس مرتبہ ردعمل بھی مختلف تھا۔ دروازہ کھلا ایک پستہ قد شخص اندر آیا اور دو قدم چل کر ہی رک گیا۔

''اے بابو!'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''یہ کیا کیا تُو نے! یہ پٹی کیسے اتارا آنکھوں سے؟''

میں نے زور سے سر ہلا کر اسے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

''چپ! استاد آئیں گا، تمہارا مومی نکالیں گا۔'' پستہ قامت پھر باہر چلا گیا۔ دروازہ پھر بند ہو گیا اور میں نے کنڈی لگانے کی آواز سنی، گویا اس وقت مکان میں کوئی اور نہیں تھا مگر یہ بات معلوم ہو جانے سے مجھے کیا فائدہ ہوا تھا، کچھ بھی نہیں۔ پھر میں نے تمام کوششیں ترک کر دیں۔ پیروں اور سینے پر رسی کی بندشیں بہت سخت اور مضبوط تھیں۔

اب میں اس کرسی پر بے بسی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ میری آنکھیں بندھی تھیں اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا تھا۔ میں اپنی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ماضی کے

واقعات یکے بعد دیگرے تیزی سے میرے ذہن میں آتے جا رہے تھے۔ پھر
خیالات اس نقطے پر مرتکز ہو گئے کہ مجھ سے دشمنی رکھنے والے یہ لوگ کون تھے؟ مگر اب
یہ سوچنا بھی بے سود تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھے، جلد سے سامنے آنے والے تھے۔ پھر میرے
خیالات کی رولالی کی طرف مڑ گئی۔

میں اس وقت لالی کے خیالوں میں گم تھا۔ نہ معلوم کیا وقت ہوا ہوگا کہ میں
پڑا۔ کمرے کے باہر ایک دم کئی آوازیں ابھری تھیں۔ وہ کئی افراد تھے۔ پھر دروازہ
آواز کے ساتھ کھلا۔ کمرے میں سب سے پہلے جو شخص داخل ہوا وہ بہت لمبا سا تھا۔ اس
بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں، جسم کسرتی تھا، سینہ چوڑا تھا، بال چھوٹے چھوٹے
اور گھنگریالے تھے۔ طویل قامتی کی وجہ سے وہ دبلا معلوم ہوتا تھا لیکن معاملہ اس کے بر
تھا۔ اس کے چہرے پر کرختگی اور درشتی برس رہی تھی۔ اس کے پیچھے تین افراد اور تھے
سب ہی شکل وصورت سے بدمعاش اور غنڈے معلوم ہوتے تھے لیکن ان سب میں نما
شخصیت اسی لمبے تڑنگے شخص کی تھی۔ پستہ قامت شخص اب بھی دروازے میں کھڑا تھا۔

''واہ بیٹا!'' طویل قامت شخص نے کہا۔ ''بڑا تیز ہے، آنکھوں کی پٹی کھول لی۔''

میں نے حقارت سے اسے دیکھا اور دیکھتا رہا۔

''تھوبڑا کھولو اس کا۔'' طویل قامت شخص نے کہا۔

طویل قامت شخص ان کا گرو تھا، استاد تھا۔ ایک شخص یہ کہتے ہوئے میری طرف
بڑھا۔ ''ابھی لو استاد!'' ذرا ہی دیر میں میرے منہ کی پٹی کھل گئی۔ میں نے دو تین گہرے
گہرے سانس لیے۔ اب میں ہر صعوبت سے گزرنے کے لیے تیار تھا۔ ان کے ارادے
بڑے خطرناک تھے۔

''کون ہے بے تُو؟'' چھوٹتے ہی استاد نے مجھ سے سوال کیا تھا۔

''شیرازی۔'' میں نے جواب دیا۔

''پورا نام؟'' استاد نے غصے سے پوچھا، پھر وہ دو قدم اور آگے آ گیا۔ اب وہ
سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھا۔

''آفاق شیرازی۔'' میں نے جواب دیا۔

''کہاں سے آیا ہے؟'' استاد کا انداز وکیلوں کی جرح کا سا تھا۔ وہ اس وقت
خود کو عرش معلی پر تصور کر رہا تھا۔

''لکھنؤ سے۔'' میں نے خاموشی سے جواب دیا۔

''کل عمر سوبانی سے کیوں ملا تھا؟'' وہ دائیں جوتے کی ایڑی پر گھوم گیا۔

''تو کیا اس ڈرامے کا ہندوستان کی سیاست سے بھی کوئی تعلق ہے'' میں نے سوچا تھا۔

''ایک پیغام پہنچایا تھا انہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیا پیغام تھا؟'' استاد نے پھر سوال کیا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' میں نے جواب دیا۔

''ابے کیوں جان کا لاگو ہوا ہے، بتا دے سیدھے سے۔'' استاد کے ایک چمچے نے
کہا تھا۔ ''تُو نے استاد کا غصہ نہیں دیکھا۔''

ابھی میرا جملہ بھی مکمل نہیں ہوا تھا کہ استاد کا زناٹے دار تھپڑ میرے منہ پڑا۔ تھپڑ
چونکہ اچانک ہی مارا گیا تھا۔ میں اس کے لیے تیار نہ تھا۔ میری زبان دانتوں میں آ کر کٹ گئی۔

''کنجر کی اولاد۔'' ساتھ ہی استاد نے مجھے گالی بھی دی تھی۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے ان کو ایک خط پہنچانا تھا۔ یہ خط بند
تھا۔'' میں نے جلدی جلدی پوری بات بتا دی۔

''مہاتما جی کے خلاف کیوں بولا تھا آج؟'' استاد نے اس مرتبہ عجیب سا سوال کیا
تھا۔

''وہ میرے اپنے خیالات تھے۔'' میں نے کہا۔

''ابھی دیکھے گا تمہارے خیالات!'' استاد نے کہا تھا۔ ''بڑا آیا خیالات والا!'' اس کا
تھپڑ اس مرتبہ پہلے سے بھی زیادہ زوردار تھا۔ ''کس نے بولا تھا ایسا کرنے کو؟''

میں نے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس کیا۔ کمبخت کے ہاتھ بہت ہی سخت تھے۔

''کسی نے نہیں بولا تھا۔'' میں نے فرش پر خون تھوکتے ہوئے کہا۔

''پھر جھوٹ بولتا ہے!'' اس مرتبہ اس کی ٹانگ گھومی تھی۔ جوتے کی نوک میری
ٹھوڑی پر پڑی تھی۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ کرسی الٹ گئی۔ میرا سر زور سے فرش سے ٹکرایا۔

''اسے اٹھاؤ۔'' استاد کی آواز ابھری۔ میری کھوپڑی میں بے شمار پھلجھڑیاں چٹ
پٹ کر کے چھوٹ رہی تھیں۔

کرسی سیدھی کر دی گئی۔ سر کے پچھلے حصے پر چوٹ کچھ شدید آئی تھی۔ کمرہ مجھے ایک
بار دائیں سے بائیں، پھر بائیں سے دائیں گھومتا محسوس ہوا، پھر چند لمحے بعد ہر چیز اپنی
جگہ ٹھہر گئی۔

''ابھی جلدی بول دے، سچ سچ! کیوں اپنی جان کا دشمن بنا ہے۔'' استاد کے اس

چمچے نے کہا جس نے مجھے کرسی سمیت فرش سے اٹھایا تھا۔

''میں سچ کہہ رہا ہوں، اس میں ذرا بھی جھوٹ نہیں ہے۔'' میں نے جلدی سے
''میں نے کسی کے کہنے پر گاندھی جی کے خلاف تقریر نہیں کی تھی۔''

''گاندھی جی مت بول!'' استاد نے کہا۔ ''مہاتما بول!'' اس کے لہجے میں
سفا کی تھی۔

یہ جو کچھ ہو رہا تھا میرے لیے غیر متوقع تھا۔ یہ سب کچھ سیاسی بنیادوں پر ہو رہا تھا
سفا کی کا مظاہرہ وہ لوگ کر رہے تھے جنہیں مہاتما گاندھی اہنسا کی تلقین کر رہے تھے
انسان کے اندر چھپا ہوا وحشی درندہ کبھی مرا ہے! اسے جب بھی موقع ملا ہے پوری قوت سے
سامنے آیا ہے۔ کبھی اس درندے نے ہلاکو کا نام پایا ہے کبھی چنگیز خان کا، کبھی ہٹلر کا اور کبھی
بے رحم آمروں کا۔

''تُو نے سب کچھ عمر سوبانی کے کہنے پر کیا ہے۔'' اس مرتبہ استاد نے سوال نہیں کیا تھا
بلکہ ایک مفروضہ اپنی طرف سے بیان کیا تھا۔ ''ہم سب جانتا ہے بیٹا!''

''یہ غلط ہے، جھوٹ ہے۔'' میں نے زور سے کہا تھا۔ ''مجھ سے کسی نے ایسا کرنے
کے لیے نہیں کہا تھا۔ میں نے جو کچھ کہا تھا، وہ میری سوچ ہے، میرے ساتھیوں کی سوچ
ہے۔'' میں جلدی جلدی کہہ رہا تھا۔ میں اس تاثر کو مٹانا چاہتا تھا جو نہ معلوم کیسے ان کے
ذہن میں پیدا ہو گیا تھا۔

''پھر جھوٹ!'' استاد نے پھر طمانچہ مارا۔

''ارے کیوں اڑی کرتا ہے!'' ایک اور چمچے نے کہا۔ ''استاد کا مگج بہت کھراب
ہے، آں۔''

''میں اڑی نہیں کر رہا ہوں۔'' میں نے پھر کہا۔ ''عمر سوبانی نے مجھ سے کچھ نہیں کہا
تھا۔''

''یہ سمجھتا ہے ابھی استاد کو کچھ پتا نہیں۔'' استاد نے کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے
کہا۔ ''عمر سوبانی نے کل تیرے سے ملنے کے بعد تیری بڑی تعریف کی تھی۔ پھر تُو نے آج
مہاتما جی کے خلاف بولا۔''

''مجھے نہیں پتا تھا کہ مجھے وہاں تقریر کرنی ہو گی۔'' میں نے تیزی سے کہا۔ ''تم لوگوں
کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔''

''تجھے تقریر نہیں کرنی تھی تو اوپر اسٹیج پر کیوں بیٹھا تھا؟ وہاں تجھے عمر نے ہی بٹھایا تھا۔

تجھے عمر نے ہی بلایا تھا۔'' استاد اب اور بھی برہم تھا۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''یہ سب ٹھیک ہے مگر عمر سوبانی نے مجھ سے یہ نہیں کہا
تھا کہ مجھے تقریر کرنا ہے۔''

''جھوٹ مت بول!'' استاد نے میری گردن پر چوڑا سا ہاتھ جما دیا۔ میرا سانس
گھٹنے لگا۔ میری آنکھوں میں پانی آ گیا۔ پھر اس نے جھٹکے سے میری گردن چھوڑ دی۔

مکان کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ ''سیٹھ جی آ گئے۔'' استاد نے کہا۔
''اوئے نمی! جا دروازہ کھول۔''

پستہ قد شخص جو دروازے کے پاس کھڑا تھا، اچھلتا ہوا باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے
لیے پوچھ گچھ کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ میری گردن بُری طرح دکھنے لگی تھی۔ ذرا ہی دیر میں دو
افراد کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ دونوں سیاہ رنگت کے، ٹھنگنے کھدر پوش تھے۔ وہ لمبے
کرتے اور دھوتیاں پہنے ہوئے تھے۔ آگے آگے جو شخص تھا، اس کا پیٹ بہت پھیلا ہوا تھا۔
پیروں میں سفید جوتے، سر پر سفید چونچ دار کھدر کی ٹوپی، موٹے موٹے ہونٹ، بھدی
پھیلی ہوئی ناک کے نیچے سیہی کے کانٹوں کی طرح کھڑی مونچھیں، ہاتھ میں بیت اور
آنکھوں پر گول شیشوں کا چشمہ! ان کے پیچھے ان کا اختصار یہ تھا، ان سے قد میں چھوٹا، کم
موٹا، کم کالا اور آدھے شیشوں کا چشمہ!

''آؤ، آؤ سیٹھ جی!'' استاد نے کہا۔ ''یہ ہے وہ جوان، شیرازی۔''

''ہوں!'' سیٹھ نے میرے قریب آتے ہوئے گہرا ہنکارا بھرا۔ ''یہ ہے وہ جوان؟
کچھ بتایا اس نے؟'' سیٹھ جی نے میری کرسی کے گرد چکر لگا کر استاد سے پوچھا۔

''بڑی موٹی کھال ہے سیٹھ جی اس کی۔'' استاد نے کہا۔ ''مگر دیکھوں گا کب تک
زبان نہیں کھولے گا!''

''ٹھیک ہے، صبح تک کام ہو جانا چاہئے۔'' سیٹھ جی نے کہا۔

''چنتا ہی مت کرو مہاراج!'' استاد نے بڑے یقین سے کہا تھا۔

''اِدھر آؤ!'' سیٹھ جی نے استاد کو اشارہ کیا اور دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ پھر
دونوں آگے پیچھے کمرے سے باہر چلے گئے۔

تھوڑی دیر تک کمرے کے باہر سے کھسر پھسر کی آوازیں آتی رہیں، پھر گویا ان کی
کھسر پھسر بند ہو گئی۔ ''ٹھیک ہے، سمجھ گئے نا!'' سیٹھ کی آواز آئی۔ ''صبح تک سب کام ہو جانا
چاہیئے۔ اس وقت دو بج رہے ہیں۔''

سب ہو جائے گا۔'' استاد نے کہا۔'' اپن کا نام استاد منگو ہے سیٹھ!''

''سب باتیں معلوم ہونی چاہئیں۔'' سیٹھ کی آواز ابھری۔

''ارے بول دیا نا سیٹھ تیرے کو، ابھی ہم کیا اسٹامپ پر لکھ دے۔'' اس مرتبہ
کچھ گرم ہو گیا۔'' لاؤ انعام نکالو۔''

''انعام صبح کو۔'' سیٹھ نے کہا۔'' کام کے بعد۔''

''اپن کچا سودا تو کیا ہی نہیں کبھی۔'' استاد بولا۔'' ابھی ہم اتنا کام ہی ایڈوانس
بگیر کیا ہے۔ بولو، انعام دیتا ہے یا نہیں؟''

''میں کہہ رہا ہوں، صبح کام کے بعد لے لینا۔ آج بینک بند ہو گئے تھے۔'' سیٹھ
کہا۔

''ہم سے مسخری مت کرو سیٹھ جی!'' استاد نے کہا تھا۔'' اپن بینک دینک نہیں جا
ہے۔ روکڑا نکال سیٹھ! نہیں نکالے گا تو ہم چھوڑ دے گا اس نوجوان کو۔ رام قسم، بولتا
چھوڑ دے گا اسے۔''

''منشی جی!'' سیٹھ صاحب نے آواز دی اور منشی تیز تیز قدموں سے باہر گیا۔''
مالک!''

''اسے رقم دے دو۔'' سیٹھ صاحب نے منشی سے کہا تھا، پھر اس نے استاد سے
تھا۔'' اس وقت آدھی رقم ہے، باقی صبح لے لینا۔''

''ارے کیوں مگج کھراب کرتا ہے سیٹھ!'' استاد نے زور سے کہا تھا۔'' پوری
ورنہ بھاگ جاؤ۔'' آخری جملہ استاد نے اتنی زور سے کہا تھا کہ منشی کو میں نے اچھلتے ہو
دیکھا جو دروازے کے سامنے ہی کھڑا تھا۔

''ارے تو اتنے زور سے کائے کو بولتا ہے!'' منشی نے کہا تھا۔

''دے دے منشی!'' سیٹھ نے کہا تھا۔

''پوری رقم!'' استاد نے زور سے کہا تھا۔

''ارے ہاں ہاں، پوری رقم۔'' سیٹھ نے ناگواری سے کہا تھا۔

پھر میں نے منشی کو تھیلے میں ہاتھ ڈال کر دروازے کی دائیں سمت بڑھتے دیکھ
اب وہ میری نظر سے اوجھل تھا۔

''کیوں جھوٹ بولتا تھا سیٹھ!'' استاد کی آواز ابھری تھی۔'' بیکار لفڑا ڈال رہا تھا

''کام ہو جانا چاہئے۔'' سیٹھ کی آواز ابھری۔

''استاد حرام نہیں کھاتا سیٹھ!'' استاد کی آواز ابھری تھی، پھر سیٹھ اور منشی وہاں سے
چلے گئے تھے۔'' چل بے ٹینی!'' استاد نے کہا تھا۔'' دروازہ بند کر۔''

اب استاد پھر میرے سامنے تھا۔

''سن اوئے!'' اس نے مجھ سے کہا۔'' مجھے سچ سچ بتا مہاتما کے خلاف کس کے کہنے
پر بولا تھا؟''

''کسی کے کہنے پر نہیں۔'' میرا جواب تھا۔

''عمر نے تجھ سے کیا بولا تھا؟'' استاد نے کہا۔'' مہاتما کو برا کہنا؟''

''نہیں، مجھ سے کسی نے کہیں کہا تھا۔''

''تیرے ساتھی کون ہیں؟'' استاد نے پوچھا تھا۔

''میرا یہاں کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں پہلی مرتبہ یہاں آیا ہوں۔''

''میں یہاں کا نہیں پوچھتا۔'' استاد نے پھر کہا۔'' ہم لکھنؤ کا پوچھتا ہے۔''

''لکھنؤ میں میرے بہت سے ساتھی ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔'' میں وہیں پیدا ہوا
تھا۔''

''اوئے کنجر کی اولاد۔'' استاد پھر غصے میں آ گیا۔'' وہ ساتھی نہیں، وہ ساتھی جن کے
ساتھ تم کام کرتا ہے، ہنگامہ کرتا ہے، ڈاکا مارتا ہے۔''

''میں ایسا کوئی کام نہیں کرتا۔'' میں نے کہا۔

''کرتا ہے، کرتا ہے، کرتا ہے!'' استاد نے جھلا کر پیر پٹخے۔'' تم حکومت کے خلاف
کام کرتا ہے۔ تم خود اپنی تقریر میں بولا تھا عمر سوبانی بھی بولتا ہے۔''

''میں ایسے کام نہیں کرتا، سمجھے!'' اس مرتبہ میں بھی چیخا تھا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' استاد نے کہا تھا۔'' ابھی سب اڑی نکل جائے گی۔'' اس
نے جیب سے گھڑی نکال کر دیکھی۔'' ابھی ڈھائی بجا ہے۔ تین بجے ہم کو سب سوالوں کا
ٹھیک ٹھیک جواب چاہیے۔ ابھی تم کو جواب دینا پڑے گا۔ گلو، مچھو! ترکیب نمبر دو۔''

جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ ترکیب نمبر دو کا کیا مطلب تھا۔

انہوں نے مل کر میرے دونوں ہاتھ دیوار میں لگی ہوئی ایک مضبوط سی کھونٹی سے
باندھ دیے۔ اب میں دیوار کے سہارے کھڑا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ سر سے بلند تھے۔ پھر
میری ایک ٹانگ ایک طرف دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی میز کے پائے سے باندھ دی گئی۔
میں نے زور لگایا۔ میز پر اتنا وزن تھا کہ میرے لیے پیر کو جنبش دینا ناممکن تھا۔ اس کے بعد

وہ باہر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ بڑا سا کنستر لے آئے، پھر اسے مٹی اور ریت سے بھر
گیا۔ اس کے بعد میری دوسری ٹانگ اس کنستر سے باندھ دی گئی۔ اب میری دونوں
ٹانگیں اتنی چڑی ہوئی تھیں کہ میں تقریباً اپنی کلائیوں کے بل لٹکا ہوا تھا۔ میرے جسم کا
زور کلائیوں پر تھا۔

''ٹینی! موم بتی جلاؤ۔''

پستہ قد ٹینی باہر سے ایک موٹی سی ادھ جلی موم بتی اٹھا لایا۔ پھر اس نے ایک
میری پھیلی ہوئی ٹانگوں کے درمیان رکھ کر اس پر جلتی ہوئی موم بتی ٹکا دی۔

''لاؤ تاش نکالو۔'' استاد نے کہا۔

پھر وہ سب ایک ایک کر کے کمرے سے چلے گئے۔

''ابھی ہم تاش کھیلتا ہے۔ جب تم سچ بولنا چاہے آواز دے لینا۔'' یہ کہہ کر وہ باہر
گیا۔ اگلے لمحے وہ پھر اندر آیا۔ ''سچ بولنا ہے تو اب بھی بول دے۔''

''میں نے سب کچھ سچ بتایا ہے۔'' میں نے کہا اور استاد باہر چلا گیا۔

استاد اپنے چمچوں کے ساتھ باہر تاش کھیل رہا تھا۔ میں نے پھونک مار کر موم بتی
دی۔ میرے لیے یہ بات ناقابلِ فہم تھی کہ آخر ان لوگوں کو اس بات پر تشویش اور
کیوں ہے کہ میں نے گاندھی جی کے خیالات کے خلاف تقریر کی تھی۔ میری تقریر کی نوعیت
ایسی تھی جس پر انگریز حکومت کی برہمی تو بجا ہو سکتی تھی لیکن انگریزوں کے خلاف جدوجہد
میں مصروف کسی شخص کے لیے اس پر اتنا برہم ہونا تعجب خیز تھا۔

میں نے جو کچھ کہا تھا وہ اس دور کے ہندوستان میں کوئی نئی بات نہ تھی۔ اس قسم کے
خیالات کا اظہار انقلابی فکر رکھنے والے بہت سے نوجوان اکثر و بیشتر کرتے رہتے تھے۔
پھر یہ بات بھی میرے لیے قابلِ فہم نہ تھی کہ آخر یہ لوگ کس بنیاد پر یہ شبہہ کر رہے تھے
میں نے یہ تقریر عمر سوبانی کے اشارے پر کی تھی۔ تو کیا ایسا ہے کہ انگریزوں کے خلاف
مختلف محاذوں پر جدوجہد کرنے والے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں میں کچھ غلط فہمیاں
پیدا ہو گئی ہیں۔ وہ آپس میں بے اعتمادی اور بدگمانی کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہ پریشان کن
سوالات تھے جن کے جواب میرا ذہن اثبات ہی میں دے رہا تھا اور اس کا سبب عمر سوبانی
کی وہ باتیں تھیں جو انہوں نے گزشتہ شام مجھ سے کی تھیں اور مجھے اس خطرے سے خبردار
کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ہو سکتا ہے مجھے سزا دینے کے احکام جاری کر دیے گئے ہوں۔
عمر سوبانی کو اس بات کا علم تھا کہ بعض حلقے میری تقریر سے بہت زیادہ برہم تھے۔

میں یہ بات بخوبی سمجھ چکا تھا کہ یہ لوگ مجھ سے صرف وہی بات سننا چاہتے ہیں جو
ان کے مفروضے کو صحیح ثابت کر دے۔ ساتھ ہی میں یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے بعد وہ پے در
پے ایسے سوالات کریں گے جن کے بارے میں میرے فرشتوں کو بھی کچھ علم نہیں ہو گا۔ پھر
یہ بات بھی انتہائی اخلاقی گراوٹ کی تھی کہ میں عمر سوبانی جیسے شخص کے بارے میں ایسا
جھوٹ بول دوں جس کا کوئی سر پیر ہی نہ تھا۔ میں نے اس لیے یہی فیصلہ کیا کہ خواہ مجھے اپنی
جان سے ہی کیوں نہ جانا پڑے، میں ان لوگوں کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔

چند منٹ گزرنے کے بعد استاد منگو کی آواز آئی۔ ''ٹینی! جا دیکھ، وہ ٹیں تو نہیں ہو
گیا۔''

ٹینی پھدکتا ہوا کمرے میں آیا۔ ''ارے استاد!'' ٹینی نے وہیں سے آواز لگائی۔

''کیا ہے؟'' استاد کی آواز آئی۔

''موم بتی، بوجھی دیو۔'' ٹینی نے وہیں سے مڑ کر کہا۔

پھر استاد اپنے تینوں گرگوں کے ساتھ واپس آیا۔ ''ابھی تُو نے موم بتی بجھا کر اچھا نئیں
کیا۔'' استاد بولا۔ ''اس کی گردن میں رسی ڈال کر ہاتھ سے باندھ دو۔'' اس کے حکم کی فوراً
ہی تعمیل ہوئی۔ اب میری گردن بالکل سیدھی تنی ہوئی تھی۔ موم بتی پھر روشن کر دی گئی۔ اس
مرتبہ اسے اینٹ پر رکھ کر تھوڑا اونچا بھی کر دیا گیا تھا۔ پھر وہ سب آگے پیچھے باہر چلے گئے۔

موم بتی کا شعلہ میری ران کے زیادہ قریب ہو گیا تھا۔ اس کی لو کی گرمی سے میری
ران میں جیسے سوراخ ہونے لگا تھا۔ یہ جلن اتنی بڑھی کہ میرے تمام خیالات منتشر ہو کر رہ
گئے۔ میں نے اپنے جسم کو ذرا سا موڑ کر ران کے اس حصے کو لو کی زد سے بچانا چاہا مگر اس
کوشش میں میرا تمام بوجھ دیوار میں لگی میخوں سے بندھے ہوئے پہنچوں پر آ گیا، ساتھ ہی
گردن میں بڑے زور کا جھٹکا لگا۔ میرا سر پیچھے ہو گیا اور رسی میری گردن کو جیسے کاٹنے لگی،
رسی کی بندشیں میرے پہنچوں میں اتر گئیں۔ میں نے بے قرار ہو کر پھر سابقہ پوزیشن میں
آنا چاہا مگر میں اپنے پنجوں پر کھڑا نہ ہو سکا، ایک اور جھٹکا لگا۔ میرا جسم سامنے کی طرف جھک
کر کمان بن گیا۔ میری آنکھوں میں تکلیف سے آنسو آ گئے۔ بڑی مشکل سے میں پھر پنجوں
پر سیدھا کھڑا ہو سکا۔ شعلہ میری ران میں برمے کی طرح اترنے لگا اور میرے جسم کا روم روم
پسینے میں بھیگ گیا۔

اس تکلیف سے گزرتے ہوئے میرا ذہن اسی ادھیڑ بن میں مصروف رہا کہ آخر وہ
کون لوگ ہیں جنہوں نے میرے لیے اس ایذا رسانی کا اہتمام کیا ہے۔ پھر ایک راہ مجھے

سوجھ ہی گئی۔ استاد منگو اپنے گرگوں کے ساتھ اب بھی تاش کھیل رہا تھا۔
''استاد منگو!'' میں نے آواز دی۔
''کیا ہے بے!'' استاد کی آواز آئی۔
''ادھر آؤ'' میں نے جواب دیا۔
استاد فوراً نہیں آیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ بازی ختم ہونے کے بعد آئے گا۔ وہ
میری قوتِ برداشت کو بالکل ہی ختم کر دینا چاہتا تھا۔۔ میں نے پھر استاد منگو کو آواز دی
تھی۔ اس نے پھر میرا مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا تھا۔ ''ابے! جان کیوں نکلی جا رہی ہے۔''
وہ تھوڑی دیر بعد کمرے میں آیا تھا۔ اس دوران میں میری ران دہکتا ہوا انگارہ بن
گئی تھی۔ ''مستک آ گیا اپنی جگہ۔'' اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔
''اسے ہٹاؤ، موم بتی کو۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں تم سے بات کرنا چاہتا
ہوں۔''
''ہو ہو! بات کریں گا۔'' استاد نے لطف لیتے ہوئے کہا۔ ''ٹینی! ہٹا لے۔''
ٹینی نے استاد کے حکم کی تعمیل میں موم بتی ہٹا لی۔ دہکتا ہوا انگارا جیسے اچانک میری
ران سے ہٹ گیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کمرے میں اس وقت میرے علاوہ
افراد اور تھے، استاد، ٹینی، گلو، مچھو اور ان کے علاوہ ایک اور شخص جس کے نام سے میں
تک واقف نہیں ہوا تھا۔
''ہاں بیٹا!'' استاد نے ترنگ میں کہا۔ ''مہاتما کے خلاف کس کے بولنے پر
تھا؟'' اب اس کا اندازِ گفتگو بھی کچھ شیخی میں ڈوبا ہوا تھا۔
''میں سب کچھ بتا دوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''ان سب لوگوں کو باہر بھیج دو۔''
''کیا بولا؟'' استاد نے حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ان کو باہر بھیج دوں
سے محبت بنائے گا کیا؟'' یہ کہہ کر وہ ہنسا تھا جیسے کوئی بڑی پُرلطف بات کہہ دی ہو۔ اس
گرگے بھی ہنسنے لگے۔ مجھے ان کی یہ ہنسی بڑی زہر لگی۔ وہ مجھ سے گویا چوہے بلی والا
کھیل رہے تھے۔ میں نے اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے ایک ترکیب سوچی
اور اسی پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ یہ ترکیب کامیاب ہو گی یا نہیں، ابھی تک مجھے کچھ معلوم
تھا۔
''محبت کیسے بنائے گا، استاد!'' ایک گرگے نے کہا۔ ''یہ تو بندھا ہوا ہے۔''
''ابھی کیا معلوم؟'' استاد نے لطف لیتے ہوئے کہا، پھر وہ مجھ پر غرایا۔ ''بول

بتا ہے یا نہیں؟''
استاد اب مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ ''میں سب کچھ بتا دوں گا، ان لوگوں کو
یہاں سے بھیج دو۔'' میں نے پھر کہا۔
اس کے ساتھ ہی استاد اور اس کے گرگوں نے پھر قہقہے لگائے۔ میں نے ان قہقہوں
کی آڑ میں سرگوشی کی۔ ''اس میں تمہارا ابھی فائدہ ہے۔'' مجھے یقین تھا کہ استاد کے سوا میرا
یہ جملہ کسی نے نہیں سنا تھا۔
استاد کے چہرے پر تعجب کے آثار کچھ اور گہرے ہو گئے۔ میں نے معنی خیز انداز میں
اسے آنکھ بھی ماری تھی۔
''یہ سالا میرے سے پرائیویٹ بات کریں گا۔'' استاد نے قہقہہ لگاتے ہوئے اپنے
گرگوں سے کہا۔ ''اے! تم سب باہر جاؤ۔'' اس نے اپنے گرگوں کو حکم دیا۔
تمام گرگے ہنستے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ اس مرتبہ پھر کسی نے ہنستے ہوئے کہا۔
''چل بے ٹینی! ابھی استاد محبت بنائیں گا۔''
''اب بول، بات کریں گا؟'' استاد نے کہا۔ ''جلدی بول! ابھی ہم تیرا سرونٹ نئی
ہے۔''
''تم مجھ سے یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہو؟'' میں نے کہا۔
''او بابا! ابھی ہم پوچھے گا نئی تو کیا کرے گا، سیٹھ نے بولا تھا۔ ابھی تم ٹھیک ٹھیک
بولو، فائدے والی بات بولو۔'' استاد فائدے کی بات سننے کے لیے بے چین تھا۔ یہ بات
میرے لیے اطمینان بخش تھی۔
''استاد منگو!'' میں نے کہا۔ ''میں تمہیں سچ بتا رہا ہوں۔ میں لکھنؤ سے آیا ہوں اور
یہاں کسی کو نہیں جانتا۔ عمر سوبانی کے نام لکھنؤ کے ایک صاحب نے خط دیا تھا، وہ میں نے عمر
سوبانی کو پہنچایا تھا۔ پھر انہوں نے مجھے پریل میں، الاؤ کی تقریب میں شرکت کے لیے کہا
تھا۔ مجھ سے کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہاں مجھے تقریر کرنے کے لیے کہا
جائے گا۔ میں نے تقریر میں جو کچھ کہا، وہ میرے اپنے خیالات ہیں۔ بہت سے لوگ اسی
طرح سوچ رہے ہیں۔ میں گاندھی جی کی عزت کرتا ہوں لیکن میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ
انگریز کو ان طریقوں سے نہیں نکالا جا سکتا جو گاندھی جی اور دوسرے نیتا بتاتے ہیں۔ ہمیں
انگریز کے خلاف جنگ کرنی ہو گی۔ ہمیں انگریز سے بندوق سے لڑنا ہو گا۔ ہمیں......''
''باس...... باس!'' استاد منگو نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اسپیچ مت کر! اپن کو

یہ باتیں سمجھ نہیں آتیں، کیا سمجھا! تُو فائدے کی بات بول!''

''سیٹھ وشوا ناتھ کی بیٹی کو تم نے اٹھایا تھا؟'' میں نے پھر اس سے سوال کیا۔

''اپن کی پارٹی کے لوگ نے اٹھایا تھا پر تجھے اس سے کیا، تُو بات بتا!''

''اس سیٹھ کا نام کیا تھا جو ابھی یہاں آیا تھا؟'' میں نے پھر اس سے سوال جڑ[ا]

استاد منگو بگڑ گیا۔ ''ابھی تُو کائے کو اپن کو گھماتا ہے۔ فائدے کی بات بول نا!''

''تم اس سیٹھ کے لیے کام کر رہے ہونا، اسی کے کہنے پر تم نے وشوا ناتھ کی بیٹی [کو اٹھایا]
تھا اور مجھے یہاں لائے تھے؟''

''ارے ہاں بابا!'' استاد نے تنگ ہو کر کہا۔ ''پن......''

''اور اس کے لیے اس نے تمہیں پیسا بھی دیا ہے؟'' میں نے استاد کی بات [کاٹ]
دی۔

''روکڑ بولا روکڑ!'' استاد نے جھلا کر کہا جیسے میں نے اس کی توہین کر دی ہو۔ ''[...]
کام تو اپن کرتا ہی نہیں۔''

''کتنا روکڑ؟'' میں نے پھر سوال جڑ دیا۔

''دو ہزار!'' استاد نے اپنی پھولی ہوئی جیب پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ اس کا [انداز]
ایسا تھا جیسے اس کی جیب میں کوہِ نور ہیرا ہو۔

''بس، صرف دو ہزار!'' میں نے حقارت اور تعجب سے کہا۔ ''صرف دو ہزار [کے]
لیے تم مجھے جان سے مار دو گے؟''

''یہ کون بولا تجھ کو!'' استاد نے حیرانی سے کہا۔ ''اس سالا ٹینی نے تیرے کو بتا[یا ہوئیں]
گا۔ ہاں جان سے ماریں گا۔ اپن چھوٹا کام نئی کرتا۔ جانتا، نئی جانتا تُو! ابھی اپن ٹینی [کو]
دیکھیں گا۔ اس نے کیوں بتایا تیرے کو۔ ٹینی!'' اس نے غصے میں زور سے آواز دی۔

''نہیں، ٹینی نے نہیں بتایا۔'' میں نے زور سے کہا۔ ''سیٹھ نے تجھ سے جو با[تیں کی]
تھیں اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا۔''

''اوئے تیرا مستک تو اپنے گلو کے بلیڈ کی مافک تیز ہوتا رے، وا!'' استاد نے
میری ذہانت کی تعریف کر ڈالی۔

اس دوران میں ٹینی پھدکتا ہوا کمرے میں آ گیا تھا۔ ''میرے کو بلایا استاد!'' [اس]
نے پوچھا۔

''جان لینے کا بات تُو نے بتایا اس کو؟'' استاد نے غصے سے پوچھا۔

''نئی استاد! رام قسم نئی، یہ سالا جھوٹ بولتا ہے۔'' ٹینی نے کپکپاتے ہوئے کہا۔

''میں نے تم سے کہا تھا، اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔'' میں نے پھر کہا۔ ''سیٹھ کی
باتوں سے پتا چلا تھا۔''

''جا بھاگ یہاں سے۔'' استاد نے ٹینی سے کہا۔ ''ابھی تم ٹیم پاس مت کرو،
فائدے کی بات بولو۔''

''سنو استاد!'' میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ''میں واقعی تمہیں فائدے کی بات
بتا رہا ہوں۔ وعدہ کرو کہ پھر تم مجھے چھوڑ دو گے۔''

''چھوڑ دیں گا، چھوڑ دیں گا۔'' استاد نے بیتابی سے کہا۔

''مجھے چھوڑ دو، میں تمہیں چار ہزار روکڑ دلا سکتا ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر
زور دے کر یہ جملہ مکمل کیا۔

وہ احمقوں کی طرح آنکھیں پٹپٹانے لگا۔ ''کیا، کیا بولا، تم کیا بولا؟'' اسے شاید اپنی
سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں نے اپنی پیشکش پھر دہرائی۔ ابھی میرا جملہ پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ استاد نے
بڑھ کر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ مجھے تارے ہی تو نظر آ گئے۔ ''کیا بولا تم! ابھی ہم بے ایمانی
کریں گا۔ بے ایمانی کو بولتا۔'' اس نے اس مرتبہ الٹا ہاتھ گھمایا تھا۔

استاد منگو کا یہ ردِعمل میرے لیے غیر متوقع تھا۔ فائدے کی بات پر اس نے جس بے چینی کا
اظہار کیا تھا، اس کی بنا پر مجھے امید ہو گئی تھی کہ وہ میری اس پیشکش کو مسترد نہیں کر سکے گا مگر
میں نے امید کا دامن اب بھی نہیں چھوڑا تھا۔ ''ٹھیک ہے تو پھر تم سیٹھ سے ہی اس کا کام
کے لیے چار ہزار مانگو۔''

''ابھی اپن سودا پکا کر لیا ہے۔ سمجھ آیا کہ نئی!'' استاد منگو بولا۔ ''زبان دے چکا
ہے۔''

''ٹھیک ہے تو پھر میں جو کچھ بتا سکتا ہوں، سیٹھ کو بتاؤں گا۔'' میں نے جی کڑا کر کے
کہا۔ ''سیٹھ کو بلاؤ۔''

''ابھی وہ تم سے پگار نئی لیتا ہے کہ ادھر آئے گا۔ سمجھا، کیا سمجھا!'' اس کے لہجے میں
اطمینان تھا۔ ''ابھی یہاں کوئی تجھے بچانے نئی آئے گا۔''

''مگر میں نے کیا کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''میں نے اس سیٹھ کا کچھ نئی بگاڑا۔
میں اسے جانتا بھی نہیں۔''

''اپن بتاتا ہے۔تم نے مہاتما کو بُرا کہا۔'' استاد منگو نے کہا۔ ''تم ملیچھ مُسلا!''

تو گویا یہ ہندو مسلم اختلافات تھے جن کی بنا پر میں اس صورتِ حال سے دوچار تھا۔ ''میں نے گاندھی جی کے خلاف کچھ نہیں کہا تھا۔''

''بولا تھا! بولا تھا! بولا تھا!'' اس نے بائیں ہتھیلی پر اپنا دایاں مکا مارتے ہوئے۔ ''ابھی ہم سے چالاکی مت کرو۔ سیدھا سادا بتاؤ، کس کے بولنے پر تم وہ باتیں بولا تھا؟''

''میں نے کسی کے کہنے پر وہ باتیں نہیں کی تھیں۔'' میں نے جھلا کر کہا۔ ''تمہیں یقین نہیں آتا تو جاؤ بھاڑ میں!''

اس مرتبہ دو تین مکے میرے منہ پر پڑے۔ ''گالی نکالتا ہے۔ ابھی فیٹے مار مار کر بگاڑ دیں گا۔ اپن منگو استاد ہے، منگو استاد! اپن سب جانتا ہے۔ تم کو عمر سوبانی بولا، سوبانی کو انگریز بولا۔ تم ملیچھ مسلمان انگریز سے مل گیا ہے۔ اس سے مل کر ہندو کے خلاف گھپلا کرتا ہے۔ اپن سب جانتا ہے۔ مائی نیم از استاد منگو!'' وہ اپنی علمیت بگھار رہا تھا۔

''یہ جھوٹ ہے؟'' میں نے پھر چیخ کر کہا تھا۔

''ابھی تم سب ٹرو، ٹرو بولیں گا۔'' استاد منگو نے کہا۔ ''اپن سب جانتا ہے۔ کیا رائٹ ہے، کیا رانگ! مائی نیم از استاد منگو! ابھی تیرا فادر بھی بتائیں گا۔'' اس کا انداز شاہانہ ہو گیا تھا۔ وہ کمرے میں کسی وائسرائے کی طرح ٹہل رہا تھا۔ انگریزی کی قابلیت بگھار کر وہ گویا اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کو منوانا چاہتا تھا۔ ''گلو! مچھو! ٹینی!'' اس نے اپنے گرگوں کو آواز دی۔

ایک مرتبہ پھر موم بتی روشن کر دی گئی۔

''ابھی تمہارا مومی باہر آئیں گا تو فر فر بولیں گا۔'' یہ کہہ کر وہ اپنے گرگوں کے ساتھ پھر باہر چلا گیا۔ ٹینی کمرے میں ہی تھا۔ باہر تاش کی بازی جم گئی تھی۔

موم بتی کے شعلۂ مثبت سے بھڑکتی ہوئی توانائی میری دائیں ران کے بالائی حصے پر مرکوز تھی۔

ٹینی میرے پاس آیا۔ اس کی آنکھوں میں تشویش تھی۔ ''ابھی کیوں مرنا مانگتا؟ استاد کو بتا دے نا!''

میں نے انکار میں سر ہلایا۔

''ابھی تیرے کو مرنا ہے کیا؟'' اس نے کہا۔ ''پھر کائے کے لیے یہ لفڑا مانگتا ہے۔ آرام سے مر جا!''

میں نے پھر انکار میں سر ہلا دیا۔ میرے پاس بتانے کو تھا ہی کیا۔ میرا تمام جسم پسینے میں بھیگ گیا تھا، جسم کا تمام بوجھ اب میرے پہنچوں پر تھا۔ مجھ میں اب اتنی بھی سکت نہیں رہی تھی کہ جسم کو جنبش دے کر پھر پنجوں کے بل کھڑا ہو جاتا۔ میری ران اب یوں لگ رہی تھی جیسے اسے کسی تنور میں لٹکا دیا گیا ہو۔ گردن میں پڑی ہوئی رسی، پھانسی کا پھندا بن گئی تھی۔ میرا سانس گھٹنے لگا تھا۔ ایسی تکلیف تھی کہ اس کا بیان مشکل ہے۔

پھر میری تمام ہمت، عزم، حوصلہ اور قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ واقعی اگر مرنا ہی تھا تو پھر اتنی اذیت کس لیے؟ میں نے سوچا تھا، پھر یہ بھی سوچا تھا کہ ان لوگوں نے صحیح یا غلط ایک مفروضہ قائم کر لیا تھا، اس کے خلاف یہ لوگ ایک لفظ سننے کے روادار نہیں تھے۔ جو بات جھوٹی تھی اسے یہ لوگ حقیقت سمجھتے تھے اور مجھ سے اس کی تصدیق چاہتے تھے۔ میرے انکار سے وہ اپنا اندازِ فکر تبدیل نہیں کر سکتے تھے۔

''استاد!'' میں زور سے چیخا۔ ''بتاتا ہوں، بتاتا ہوں۔''

''ابھی تھوڑا ویٹ کرنا!'' استاد نے کہا۔ ''ابھی کاہے کو بتاتا ہے!''

''استاد!'' میں پھر چیخا۔

اس مرتبہ ٹینی نے دوڑ کر موم بتی ہٹالی۔ وہ واقعی نرم دل آدمی تھا۔ میں نے بھیگی آنکھوں سے اسے متشکرانہ انداز میں دیکھا۔ اسی وقت استاد اپنے گرگوں کے ساتھ کمرے میں آگیا۔ موم بتی کی لو ہٹتے ہی میرے جسم میں جیسے ٹھنڈک سی پڑ گئی۔ تمام جلن، تمام درد اور آگ صرف ران میں محدود ہو کر رہ گئی۔ میں اپنی جگہ بے سدھ اور بے دم سا ہو کر رہ گیا۔ پہنچوں میں اٹھنے والی ٹیس اب ران کی تکلیف میں دب کر رہ گئی تھی۔

''اے چلو! اسے ہولی کر اس سے اتارو۔'' استاد منگو نے اپنے گرگوں کو حکم دیا۔

گلو اور مچھو میرے دونوں ہاتھوں کی بندشیں کھولنے لگے جب کہ تیسرا گرگا میری گردن میں پڑی ہوئی رسی کی گرہیں کھول رہا تھا۔

اسی وقت بیرونی دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔

''اس ٹیم کون اپنی مدر کا ہزبنڈ آگیا۔ ٹینی جا دیکھ!'' استاد نے کہا اور میری طرف متوجہ ہو گیا۔ ''ابھی فر فر بولیں گا، کیوں؟''

اسی وقت ٹینی کی چیخ رات کے سناٹے میں گونج گئی۔ ''استاد!'' وہ بے اختیارانہ چلایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی کسی کے بھد سے گرنے کی آواز آئی۔ استاد اور اس کے گرگے چونک اٹھے۔ تکلیف سے بوجھل میرا ذہن بھی چوکنا ہو گیا۔ استاد اور اس کے گرگوں کے ردِ

عمل سے ظاہر تھا کہ جو کچھ ہوا ہے، ان کی توقع کے خلاف ہوا ہے۔

استاد اور اس کے گرگے باہر کی طرف لپکے تھے کہ انہیں ٹھہر جانا پڑا۔

''ہینڈز اپ!'' ایک کھرکھراتی آواز گونجی اور ایک نقاب پوش دروازے میں آ گیا۔

''پیچھے ہٹو! الٹے قدموں، دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ۔ ہاتھ اٹھائے رکھو!'' نقاب پوش اپنی کھرکھراتی آواز میں کہتا رہا۔ اس کے ہاتھ میں پستول چمک رہا تھا۔

استاد منگو اور اس کے ساتھی نقاب پوش کی ہدایت کے مطابق الٹے چلتے ہوئے دیوار سے ٹک گئے۔ استاد منگو کے چہرے سے سخت برہمی ظاہر تھی۔ ''ابھی میرے کو بتاؤ، تم کون ہے؟''

''تم خاموش رہو گے، استاد منگو۔'' نقاب پوش نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔''

''تم مٹھا کا لوگ معلوم ہوتا ہے۔'' اسی وقت دروازے کے باہر سے ایک بڑا سا پتھر استاد منگو کے پیٹ پر آ کر لگا۔ یقیناً نقاب پوش کے ساتھی باہر بھی موجود تھے جنہیں میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ استاد منگو تکلیف سے دہرا ہو گیا۔

''اے منگو! ہاتھ اوپر ہی رکھو ورنہ ایک اور پتھر پڑے گا۔'' نقاب پوش نے اور بھی سرد لہجے میں کہا۔ ''تم خاموشی سے دیکھتے رہو۔''

''ہولی گاڈ کا قسم، ٹیم آنے پر ہم تمہارا مومی نکالیں گا۔'' استاد منگو نے کہا۔ ''اس مرتبہ پتھر اس کے سینے پر پڑا تھا۔

''اور اب اگر تم بولے استاد منگو تو پستول کی گولی لگے گی۔'' نقاب پوش نے کہا۔ ''میں کچھ سننے کے لیے نہیں آیا، میں خاموشی چاہتا ہوں، سمجھے!''

اس کے بعد جیسے استاد منگو بولنا ہی بھول گیا۔ اس کے گرگوں کو تو پہلے ہی سانپ سونگھ گیا تھا۔ میں نے استاد منگو کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔

اس کے بعد اس نقاب پوش نے اپنے ساتھیوں کو بھی اندر بلا لیا۔ وہ دو آدمی تھے اور دونوں نقاب پوش۔ تو کیا یہ میرے ساتھی ہیں؟ میری تنظیم کے کارکن ہیں؟ میں نے تکلیف کے سبب نڈھال ذہن سے سوچا تھا۔ یقیناً ایسا ہی ہے۔ ان کے اندازِ گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کا تعلق یوپی سے ہے۔ پھر انہوں نے آپس میں ابھی تک کسی کو نام سے بھی نہیں پکارا تھا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس نے مجھے اسی نتیجے پر پہنچایا کہ وہ میرے رفیق، میرے کامریڈ ہیں مگر انہیں یہ کیسے پتا چلا کہ اس وقت میں یہاں ہوں؟ ایک اور سوال میرے

ذہن میں گونجا۔ ہو سکتا ہے، انہوں نے مہندر کے ہاں مجھ سے رابطہ قائم کرنا چاہا ہو، پھر وہاں سے انہیں میرے اغوا کا علم ہوا مگر اس کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ برقرار تھا کہ انہیں کیسے پتا چلا کہ مجھے یہاں قید کیا گیا ہے؟

پستول تانے ہوئے نقاب پوش کی ہدایت پر اس کے دونوں ساتھیوں نے مجھے بقول استاد منگو کے ہولی کراس سے اتار لیا اور میں بے سدھ ہو کر ٹانگوں کے درمیان رکھے ہوئے ٹین پر بیٹھ گیا۔ میری ٹانگوں میں اتنی جان نہیں تھی کہ میں کھڑا رہ سکتا، نہ جسم میں اتنی سکت تھی کہ دو قدم چل سکتا۔ میرے پہنچے دکھ رہے تھے۔ میری گردن میں تکلیف تھی اور ران میں جو جلن اور سوزش تھی، اس کا بیان تو الفاظ کی گرفت سے باہر ہے۔ میں ٹین پر بیٹھا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

مجھے کھولنے کے بعد ان رسیوں کو جن سے مجھے باندھ گیا تھا، استاد منگو اور اس کے ساتھیوں کی طرف پھینک دیا گیا۔ ''مچھو!'' نقاب پوش نے کھرکھراتی آواز میں کہا۔ ''اس اپنے استاد کی مشکیں کس دو! اور گلو تم پینڈو کی مشکیں کس دو، جلدی کرو!''

گلو اور مچھو کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں دیکھتے رہے۔ نقاب پوش سمجھ گیا کہ وہ مشکیں کسنے کے الفاظ نہیں سمجھ سکے تھے۔ وہ پھر بولا۔ ''منگو اور پینڈو۔ دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔'' وہ دونوں گھوم گئے تو نقاب پوش نے دوسرا حکم دیا۔ ''منگو اور گلو! اب تم دونوں اپنے ہاتھ کمر کے پیچھے لے آؤ۔'' انہوں نے ایسا ہی کیا تو نقاب پوش نے کہا۔ ''ہاں مچھو اور گلو! اب تم ان کے ہاتھ باندھ دو۔''

ذرا ہی دیر میں یہ مرحلہ طے ہو گیا۔ پھر گلو کو حکم دیا گیا کہ وہ مچھو کے ہاتھ بھی اسی طرح باندھ دے۔ آخر میں نقاب پوش کے ساتھیوں نے گلو کے ہاتھ میں باندھ دیے۔ اس کے بعد انہوں نے منگو اور پینڈو کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو، دیوار میں لگی ہوئی انہی میخوں سے باندھ دیا جن سے تھوڑی دیر پہلے میں بندھا ہوا تھا۔ اب وہ آگے کی طرف جھکے کھڑے تھے اور ان کے پشت پر بندھے ہوئے ہاتھ جس حد تک اوپر ہو سکتے تھے اوپر کر دیے گئے تھے اور انہیں رسی کی مدد سے باندھ دیا گیا تھا۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر جنبش نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے بعد مچھو کو منگو کی ٹانگوں کے پاس سینے کے بل لٹا دیا اور منگو کی ایک ٹانگ سے ٹخنوں کے اوپر اس کے ہاتھوں کو کس کر باندھ دیا گیا۔ گلو کو بھی اسی طرح پینڈو کی ٹانگ سے باندھ دیا گیا تھا۔ یہ تمام کارروائی دس منٹ سے بھی کم وقت میں ختم ہو گئی۔ اس کے بعد ٹمی کو اندر لا کر میز کے پائے سے باندھ دیا گیا۔

"آفاق شیرازی!" ایک نقاب پوش مجھ سے مخاطب تھا۔ "تم کیسا محسوس کر رہے ہو، چل سکتے ہو؟"

"شاید۔" میں نے کہا۔ اس قید سے رہائی پر میرے اندر ایک توانائی سی عود کر آئی تھی۔ میں کھڑا ہوا مگر میری سیدھی ٹانگ پھوڑے کی مانند دکھ رہی تھی۔ میں نے لنگڑا کر ایک دو قدم اٹھائے۔ "شاید چل سکوں مگر زیادہ دور نہیں۔"

"تم مٹھا کا مین معلوم ہوتا ہے۔" استاد منگو نے پھر کہا۔

"تم پھر بولے!" نقاب پوش نے بڑھ کر اس کے منہ پر تھپڑ مارا، پھر اس نے [illegible] سے کہا۔ "آؤ چلو!"

"مگر انہوں نے شور مچایا تو؟" میں نے نقاب پوش سے کہا۔

وہ زہریلی ہنسی ہنسا۔ "ان کی فکر مت کرو۔ ہمارا ایک ساتھی پندرہ منٹ تک یہاں رہے گا۔ اسے ہدایت ہے کہ اگر ان میں سے کوئی بھی بلند آواز سے بات کرے یا شور مچائے تو اسے گولی مار دے۔" پھر وہ ایک نقاب پوش کی طرف متوجہ ہوا۔ "تم یہیں رہو اور باقی پروگرام پر عمل کرو گے۔"

"اب ہمیں کہاں جانا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" اس نے کہا اور پھر اسی شخص سے مخاطب ہوا جسے یہاں ٹھہرنے کی ہدایت تھی۔ "اچھا ہم چلتے ہیں۔"

یہ لوگ کون تھے۔ ابھی تک میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا تھا۔ اگر ان کا تعلق ہماری تنظیم سے ہوتا تو اب تک وہ شناختی جملہ کہہ کر مجھے اپنی شناخت کرا چکے ہوتے۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا اس لیے میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔ میں لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا، میری ران میں تکلیف اور بڑھ گئی تھی۔ چھالے پر کپڑے کی رگڑ سے یہ تکلیف اور بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس وقت میں اس تکلیف کی پروا نہیں کر رہا تھا۔ میں تو اس ماحول سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔

"تم کون ہو؟" میں نے مکان سے باہر آ کر کہا۔

"تمہارا ایک ہمدرد۔" اس کا جواب تھا۔ "اور اب ہم اپنی منزل پر پہنچنے تک بات نہیں کریں گے۔"

"جب تک مجھے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ مجھے کہاں لے جایا جا رہا ہے، میں آگے نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ مجھے اب تک کے واقعات میں ایک عجیب سا غیر فطری پن

یہ ٹھیک تھا کہ اس نقاب پوش نے مجھے استاد منگو کے عقوبت خانے سے نجات دلوایا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس پر اعتماد کرنے سے میرا دل ہچکچا رہا تھا۔ میں ٹھہر گیا۔

"تمہارے لیے اور کوئی راستہ نہیں ہے۔" نقاب پوش نے کہا۔ "تم وہی کرنے پر مجبور ہو جو میں کہہ رہا ہوں۔" اس کے لہجے میں سختی تھی۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں اس وقت خود مختار نہیں تھا۔ اس وقت میں پھر اس نقاب پوش کے بس میں تھا جس نے مجھے استاد منگو سے رہائی دلائی تھی۔

یہ مکان جس سے ہم برآمد ہوئے تھے ایک میدان میں تھا۔ آبادی اس سے تھوڑے فاصلے پر تھی۔ جہاں مکانات کے ہیولے مجھے آسمان کے پیش منظر میں نظر آ رہے تھے۔ تب مجھے خیال آیا کہ وہ لوگ جو مجھے یہاں مکان میں لائے تھے بلاوجہ ہی شاید میدان میں اِدھر اُدھر مڑ رہے تھے کیونکہ کار سے اترنے کے بعد میں کئی موڑ مڑنے کے بعد اس عقوبت گاہ تک پہنچا تھا۔ اس کا مقصد شاید تھا کہ وہ مجھے یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ میں کسی آبادی میں چل رہا ہوں۔

تھوڑے ہی فاصلے پر مجھے ایک کار نظر آ گئی۔ ہمارا رخ اسی طرف تھا۔

ابھی ہم کار میں بیٹھے ہی تھے کہ میں نے دو کاروں کو آگے پیچھے، میدان میں بڑھتے دیکھا۔ میدان میں ان کی روشنیاں آڑی ترچھی لکیریں بنا رہی تھیں۔ وہ کار جس میں ہم بیٹھے تھے ایک چھوٹے سے ٹیلے کی آڑ میں اس طرح کھڑی تھی کہ ان کاروں میں موجود کوئی بھی شخص اس کار کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ان دونوں کار رخ میدان میں اسی مکان کی طرف تھا جہاں سے مجھے لایا گیا تھا۔

"یہ کون ہیں؟" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔

"شام دت ہے شاید۔" اس نقاب پوش نے کہا جو ان کا سربراہ تھا اور میرے برابر بیٹھا ہوا تھا۔ "کار بڑھاؤ، لائٹ مت جلانا۔"

جس وقت ہماری کار نے حرکت کی، وہ دونوں کاریں میدان کے اس کونے پر پہنچ کر رک گئی تھیں جہاں سے مجھے لایا گیا تھا۔ میں نے ادھر دیکھا لیکن میرے ذہن میں اس وقت دو شخصیتوں کے بارے میں سوال ابھرے۔ مٹھا کون تھا؟ شام دت کون تھا؟ مٹھا کا حوالہ استاد منگو نے دیا تھا۔ اس نے نقاب پوش سے کہا تھا کہ وہ مٹھا کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ شام دت کا حوالہ اس نقاب پوش نے ابھی دیا تھا۔

"تم مٹھا کے آدمی ہو؟" میں نے سوال کیا تھا۔

''میں خود اپنا آدمی ہوں۔'' نقاب پوش نے کہا۔

''شام دت کون ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''میرا خیال ہے وہ ایک آدمی ہے، ہندو ہے اور بمبئی میں پیدا ہوا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں گہرا سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ یہ شخص کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ بہت گہرا آدمی ہے اور باتیں کرنے کا ماہر بھی۔

کار پکی سڑک پر آ کر تیزی رفتاری سے دوڑنے لگی تھی۔ ''تم مجھے کیوں لائے ہو؟ کیوں بچایا ہے تم نے مجھے؟''

نقاب پوش ہنسا۔ ''میں تمہیں اس سوال کا جواب ضرور دوں گا۔ اس کے بعد تم کوئی سوال نہیں کرو گے، بالکل خاموش بیٹھو گے ورنہ مجھے مجبوراً سختی اختیار کرنا پڑے گی۔ میں بہت نرم دل بھی ہوں اور بہت بے رحم بھی۔ میری مرضی کے مطابق کام ہوتا رہے تو میں خاموش رہتا ہوں اور جب ایسا نہ ہو تو پھر اتنا ہی خطرناک بھی ہوں، سمجھے! اور اب سنو اپنے سوال کا جواب! مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے۔ تمہاری تکلیف نہیں دیکھی جا رہی تھی مجھ سے اس لیے میں تمہیں بچا لایا ہوں۔''

''تو تم کچھ بتانا نہیں چاہتے۔'' میں نے کہا۔

''بس اب خاموش ہو جاؤ۔''

''تمہیں اپنے اس آدمی کی بھی پروا نہیں جسے تم مکان میں چھوڑ آئے تھے؟'' میں نے پھر سوال کر دیا، گو میں جانتا تھا کہ نقاب پوش مجھے خاموش ہی دیکھنا چاہتا ہے۔

''تم چپ نہیں ہو گے!'' نقاب پوش اس مرتبہ واقعی بہت برہم تھا، پھر وہ خود ہی ہنس پڑا۔ اس وقت مجھے اس کی ہنسی عجیب لگی۔ ''وہ اپنا کام جانتا ہے۔ ویسے تمہیں اس سے اچانک اتنی دلچسپی کیوں ہو گئی ہے؟ کیا محبت کرنے لگے ہو؟''

''بہر حال اس نے مجھے وہاں سے نکالنے میں ایک کردار ادا کیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تعجب مجھے تمہارے اطمینان پر ہو رہا ہے۔ تمہارا ساتھی وہاں پھنس بھی سکتا ہے اسی لیے میں نے پوچھا تھا۔''

''اچھا، اب زیادہ باتیں نہیں، بالکل خاموش ہو جاؤ! ایک لفظ بھی تمہاری زبان سے نہیں نکلنا چاہیے۔'' اس کا لہجہ سخت اور تنبیہی تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے، سو میں خاموش ہو رہا۔ اس وقت میں اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔

کار دوڑتی رہی۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ ہم کس راستے سے گزر رہے ہیں، کہاں جا رہے ہیں؟ یہ تمام علاقہ اجنبی تھا۔ میں خاموشی سے لالی کے اغوا سے اب تک کے واقعات پر غور کر رہا تھا۔ پہلے تو یہی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ آخر بعض لوگ میری تقریر پر اتنے برہم کیوں تھے کہ میری جان ہی کے بیری ہو گئے تھے۔ پھر آخر مجھے ہلاک کر کے کیا مقصد حاصل کرنا چاہتے تھے اور اب یہ بات میری فہم سے بالاتر تھی کہ آخر ان نقاب پوشوں کو مجھ سے کیا دلچسپی پیدا ہو گئی تھی کہ مجھے استاد منگو کے چنگل سے چھڑا لائے تھے؟ آخر وہ کیا اسباب تھے کہ یک بیک دو پارٹیاں مجھ میں دلچسپی لینے لگی تھیں؟ وہ کیا بات تھی کہ اچانک میں بعض لوگوں کے لیے اہمیت اختیار کر گیا تھا؟ بہر حال میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ اب میں جن لوگوں درمیان تھا اور جنہیں پہلے میں اپنے ساتھی سمجھا تھا، وہ ہماری تنظیم سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔

میں خیالات کی انہی بھول بھلیوں میں تھا کہ اچانک میری نظر سامنے، سڑک کے کنارے کھڑی ہوئی ایک گھوڑا سوار پولیس پارٹی پر پڑی۔ جونہی کار ان کے پاس سے گزری، میں پوری قوت سے چلایا۔ ''مدد، بچاؤ، ہیلپ!''

اسی وقت میری کھوپڑی جھنجھنا اٹھی۔ کئی پھلجھڑیاں سی چھوٹیں۔ پھر نقاب پوش کے مضبوط ہاتھ میری گردن پر جم گئے اور بالآخر میرے ذہن پر تاریکی کی گہری چادر چھا گئی۔ اس سے قبل میں نے محسوس کیا تھا کہ کار کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔

☆======☆======☆

میں اس وقت بھی کار میں تھا جب اس بیہوشی سے نکلا تھا مگر اب میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی، منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میری ران، رانیں اور میرے پہنچے بری طرح دکھ رہے تھے۔ کار رکی ہوئی تھی۔ میں اپنی جگہ کسمسایا، کچھ بولنا چاہا تو اسی وقت نقاب پوش کی آواز مجھے سنائی دی۔ ''مسٹر! بس چپ چاپ بیٹھے رہو۔ میں بلا وجہ کسی کو مارنے پیٹنے سے بچتا ہوں لیکن جب مجھے مجبور کر دیا جاتا ہے تو کوئی اقدام سے بھی گریز نہیں کرتا۔''

میں خاموش ہو گیا بلکہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ اب مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ اور مار پیٹ کا متحمل ہو سکتا۔ شاید اس کیفیت میں مجھے صدیاں بیت گئیں۔ پھر میں نے کار کا دروازہ کھلنے اور نقاب پوش کے کھکنے کی آواز سنی۔ اس نے شاید ڈرائیور سے کہا تھا۔ ''لو بھئی شام دت، الو کے پٹھے! چلے تھے مجھے رگڑا دینے۔'' اس کے جواب میں ڈرائیور

نے دبا دبا قہقہہ لگایا تھا۔

''آیئے مسٹر شام دت!'' نقاب پوش کی آواز سنائی دی۔

''تم......تم......کیوں بلایا ہے مجھے؟'' شام دت نے جواب دیا۔ یہ آواز
بھی سن چکا تھا مگر مجھے یاد نہیں آیا کہاں۔ میں اس آواز کو کسی شخصیت سے ابھی تک
نہیں کر پایا تھا۔

''سیٹھ!'' نقاب پوش کی آواز آئی۔ ''ہاتھی سے گنے چھیننے چلے تھے۔ ادھر آؤ
بتاتا ہوں کیوں بلایا ہے؟'' اس وقت مجھے یاد آیا کہ یہ آواز اسی سیٹھ کی ہے جس نے
منگو سے مجھے اغوا کرایا تھا۔ میں نے قدموں کے بڑھنے کی آواز سنی۔ یہ آوازیں
پاس آ کر رک گئیں۔ پھر میں نے ناک کے بانسے کے نیچے پٹی کی جھری سے روشنی
دیکھی۔ روشنی یقیناً میرے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ ''یہ آفاق شیرازی ہے اور اب میرے
میں ہے۔''

''کک......کیا؟ یہ تو منگو کے پاس تھا'' سیٹھ کی آواز آئی۔

''ہاں آدھے گھنٹے پہلے تک!'' میں نے نقاب پوش کی آواز سنی۔ ''اسے
کرنا ہے تو سودا کرلو۔''

''مگر......مگر......'' سیٹھ شام دت کچھ نہ کہہ سکا۔

''سوچ لو، کل بارہ بجے تک مجھے جواب مل جانا چاہیے۔ اگر اسے حاصل کرنا چا
ہو تو ٹھیک بارہ بجے اسی جگہ آ جانا، تنہا! میں چھ ہزار میں اسے تمہارے حوالے کرسکتا ہوں۔''

''چھ ہزار!'' سیٹھ شام دت نے جیسے ہچکی لے کر کہا۔

''چھ ہزار، نہ کم نہ زیادہ اور اگر باقی کام بھی مجھ سے کرانا چاہتے ہو تو مزید دو
روپے۔''

''دو ہزار اور؟''

''ہاں دو ہزار اور!'' نقاب پوش نے کہا۔ ''ویسے منگو اب تک پولیس گرفتار کر
ہو گی۔''

''پولیس!'' شام دت کی کپکپاتی آواز سنائی دی۔

''ہاں۔'' نقاب پوش نے کہا۔ ''اس لیے دوسرا کام بھی تمہیں مجھ ہی سے کرانا
آٹھ ہزار دے دیے تو دونوں کام ہو جائیں گے۔ چھ ہزار دو گے تو آفاق شیرازی
تمہارے حوالے کر دیا جائے گا نہیں دو گے تو ٹھیک بارہ بج کر پندرہ منٹ پر اسے چھ

دے گا۔ اسے تمہارا نام پتا بتا دیا جائے گا۔ پھر یہ اس کی مرضی ہو گی کہ پولیس کے پاس
جائے یا خود تم سے انتقام لے۔'' نقاب پوش انسانی نفسیات خوب سمجھتا تھا۔

''تو کیا منگو کو واقعی پولیس......''

''ہاں۔'' نقاب پوش نے کہا۔ ''جس وقت ہم اسے وہاں سے لے کر چلے تھے
پولیس وہاں پہنچ گئی تھی۔'' وہ ٹھیک کہہ رہا تھا یا غلط، میں اس وقت کوئی اندازہ نہیں کرسکتا تھا،
ہو سکتا تھا کہ وہ دو کاریں جنہیں میں نے میدان میں بڑھتے دیکھا تھا پولیس ہی کی ہوں۔

''ہائے رام، اگر اس نے بتا دیا تو؟'' شام دت نے کہا۔

''وہ اتنا بیوقوف نہیں ہے۔'' نقاب پوش نے یقین دلایا۔ ''اچھا میں چلتا ہوں۔ دن
کے بارہ بجے ملاقات ہو گی۔'' میں نے نقاب پوش کو اپنے برابر بیٹھتے ہوئے محسوس کیا۔

''اے، اے، رکو!'' شام دت نے بیتابی سے کہا۔ ''آٹھ ہزار بہت زیادہ ہیں، چار
ہزار میں دونوں کام کر دو۔ منگو تو دو ہزار میں راضی ہو گیا تھا۔''

''تو پھر منگو سے کام کرا لینا۔'' نقاب پوش نے کہا۔ ''اچھا تو پھر بارہ بجے۔''

''اے، اے ٹھہرو!'' شام دت نے پھر کہا۔ ''چھ ہزار لے لو۔''

''ٹھیک ہے تو بارہ بجے یہ تمہارے گھر پہنچا دیا جائے گا۔ رقم ابھی دے رہے ہو تو
ابھی چھوڑ جاتے ہیں۔''

''نہیں، نہیں!'' شام دت کے لہجے سے پریشانی عیاں تھی۔ ''چھ ہزار میں تمہیں
سب کام کرنا ہو گا۔ میرے پاس اس سے زیادہ نہیں ہے۔''

''پھر بھی تمہارے پاس دو ہزار بچ جائیں گے۔'' نقاب پوش نے کہا۔ ''یقین کرو
میں ماوالنکر کو نہیں بتاؤں گا کہ تم نے دو ہزار کی رقم بچا لی ہے۔''

''کیا؟'' شام دت تقریباً چیخ پڑا تھا۔ ''تمہیں کیا پتا ماوالنکر کا!''

''پتا نہ ہوتا تو نہ میں یہاں ہوتا نہ تم۔'' نقاب پوش نے کہا۔ ''ہاں تو بولو، اب بھی تم
دو ہزار کے فائدے میں ہو۔''

''میں دو ہزار منگو کو دے چکا ہوں۔'' شام دت نے کہا۔

''ان دو ہزار کی نہیں، اس دو ہزار کی بات کر رہا ہوں جو تمہیں اپنے پاس سے ملانے
تھے۔ تم نے اس کام کے بارہ ہزار ہی بتائے تھے نا!''

میں نے جواب میں شام دت کی بڑبڑاہٹ سنی۔ ''پر......پر......'' وہ کچھ بھی نہ کہہ
سکا۔ ''تم بدذات ہو۔'' اسے شاید کوئی گالی بھی نہیں سوجھ رہی تھی۔

''بدذات، تو تم ہو شام دت!'' نقاب پوش نے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں چلتا ہو
''ارے رکو تو۔'' شام دت کی آواز آئی۔ ''ٹھیک ہے۔ آٹھ ہزار ابھی
بجے تک مجھے سب کچھ معلوم ہو جانا چاہیے اور اسے بھی ٹھکانے لگا دینا۔''

''ڈن!'' نقاب پوش نے کہا۔

''آؤ میرے ساتھ!'' میں نے شام دت کی آواز سنی۔

''یہیں لے آؤ۔'' نقاب پوش نے کہا۔ ''اور دیکھو زیادہ چالاک بننے کی کو
کرنا۔''

''مجھے کچھ اور بھی بتانا ہے۔'' شام دت نے کہا۔

''میں سب جانتا ہوں۔'' نقاب پوش کی آواز ابھری۔ ''تمہیں ان سے کیا کیا
کرنے ہیں مجھے پتا ہے۔ تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔''

شام دت کی بڑبڑاہٹ کی آواز آئی، پھر قدموں کی دور ہوتی آوازیں ابھر
نقاب پوش نے کہا۔ ''جلدی، شام جی! میں دس منٹ سے زیادہ نہیں رکوں گا۔''

شام دت کے قدموں کی آواز رات کے سناٹے میں گم ہو گئی۔

اس وقت میری کیفیت وہی تھی کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ میں سمجھ گیا
اب میری زندگی اور موت کے درمیان صرف چند گھنٹوں کا فصل باقی رہ گیا ہے۔ می
جگہ ایک مرتبہ پھر کسمسایا، ہاتھوں کو اِدھر اُدھر جنبش دے کر بندشوں کو ڈھیلا کرنے کی کو
کی مگر بندشیں بہت سخت تھیں۔ میری اس کوشش کو نقاب پوش نے بھی محسوس کر لیا تھا۔
نے میری دکھتی ہوئی ران پر زوردار دھپ ماری۔ تکلیف کی وجہ سے بے اختیار میر
سے چیخیں نکل گئیں مگر یہ چیخیں اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئیں کیونکہ میرا منہ بندھا ہوا تھا۔ شد
تکلیف سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''مسٹر!'' نقاب پوش کی سرد آواز ابھری۔ ''میں نے تم سے کہا تھا کہ بلاوجہ خو
تکلیف میں نہ ڈالو۔''

میں اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ واقعی بلاوجہ اذیت مول لینے سے فائدہ بھی کیا تھا۔
پندرہ منٹ بعد کار حرکت میں آئی۔ شام دت ٹھیک دس منٹ بعد وہاں پہنچ گیا تھا۔ ا
نقاب پوش نے جملہ بھی کسا تھا۔ پھر چند منٹ رقم کی گنتی میں لگے تھے۔ میں پھر اپنی
کسمسایا تھا۔ اس مرتبہ نقاب پوش نے گویا مجھے دلاسا دیا تھا۔ ''بے فکر رہو، چند منٹ
بات اور ہے۔''

میرے خیالات اس وقت بالکل بے ترتیب ہو گئے تھے۔ بچپن سے لے کر اب تک
کے مختلف واقعات میرے ذہن میں بجلی کے کوندوں کی طرح لپکتے اور جھمکتے رہے۔ میں
بہت کوشش کر رہا تھا کہ اپنے خیالات کو اس وقت کے حالات پر مرکوز رکھوں لیکن زندگی کی
طرف سے جب مایوسی ہو جائے تو ذہن شاید اسی طرح بے قابو ہو جاتا ہے۔

پھر ایک جگہ کار رکی۔ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص کار سے اترا۔ اس کے ساتھ ہی
نقاب پوش بھی جو میرے برابر بیٹھا تھا، کار سے نکل گیا۔ وہ یقیناً دوسرے شخص کو کوئی ہدایت
دے رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ پھر میرے پاس آ بیٹھا اور کار حرکت میں آ گئی۔

اس مرتبہ یہ سفر چند منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ اس مرتبہ مجھے کار سے اترنے کے
لیے کہا گیا۔ پھر میں نے کار کے روانہ ہونے کی آواز سنی۔ کئی سیڑھیاں چڑھ کر ہم اوپر
آئے۔ پھر میں نے آواز سے اندازہ لگایا کہ تالا کھولا گیا ہے۔ پھر دروازہ کھلا اور نقاب
پوش میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد مجھے ایک جگہ کھڑا کر دیا گیا اور
میری آنکھیں کھول دی گئیں۔

اس وقت میں ایک بڑے سے آراستہ کمرے میں تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا
ہوا تھا۔ فرنیچر سے یہ کمرہ ڈرائنگ روم معلوم ہوتا تھا۔ کمرے کی آرائش صاحب خانہ کی
خوش ذوقی اور نفاست کا مظہر تھی۔ سامنے دیوار پر کلاک آویزاں تھا۔ اس وقت پانچ بج کر
چند منٹ اوپر ہوئے تھے، گویا میری زندگی کے زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے باقی تھے۔

''تشریف رکھیے، مسٹر آفاق شیرازی!'' اس شخص نے نہایت شائستگی سے کہا جسے میں اب
تک نقاب پوش لکھتا رہا ہوں۔ اب اس کے چہرے پر نقاب نہیں تھی۔ وہ ایک وجیہہ
نوجوان تھا، چہرے سے ذہانت کے ساتھ عیاری، شائستگی کے ساتھ سفاکی اور لہجے میں
اعتماد کے ساتھ مکاری عیاں تھی۔ اس کا چہرہ تضادات کا نمونہ تھا۔ اس کے ہونٹوں کے
گوشوں سے مسکراہٹ کی لکیریں قوس بناتی تھیں تو ماتھے پر غصے کی شکنیں ابھر آتی تھیں۔
عجیب دوغلا، دورخا اور دھوکے باز چہرہ تھا۔

''بیٹھو یار!'' اس نے بڑے پیار سے کہا۔ ساتھ ہی مجھے زور سے پیچھے دھکا دیا۔ میں
لڑکھڑا کر صوفے پر گر گیا۔ میں اسے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ میرے منہ پر اب بھی پٹی بندھی ہوئی
تھی۔ ''میں ہر کام چپ چپاتے اور نفاست سے کرنے کا عادی ہوں۔ ہڑبونگ اور شور غوغا
مجھے پسند نہیں۔ کسی کو جان سے مارنا ہو تو اسے بلاوجہ موت سے قبل اذیت دینا بھی میری
فطرت نہیں۔ جو لوگ تعاون نہیں کرتے، انہیں ایسی اذیتوں سے گزرنا ہوتا ہے کہ......'' وہ

جھرجھری لے کر خاموش ہو گیا اور اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''مجھے خود بہت
ہوتی ہے۔ احمق بلا وجہ سکون و اطمینان کی موت کی بجائے غلط راہ اختیار کرتے ہیں
خاموش ہو کر اس طرح ٹہلنے لگا جیسے کوئی پروفیسر کلاس لیتے ہوئے اِدھر اُدھر ٹہل
دیتا ہے۔ ''اوہ ہاں، تمہارا منہ بند ہے۔'' یہ کہہ کر وہ بڑھا اور میرے منہ پر بندھی
کھول دی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم لوگ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' میں نے کہا۔

''ہاں میں بتاتا ہوں۔ آدمی کو سکون سے مرنے کے لیے بہت ضروری ہے کہ
یہ بھی معلوم ہو کہ وہ مر کیوں رہا ہے؟'' اس نوجوان نے کہا۔ ''میں تمہاری بے چینی
طرح سمجھتا ہوں۔ دراصل ہر آدمی مرنے سے پہلے اپنے مرنے کی وجہ جاننا چاہتا ہے
سنو!'' وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔ ''میرا خیال ہے کہ اگر منگو تمہیں وجہ بتا دیتا کہ تمہیں
مارا جانے والا ہے تو تم اسے ہر سوال کا جواب آسانی سے دے سکتے تھے۔''

''منگو مجھ سے بے سروپا سوال کر رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''بہر حال میں نے اپنے ایک ساتھی کو ز
منگوانے کے لیے بھیجا ہے۔ ممکن ہے تمہیں پتا نہ ہو سائنائڈ بہت زود اثر زہر ہوتا
زبان پر اس کا قطرہ ٹپکتے ہی زندہ انسان لاش میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ نہ مارنے والے
لئے کوئی مصیبت نہ مرنے والے کو کوئی تکلیف! تمام کام چٹ پٹ ہو جاتا ہے۔''

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔'' میں نے پھر کہا۔

''ہاں تمہارے سوال کا جواب بھی دینا ضروری ہے۔'' اس نے پھر کہا۔
دراصل کچھ یوں ہے کہ......'' وہ رکا۔ ''میں تمہیں پہلے یہ بتا دوں کہ میں یہ سب کچھ
کیوں بتا رہا ہوں۔ یہ اس وقت حکومت کا سب سے بڑا راز ہے۔ کم از کم میرے خیال
مطابق، اس کی تہہ میں جو فلسفہ کارفرما ہے اسے ڈیوائڈ اینڈ رول کہا جا سکتا ہے۔ بات
ہے کہ حکومت اس وقت ہندوستانیوں کے سیاسی اتحاد سے بہت گھبرائی ہوئی ہے۔ اس
کو کمزور کرنے کے لیے مختلف علاقوں میں مختلف طریقوں سے ہندو مسلم فساد کو ہوا دی
ہے۔'' وہ پھر رکا۔ ''ارے میں تو بھول ہی گیا بتانا کہ میں یہ سب کچھ تمہیں کیوں بتا
...... اس لیے مسٹر شیرازی کہ تمہیں یہ راز بتانا ایسا ہی جیسے میں اس وقت خالی کمرے
اپنے آپ ہی سے گفتگو کر رہا ہوں، خود کلامی سے مراد ہے میری! تم میرے لیے
مر چکے ہو۔ ایک مردہ آدمی ہر راز کا سب سے بہتر امین ہوتا ہے جبکہ زندہ آدمی تو

کا ریکارڈ ہوتا ہے۔ چابی دی، پہیا چلا، سوئی رکھی اور اس نے بولنا شروع کر دیا۔ ہاں تو
میں کیا کہہ رہا تھا؟'' وہ خاموش ہو گیا۔

میں جانتا تھا، اس وقت وہ میری بے بسی سے محظوظ ہو رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ
میں اس کو لقمہ دوں مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔'' اس نے اپنی گفتگو کا ٹوٹا ہوا دھاگا جوڑتے ہوئے کہا۔
''حکومت مختلف علاقوں میں مختلف طریقوں سے ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی
ہے۔ یہاں اس مقصد کے لیے تمہیں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ کل تمہاری لاش
بمبئی کے کسی علاقے میں پائی جائے گی۔ اس کے ساتھ ایک خط بھی ہوگا جو کسی ہندو تنظیم کی
طرف سے لکھا گیا ہوگا۔ اس خط میں مسلمانوں کو بُرا بھلا کہا جائے گا، ساتھ ہی یہ بھی کہا
جائے گا کہ ہندوستان کا کوئی ہندو، کسی مسلمان کو ہرگز یہ اجازت نہیں دے گا کہ وہ مہاتما
گاندھی یا کسی بھی ہندو لیڈر کو بُرا بھلا کہے۔''

اس کی یہ باتیں سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ انگریز کی یہ سازش بہت گہری تھی۔ یہ
چنگاری پورے ہندوستان کو تنور بنا سکتی تھی۔

''وہ مگر وہ شام دت اور منگو تو عمر سوبانی کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔'' میں نے
کہا۔

''یہ بھی اسی منصوبے کا حصہ ہے۔ منگو اور اس کے دوستوں کے ذریعے یہ بات یقیناً
کچھ اور لوگوں تک بھی پہنچے گی۔ ایسی باتیں پر لگا کر اڑتی ہیں اور جنگل کی آگ کی طرح
پھیلتی ہیں۔ اس منصوبے میں شام دت کی حیثیت محض آلۂ کار کی ہے۔ کیا سمجھے مسٹر
شیرازی!''

''مگر میرا خیال ہے، اس سازش سے ہندو اور مسلمان لیڈر بھی آگاہ ہیں۔ مجھے شام
دت ہی بتا گیا تھا کہ میرے قتل کے احکام صادر ہو چکے ہیں۔''

''ضرور بتا گیا ہوگا اس لیے کہ اس منصوبے سے مسلمان اور ہندو لیڈروں کو حکومت
کے پٹھوؤں نے آگاہ کیا ہے۔'' اس نے فاتحانہ انداز میں مجھے دیکھا۔

''کیا مطلب؟ خود حکومت نے؟'' میری سمجھ سے یہ بات بالا تھی۔

''ہاں مگر ذرا مختلف انداز میں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''شاید تمہیں معلوم نہیں کہ
ہندو اور مسلمان لیڈروں میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو حکومت کے تنخواہ دار ہیں۔ یہ لوگ
ان سیاسی پارٹیوں میں حکومت کے جاسوس ہیں، ان جاسوسوں کے بڑے فائدے ہوتے

ہیں۔ ایک تو ان کے ذریعے پارٹی کے راز حکومت کو معلوم ہوتے رہتے ہیں، دوسرے انہی لوگوں کو ذریعے پارٹیوں میں بے اعتمادی، بددلی اور مایوسی پھیلائی جاتی ہے۔ اہم مسائل پر ہونے والے مباحثے کو الجھا دیتے ہیں اور فروعی مسئلوں کو نہایت اہم انہیں پارٹی کی سطح پر جذباتی انداز میں اس شدت سے ابھارتے ہیں کہ وہی سب سے مسئلہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اب یہی دیکھ لو، کانگریس کی مجلس عاملہ، تحریکِ خلافت کی امداد کی حمایت میں ایک قرارداد بھی منظور نہیں کرسکی جس میں فوج اور پولیس کے مقاطعے لیے کہا گیا تھا۔ زور دیا گیا تھا بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ پر، پرنس آف ویلز کے دورے کے مقاطعے پر جس میں ابھی چند ماہ باقی ہیں۔ بدیسی کپڑے کے مقاطعے سے کیا ہوگا؟ یہی کہ بدیسی کپڑے کی مانگ بڑھے گی کیونکہ اس مقاطعے کی عملی صورت یہ بنائی گئی کہ بدیسی کپڑا جلا دیا جائے۔ پرانا کپڑا یا اسٹاک میں موجود کپڑا جلا دیا جائے گا تو اس کی جگہ نیا آئے گا اور مانچسٹر کے کارخانے زیادہ مصروف ہوجائیں گے۔“ وہ خاموش ہوگیا۔

”مگر یہ سب باتیں تمہیں کیسے معلوم ہوئیں۔“ میں نے پوچھا۔ مجھے اس کی باتوں میں کچھ وزن محسوس ہو رہا تھا۔

”میں بڑا اہم آدمی ہوں۔“ اس نے کہا۔ ”چلو میں تمہیں یہ بھی بتائے دیتا ہوں۔ تمہیں بہر حال مرنا ہی ہے۔“ اس نے گھڑی دیکھی۔ ”بس دس منٹ کے اندر اندر سانپ آ ہی جائے گا۔ اس کے بعد تمہارا لاشہ ہوگا لہٰذا بہتر یہی ہے کہ تم کوئی حسرت دل میں لے کر نہ مرو، تم اس اطمینان کے ساتھ مرو کہ تمہیں اس راز کی ہر تفصیل معلوم تھی۔ بہر حال سنو میں گورنر کے عملے کا آدمی ہوں۔ بنیادی طور پر سی آئی ڈی میں ملازم ہوں۔ میں پولیٹیکل برانچ میں ہوں۔ سیاست سے متعلق گورنر صرف میری رپورٹ پر بھروسا کرتا ہے۔“

ایک مرتبہ پھر میری موت کا ذکر چھیڑ کر اس نے مجھے اس صورتِ حال کی سنگینی کا احساس دلایا تھا جس سے میں دوچار تھا مگر میرے ہاتھ کی بندشیں بہت سخت تھیں۔ میں نے ہاتھوں کو اِدھر اُدھر جنبش دی مگر فضول ثابت ہوا۔

وہ ہنس پڑا۔ ”اپنی انرجی کیوں ضائع کرتے ہو۔ یہ وہ مخصوص گرہ ہے جو کسی بندھے ہوئے آدمی کے لیے کھولنا ناممکن ہے۔“

میں نے اپنی کوشش ترک کردی۔ ”ہوسکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”مگر میں منگو کو اس کے سوالوں کا کیا جواب دے سکتا تھا۔ ظاہر ہے وہ جو کچھ کہہ رہا تھا۔“

”ارے یار!“ اس نے پھر اسی نرم اور تپا دینے والے لہجے میں کہا۔ ”تم سے سچ کون قبولوانا چاہتا تھا۔ شام دت نے تو اسے چند سوالات بتائے تھے اور اس سے کہا تھا کہ تم سے یہ بات قبولوانا ہے۔ تم نے شاید سوالوں کی نوعیت پر غور نہیں کیا۔ ہر سوال کے ساتھ اس کا جواب موجود تھا مثلاً کیا تمہیں گاندھی جی کے خلاف تقریر کرنے پر عمر سوبانی نے اکسایا تھا؟ تم مسلمان، گاندھی کے خلاف سازش کر رہے ہو وغیرہ وغیرہ۔ شام دت نے منگو سے کہا تھا کہ وہ تم سے صرف ان باتوں کا اقرار کرا لے۔ تم انکار کرتے وہ تمہیں زیادہ تکلیف دیتا۔ اگر تنگ آکر اقرار کرلیتے تو وہ یہ سمجھتا کہ تم نے تکلیفوں سے تنگ آکر صحیح بات کا اقرار کرلیا ہے۔ اگر تم انکار کرتے رہتے تو وہ تمہیں بہت زیادہ سخت جان سمجھتا۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں یہی ہوتا کہ وہ تمہیں ٹھکانے لگا دیتا۔ پھر کیا ہوتا، میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔“

وہ خاموش ہوگیا تھا۔ میں بھی خاموش تھا۔ ابھی میرے ذہن میں اور بھی کئی خیالات اور سوالات تھے مگر اس وقت میں صرف اس بات پر سوچنا چاہتا تھا کہ اس آنے والی موت کو کس طرح ٹالا جا سکتا ہے۔ وہ شخص جس نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا تھا، شاید ذہن پڑھنے کی بھی صلاحیت رکھتا تھا یا پھر بہترین قیافہ شناس تھا۔

”اور بھی جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو۔ اس کا تو خیال بھی دل میں مت لاؤ کہ تم یہاں سے بچ کر جا سکتے ہو۔“ وہ بولا۔

”تم نے میرے قتل کے لیے رقم کی بات کی تھی، بارہ ہزار روپے! یہ رقم کس کس نے دی تھی؟ دو ہزار تو شام دت کے حصے میں آئے تھے۔“ میں نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر سوال کیا۔ میں اس وقت خود کو اس کے سامنے خوفزدہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ موت تو میرا مقدر بن ہی چکی تھی۔ میں نے سوچا تھا پھر کیوں نہ اپنے دل کی بھڑاس نکال ہی لی جائے۔

”یہ تمام رقم دراصل سرکار ہی کی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ویسے پانچ مختلف آدمیوں نے دو دو ہزار روپے دیے تھے اور چھٹا آدمی شام دت ہے جسے دو ہزار روپے اپنی طرف سے ملانے تھے۔ یہ چھ آدمی حکومت کے تنخواہ دار ہیں۔ خصوصی اخراجات کے لیے حکومت نے انہیں ایک مخصوص فنڈ دے رکھا ہے تاکہ وقت بے وقت یہ لوگ فوراً دو اڑھائی لاکھ روپے تک جمع کرسکیں۔ اس فنڈ سے جو اخراجات یہ لوگ کرتے ہیں، وہ رقم انہیں پھر ادا کردی جاتی ہے۔ ہر شخص کے پاس پچاس پچاس ہزار روپے اس فنڈ میں موجود ہیں۔ شام دت کا خیال یہ ہے کہ اس کام کے لیے بارہ ہزار کی ادائیگی اسے کرنا تھی جس میں دو ہزار

روپے اسے بھی دینے تھے۔اب وہ رقم خرچ کیے بغیر حکومت سے دو ہزار روپے وصول
سکے گا۔اگر منگو یہ کام کر دیتا تو مزید آٹھ ہزار کا فائدہ اسے ہوتا۔''

تبات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔اس دن پہلی مرتبہ مجھے انگریز حکومت کے اس طر
کار کا علم ہوا تھا۔ یہ لوگ معاشرے میں ایسی حیثیت رکھتے تھے کہ کوئی ان پر یہ شبہ
نہیں کرسکتا تھا کہ وہ انگریز حکومت کے پٹھو ہوں گے مگر انگریز نے دولت سے ان کے ضمیر
خرید لیے تھے اور وہ اپنے ہی ہموطنوں کو آگ اور خون کی ہولی میں پھونک ڈالنا چاہتے
تھے۔

''پوچھو، پوچھو، یار!'' اس نے پھر کہا۔''اور کوئی سوال بھی کرو۔ابھی تو پانچ چھ منٹ
باقی ہیں۔خاموشی سے مجھے نیند آنے لگتی ہے اور آج تو تمام رات ہی جیسے کالی ہو کر رہ گئی۔''

''مگر اچانک میرے متعلق یہ فیصلہ کیسے کیا گیا؟ میں تو اس شہر میں بالکل نیا ہوں۔
یہاں کوئی مجھے نہیں جانتا۔لگتا تو ایسا ہے کہ اس کی تیاریاں بہت پہلے سے تھیں۔''

''پہلی بات یہ کہ تم اس شہر میں اجنبی تو ضرور ہو مگر انجانے نہیں۔تمہاری تقریر کی گونج
پورے بمبئی میں ہے۔ ہر شخص کی زبان پر لکھنؤ کے شیرازی کا تذکرہ ہے۔لوگ اس کی تقریر
کے حوالے دے رہے ہیں۔ یہ میں تمہاری تعریف نہیں، حقیقت بیانی سے کام لے رہا
ہوں۔حقیقت حال کی رپورٹ دینا میرے فرائض میں داخل ہے کیونکہ غلط رپورٹ کی بنیاد
پر کبھی صحیح اور موٴثر اسکیم یا پالیسی نہیں بنائی جاسکتی۔ سمجھتے ہو نا! میں سی آئی ڈی میں ہوں نا!''
وہ ایک لمحے کے لیے رکا، آہستہ سے ہنسا اور کھنکار کر بولا۔''تم نہ ہوتے تو تمہاری جگہ کوئی
اور مسلمان ہوتا مگر تمہارے بارے میں فوری فیصلہ اس لیے کیا گیا کہ تم آج کے ہیرو ہو۔
لوگوں کے جذبات تمہارے لیے بیدار ہیں۔تمہاری موت سے جتنے موٴثر نتائج حاصل ہو
سکتے ہیں، اس وقت کسی اور کی موت سے یہ نتیجہ حاصل نہیں کیا جاسکتا، اور کچھ؟'' اس نے
سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا۔

''کیا واقعی اس قسم کی اسکیم پورے ہندوستان کے لئے بنائی گئی ہے؟'' میں نے
یونہی پوچھا حالانکہ مجھے اس کی بات پر یقین آ گیا تھا۔

''بالکل میرے دوست!'' اس نے کہا۔''حکومت کی ہدایت ہے کہ پرنس آف ویلز
کی آمد تک اس ملک کے ہر صوبے میں ایسے فرقہ وارانہ فسادات کرائے جائیں کہ ہندو مسلم
ایکتا بکھر کر رہ جائے۔ضروری نہیں کہ یہ فسادات ایک ہی دن میں ہوں یا ایک ہی ہفتے میں
ہوں۔بس جونہی کوئی مناسب موقع ہاتھ لگے فسادات کرا دینے کے لیے زمین ہموار کر دی

جائے، کیا سمجھے! میاں، یہ انگریز حکومت ہے۔انگریز کا دماغ ہے۔'' اس نے پھر گھڑی
بھی۔ ''یہ کمبخت ابھی تک نہیں آیا؟ اب تک اسے آ جانا چاہیے تھا، آتا ہی ہو گا۔'' اس نے
خود ہی سوال کیا اور خود ہی جواب بھی دے دیا۔''اس عرصے میں تم کچھ اور پوچھنا چاہو تو
پوچھ لو۔ چند سانسوں کی جو مہلت ملی ہے غنیمت جانو۔اس کے آتے ہی تمہارا کام کرنے
کے بعد میں سو جاؤں گا، بڑی نیند آ رہی ہے۔'' اس نے زور سے جماہی لی۔''خوش قسمت
ہو کر آج تم ہمیشگی کی نیند سو جاؤ گے۔مردے بھی کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں، ہمیشہ ہمیشہ
کے لیے چین کی نیند سو جاتے ہیں! مجھے بارہ بجے، شام دت کے پاس بھی پہنچنا ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔''تم سی آئی ڈی کے آدمی ہو پھر تمہیں اس کی کیا ضرورت
تھی؟ یہ کام تو منگو بھی کر لیتا۔شام دت تمہیں نہیں پہچانتا کیا؟''

''میں ایک بے چہرہ آدمی ہوں۔'' اس نے خاص انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔
''گورنر سے میری ملاقات ہفتے میں دو مرتبہ ہوتی ہے۔اس رات گورنر ہاؤس کا ایک خاص
دروازہ میرے لیے کھول دیا جاتا ہے۔ میں اس راستے سے گورنر ہاؤس میں داخل ہوتا
ہوں۔گورنر مجھ سے ملاقات کے لیے خود باغ ہی میں کہیں موجود ہوتا ہے۔ پھر میں اسے
رپورٹ دیتا ہوں۔ یہ رپورٹ زبانی ہوتی ہے کیونکہ بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں جن کو ضبطِ
تحریر میں لانا، مناسب نہیں ہوتا۔ مجھے آج تک کسی بھی شخص نے کبھی گورنر ہاؤس میں نہیں
دیکھا ہو گا۔ میں ایک سیاسی پارٹی کا عام کارکن ہوں۔زوردار نعرے لگانے میں میرا جواب
نہیں۔میری ایک چھوٹی سی دکان ہے۔جس میں ایک ملازم بیٹھتا ہے۔ یہ مکان جس میں تم
اس وقت بیٹھے ہو، میری شب بسری کی جگہ ہے۔ یہاں دن میں میرے محکمے کا ایک چپراسی
رہتا ہے، وہی صفائی اور دیکھ بھال کرتا ہے مگر میں یہ تمہیں کیوں بتا رہا ہوں مسٹر شیرازی!''
اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔اس کے اندازِ گفتگو اور اس کے جملوں سے، اس کے اندر
کا شیطان پوری طرح نمایاں تھا۔

''پتا نہیں کیوں بتا رہے ہو!'' میں نے یونہی کہہ دیا۔

''شاید اس لیے کہ میں تمہارے لیے اپنے دل میں گہری ہمدردی محسوس کر رہا ہوں۔
یقیناً تمہارے ماں باپ، بھائی بہن ہوں گے اور تم یہاں غریب الوطنی میں جام شہادت
نوش کر جاؤ گے۔ کیوں، تم اسے شہادت ہی کہو گے! خیر تو یہ بات ہو رہی تھی کہ شام دت
مجھے پہچانتا ہے یا نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ شام دت بے چارہ مجھے آج سے پہلے نہیں
جانتا تھا البتہ وہ میرے دستخطوں کو ضرور پہچانتا ہے۔اگر میں ایک کاغذ پر دو ہزار روپے کی

رقم لکھ دوں اور اس کے نیچے دستخط کر دوں تو سمجھو وہ نقد دو ہزار روپیا ہے۔ تم وہ پرزہ
شام دت کے پاس چلے جاؤ تو وہ دو ہزار کی رقم بے چون و چرا تمہیں دے دے گا مگر
تمہیں اس کے تجربے کا موقع نہیں ملے گا۔ خیر تو میں پانچوں بروکروں سے رقم جمع کر
اس کے پاس دس ہزار روپے لے کر گیا اور اس سے کہا کہ صاحب نے یہ رسید دی
دو ہزار روپے آپ بھی اس میں جمع کرا دیں۔ ساتھ ہی اسے یہ پیغام بھی بھیجا ہے کہ شیراز
کا کام تمام آپ مجھ سے کرائیں۔ سیٹھ نے مجھ سے سودا کیا۔ معاملہ پانچ ہزار پر پٹا گر
کمبخت بہت لالچی نکلا۔ میرے آتے ہی اس نے منگو سے معاملہ کر لیا۔ اب یار تم جا
حکومت اگران بھڑووں کو پچاس ہزار روپے کا فنڈ دیتی ہے تو کیا ان کی نگرانی نہیں کرائے
گی۔ اس کی نگرانی اس کا ایک ملازم کرتا ہے۔ اس نے فوراً ہی یہ خبر اپنے متعلقہ افسر کو دی
آخر کار میرے پاس پہنچ گئی۔ پھر مجھے جو کچھ کرنا تھا کر گزرا۔ دولت کی کسے ضرورت نہیں
ہوتی۔ شام دت جیسے آدمی کو بھی اس کی ضرورت ہوتی ہے، پھر میں تو ایک معمولی سا آدمی
ہوں۔ پھر اس میں حرج بھی کیا ہے، تمہیں ٹھکانے ہی تو لگانا ہے! اس کام کے بارہ ہزار
حکومت دے رہی ہے۔ حکومت کو تو کام چاہیے، منگو کرے یا میں کر دوں۔''

''تو گویا تم مجھے ہلاک کر دینے کا تہیہ کر چکے ہو۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، نہیں میرے دوست!'' اس نے کہا۔ ''میں نے نہیں حکومت نے تہیہ کیا ہوا
ہے۔ میں بھلا کون ہوتا ہوں۔'' اس نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری موت کا
حکم حکومت نے صادر کیا ہے؟ میں تو صرف جلاد کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔''

''ایک ہندوستانی ہو کر تمہیں ایسا کرتے شرم نہیں آتی۔'' میں نے اب آخری حربہ
استعمال کرنا چاہا تھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟ مجھے تم گفتگو سے تو مسلمان معلوم ہوتے ہو۔ کیا تم
مجھے، ایک مسلمان کو اس طرح مارو گے؟''

''میں کون ہوں!'' وہ زہر خند کرتے ہوئے بولا۔ اس کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا اور
جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئیں۔ اس کی آنکھوں میں جیسے وحشت ناچنے لگی۔ ''میں بتاتا ہوں
میں کون ہوں۔'' اس نے صوفے کو زور سے ٹھوکر ماری اور اپنے بالوں کو دونوں مٹھیوں میں
جکڑ کر جھٹکے دے ڈالے۔ ''میرا نام محمود ہے، میرا نام رام چندر ہے، میرا نام بھوپندر سنگھ
ہے اور میرا نام بمفورڈ بھی ہے۔'' اس کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔ اس نے میز پر رکھے
ہوئے راکھ دان کو زور سے پھینک کر دیوار پر مارا۔ راکھ دان گھڑی پر پڑا۔ گھڑی کا شیشہ
جھنجھنا کر ٹوٹ گیا۔ میں نے گھڑی کو دیکھا ساڑھے پانچ بجنے والے تھے مگر راکھ دان کی

ضرب سے گھڑی رک گئی تھی۔ ''میں ہندوستان کی ایکتا ہوں۔ میں ہندو مسلم سکھ عیسائی
اتحاد کی علامت ہوں۔'' لگ رہا تھا کہ جسم کا سارا خون اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔
''سنو میں بتاتا ہوں، میں کون ہوں!'' وہ خاموش ہو گیا۔

میں حیران تھا کہ آخر اسے غصہ کس بات پر آ گیا تھا۔

وہ بے سدھ ہو کر صوفے پر بیٹھ گیا، پھر وہ پُرسکون ہوتا گیا۔ ''میں بتاتا ہوں، کون
ہوں! اس لیے بتاتا ہوں کہ تم یہ بات کسی کو نہیں بتا سکو گے۔'' وہ زہریلے انداز میں ہنسا۔
''شملے میں ایک انگریز افسر تھا، بڑا رحمدل، بڑا نیک اور شریف النفس! ایک نوجوان ہندو
عورت اس کے ہاں آیا تھی۔ وہ بیوہ تھی اور حسین بھی۔ پھر ایسا ہوا کہ اس افسر کی کوٹھی کے
مالی محمود، باورچی رام چندر اور خانساماں بھوپندر سنگھ نے رات کے وقت اسے باغ میں پکڑ
لیا۔ باری باری تینوں نے اسے پامال کیا۔ پھر انگریز افسر جس کی بیوی ہندوستان ہی میں
مری تھی اور جس کی بیٹی کی وہ آیا تھی، آدھر آ نکلا۔ تینوں ملازم اسے دیکھ کر ہی بھاگ نکلے مگر
اس حالت میں ایک عورت کو دیکھ کر اس انگریز کا مرد بھی جاگ اٹھا۔ سو اس رات وہ عورت
انگریز کے ساتھ بھی سوئی۔ اگلے دن انگریز نے اس سے بہت معذرت کی، بہت معافی مانگی
مگر جو ہونا تھا ہو گیا۔ نو ماہ بعد اس عورت سے بچہ ہوا۔ وہ بچہ میں ہوں، ہندو مسلم سکھ عیسائی
اتحاد کا مظہر! میری ماں بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ میں ان چاروں میں سے کس کا بیٹا ہوں۔ کیا
بتاؤں میں کون ہوں۔'' اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے قطرے گالوں پر ڈھلک گئے
مگر اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے پھیلنے والی مسکراہٹ کی لکیر بھی گہری ہو گئی۔

''مجھے ہمدردی ہے تم سے۔'' میں نے کہا۔ مجھے اس وقت اور کوئی جملہ ہی نہ سوجھا۔
میں واقعی بہت افسردہ ہو گیا تھا۔

''شکریہ!'' اس نے بڑے طنزیہ انداز میں کہا۔ اس نے حیرت انگیز طور پر اپنے غصے
پر قابو پا لیا تھا۔ وہ جو ایک خوابیدہ آتش فشاں تھا ذرا دیر جاگ کر، اندر ہی اندر کھول کر پھر
ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اب وہ پھر وہی سرد مزاج شخص تھا۔

''تو کیا اس انگریز نے شادی کر لی تھی تمہاری ماں سے؟'' میں نے پھر پوچھا۔

''وہ انگریز اتنا شریف بھی نہیں تھا۔ اس نے صرف اتنا کیا کہ میری ماں کو بہت محبت
سے پناہ دی۔ پھر جب میں پیدا ہوا تو میری پرورش بھی اس نے کی۔ جب میں پانچ برس کا
ہوا تو وہ انگریز مر گیا۔ اس نے اپنی وصیت میں میری ماں کے لیے بھی تھوڑی بہت رقم رکھی
تھی۔ یہ رقم اتنی تھی کہ میری ماں نے مجھے میٹرک تک تعلیم دلائی۔'' اس کے بعد وہ پھر ٹہلنے لگا

تھا۔ ''یہ کمبخت ابھی تک نہیں آیا۔'' اس نے جیب سے گھڑی نکال کر دیکھی۔ ''بس
ہے آتا ہی ہوگا۔'' اس نے گھڑی جیب میں رکھتے ہوئے کہا، پھر اسے جیسے کچھ یاد
''تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ مجھے ایک ہندوستانی کو قتل کرتے ہوئے شرم نہیں آئے گی۔
ہاں نہیں آئے گی۔ میں...... میں تمام ہندوستانیوں کا دشمن ہوں۔ مجھے ان سے کوئی
نہیں۔ یہ ہندوستان، اس کے پینتیس چالیس کروڑ افراد مجھے ایک باپ تو نہیں دے
تمھیں پتا ہے، میری ولدیت کا خانہ خالی ہے۔ میرے سرٹیفکیٹ میں میرا نام شانتا
لکھا ہے۔ ولدیت کے خانے میں لکھا ہے سن آف شانتی۔ میں نے لوگوں کو
بتایا۔ میں نے کہا کہ میرا باپ میرے پیدا ہونے سے پہلے مر گیا تھا۔ میری پیدائش
کے کنارے اس طرح ہوئی کہ میری ماں مر گئی۔ ادھر سے گزرنے والے ایک شخص
نے مجھے ہسپتال پہنچایا اور اسی نے میری پرورش کی۔ میری ماں کسی کو یہ بھی نہ بتا
میرے باپ کا نام کیا تھا مگر میری یہ تمام کوششیں فضول رہیں۔ میں نے اپنے حرامی
چھپانا چاہا، اس کے لیے جھوٹ بھی بولا لیکن لوگوں کی زبان بند نہ ہو سکی۔ اب مجھے اس
سے، اس کے لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرا دھرم، میرا دین، میرا ایمان صرف دولت
ہے۔ وہ دولت جس کے سہارے میری ماں نے مجھے میٹرک کرایا۔ اس کی خاطر میں گاندھی
کو بھی مار سکتا ہوں، محمد علی جوہر کو بھی، کیا سمجھے!'' وہ خاموش ہو گیا اور میز پوش کھینچ
کر اپنا چہرہ صاف کرنے لگا۔

کمرے میں گمبھیر خاموشی چھا گئی تھی۔ اب میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں
پھر بھی میں نے کہا۔ ''تمہارا یہ اندازِ فکر غلط ہے۔ یہ حادثہ کسی بھی عورت کے ساتھ پیش آ
تھا۔''

''مسٹر!'' اس نے کہا۔ ''بس اب اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں ہوگی۔ بہر حال مجھے
تمھیں ہلاک کرنے کا عمر بھر افسوس رہے گا۔''

اسی وقت زینے پر قدموں کی آواز آئی۔ ''لو بھئی وہ آ ہی گیا۔ صرف ایک
تمہاری زبان پر پڑے گا اور تم تمام فکروں سے آزاد ہو جاؤ گے۔''

''مگر......'' میں نے کچھ کہنا چاہا۔

اس نے اٹھ کر زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا۔ ''کہہ دیا خاموش رہو! خاموشی
بلائیں ٹالتی ہے۔''

میں حیرانی سے منہ پھاڑے رہ گیا۔ زینے پر قدموں کی آوازیں واضح ہوتی

''ابے جلدی آ! کیا ہو گیا آج تجھے!'' شانتا نے آواز لگائی۔ پھر دروازہ کھلنے کی
آواز آئی۔ میں نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔

''شانتا!'' دروازے ہی سے آواز آئی۔ اس آواز میں عجیب سی لرزش تھی۔

''کیا ہے بے!'' اپنی کہانی سنانے کے بعد شانتا اپنا رکھ رکھاؤ بھول گیا تھا۔ اب اس
کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔ شائستگی دم توڑ گئی تھی۔

''ذرا ادھر آؤ، بہت اہم بات ہے۔''

''کیا مصیبت ہے!'' شانتا کچھ جھلایا ہوا اٹھا۔ ''ایک تو اتنی دیر کر دی۔'' وہ تیز تیز
قدموں سے کمرے سے نکل گیا۔ میں جلدی سے اٹھا۔ میں نے سوچا تھا کہ گھڑی کے ٹوٹے
ہوئے شیشے کی دھار سے رسی کو کاٹنے کی کوشش کی جائے کہ اسی وقت مجھے کمرے کے باہر
ہاتھا پائی کی آواز سنائی دی، پھر ذرا ہی دیر میں یہ آوازیں ختم ہو گئیں۔

اگلے ہی لمحے میں خوشگوار ترین حیرت سے دوچار تھا۔ وہ آواز ہی ایسی تھی۔

''شیرازی جی!'' لالی کی آواز گونجی۔ ''کہاں ہو؟''

''لالی!'' میں نے جواباً کہا۔

پھر چند ہی لمحے بعد لالی میرے سامنے دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی
میرے پاس آ گئی اور میرے سینے سے اپنا سر ٹکا دیا۔ ''ہائے شیرازی جی!'' وہ اس کے
سوا کچھ نہ کہہ سکی۔

''اکیلی ہو کیا؟'' میں نے اس کے ماتھے پر ہونٹ رکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے ہاتھ
کھولو۔''

''مہندر بھیا اور ان کا ایک دوست بھی ہے۔'' لالی نے کہا۔ ''وہ شانتا کا بندوبست
کر رہے ہیں۔''

میں حیران ہوا کہ لالی کو شانتا کا نام کیسے معلوم ہوا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ اس کے ساتھی
نے اسے شانتا ہی کہہ کر آواز دی تھی۔

ذرا ہی دیر میں میرے ہاتھ کھل چکے تھے۔ میں لالی کے چہرے کو ہاتھ میں لے کر
صرف اتنا کہہ سکا۔ ''میری اچھی سی لالی۔''

''ہائے شیرازی جی!'' لالی نے کہا۔ ''میں تو جیسے جیتے جی مر گئی تھی۔'' اس نے
میرے ہاتھوں کو زور سے دبا کر کہا۔

''شیرازی تو ٹھیک ہے لالی؟'' مہندر کی آواز آئی۔

"ٹھیک ہوں دوست!" اس وقت میری مسرت کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ میں نے موت کو صرف چند لمحوں کے فرق سے شکست دے دی تھی مگر یہ شکست میں نے دی تھی یا مہندر اور لالی نے!

"ٹانگ کا کیا حال ہے؟" مہندر کی آواز پھر آئی۔

"لنگڑا کر چل سکتا ہوں۔" میں نے پھر کہا۔ لالی میرے ہاتھوں کو بار بار چوم رہی تھی۔

"تم وہیں بیٹھو، میں ابھی آیا۔" مہندر کی آواز سنائی دی۔

"بیٹھ جاؤ شیرازی جی!" لالی نے کہا۔

میں صوفے پر بیٹھ گیا اور لالی وہیں صوفے کے ساتھ قالین پر بیٹھنے لگی تو میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا۔ "صوفے پر بیٹھو یہ کیا حماقت کر رہی ہو؟" مجھے اس وقت لالی کی یہ حرکت واقعی کھل گئی تھی۔

"چرنوں سے تو جدا مت کرو دیوتا جی!" اس نے بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر کہا۔ اس کی آنکھوں میں اس وقت وہی بھیگی بھیگی چمک تھی جو گلاب کی کنواری پتی پر اوس کے لمس سے پیدا ہوتی ہے۔ عجیب انداز تھا۔ میں کتنے ہی الفاظ لکھ ڈالوں مگر اس تاثر کو الفاظ کی گرفت میں نہیں لا سکتا۔ انسان شاید ابھی تک اس اندازِ نظر کو بیان کرنے کے لیے کوئی لفظ یا ترکیب تخلیق نہیں کر سکا۔ میں اگر مصور ہوتا تو اس انداز کو پینٹ کرتا اور لیونارڈو کی مونا لیزا کی مسکراہٹ خفیف سی ہو کر رہ جاتی۔ "لاؤ تمہارے ہاتھ دبا دوں۔" اس نے واقعی میرے ہاتھوں کو ہولے ہولے دبانا شروع کر دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں مہندر اور اس کا ساتھی اس کمرے میں آ گئے۔ مہندر کا اصرار تھا کہ ہمیں فوراً وہاں سے چل دینا چاہیے مگر میں اس دوران میں انگریز کی اسکیم کو کم از کم بمبئی کی حد تک ناکام بنانے کا لائحۂ عمل مرتب کر چکا تھا۔ میں کم از کم دو دن اس مکان میں رہنا چاہتا تھا۔ شانتا رام جس شعبے سے تعلق رکھتا تھا، اس میں کارکن کی دو ایک دن کی غیر حاضری خلافِ معمول بات نہ تھی۔ وہ خود مجھے بتا چکا تھا کہ اس مکان میں وہ تنہا رہتا ہے۔ مکان کی صفائی اور دیکھ بھال کے لیے اس کے محکمے ہی کا ایک چپراسی روزانہ صبح وہاں آ جاتا تھا۔ پروگرام یہ تھا کہ میں وہیں ٹھہر کر چپراسی کو بھی اسی طرح بے بس کر لوں جس طرح شانتا رام اور اس کے دوسرے ساتھی کو بے بس کر لیا تھا اور پھر اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے تک یہیں رہوں۔ یہ اسکیم دوسرے روز تک یقینی طور پر مکمل ہو جاتی۔ اس کے بعد یہاں سے

نکل جانے اور منتقل ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

میں، مہندر کے دوست سے معذرت کر کے مہندر کو اس کمرے سے لے گیا۔ پہلے تو میں نے اس سے یہ بنیادی سوال کیا کہ وہ اپنے دوست پر جس کا نام اس نے جمشید بتایا تھا، کس حد تک بھروسا کر سکتا ہے۔ اس پر اس نے مجھ سے کہا کہ جمشید پر وہ اسی طرح بھروسا کرتا ہے جس طرح خود اپنے آپ پر یا مجھ پر۔ پھر میں نے مہندر کو ہندو مسلم منافرت پھیلانے سے متعلق انگریز حکومت کی اس اسکیم سے آگاہ کیا جس کا علم مجھے شانتا سے ہوا تھا۔ یہ تفصیلات سن کر خود مہندر بھی حیران رہ گیا۔ جب میں نے اسے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا جو میں نے اس خطرناک اسکیم کو کم از کم بمبئی کی حد تک ناکام بنانے کے لیے سوچا تھا تو اس نے بھی میری رائے سے اتفاق کیا۔

"اس منصوبے میں جمشید کو اہم کام کرنا ہے۔" میں نے مہندر سے کہا۔ "بات یہ ہے کہ میں شام دت کے سامنے نہیں جا سکتا، نہ تم جا سکتے ہو کیونکہ جب بدیسی کپڑوں کی ہولی جلائی جا رہی تھی، تم بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ پھر سیاسی حلقوں کے لیے بھی تم اجنبی نہیں ہو۔ شام دت کے پاس کسی ایسے آدمی کو جانا چاہیے جو اس کے لیے اجنبی ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" مہندر نے کہا۔ "جمشید کو میں خوب جانتا ہوں۔ ہم اس پر مکمل اعتماد کر سکتے ہیں۔ وہ بھی ایک سلگتی ہوئی جان ہے۔"

"تو پھر طے یہ ہوا کہ میں اور جمشید یہیں رکیں گے اور شانتا کے چپراسی کو ہم قابو میں کر لیں گے۔ اس وقت ضروری یہی ہے کہ شانتا اور اس کے ساتھ رات کو کام کرنے والے افراد کسی سے رابطہ قائم نہ کر سکیں۔ پھر اس کے ملازم کو بھی یہیں روکنا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا ڈرائیور بھی آئے۔ ہم یہاں رہ کر اسے بھی آسانی سے بے بس کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی کو شانتا اور اس کے ساتھیوں کے غائب ہونے کا احساس نہ ہو۔"

پھر ہم دونوں ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ میں نے جمشید اور لالی کو تمام صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ جمشید واقعی آتش بجاں شخص تھا۔ وہ تو اس قدر جوش میں آ گیا تھا کہ اسی وقت اگر اسے کوئی کام کرنے کے لیے کہہ دیا جاتا تو وہ بلا روک اس کی تکمیل کے لیے سرگرم ہو جاتا۔

یہ معاملہ طے ہونے کے بعد مہندر کو میری ٹانگ کی فکر ہوئی۔ پھر وہ ایک الماری سے فرسٹ ایڈ کا بکس لے ہی آیا۔ اس کا اندازہ درست تھا کہ شانتا جیسے آدمی کے گھر میں

امدادی ادویات کا ہونا لازمی امر ہے۔

مہندر میری بینڈ تج کر کے فارغ ہوا۔ میری ران پر چاندی کے روپے
آبلہ پڑا ہوا تھا اور تمام ران سرخ ہو رہی تھی۔

اس دوران میں جبکہ مہندر میری بینڈ تج میں مصروف تھا۔ میں نے ان لوگوں
کے گھر اغوا ہونے سے لے کر شانتا بمفورڈ کے گھر آنے تک کے تمام واقعات
بتائے۔ لالی بیچ میں ٹوک ٹوک کر مجھ سے ایک ایک بات پوچھ رہی تھی۔

اپنی بپتا سنانے کے بعد میں نے مہندر سے کہا۔ ''تو یہ ہے میری کہانی! مگر یہ
عین اس وقت جبکہ میری موت کا سامان آ گیا تھا، کیسے ٹپک پڑے؟''

مہندر نے جو کچھ بتایا وہ مختصراً یہ ہے کہ جب منگو کے آدمی مجھے وہاں سے اغوا
روانہ ہوئے تو مہندر نے فوراً ہی تعاقب کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ بھی اپنی کار میں بیٹھ
وقت تک لالی بھی وہاں پہنچ چکی تھی اور وہ بھی ضد پر اڑ گئی تھی کہ مہندر کے ساتھ
گی۔ وقت کیونکہ بہت کم تھا اس لیے مہندر کو اس کی ضد ماننا ہی پڑی۔ سیٹھ وشوانا
بھی لالی کو روکنے کی کوشش کی مگر اس نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ وہ مہندر کے
جا رہی ہے، اب خطرے کی کیا بات ہے۔ بہر حال مہندر تعاقب کرتا ہوا اس مکان
گیا جہاں مجھے اذیت دی گئی تھی۔ مکان کا پتا چلانے کے بعد وہ فوراً اپنے چند دوستو
تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ مہندر نے بتایا کہ وہ تو اس سلسلے میں پولیس کے پاس جانے
لیکن لالی نے اسے منع کر دیا۔ لالی کا خیال تھا کہ یہ معاملہ پولیس میں لے جانے
میرے لیے پریشانیاں بڑھ جائیں گی، پھر میں ایک بڑے اور با اختیار دشمن کے شکنجے
پھنس جاؤں گا۔ مہندر کو بھی لالی کی یہ تجویز پسند آئی۔ پھر وہ اپنے دوستوں کی تلاش
کھڑا ہوا۔ یہ ایسے دوست تھے جو اس کے خیالات اور نظریات کے حامی تھے، جو انسان
انسان کا سب سے بڑا مذہب جانتے تھے۔ ان لوگوں کو تلاش میں اسے خاصا وقت
اور پھر وہ دو گاڑیوں میں بھر کر وہاں پہنچے۔ یہ وہی وقت تھا جب شانتا نے مجھے
چھڑایا تھا اور ہم میدان سے گزر کر ایک کار میں آ بیٹھے تھے۔ اسی وقت دو کاریں
میدان میں داخل ہوئی تھیں۔ مہندر وغیرہ نے منگو اور ان کے بندھے ہوئے ساتھیوں
چند سوالات کیے جن کے جواب ان لوگوں نے صحیح نہیں دیے۔

مہندر نے بتایا کہ وہاں مجھے نہ پا کر وہ لوگ مایوس ہو گئے تھے۔ پھر ان کی
پڑی جس نے انہیں دیکھتے ہی معنی خیز انداز میں آنکھ مار دی۔ ٹینی کسی زمانے میں

زم رہ چکا تھا۔ مہندر سمجھ گیا تھا کہ ٹینی کوئی خاص بات جانتا ہے۔ اس نے ایک مرتبہ
لوگوں سے سوال کیے اور انہوں نے یہی کہا کہ ان کی حریف پارٹی انہیں اس طرح
کر کے اپنے ایک آدمی کو لے گئی ہے۔ وہ سب اس بات سے صاف مکر گئے کہ انہوں
مہندر کے گھر سے مجھے اغوا کیا تھا یا اس سے قبل لالی کو اغوا کیا تھا۔ لالی نے بھی ان سب
دیکھا۔ ان میں سے کوئی بھی اسے اغوا کرنے والوں میں شامل نہیں تھا۔

اس کے بعد انہوں نے ٹینی کو کھول لیا مگر ٹینی نے مہندر کے سوا کسی کے سامنے بات
کرنے سے انکار کر دیا۔ مہندر نے بتایا تھا کہ ٹینی کو ساتھ لے کر وہ وہاں سے چلے آئے
تھے۔ پھر باہر آ کر ٹینی نے مہندر کو اکیلے میں بتایا تھا کہ منگو کے آدمی مجھے وہاں اغوا کر لائے
تھے۔ پھر جو کچھ مجھ پر گزری تھی وہ بھی اس نے مہندر کو بتا دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ اس شخص کو
پہچان گیا ہے جو مجھے اغوا کر کے لے گیا تھا۔ اس کا نام ٹینی نے شانتا بتایا تھا اور کہا تھا کہ
جہاں وہ رہتا ہے اسی محلے میں شانتا کی دکان ہے۔ شانتا کہاں رہتا ہے، اس کا ٹینی کو علم
نہیں تھا، البتہ وہ اس شخص کا مکان جانتا تھا جو شانتا کی دکان پر ملازم ہے۔

یہ تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد مہندر نے دو ساتھیوں کے سوا سب کو واپس کر
دیا۔ اس کا خیال تھا کہ پوری برات کی برات لے جانے سے معاملہ بگڑ سکتا ہے۔ اس پر اس
کے دوستوں میں اختلاف ہوا کہ کون مہندر کے ساتھ جائے گا، سو اس کا فیصلہ ٹاس کے
ذریعے ہوا اور دو ساتھی منتخب کر لیے گئے۔ پھر وہ لوگ وہاں سے اس شخص کے گھر پہنچے جو
شانتا کی دکان پر ملازم تھا۔ وہ ملازم اس وقت گھر نہیں پہنچا تھا۔ ٹینی کو یاد آیا کہ وہ جوا کھیلنے کا
عادی ہے چنانچہ ٹینی جوئے کے اڈے پر پہنچا۔ وہاں بمشکل تمام وہ شانتا کے ملازم کو جوئے
سے چند منٹ کے لیے اٹھا سکا۔ اس نے ٹینی کو بڑی رد و کد کے بعد شانتا کے مکان کا پتا
بتایا۔ شانتا نے اسے بتا رکھا تھا کہ یہ مکان اس کے کسی دوست کا ہے جو تجارت کے سلسلے
میں ہندوستان کے مختلف شہروں میں آتا جاتا رہتا ہے اور مہینے دو مہینے بعد بمبئی آتا
ہے۔ ایک دو دن رہ کر وہ پھر کاروباری دورے پر نکل جاتا ہے۔

پتا اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے بعد وہ شانتا کے مکان کی طرف آئے تھے۔
انہوں نے شانتا کے ملازم سے بہت کہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ چلے مگر وہ جوا چھوڑ کر جانے
پر تیار ہی نہیں تھا۔ انہیں صرف اسی پتے کے سہارے اس علاقے میں شانتا کا مکان
ڈھونڈنا پڑا۔ پھر انہوں نے جب مکان تلاش کر لیا تو مہندر کا ساتھی زینے چڑھ کر دبے
پاؤں ننگے پیر اوپر گیا۔ اس نے آہٹ لی اور پھر مکان کے اندر بھی چلا گیا۔ اس وقت

شانتا مجھے پُرسکون موت کا فلسفہ بتا رہا تھا۔ اس موقع پر اس نے اپنے اس ساتھی کا نام
جسے اس نے سائنائڈ لانے کے لیے بھیجا تھا اور جو کسی بھی وقت آسکتا تھا۔ وہ
الٹے قدموں واپس ہوا۔ پھر انہوں نے فوراً ہی ایک اسکیم تیار کی۔ انہیں اس
اطمینان ہو گیا تھا کہ جب تک سائنائڈ نہیں آجاتا، میں زندہ ہی ہوں چنانچہ وہ سب
دبک گئے اور شانتا کے ساتھی کی گھات میں بیٹھ گئے۔ شانتا کا ساتھی تھوڑی ہی دیر بعد
تو انہوں نے اسے چھاپ لیا۔ اس کے بعد حالات مجھے معلوم ہی تھے۔

''اچھا بھئی شیرازی!'' مہندر نے کہا۔ ''اب ہم چلتے ہیں۔ پتا جی بہت پریشان
ہوں گے۔ میں ٹھیک نو بجے پہنچ جاؤں گا۔''

پھر وہ دونوں بہن بھائی وہاں سے چلے گئے۔

☆======☆======☆

صبح کا ملگجا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ رات کی تاریکیاں سمٹتی چلی جا رہی تھیں۔ رات
جاگنے کی وجہ سے میری آنکھیں جل رہی تھیں اور ذہن بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ میں نے
سے کہا کہ وہ جا کر شانتا کے کپڑوں کی تلاشی لے، اس میں یقیناً گھر کی چابیاں ہوں گی۔
چابیاں نکال کر لے آئے۔ وہ ادھر گیا اور میں لنگڑاتا ہوا غسل خانے میں گھس گیا۔ میں نے
خوب منہ دھویا۔ سر کو بھگویا اور تولیے سے سر پونچھتا ہوا باہر آگیا۔ اس سے میرے ذہن کا
بوجھل پن ختم ہو گیا اور آنکھوں کی جلن بھی ٹھنڈی پڑ گئی۔

میرا اندازہ درست تھا۔ شانتا کے لباس سے چابیوں کا ایک گچھا برآمد ہوا تھا۔ اس
کے علاوہ اس کا ایک شناختی کارڈ بھی تھا جس سے تصدیق ہوتی تھی کہ شانتا سی آئی ڈی کے
محکمے سے وابستہ تھا۔ میں نے ان چابیوں سے وہ کمرہ بند کر دیا جس میں شانتا اور اس کا
ساتھی بندھے پڑے تھے۔

''یہ پورا مکان شانتا کے پاس ہے۔'' میں نے جمشید سے کہا۔ ''اس کے چچا پر
قابو پانے کے بعد ہم اس مکان کا جائزہ لیں گے۔ ہم ان لوگوں کو ایک ہی کمرے میں رکھ
کے کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' جمشید نے کہا۔ ''یہی بات سوچتے ہوئے مہندر نے
دونوں کو سینے کے بل ملا کر باندھا تھا تاکہ ان کے ہاتھ ایک دوسرے کی بندشوں تک نہ پہنچ
سکیں۔''

''پتا نہیں کمبخت چپراسی کب تک آئے گا؟'' میں نے کہا۔ ''اس وقت تک ہمیں

پہنچ جائے گا۔''

''آپ آرام کرلیں۔'' جمشید نے کہا۔ ''میں جاگ رہا ہوں۔''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے کام، پھر آرام! اور یہ تم مجھے آپ آپ کیا کہہ رہے
ہو۔ میں اپنے ہم عمروں میں ان تکلفات کا عادی نہیں۔''

اسے مہندر نے میرے بارے میں نہ جانے کیا کیا بتایا تھا۔ اس نے کہا۔ ''مہندر نے
آپ کے بارے میں مجھے جو کچھ بتایا ہے، آپ کے لیے میرے دل میں اسی وجہ سے احترام
پیدا ہوا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مہندر دوستوں کی ضرورت سے زیادہ ہی تعریف کر دیا کرتا ہے۔ بہر
حال میں چاہتا ہوں کہ تم مجھ سے بے تکلفی کے ساتھ گفتگو کرو، برابر کی سطح سے گفتگو کرو ورنہ
میں بھی تم سے یہی تکلفات برتنا شروع کر دوں گا۔''

پھر وہ واقعی بے تکلف ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کرید کرید کر میری مختلف مہموں کے
بارے میں پوچھا لیکن میں اسے ٹالنے والے جواب دیتا رہا اور سوچتا رہا کہ اب مہندر سے
منع کر دوں گا کہ میری سرگرمیوں کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائے۔

چپراسی کا انتظار ٹھیک آٹھ بجے ختم ہوا۔ دروازہ جمشید نے کھولا تھا۔ چپراسی شاید اس
گھر میں روز روز نئے چہرے دیکھنے کا عادی تھا۔ اس نے اندر آتے ہی پوچھا۔ ''صاحب
جاگ گیا؟''

''ہاں!'' جمشید نے دروازہ بند کرتے ہوئے جواب دیا اور پھر اس کو چھاپ لیا۔ وہ
پستہ قد کا دبلا پتلا شخص تھا۔ ذرا ہی دیر میں بے بس ہو گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ پیر باندھنے
اور اس کے منہ کو بند کرنے میں جمشید کی مدد کی، پھر اسے ایک کمرے میں گٹھری بنا کر ڈال
دیا۔

اب ہم مطمئن تھے۔ چپراسی کے بعد اب ہمیں کسی طرف سے کوئی خدشہ نہیں رہا تھا۔

''اب تم ایسا کرو، اس پورے مکان کا جائزہ لے ڈالو۔'' میں نے چابیاں اس کی طرف
پھینکتے ہوئے کہا۔ ''میری ٹانگ میں تکلیف ہے اس لیے چلا نہیں جا رہا۔''

''ٹھیک ہے۔'' جمشید نے کہا اور چلا گیا۔

میں صوفے پر لمبا لیٹ گیا۔ کوئی بیس منٹ بعد ہی وہ تمام مکان کا معائنہ کر کے واپس
آیا۔

''اس دو منزلہ مکان کے زینے کا ایک دروازہ گراؤنڈ فلور پر بھی کھلتا ہے۔ نیچے اس

انداز میں چار کمرے بنے ہوئے ہیں۔ تمام کمروں میں مختلف قسم کا فرنیچر ہے۔ سمجھ نہیں
آتا، شانتا نے اس مکان کو اتنا بنا سنوار کر کیوں رکھا ہے جبکہ اس کے لیے یہی بالائی منزل
کافی ہے۔"

"اس قسم کے لوگ عموماً ایسی ہی زندگی گزارتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "
کمروں کی چابیاں ہیں؟"

"ہاں، تمام کمروں میں تالے پڑے ہیں۔ سب کی چابیاں اسی گچھے میں
ہیں۔" جمشید نے جواب دیا۔ "دو اسٹور بھی ہیں جو خالی پڑے ہیں۔ میرا خیال ہے
دونوں اسٹورز میں ان کو بند کیا جا سکتا ہے۔"

اس کے بعد ہمارے لیے مہندر کا انتظار کرنے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ وعدے کے
مطابق وہ ٹھیک نو بجے پہنچ گیا۔ اس کے آتے ہی ہم اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ چ
اور سائونڈ لانے والے کو مکان کی زیریں منزل کے اسٹورز میں منتقل کر دیا گیا۔ اس
سے فارغ ہو کر ہم نے شانتا پر طبع آزمائی شروع کر دی۔ اس کے مکان سے ہمیں بہت
معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ سب سے زیادہ معلومات اس کی ڈائری سے ملی تھیں۔ جس
اس نے ان چھ ہندو اور مسلمان رہنماؤں کو بروکر یعنی دلال ہی لکھا تھا جو ہندو مسلم فساد
کرانے کے لیے انگریزوں کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے ذمے دار تھے۔ شانتا نے
ناموں کے پہلے حروف لکھے تھے۔ اس ڈائری میں اس نے اپنے طور پر یہ حساب لگا
ہوا تھا کہ سرکار کے خفیہ خصوصی فنڈ کی کتنی رقم ان کے پاس موجود ہے۔ اس کے علاوہ
ڈائری سے ہمیں یہ بھی پتا چلا تھا کہ اکثر ان بروکرس کے اجلاس اسی گھر میں ہوا کرتے
لیکن ایسے موقعوں پر، شانتا کبھی بذات خود شریک نہیں ہوتا تھا۔ ان اجلاسوں کے موقع پر
اس کا چپراسی ان لوگوں کو زبانی یا تحریری حکم دیا کرتا تھا کہ انہیں آئندہ کیا کرنا ہے۔
وہیں اس حکم کی تعمیل کے لیے حکمت عملی وضع کرتے، اس حکم پر تبادلۂ خیال کرتے اور
کرتے کہ ان کے ذمے کیا کیا فرائض ہوں گے۔ اس ڈائری سے یہ بھی پتا چلا تھا
اجلاسوں کے موقعوں پر شانتا وہیں کسی قریبی کمرے میں چھپا بیٹھا ہوتا تھا۔ اس کمرے کے
باہر تالا ہی پڑا ہوا کرتا تھا تاکہ اجلاس میں شریک کوئی بروکر اس کمرے میں نہ آئے۔
اہتمام اس لیے کرتا تھا کہ اسے لوگوں کی گفتگو سے ان کے اندازِ فکر کا بھی پتا چل جائے۔
نے ان چھ بروکرس کے بارے میں اپنے مخصوص انداز میں تبصرے بھی کیے تھے۔

ش۔و: انتہائی حریص، لالچی، بزدل شخص، اپنے باپ کو بھی دھوکا دینے

رنے والا! اگر میں اسے دس ہزار کی پیشکش کر دوں اور یہ بھی بتا دوں کہ میں حرامی ہوں تو
حسین بیٹی کو ایک رات کے لیے میرے حوالے کر دے گا۔

ق۔م: بدطینت، بدخو، ظالم اور سفاک مگر ایماندار! پیسے پیسے پر جان دینے والا مگر
کی ایک پائی بھی اپنے پاس رکھنے کو حرام سمجھنے والا۔ اردو شاعری میں محبوب کو مذکر
تے ہیں مگر یہ عملی زندگی میں اردو شاعری کرتا ہے۔ خوبصورت لڑکی اس سے کوئی راز
نہیں اگلوا سکتی مگر خوبصورت لڑکا اس کی کمزوری ہے۔

ل۔م: چارسو بیس، چرب زبان، کینہ پرور، انتہائی کنجوس، چمڑی جائے دمڑی نہ
جائے کی زندہ تصویر! اندھے فقیر کو جعلی نوٹ دے کر کھرے سکے واپس لینے کا قائل۔ ایک
بیٹی معیادی بخار سے مرگئی مگر علاج کے لیے اس کی جیب سے رقم نہ نکلی۔ دھن اس کا دھرم!

م۔ل: وسیع القلب، خوش گفتار، رحمدل مگر اس صورت میں کہ اس کا اپنا کوئی بڑا
نقصان نہ ہو۔ گھاٹے کی صورت سامنے ہو تو پھر خود غرض، رکھ رکھاؤ کا آدمی! بے چارہ،
پھنسا اس لیے کہ خوبصورت عورت اس کی کمزوری ہے۔ ایک مسلمان لڑکی کو داشتہ بنا رکھا
ہے۔ اس راز کو راز رکھنے کی قیمت ادا کرنے کے لیے بروکر بن گیا۔

ط۔ج: مسلمان بنیا، مایا کا سانپ، شکل پر ہر وقت مسکینی کی پھٹکار، بظاہر منکسر
المزاج! اصولوں کا زبردست حامی مگر ان اصولوں کا جو اس کی ذات کو فائدہ پہنچا سکیں۔
بیوی کا وفادار شوہر کہ دولت کی شکل بیوی کے ذریعے دیکھی۔ ڈرپوک اتنا کہ اسے قتل
کی دھمکی دے کر کسی کو بھی قتل کروا لو، صرف تحفظ کی ضمانت پر!

چ۔ل: بڑا انقلابی، بڑا فسادی، بڑا حرامی، مجھ سے بھی بڑا! دولت کو سونے میں
تبدیل کرنے کا رسیا، لاکھوں کا آدمی، ہر وقت پھکڑ! بڑی کوٹھی میں جھونپڑی جتنا سامان۔
لان کو کھیت میں اس لیے تبدیل کر دیا کہ بارہ مہینے مفت کی سبزیاں ملتی رہیں۔ کنجوسی
کو کفایت اور کفایت کو اسراف بے جا سمجھنے والا۔ شادی اس لیے نہیں کہ جوانی کی توانائی
صرف ہو جاتی۔

یہ تھے وہ چھ بروکر جن کے چہرے شانتا نے اپنی ڈائری میں لکھے تھے۔ بمبئی میں
مصروفیات کی یادگار یہی ایک ڈائری ہے جو آج بھی میرے پاس ہے۔ اس ڈائری
کی وجہ سے مجھے اپنی اسکیم کے دوسرے حصے پر عمل کرنے میں زیادہ آسانی ہوگئی ورنہ شاید
لمبا چکر پڑ جاتا۔ اس ڈائری کی وجہ سے نہ ہلدی لگی نہ پھٹکری، رنگ چوکھا آ گیا۔
شانتا بہت بوگس اور بودا آدمی ثابت ہوا۔ میں سمجھا تھا کہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے،

سخت جان ہوگا اور آسانی سے کچھ قبول کر نہیں دے گا۔ وہ واقعی ایک نازک طبع شخص رہ
تکلیف تو برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ تیسرا منٹ بھی نہیں گزرنے پایا تھا کہ وہ بالکل
ہم سے مکمل تعاون کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس نے ہمیں ان چھ قومی دلالوں کے نام
بھی بتا دیے جن کے چہرے ابھی آپ پڑھ چکے ہیں۔ ان کے نام علی الترتیب یہ تھے
دت، قادر مٹھا، لالہ مولچند، ماوالنکر، طیب جی اور چونی لال! یہ نام میرے لیے تو نہ
مہندر اور جمشید کے لیے چونکا دینے والے تھے۔ ان کے بارے میں شانتا نے اپنی
میں جو کچھ لکھا تھا، وہ بھی بیشتر ان دونوں کے لیے انکشافات ہی تھے۔ یہ سب
حلقوں میں جانی پہچانی شخصیتیں تھیں۔ قومی سطح پر اگرچہ ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی مگر
سیاست میں وہ ستون کی حیثیت رکھتے تھے۔

ان تمام معلومات کے بعد ہم نے شانتا سے ان تمام بروکروں کے نام وہ پرچیاں
بھی لے لیں جو بقول شانتا کے ہنڈیاں تھیں۔ ہر ہنڈی تیس تیس ہزار روپے کی تھی۔
پر سب سے اوپر کی سطر میں بروکر کا نمبر لکھا تھا، یعنی شام دت کے لیے لکھا تھا، بروکر
ایک! دوسری سطر میں رقم لکھی تھی، تیس ہزار! تیس ہزار کے ہندسوں کے دائیں بائیں
نے اپنے مختصر دستخط کیے تھے جنہیں انگریزی میں ''اینی شل'' کہتے ہیں۔ آخری یعنی تیسری
سطر میں اس نے اپنے دستخط کیے تھے۔ ان پرچیوں کو اس نے مخصوص رنگ کے لفافوں
رکھوایا تھا۔ ہر بروکر کے لیے الگ الگ رنگ کا لفافہ تھا۔ یہ لفافے اسی الماری میں
ہوئے تھے جہاں سے ڈائری ملی تھی۔ اس وقت میں نے اس سے کہا تھا کہ اگر اس نے
بھی دھوکا دیا تو اس کا کام تمام کر دیا جائے گا۔ اس پر اس نے مجھے اسی ڈائری کا وہ صفحہ
کے لیے کہا جس پر اس نے چھ بروکروں کے چہرے لکھے تھے۔ پھر اس نے ان چہروں
اختتام پر لکھے ہوئے حروف کی طرف توجہ دلائی۔ ان پر علی الترتیب ل، ن، پ، ہ، س،
کے حروف تحریر تھے۔ اس نے بتایا کہ یہ حروف لال، نیلے، پیلے، ہرے، سفید اور
رنگوں کے مخفف کے طور پر لکھے ہیں۔ ان لوگوں کو ہمیشہ اسی رنگ کے لفافے میں بند
بھیجی جاتی ہیں جو ان کے یے مخصوص ہیں۔ اگر غلط رنگ کا لفافہ کسی کے پاس بھی پہنچ
تو وہ لفافہ لے جانے والا خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

''سوچ لو شانتا!'' میں نے کہا۔ ''ہم میں سے ایک آدمی یہاں رہے گا۔
لوگوں کے پاس جانے والے دونوں میں سے کوئی بھی خطرے میں پڑا تو تمہاری موت
اذیت ناک ہوگی۔ میں تمہیں سائنائڈ سے نہیں ماروں گا، چھری سے تمہارے جسم کی

یہ بوٹی اتاروں گا اور اس وقت تک اتارتا رہوں گا جب تک کہ تم ہلاک نہیں ہو جاؤ گے۔
ہر مرتبہ بوٹی اتارنے کے بعد میں زخم پر مرچیں بھی چھڑکتا رہوں۔ تم نے دیکھا،
مرچ کیسی ظالم چیز ہوتی ہے۔ ابھی ایک چٹکی مرچ ہی پھونک مار کر تمہارے چہرے کی
طرف اڑائی گئی تھی اور تمہاری آنکھیں اب تک پانی بہا رہی ہیں۔ جب مرچیں زخم میں لگتی
ہیں تو تکلیف اور زیادہ ہوتی ہے۔ آنکھیں زیادہ پانی بہانے لگتی ہیں۔''

اس نے زور سے جھرجھری لی۔ شاید وہ زخموں پر مرچیں چھڑکے جانے کے تصور ہی
سے کپکپا کر رہ گیا تھا۔ وہ وحشت زدہ انداز میں مجھے دیکھتا رہا، پھر چیخ پڑا۔ ''نہیں، نہیں
میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' اس نے اٹکتے ہوئے کہا۔ اس وقت اس کے لہجے میں وہ اعتماد اور
کمینہ پن ختم ہو گیا تھا جو رات اس کے اندازِ گفتگو کا ایک حصہ بنا ہوا تھا۔

''تم ان چھ بروکروں کو یہاں جمع بھی کرتے ہو؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔

''ہاں جب کبھی ضرورت ہوتی ہے، ان کی میٹنگ بلا لیتا ہوں۔'' شانتا نے جواب
دیا۔

''کیا وہ اپنی مرضی سے بھی یہاں آ سکتے ہیں؟''

''نہیں، انہیں سخت ہدایت ہے کہ جب تک انہیں یہاں نہ بلایا جائے، وہ ادھر کا رخ
بھی نہ کریں۔ وہ یہاں صرف اس وقت آتے ہیں جب انہیں بلایا جاتا ہے۔''

''اجلاس کس طرح بلایا جاتا ہے؟ میرا مطلب ہے انہیں میٹنگ کی اطلاع کس طرح
دی جاتی ہے؟'' میں نے پھر سوال کیا۔

''ایک کاغذ کی پیشانی پر میٹنگ کی تاریخ اور وقت لکھ کر اس کے نیچے دستخط کر دیتا
ہوں۔ پھر اس کے نیچے ایک سے چھ تک نمبر ترتیب وار لکھ دیے جاتے ہیں۔ دعوت نامہ
ایک لیٹر ہیڈ پر لکھا جاتا ہے جس پر بروکرز ایسوسی ایشن چھپا ہوا ہے۔ پھر محکمے کے کسی
کارندے سے کہا جاتا ہے کہ وہ بروکروں سے اس کاغذ پر دستخط کرا لائے۔ وہ بروکر اپنے
نمبر کے آگے دستخط کر دیتے ہیں اور مقررہ تاریخ کو متعینہ وقت پر یہاں پہنچ جاتے ہیں۔''

اس نے ایک ایک بات مجھے بتا دی۔ مجھے یاد آیا تھا کہ میں نے الماری میں رکھے ہوئے
ایک فائل میں اس قسم کے کاغذ لگے دیکھے تھے۔ اس وقت جب میں وہ فائل دیکھ رہا تھا،
مجھے ان کا مقصد اور مطلب سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''مقام کا نام کیوں نہیں لکھتے؟'' میں نے پوچھا۔

''مقام انہیں معلوم ہے۔'' شانتا نے کہا۔ ''ان بروکروں کو بتا دیا گیا ہے کہ تا اطلاع

ثانی اجلاس یہیں ہوا کریں گے۔"

"یہاں تمہارے دوست وغیرہ آتے ہیں؟" میں نے معلوم کیا۔ یہ سوال بہت دیر سے میرے ذہن میں کھٹک رہا تھا۔

"نہیں۔" شانتا نے بتایا۔ "یہاں میرے محکمے کے صرف تین آدمی آتے ہیں۔ چپراسی، ایک مخبر وحید، یہ دونوں تم نے پکڑ رکھے ہیں۔ تیسرا وہ ڈرائیور ہے جو رات ہمارے ساتھ تھا۔"

"وہ آج آئے گا؟" میں نے دریافت کیا۔ "ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "ورنہ اس سے قبل کہ کوئی تمہاری مدد کو آسکے میں تمہارا کام تمام کر دوں گا۔ ہوسکتا ہے وہ یہاں سے ہماری لاشیں ہی اٹھائیں لیکن تم یہ منظر دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہو گے۔"

"اسے نہیں آنا چاہیے۔" شانتا نے کہا۔ "ویسے رات بارہ بجے، مجھے اس سے گیٹ وے آف انڈیا پر ملنا تھا۔"

"اگر تم اس سے نہیں ملے تو وہ یہیں آئے گا؟" میں نے سوال کیا۔

"ہوسکتا ہے۔" شانتا نے کہا۔ "بلکہ یقیناً آئے گا۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ ہمیں آج رات تمہاری لاش ٹھکانے لگانا تھی۔" شانتا نے کہا۔

میں ہنس پڑا۔ "میری لاش ٹھکانے لگانا تھی! مگر وہ سیدھا یہیں آسکتا تھا، تمہیں وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہ پروگرام میں نے ہی بنایا تھا۔ دراصل میں اس وقت اسی علاقے میں ہوتا۔" اس نے جواب دیا۔

"تو ان تین کے سوا اور کوئی یہاں نہیں آتا؟"

"نہیں۔"

پھر میں نے شانتا سے اس کار اور اس کے ڈرائیور کی شناخت معلوم کی۔ اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا تو میں نے اس سے کہا۔ "ہاں تو مسٹر شانتا بمفورڈ تم آج کی رات ان بروکروں کا اجلاس طلب کر رہے ہو۔"

"مگر..... مگر کیوں؟" اس نے کہا۔ "آج تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"یہ میں جانتا ہوں کہ کوئی بات ہے یا نہیں!" میں نے سرد لہجہ میں اس سے کہا۔

"بے کیا یہ بات اہم نہیں ہے کہ تم آج رات ہمارے قبضے میں ہو؟" میں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "کیوں بتاؤ نا! یہ بات اہم ہے یا نہیں؟"

شانتا بے چارہ اس کا کیا جواب دیتا؟ اس کا حلق خشک ہوگیا تھا۔ "وہ..... وہ تو ٹھیک ہے مگر تم ان کا کیا کرو گے؟"

"ہم ان کا اچار نہیں ڈالیں گے، سمجھے مسٹر شانتا بمفورڈ!" میں نے لطف لیتے ہوئے کہا۔ "ویسے ہم ایسے وطن دشمنوں اور قوم فروشوں کو ایسا سبق دینا چاہتے ہیں، وہ عمر بھر یاد رکھیں کہ قوم سے غداری کی سزا کیا ہوتی ہے تاکہ انہیں پتا چل جائے کہ صرف دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔"

شانتا کی تمام مدافعتی حس ختم ہوچکی تھی۔ اب وہ موم کا ایسا پتلا تھا کہ اسے جس طرح چاہے توڑا موڑا جا سکتا تھا۔ میں نے اس سے اجلاس بلانے کا دعوت نامہ لکھوا ہی لیا۔ اس میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔

میں نے پھر اس کا منہ باندھ دیا، اس کے ہاتھ پیر کی بندشوں کا جائزہ لیا اور اسے اسٹور میں بند کر دیا۔

میری اسکیم کی تمام تیاریاں مکمل ہوچکی تھیں۔ اب صرف عمل درآمد کی ضرورت تھی اور میں جانتا تھا کہ اس میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

اس دوران میں جبکہ میں شانتا سے پوچھ گچھ کر رہا تھا، مہندر اور جمشید دونوں باہر گئے ہوئے تھے۔ یہ چھ بروکر چونکہ ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر رہتے تھے لہٰذا مہندر نے یہی سوچا تھا کہ اپنے ڈیڈی کے دفتر جا کر کار لے آئے تاکہ کام جلد سے جلد نمٹ سکے۔

تھوڑی دیر میں وہ دونوں بھی آگئے۔ میں نے انہیں شانتا بمفورڈ سے اپنے سوال جواب کی تفصیل مختصراً بتائی اور پھر اس پروگرام پر گفتگو ہوئی جس پر ہم عمل کرنے والے تھے۔ طے یہ ہوا کہ ہنڈیاں اور دعوت نامے لے کر ہر بروکر کے پاس جمشید ہی جائے گا۔ ہم اس مرحلے پر کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ یہ سب حضرات گزشتہ روز پریل میں بدیسی کپڑے کے الاؤ کی تقریب میں شریک رہے ہوں۔ مخبر تھے اور سیاسی آدمی ہونے کی وجہ سے اہم اہم سیاسی مواقع پر موجود رہا کرتے ہوں گے اور اس موقع پر میں اور مہندر دونوں اسٹیج پر بیٹھے تھے۔ پھر میں تو ویسے ہی اپنی تقریر کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں آگیا تھا۔ طے یہ ہوا کہ اسکیم کے انجن کو حرکت میں لانے کے لیے مہندر اور جمشید جائیں اور میں مکان ہی میں رہوں۔ اس طرح ایک تو مکان کی حفاظت بھی رہتی، دوسرے اس طرح

اس بات کا بھی کوئی امکان نہیں تھا کہ میں کسی ایسے شخص کی نظر میں آ جاؤں گا جو
تلاش میں ہو گی یا یہ علم ہو گا کہ بعض افراد میری تلاش میں ہیں۔ اگرچہ شانتا نے بتایا تھا
کسی کے وہاں آنے کا امکان نہیں تھا لیکن اس پر کس حد تک یقین کیا جا سکتا تھا۔ خود
وہ ملازم جو اس کی دکان پر کام سنبھالتا تھا، اس مکان سے واقف تھا۔ وہ بھی شانتا کی
میں یہاں آ سکتا تھا۔ شانتا نے جان کر یہ نہیں بتایا تھا یا وہ بھول گیا تھا، میں کہہ نہیں سکتا تھا
پھر یہ طے ہوا کہ ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے ایک شیشے پر سبز کپڑا لگا دیا جائے تا کہ جب
اور جمشید واپس آئیں تو وہ اس کپڑے کو دیکھ کر سمجھ جائیں کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔
رات کے وقت اس شیشے کے پیچھے موم بتی جلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ پھر یہ طے ہوا کہ جب
مہندر اور جمشید واپس آئیں گے تو دروازے پر مخصوص انداز میں دستک دیں گے تا کہ مجھے
یہ اندازہ ہو جائے کہ وہی آئے ہیں۔ یہ بھی طے کیا گیا کہ ان کی عدم موجودگی میں جب
دروازے پر دستک ہو یا میں کوئی خطرہ محسوس کروں تو سب سے پہلے کھڑکی کے نچلے حصے
پڑا ہوا سبز کپڑا اتار دوں۔ سبز کپڑے کا خیال ہمیں اس لیے آیا تھا کہ ایک طرف میز پر
سا سبز رومال پڑا ہوا تھا۔ اس مقصد کے لیے ہم اس رومال کو آسانی سے استعمال کر سکتے
تھے۔ یہ رومال کیلوں کی مدد سے مہندر اور جمشید کی روانگی سے قبل ہی کھڑکی کے شیشے پر لگا دیا
گیا تھا۔

مہندر اور جمشید جا چکے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اس مکان کا جائزہ لیا۔ اس
مکان میرے نقطۂ نظر سے زیادہ اہم وہ الماری تھی جس میں شانتا کے کاغذات رکھے ہوئے
تھے۔ اس مرتبہ بھی جائزے کے بعد مجھے کہیں اور کوئی اہم چیز نہ مل سکی۔ میں نے ان تمام
کاغذات کو جو اس الماری میں تھے، ایک جگہ سمیٹ کر ایک میز پوش میں باندھ لیے تھے۔
وجہ اس کی یہ تھی کہ ہمیں اپنی اسکیم کے دوسرے مرحلے کی تکمیل کے بعد اس مکان کو چھوڑ دینا
تھا اور میں ان کاغذات کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے ایک مرتبہ پھر تمام حالات کا جائزہ لیا۔ ابھی مجھے
پانچ دن تو کم از کم بمبئی میں قیام کرنا ہی تھا۔ پھر مجھے بائی کلہ کلب کے سامنے سے حسب
ہدایت گزرنا تھا۔ شاید اس دن مجھے آئندہ کا کوئی پروگرام بتایا جانا تھا یا کوئی اور مہم مجھے
سونپی جانے والی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ مجھے شاید بمبئی میں کچھ زیادہ عرصے ہی قیام کرنا
پڑے گا۔

پھر میں نے موجودہ حالات پر غور شروع کر دیا۔ اب میرے ذہن میں ایک اور

ہ ابھرنا شروع ہو گیا تھا۔ میں اس مسلمان لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا جسے ماوا
نے اپنی داشتہ بنایا ہوا تھا۔ میں چونی لال کی اس دولت کے بارے میں سوچ رہا تھا جو
نے سونے میں تبدیل کی تھی۔ اس کے ساتھ میرے ذہن میں سالارِ اعظم کی تصویر بھی
ابھری تھی جو اصولوں پر سختی سے کاربند تھا۔ میں اس عہد کے بارے میں سوچ رہا تھا جو میں
نے امروہے کے اس چھوٹے سے کمرے میں تنظیم سے وفاداری کے بارے میں اٹھایا تھا
اور جس کے فوراً بعد قاسم تانگے والے کو لاشے میں تبدیل ہوتے دیکھا تھا کیونکہ سالار اس
کی غداری سے آگاہ ہو گیا تھا۔ کیا میں تنظیم سے غداری کا مرتکب ہو رہا تھا؟ کیا میں نے
تنظیم کی ہدایات سے انحراف کیا تھا؟ کیا اب جو کچھ میں کر رہا تھا، وہ تنظیم کے متعینہ اصولوں
کے خلاف تھا؟ کیا میں جو کچھ سوچ رہا تھا اس سے تنظیم کو نقصان پہنچ سکتا تھا؟

پھر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میں جن حالات میں گرفتار ہوا تھا اور جن کی بنا پر اس
وقت یہ صورتِ حال بنی تھی اس میں میرا دانستہ کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی
تھی کہ تنظیم بنیادی طور پر انگریز حکومت کے خلاف ہی کام کر رہی تھی اور میں اس وقت جو
کچھ بھی کر رہا تھا، وہ اسی حکومت کے ایک گھناؤنے منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے کر رہا
تھا۔ میرا ضمیر مطمئن تھا۔

تین گھنٹے بعد جمشید اور مہندر آ گئے۔ شانتا نے واقعی ہم سے بھرپور تعاون کیا تھا۔
مہندر اور جمشید نہ صرف ان چھ دلالوں سے وہ ہنڈیاں بھنا لائے تھے جو شانتا نے دی تھیں
بلکہ رات آٹھ بجے ہونے والی میٹنگ کے دعوت نامے پر ان چھ دلالوں کے دستخط بھی لے
آئے تھے۔ شام دت نے رقم دینے کے علاوہ ایک خط بھی دیا تھا۔ یہ خط وہ تھا جو شانتا اور
شام دت کے پروگرام کے مطابق میری لاش کے ساتھ ہی پولیس کو ملتا۔ پھر حکومت اس خط
کو خوب خوب اچھالتی۔ ہندو مسلم منافرت کو خوب ہوا ملتی۔ اس خط میں زہر کوٹ کوٹ کر
بھرا ہوا تھا۔ میں نے احتیاط سے وہ خط اپنے پاس رکھ لیا۔

پہلا مرحلہ نہایت کامیابی سے طے ہو گیا تھا۔ اب اسکیم کا دوسرا مرحلہ شروع ہونا تھا۔
اس کے لیے ہمیں سورج ڈھلنے کا انتظار کرنا تھا۔ ہم تینوں نے فرصت کو غنیمت جانا اور
سونے کا پروگرام بنایا، اس طرح کہ ہر وقت ایک شخص ضرور جاگتا رہے۔

☆======☆======☆

سورج کا جلتا دیا کب کا بجھ چکا تھا۔ رات جوان ہو کر انگڑائیاں لیتے ہوئے بہت
ہی دنیا کو اپنی بانہوں میں سمیٹ چکی تھی۔

ہم نے آٹھ بجے ہی اپنے دو اسیروں کو چائے اور توس کے ساتھ خواب
دے دی تھی۔ صرف شانتا ایسا تھا جس کے ساتھ ایسی حرکت نہیں کی گئی تھی۔ ہم چھ
کے آخری اجلاس کی تیاری مکمل کر چکے تھے اور اپنے مہمانوں کے استقبال کے لیے
تھے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ مخصوص دستک جمشید نے دی تھی۔ اس کا مطلب
کہ ہمارا پہلا مہمان آنے والا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ مہمان آ گیا۔ یہ کمبخت شام
تھا۔ وہ اطمینان سے مکان میں داخل ہوا، دروازے کو آہستگی سے بھیڑا اور کانفرنس
میں آ گیا۔ ابھی وہ دو قدم ہی اندر آ گیا ہو گا کہ بغلی کمرے میں اس طرف اس کی نظر
جہاں مہندر چہرے پر نقاب ڈالے اور ہاتھ میں پستول لیے کھڑا تھا۔ ''ذرا آواز نکلی اور
نے گولی ماری۔'' اس نے سختی سے کہا۔ گفتگو کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں کی جنبش
سانس کی آمد و رفت سے اس کے چہرے پر پڑی نقاب میں حرکت پیدا ہوئی۔

شام دت جیسے پتھر کا ہو گیا۔

''ہاتھ پیچھے کرو شام دت!'' میں نے دروازے کی آڑ سے اس کے پیچھے آ کر کہا۔

شام دت مڑنا چاہتا تھا کہ مہندر نے کہا۔ ''تم اپنی جگہ سے ہلو گے بھی نہیں۔''

ذرا دیر میں ہم اسے بے بس کر کے باندھ چکے تھے اور بغلی کمرے میں دھکیل کر
کے پیر بھی باندھ دیے تھے۔

نو بجے تک، یعنی پندرہ منٹ کے دوران میں ہم چھ دلالوں کا اسی انداز میں استق
کر چکے تھے۔ ایک مرتبہ ذرا سی پریشانی ہوئی تھی کیونکہ ماوالنکر اور چونی لال ایک ساتھ
آئے تھے مگر وہ پریشانی اس وجہ سے ہوئی تھی کہ ہم نے اس امکان پر کہ دو مہمان ایک ساتھ
آ سکتے ہیں، غور ہی نہیں کیا تھا۔ بہرحال ان دونوں کو بھی ہم نے سنبھال لیا۔ دراصل نقاب
اور پستول کے ساتھ ایک آدمی کھڑا ہو اور اس کے مقابلے میں ایک ایسا شخص ہو جس کا ضمیر
بھی مجرم ہو تو اس کی آدھی جان تو ویسے ہی نکل جاتی ہے۔ وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ جب
دوسروں کے ساتھ زیادتی کر رہا ہوتا ہے تو دوسرا اس سے کیوں رحم کا سلوک کرنے لگا۔

آج بھی اس رات کے بارے میں سوچتا ہوں تو ایک ٹھنڈی سی لہر میرے جسم میں
دوڑ جاتی ہے۔ ہم تینوں اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ واپسی ناممکن تھی۔ اگر ہم ان
اسیروں میں سے ایک کو بھی زندہ چھوڑ دیتے تو اپنے لیے نت نئی مصیبتیں مول لے لیتے۔
حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو چھوڑنا اپنی موت کو دعوت دینا تھا، سو ہم نے ان کے

ہی عدالت قائم کی۔ مہندر اس عدالت کا صدر تھا۔ آج میں سوچتا ہوں کہ یہ حرکت
کی ہی معلوم ہوتی ہے مگر اس وقت شاید ہم نے خود کو مطمئن کرنے کے یہ ڈراما کیا تھا۔
بھی کیا شے ہے، خود کو حق پر ثابت کرنے کے لیے کیسے کیسے سوانگ رچاتا ہے مگر وہ جو
ضمیر ہوتا ہے، اس میں ایک پھانس سی گھس جاتی ہے اور کھٹکتی رہتی ہے اس لیے کہ وہ جانتا
ہے، اس نے جو کچھ کیا وہ محض اداکاری تھی، ایک جھوٹ تھا۔ جھوٹ نے انسان کو کبھی
اطمینان بخشا ہے! وہ خلش جو آج بھی میرے دل میں ہے، صرف یہ ہے کہ اس وقت اپنے
اقدام کو درست ثابت کرنے کے لیے ہم نے عدالت کا اور انصاف کا مذاق اڑایا تھا۔ ہم
ان کے بغیر بھی وہ سب کچھ کر سکتے تھے۔ وہ چھ بروکر، شانتا اور اس کے ساتھی سب اس قوم
کے مجرم اور غدار تھے جو غلامی کے جوئے کو اپنی گردن سے اتار پھینکنے کے لیے مصروفِ
جدوجہد تھے۔ ان کے اعمال نامے ہمارے سامنے تھے۔ انہیں موت کے گھاٹ اتارنا اس
لیے ضروری تھا کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو سینکڑوں بے گناہ افراد مارے جاتے۔ یہ موذی اور
آدم خور درندے تھے۔ انہیں ہم عدالت کا سوانگ رچائے بغیر بھی اسی انجام کو پہنچا سکتے
تھے جو ہم نے ان کے لیے طے کر لیا تھا۔

بہرحال عدالت لگی۔ ان کے خلاف ثبوت کے طور پر وہ کالی ڈائری پیش کی گئی جو
شانتا لکھا کرتا تھا۔ وہ کاغذات پیش کیے گئے جو شانتا کے گھر سے ملے تھے۔ خصوصی فنڈ کے
اخراجات کے وہ گوشوارے پیش کیے گئے جو ایک فائل میں موجود تھے۔ آخری اور ٹھوس
ثبوت کے طور پر اس اجلاس کا دعوت نامہ پیش کیا گیا جس میں شرکت کے لیے وہ سب
یہاں جمع ہوئے تھے۔ پھر شام دت کا وہ خط پیش کیا گیا جو میری لاش کے ساتھ پایا جانا تھا۔

وہ چھ تھے اور کمرۂ عدالت کی دیوار کے ساتھ لگے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ پشت
پر بندھے ہوئے تھے۔ ان کے دونوں پیروں کو ٹخنوں کے پاس باندھ دیا گیا تھا تاکہ وہ
حرکت نہ کر سکیں۔ ان کے منہ پٹیوں سے باندھے گئے تھے کہ بول نہ سکیں۔ ان کی آنکھوں
میں آنسو تھے، التجا تھی کہ ہم انہیں چھوڑ دیں مگر ان کو چھوڑنا اب ہمارے ممکن نہیں تھا۔

مہندر نے ان سب کو سزائے موت سنا دی۔ چونی لال اور ماوالنکر کے سوا باقی تمام کو
فی الوقت موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم دیا۔ پھر اس نے شانتا کی موت کا بھی حکم سنایا۔
پر علیحدہ مقدمہ چلایا گیا تھا جس وقت شانتا پر مقدمہ چلا وہ بھی کمرۂ عدالت میں لایا گیا
سے بھی دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا گیا۔ شانتا کے چوتھے ساتھی یعنی ڈرائیور پر اس
کی عدم موجودگی میں مقدمہ چلا اور اس کی گرفتاری کا حکم صادر کیا گیا۔ شانتا کے دونوں

ساتھیوں کو بھی عدالت کے برخواست ہونے کے بعد ایک گھنٹے کے اندر موت کے گھاٹ
اتارنے کا حکم دیا گیا۔ شانتا کی موت چھ دن کے لیے مؤخر کر دی گئی کیونکہ اسے بھی
موت پانے والے مجرموں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا فرض بھی انجام دینا تھا۔
کیسی ستم ظریفی تھی وقت کی۔ یہ سب لوگ اسی کمرے میں بیٹھ کر مسلمانوں
ہندوؤں کو آپس میں لڑانے کے منصوبوں کے تار و پود تیار کرتے تھے، یہاں بیٹھ کر انسانوں
کو انسانوں سے لڑوانے کی ترکیبیں سوچا کرتے تھے۔ آج یہی کمرہ ان کے لیے
عدالت بن گیا تھا۔

عدالت برخواست ہوئی تو وہ ساتوں گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھے گئے۔ وہ بار بار
زمین پر اپنا سر رکھ رہے تھے مگر ہمیں ان سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ فیصلہ سنانے کے بعد میں
نے مہندر کا چہرہ دیکھا جو زرد پڑا ہوا تھا۔ اس پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ خود میری
قمیص کی کالر کے نیچے بھی پسینے کی لکیریں سرسرا رہی تھیں۔ میں نے بھی اپنے سیدھے ہاتھ کی
پہلی انگلی سے اپنے ماتھے کے پسینے کو صاف کیا تھا۔ جمشید کی آنکھوں سے جیسے زندگی کی ساری
چمک ختم ہو گئی تھی۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے قریب کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔

بڑی دیر تک موت کا سا سناٹا طاری رہا۔ ہم میں سے کسی میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ
بات کرتے۔ بات کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ ساتوں ہمارے سامنے گھٹنوں کے
بل بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ان کے بندھے ہوئے منہ سے گھٹی گھٹی
آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ شاید اس عدالت کے طریقۂ کار پر احتجاج کر رہے تھے۔ یا
شاید رحم کی اپیل کر رہے تھے مگر ہم اس وقت انصاف کے کرتا دھرتا بنے اپنے کان بند کر
چکے تھے۔ شاید اس خوف سے اگر ہم انہیں چھوڑ دیتے تو خود ہماری زندگی خطرے میں پڑ
جاتی۔

''اب کیا کیا جائے؟'' مہندر نے کمزور سی آواز میں کہا۔

''اب سزائے موت پر عمل درآمد کیا جائے اور کیا۔ جمشید، اوپر سے سائنائڈ کی شیشی
اور ڈراپر لے آؤ۔'' میں نے کہا اور جمشید ایک دم وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ وہ جیسے اس
ماحول سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔ ''تم کچھ خاموش سے ہو مہندر!'' میں نے اپنے
دوست سے کہا۔ ''کیوں؟''

''تم بھی تو خاموش ہو۔'' مہندر نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا۔ اس کے
چہرے کی تازگی اور لہجے کی شگفتگی دم توڑ گئی تھی۔

''ہاں میں بھی خاموش ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''شاید تمہاری طرح میں بھی اس
ہوں کی شگفتگی سے متاثر ہوں۔ کیسی عجیب بات ہے مہندر! کل جب میں منگو کے عقوبت
خانے میں اذیت سے گزر رہا تھا تو میرے ذہن میں بھی یہ نہیں تھا کہ صرف بیس بائیس گھنٹے
بعد بازی اس طرح پلٹ جائے گی۔ کل میں نے ان میں سے کسی کو جو میری زندگی ختم
کرنے کا تہیہ کر چکے تھے، اس طرح پریشان اور افسردہ نہیں دیکھا تھا۔ کیوں مہندر! آخر
کیوں انسان اس قدر بے حس ہو جاتا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا تھا مگر وہ کوئی جواب
نہیں دے سکا تھا۔ ''ذرا سوچو مہندر! یہی لوگ کتنے ٹھنڈے دل سے انسانوں کو مروانے
کے منصوبے بناتے تھے۔ کبھی ان لوگوں کے دل میں انسان سے ہمدردی کا جذبہ نہیں جاگا۔
میرے دوست! یہ لوگ وہ موذی جانور ہیں کہ اگر تم ان پر اس وقت ذرا سی گرفت ڈھیلی کر
دو گے تو یہ پلٹ کر تمہیں ہلاک کر دیں گے۔ یہ لوگ کسی رحم کے مستحق نہیں۔ یہ لوگ اس
قابل نہیں کہ ان کی موت پر افسردہ ہوا جائے۔ ان کی موت ہمارے لیے باعثِ تاسف
نہیں ہونا چاہیے۔''

''دلائل اور منطق کے اعتبار سے تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' مہندر نے جواب دیا۔
''حقائق کا تقاضا بھی یہی ہے مگر میں نے انسان کو ہمیشہ انسان سمجھا ہے۔'' وہ خاموش ہو
گیا۔ شاید اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ کوئی ٹھوس دلیل پیش نہیں کر سکتا تھا۔ ''تم ٹھیک ہی
کہتے ہو۔ یہ لوگ ننگِ انسانیت ہیں۔ ان سے رحم کرنا، ان کی موت پر افسردہ ہونا انسان
اور انسانیت سے دشمنی ہے۔'' وہ جھرجھری لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جیسے اپنے ان تمام
خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا جو اسے افسردہ کیے ہوئے تھے۔ ''ہمیں جلدی کرنا چاہیے۔
ابھی بہت کام باقی ہے۔''

جمشید سائنائڈ کی شیشی اور ڈراپر لا کر احتیاط سے میز پر رکھ چکا تھا۔ میں نے ڈراپر
میں سائنائڈ بھرا۔ ڈراپر میں تقریباً پچاس قطرے آ گئے تھے۔ یہ زہر فی قطرے کے حساب
سے پچاس آدمیوں کے لیے ہلاکت کا پیغام بن سکتا تھا اور ہمیں اس وقت صرف سات
آدمیوں کو موت کی سزا دینا تھی۔

سب سے پہلے شام دت کو اٹھایا گیا۔ وہ بری طرح مچلا مگر اس کی ہر کوشش بے سود
رہی۔ میں اور جمشید اسے سزائے موت پانے والے دوسرے مجرموں سے علیحدہ لے
گئے۔ وہ فرش پر پڑا بری طرح مچل رہا تھا۔ باقی چھ مجرم سمٹ سمٹ کر ایک دوسرے کے
[illegible] گئے تھے۔

پھر میں نے شانتا سے کہا۔ ''شانتا! تم نے رات کہا تھا کہ تم صرف جلاد
انجام دے رہے ہو۔ تمہیں میری جان لینے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اب بھی تمہیں
کرنا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مجرم بدل گئے ہیں۔ کل تمہیں صرف ایک مجرم کو
گھاٹ اتارنا تھا، آج تمہیں چھ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارنا ہے۔ کل تم
خواہش پر مجھے مارنے کے لیے تیار تھے، آج تمہیں ہماری عدالت کے فیصلے پر عمل
کیونکہ اس وقت تمہارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ تمہیں یاد رکھنا چاہیے کہ تم
دن کی مہلت صرف اس لیے دی گئی ہے کہ تمہیں ان مجرموں کو موت کے گھاٹ اتار
اگر تم نے اس فرض کی ادائیگی میں ذرا بھی کوتاہی کی تو یاد رکھو تمہیں ایسی ہولناک
جائے گی کہ تمہارے بزرگوں کی روحیں بھی تڑپ اٹھیں گی۔ ان چھ دنوں میں تمہیں
اذیت سے گزرنا پڑے گا کہ تم موت کی خواہش کرو گے مگر موت تم سے دور کھڑی
رہے گی لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اپنا کام نفاست اور مہارت سے کرو۔ یہ رہا ڈراپر!''
میز پر رکھے ہوئے ڈراپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہر ایک کے نتھنوں میں
قطرہ ٹپکا دو۔ تم ہر کام سکون سے کرنا چاہتے ہو اور میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ ان کا
جائے گا تو یہ اس طرح ممیائیں گے جیسے بکرا قصاب کی چھری کی دیکھ کر ممیاتا ہے۔''

باقی چھ مجرم پھر کسمسائے تھے۔ شام دت، فرش پر بُری طرح مچلا تھا اور شا
بدن نے جھرجھری سے زور زور کے جھٹکے لیے تھے۔

''میں تمہارے ہاتھ کھول رہا ہوں۔'' میں نے شانتا کو گھسیٹ کر ایک طرف
''تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ وہی کرو جو کہا گیا ہے۔'' میں ڈراپر میز سے اٹھا کر شا
طرف پلٹا تو وہ ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ ''مجھے غصہ مت دلاؤ شانتا!'' میں نے جھلا کر
''یہ تھامو!'' یہ کہہ کر میں نے سائنائڈ سے بھرا ہوا ڈراپر اسے دے دیا۔

اس دن مجھے محسوس ہوا کہ ہر طرف سے مایوس ہو کر جب انسان زندگی
جدوجہد کرتا ہے تو اس میں کتنی قوت آجاتی ہے۔ کہتے ہیں دیوانے آدمی میں عام
انسان کے مقابلے میں دس گنا قوت ہوتی ہے۔ مایوسی کے عالم میں جب انسان جد
کرتا ہے تو وہ بھی عالم دیوانگی ہی میں ہوتا ہے۔ بہرحال میں نے اور جمشید نے
دت کو بے بس کر لیا۔ جمشید نے اسے ٹانگوں کی طرف سے پکڑا تھا اور میں اس کے
سوار ہو کر اس کا چہرہ سیدھا کیے ہوئے تھا۔ پھر شانتا نے اس کے نتھنوں میں سائنائڈ
ایک قطرہ ٹپکا دیا۔

چند لمحوں میں وہ ساکت ہو گیا۔ میں اس کے سینے سے اتر آیا۔ اس وقت میرے جسم
کے تمام مساموں سے جیسے پسینہ پھوٹ بہا تھا۔ جمشید ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ شانتا
زمین پر بیٹھا کپکپا رہا تھا اور ڈراپر اس نے ایک طرف ڈال دیا تھا۔

میں نے پلٹ کر باقی مجرموں کو دیکھا ان کی آنکھوں میں وحشت رقصاں تھی اور
چہرے پیلے پڑ گئے تھے۔ خوف کی وجہ سے شاید اس وقت ان کے حلق بھی بند ہو کر رہ گئے
تھے۔ مہندر اس وقت مجھے انسان نہیں مومیائی ہوئی لاش معلوم ہو رہا تھا۔ خود میری حالت
اس وقت عجیب ہو رہی تھی دل تھا کہ بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ جسم میں جیسے جان نہیں رہی
تھی۔ شانتا، شام دت کی لاش کے پاس منجمد سا بیٹھا تھا۔

''اب باقی کام بھی جلدی کرو۔'' مہندر کے ہونٹ ہلے۔ اس کی آواز کہیں دور سے
آتی معلوم ہوئی۔ ''پھر اور بھی بہت سا کام ہے۔''

مجرموں میں پھر بے چینی دوڑ گئی۔ ''آؤ جمشید!'' میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ شام
دت کو مارنے کے بعد اب ہمارے لیے کوئی اور راہ ہی نہیں رہ گئی تھی۔ کاش میں ایسا نہ کرتا،
میں سوچ رہا تھا۔

اس کے بعد قادر مٹھا، مولچند، اور طیب جی بھی انجام کو پہنچ گئے۔

یہ وہ کمرہ تھا جہاں ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو آپس میں لڑانے، بڑے
پیمانے پر انسانوں کو ہلاک کرنے منصوبے بنائے جاتے تھے، اجلاس ہوتے تھے، پھر یہی
کمرہ ان لوگوں کے لیے کمرۂ عدالت میں تبدیل ہوا تھا اور اب یہی ان کی قتل گاہ میں تبدیل
ہو گیا تھا۔

اس کے بعد ہم اوپر گئے تھے۔ ہم نے اوپر کی منزل میں روشنی نہیں کی تھی، ٹارچ کی
روشنی سے کام چلایا تھا۔ پھر شانتا کے ذریعے اس کے چپراسی اور دوسرے کارندے کو بھی
موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا اور ہم ان کی لاشوں کو بھی نیچے لے آئے تھے۔

اب ان لاشوں کو بمبئی کے مختلف علاقوں میں پھینکنے کا مرحلہ تھا مگر مہندر نے اس وقت
اس پروگرام کی مخالفت کی تھی۔ مہندر نے اس دوران میں جبکہ بالائی منزل پر دو مجرموں کو
موت دی جا رہی تھی، باقی چاروں لاشیں ایک اسٹور میں بند کر دی تھیں۔ اس کا کہنا
تھا کہ لاشیں شہر کے ایک مقام سے ملیں یا مختلف مقامات سے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا
اگر یہ لاشیں اسی مکان سے برآمد ہوں تو زیادہ بہتر ہے کیونکہ شانتا غائب ہو گا اور
پولیس اسی نتیجے پر پہنچے گی کہ شانتا ہی ان کا قاتل ہے یا پھر قتل سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ ہم

نے اسی لیے باقی دو لاشیں بھی اس اسٹور میں ڈال کر باہر سے تالا لگا دیا۔

اب ہمیں اس مکان کو چھوڑ دینا تھا۔ مہندر نے اپنی کار، مکان کے عقبی
سے قریب کھڑی کی تھی۔ میں نے مکان کا پچھلا دروازہ کھول کر گلی کا جائزہ لیا۔ گلی
اور سنسان پڑی تھی۔ اسی وقت مہندر میرے پاس آیا اور اس نے کہا کہ ان لوگوں
نہیں بلکہ اس کمرے سے کار میں منتقل کیا جائے جس کا دروازہ پہلو کی سڑک پر کھلتا
تجویز معقول تھی۔ ہم واپس آ گئے۔

مہندر نے شاید کچھ سوچ کر ہی کار اس دروازے کے سامنے کھڑی کی تھی
سے ان تینوں یعنی ماوا لنکر، چونی لال اور شانتا کو کار میں منتقل کرنا آسان تھا۔ میں نے
سے پہلے وہ گٹھری کار میں رکھی جس میں شانتا کے مکان سے ملنے والے کاغذات
ہنڈیوں کے عوض ملنے والی رقم موجود تھی۔ اس کے بعد ماوا لنکر اور شانتا کو کار میں منتقل
گیا۔ مہندر کار میں بیٹھا تھا۔ میں اور جمشید اس وقت چونی لال کو لے کر کمرے میں پہنچے
کہ مکان کے باہر سرگرمی سی محسوس ہوئی۔ لگتا تھا تین چار آدمی دوسری منزل کے زینے
دروازے پر موجود ہیں۔

میں نے چونی لال کو کندھے سے اتار کر جمشید سے کہا۔ ”تم اسے کار میں لے
جاؤ، میں دیکھتا ہوں کیا معاملہ ہے۔“

میں تیزی سے دبے پاؤں باہر آیا اور باہر کی آوازوں پر کان لگا دیے۔

”یہ دیکھو استاد، تالا لگا ہے۔“ یہ آواز مچھو کی تھی۔

”ابھی یہ اپنی مدر کا ہز بینڈ کہاں گیا ہے؟“ استاد منگو کی آواز ابھری۔ ”ابھی ہم
میں بیٹھا ہے۔ تم نیچے لوگوں سے پتا کرو، شانتا کب آئیں گا؟ کہاں گیا ہے؟ ابھی
دیکھیں گا کہ کہاں جائیں گا۔ اس کا......“ استاد منگو نے موٹی گالی دی۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ دستک نچلی منزل کے دروازے پر ہوئی تھی
جمشید میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے چپکے سے کہا۔ ”دروازہ کھولو اور پوچھو
ہے؟ شانتا کے بارے میں پوچھے تو کہنا، وہ صبح آئے گا۔ داور گیا ہے۔“

میں پستول لے کر کھڑا ہو گیا تھا۔ نہ معلوم کیا حادثہ پیش آنے والا تھا۔ جمشید
دروازہ کھولا۔ ”کہیے؟“

”یہ شانتا صاحب اوپر رہتا ہے؟“ مچھو نے سوال کیا۔

”ہاں اوپر رہتا ہے۔“

”معلوم ہے کب آئیں گا، تالا لگا پڑا ہے؟“

”شانتا صاحب آج شام داور گئے ہیں۔ کہہ گئے ہیں کل صبح آئیں گے کسی کے
ہاں گئے ہیں۔“ جمشید نے کہا۔

”رام رام!“ مچھو نے کہا۔ ”بڑا سوری ہوا سن کر۔“

”آپ کا نام؟“ جمشید نے کہا۔ ”میں انہیں بتا دوں گا۔ کوئی پیغام؟“

”نہیں تھینک یو، ہم صبح مل لیں گے۔“ مچھو نے کہا۔ ”ویسے رات کو تو نہیں آئیں
گے؟“

”پتا نہیں۔“ جمشید نے جواب دیا۔ ”مجھ سے تو صبح ہی آنے کے لیے بول گئے
تھے۔“

”اچھا، شکریہ!“ مچھو نے کہا۔ ”آپ کو تکلیف دیا۔“

”کوئی بات نہیں۔“ جمشید نے کہا۔ مچھو کے دور ہوتے قدموں کی آواز ابھری اور
جمشید نے دروازہ بند کر دیا۔ پھر ہم دونوں وہاں سے تیزی کے ساتھ چلتے ہوئے مہندر کی
کار میں جا بیٹھے۔

”کیا ہو گیا تھا؟ اتنی دیر کیوں ہو گئی؟“ مہندر نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

”استاد منگو اپنے گرگوں کے ساتھ شانتا کی تلاش میں آیا تھا۔“ میں نے کہا۔

کار چل پڑی۔ مہندر خاموش ہو گیا تھا۔ شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آخر استاد منگو کو شانتا
سے کیا کام پڑ گیا مگر میں یہ سوچ رہا تھا کہ استاد منگو کو شانتا کا کیسے پتا چلا۔ شانتا نے بتایا تھا
کہ اس کی قیام گاہ سے صرف اس کے محکمے کے تین افراد واقف ہیں۔ ایک ڈرائیور، ایک
ڈرائی اور ایک وہ کارندہ جو سائنائڈ لایا تھا۔ اس وقت ان میں سے دو، لاشوں میں تبدیل
ہو چکے تھے، ڈرائیور رات بارہ بجے گیٹ وے آف انڈیا پر ہو گا۔ میرا خیال تھا کہ استاد منگو
کے ذریعے یقیناً اس مکان تک نہیں پہنچا ہو گا کیونکہ ڈرائیور تو اس کی کمیں گاہ میں گیا ہی
نہیں تھا۔ اس وقت مجھے شانتا کے اس ساتھی کا خیال آیا جسے اس نے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ ہو
سکتا ہے وہی استاد منگو کے ہتھے چڑھا ہو۔ دوسرا ذریعہ شانتا کے گھر پہنچنے کا، شام دت بن
سکتا تھا کیونکہ شام دت ہی نے اسے مجھے ہلاک کرنے پر مقرر کیا تھا مگر نے اس خیال کو بھی
رد کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ اگر شام دت سے وہ مل بھی لیتا تو بھی شانتا کا بیان تھا کہ اس کے
کارندوں میں سے ایک بھی اس کی قیام گاہ سے واقف نہیں۔ پھر وہ کس طرح یہاں
پہنچا۔ منگو کو کس نے شانتا کے گھر کا پتا بتایا؟ میں سوچتا رہا۔

کار تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں تھی۔ تینوں مجرم پچھلی نشست اور اگلی نشست کے درمیان پائیدان میں پڑے تھے اور جمشید پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔

''سنو مہندر!'' میں نے کہا۔ ''کل رات جب تم استاد منگو کے ٹھکانے پر پہنچے تھے تو وہاں تمہیں کوئی اور آدمی ملا تھا؟''

''اور کون آدمی؟ وہاں چار آدمی تھے۔ چاروں بندھے ہوئے تھے، منگو، گلو، ... ٹینی!'' مہندر نے جواب دیا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

''سوچ رہا ہوں کہ استاد منگو شانتا کے گھر کس ذریعے سے پہنچا ہوگا۔''

''منگو؟'' مہندر نے کہا۔ ''شاید ٹینی کے ذریعے۔ ہم بھی اسی کی وجہ سے یہاں ... تھے۔ شاید منگو نے ٹینی کو کہیں پکڑ لیا ہوگا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ دو چار دن اپنے ... نہ جائے۔''

یقیناً وہ ٹینی ہی کے ذریعے وہاں پہنچا ہوگا۔ میرا دل مہندر کی اس بات پر ٹھک ... تھا۔ اسی وقت جمشید نے کہا۔ ''یار مہندر! ایک کار بڑی دیر سے ہمارے پیچھے آرہی ہے۔''

''کیا؟'' میں نے اور مہندر نے تقریباً ایک ساتھ ہی کہا۔ مہندر نے عقب نما میں دیکھا۔ میں نے مڑ کر سڑک کا جائزہ لیا۔ کافی فاصلے پر دو روشنیاں ٹمٹما رہی تھیں۔

''تمہیں یقین ہے؟'' مہندر نے پوچھا۔

''ہاں میں شروع ہی سے بار بار پیچھے دیکھتا رہا ہوں۔ یہ کار وہیں سے ہمارے ... لگی تھی۔ ابھی تم نے تین چار موڑ کاٹے ہیں مگر یہ کار مسلسل تعاقب میں لگی ہوئی ہے'' جمشید نے جواب دیا۔

''کون ہو سکتے ہیں یہ لوگ؟'' مہندر بڑبڑایا۔

''اب کیا کرو گے؟'' میں نے پوچھا۔

''دیکھتے جاؤ۔'' مہندر نے یہ کہتے ہی کار کی رفتار بڑھا دی، پھر تین چار موڑ ... سے کاٹے۔ دو موڑ تک تو وہ کار پیچھے لگی رہی، تیسرے موڑ پر کار موڑتے ہی مہندر نے ... رفتار انتہائی تیز کر دی اور پھر جب اس نے اگلا موڑ کاٹا تھا تو تعاقب کرنے والی کار کی ... روشنیاں عقب میں نہیں تھیں مگر مہندر نے کار کی رفتار کم نہیں کی۔

اس وقت ہم بائی کلہ جا رہے تھے۔ بائی کلہ پر سیٹھ وشوا ناتھ کی ایک کوٹھی تھی ... آراستہ اور پیراستہ حالت میں ان دنوں کرائے کے لیے خالی تھی۔ اسے وہ صرف ... افسروں کو کرائے پر دیتے تھے کیونکہ ان سے ایک تو کرایہ اچھا ملتا تھا، دوسرے انگریز

بھی اچھی حالت میں رکھتے تھے۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق مہندر نے یہ کوٹھی ایک ماہ کے لیے اپنے والد سے کہہ کر کسی دوست کو وہاں ٹھہرانے کے لیے حاصل کر لی تھی۔ مہندر کا کہنا تھا کہ یہ کوٹھی ہمارے پروگرام کے لیے بہت مفید رہے گی کیونکہ اس میں ایک لمبا چوڑا تہہ خانہ تھا جہاں دو کمرے میں بھی بنے ہوئے تھے۔ اس کوٹھی میں ایک گونگا چوکیدار بھی رہتا تھا جو کوٹھی کی نگہداشت کرتا تھا۔

''یار مہندر۔'' میں نے کہا۔ ''اگر استاد منگو، ٹینی کے ذریعے ہی شانتا کے گھر پہنچا تھا تو شاید اس نے ٹینی سے یہ بھی معلوم کر لیا ہو کہ رات تم بھی شانتا کی تلاش میں تھے۔''

''ہو سکتا ہے۔'' مہندر نے جواب دیا تھا۔

''اگر ایسا ہے تو استاد منگو پھر تمہارے گھر پر حملہ کر سکتا ہے۔'' میں نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

مہندر بے چین ہو گیا۔ ''ہاں، ہو سکتا ہے۔ میں تمہیں چھوڑ کر سیدھا گھر جاؤں گا۔'' اس نے کار کی رفتار اور تیز کر دی۔

دس منٹ بعد ہم بائی کلہ میں مہندر کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ بوڑھے چوکیدار نے کوٹھی کا گیٹ کھولا اور نمستے کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ مہندر، کار کو اندر لیتا چلا گیا، پھر کار روک کر اترا۔

''جمشید! شیرازی! تم بھی آؤ۔'' مہندر بولا اور چلتا ہوا چوکیدار کی طرف بڑھا۔ ہم اس کے ساتھ ساتھ ہو لیے۔

''بابا!'' اس نے چوکیدار سے کہا۔ ''یہ میرے دوست ہیں۔ یہ یہیں رہیں گے۔ ان کا خیال رکھنا۔''

بوڑھے بابا نے جھک کر ہاتھوں سے اس طرح اشارے کیے، گویا مہندر کی بات سمجھ گیا ہو۔

''اچھا جاؤ، اب جا کر سو رہو۔'' مہندر نے کہا۔ بوڑھا بابا ہاتھوں سے کچھ اشارے کر رہا تھا۔ ''نہیں نہیں، بس اب تم جا کر سو رہو۔ ان لوگوں کو میں خود اندر لے جاؤں گا۔ اب کوئی کام نہیں ہے۔ بس تم جا کر سو رہو۔'' مہندر نے جیب سے ایک روپے کا سکہ نکال کر اسے دیا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے دو چار قدم اور اس کی کوٹھری کی طرف لے گیا۔ ''جاؤ، جا کر سو رہو۔''

بابا چلا گیا تو مہندر نے کوٹھی کا مرکزی دروازہ کھولا، سوئچ دبا کر لائٹ آن کی، پھر ان

تینوں مجرموں کو ہم نے یکے بعد دیگرے تہہ خانوں میں منتقل کر دیا اور باہر آ کر
ایک مرتبہ پھر ان تینوں کی بندشیں دیکھیں۔

''میرا خیال ہے جمشید!'' مہندر نے کہا۔ ''اب تم بھی اپنے گھر جاؤ۔ میں تمہیں
پورا اتار دوں گا۔ تم اپنی والدہ سے مل کر کل صبح ہی بمبئی سے نکل جاؤ۔ صبح ہم
تمہارے پاس آئیں گے۔ مجھے اس وقت خیال آ رہا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ
زیادتی ہی کر ڈالی۔''

''کیا مطلب؟'' جمشید نے کہا۔ ''کیسی زیادتی؟''

''بات یہ ہے جمشید کہ بیک وقت اتنے اہم آدمیوں کی ہلاکت سے حکومت ہل
جائے گی۔ بڑے پیمانے پر تفتیش ہوگی۔ اس کے نتیجے میں یہ بات سامنے آنا لازمی ہے
ان چھ بروکروں کے پاس اس دن ایک ہی حلیے کا شخص پہنچا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان چھ میں
پر کوئی ایسا آدمی بھی رہا ہو جو تمہیں شکل سے پہچانتا ہو۔ پھر پولیس کو تم تک پہنچنے میں دیر نہیں
ہوگی۔''

''میں پولیس سے نہیں ڈرتا۔'' جمشید نے کہا۔

''جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔'' مہندر نے کہا۔ ''میرا خیال ہے تم یہاں
کراچی نکل جاؤ، جہاز سے۔'' پھر مہندر مجھ سے بولا۔ ''شیرازی، کچھ رقم جمشید کو دے دو۔''

''نہیں نہیں۔'' جمشید نے کہا۔ ''میں نے جو کچھ کیا ہے وہ رضا کارانہ طور پر کیا۔
میں ایک پیسا نہیں لوں گا۔''

''ہم تمہارے جذبات کی توہین نہیں کر رہے ہیں دوست!'' مہندر نے کہا۔ ''بات
یہ ہے کہ میں جانتا ہوں تم ہی اپنے گھر کے کفیل ہو۔ تمہاری ماں اور تمہاری بہن، دونوں
ہی انحصار کرتی ہیں۔ پھر تمہیں بھی کراچی میں اخراجات کی ضرورت ہوگی۔ یقین کرو
دوست! رقم ہم تمہیں اس کاز کو دے رہے ہیں جس کے لیے یہ رقم حاصل کی گئی ہے۔''

پھر بڑی ردوکد کے بعد ہم نے جمشید کو دس ہزار کی رقم لینے پر راضی کر ہی لیا۔
لیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''نہیں میرے دوست!'' میں نے کہا۔ ''یہ نہ
سمجھو کہ خدانخواستہ ہم تمہیں اپنا ساتھ دینے کا معاوضہ دے رہے ہیں۔ تم ہمارے لیے
اس ہندوستان کی آزادی کے لیے بہت اہم ہو۔ اچھا یوں سمجھ لو کہ اس تمام کارروائی کے
عوض ہم بھی دس دس ہزار روپے لے رہے ہیں۔ واقعی، اسے جھوٹ نہ سمجھو، میں اور مہندر بھی
یہ رقم اپنی ہی ذات پر خرچ کریں گے۔'' پھر میں نے مہندر کو بھی دس ہزار کی رقم دی۔

بچے ہیں ہزار روپے رکھ کر باقی رقم پوٹلی میں باندھ دی۔ ''ہم تم سے وعدہ کرتے ہیں کہ یہ رقم
ہم اپنی مرضی سے اپنی ہی ذات پر خرچ کریں گے۔''

''ہاں ہاں یار!'' مہندر نے کہا۔ ''جذباتی نہ بنو، حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''تم وعدہ کر رہے ہو کہ تم یہ رقم اپنی ذات پر خرچ کرو گے؟'' جمشید کو شاید ہم پر اس
معاملے میں اعتبار نہیں تھا۔

''ہاں بھئی وعدہ کر رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''قسم کھاؤ، ہندوستان کی اور اس کے باسیوں کی۔'' جمشید نے کہا۔ ''اس وقت میں
سمجھتا ہوں ہم تینوں کے نزدیک ان سے پیاری کوئی چیز نہیں ہے۔''

ہم نے قسم کھا کر یقین دلایا۔ یہ قسم کھاتے ہوئے میری آواز شدتِ جذبات سے لرز
رہی تھی۔ مہندر کے لہجے میں بھی کپکپاہٹ تھی۔

ہم نے جمشید کو ایک جگہ اتار دیا اور اس سے گھر اگلی صبح کا پروگرام طے کیا۔ مہندر نے
جمشید کے بارے میں جو کچھ سوچا، درست تھا۔ واقعی اس بات کا امکان تھا کہ پولیس سراغ
لگاتی لگاتی اس تک پہنچ جاتی۔

اب مہندر نے کار کا رخ اپنے گھر کی طرف کر دیا تھا۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا
تھا۔ یہ رات ہمارے لیے بڑی اہم تھی۔ ہمیں آج رات ابھی دو اور کام نمٹانے تھے مگر ان
سے پہلے مہندر کے گھر جا کر سیٹھ وشوا ناتھ کو منگو کے خطرے سے خبردار کرنا تھا کیونکہ یہ بات
خارج از امکان نہیں تھی کہ منگو کو اگر ٹینی نے یہ بتا دیا تھا کہ مہندر بھی شام دت کی تلاش میں
اس کے گھر گیا تھا تو پھر وہ شام دت کا پتا چلانے کے لیے اسی طرح مہندر کے خلاف کوئی
کارروائی کرتا جو اس نے گزشتہ روز کی تھی۔ وہ لالی کو بھی اغوا کر سکتا تھا اور سیٹھ وشوا ناتھ کو
بھی اور مہندر کو بھی۔

اس سڑک پر مڑتے ہی جو سیٹھ وشوا ناتھ کے بنگلے کو جاتی تھی مہندر نے کار کی
بتیاں بند کر دیں اور اسے ایک گلی میں موڑ لیا۔

''یہ کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہو سکتا ہے اس کار میں جو ہمارے تعاقب میں تھی، منگو یا اس کے ساتھی رہے
ہوں۔'' مہندر نے جواب دیا۔ ''اگر ایسا ہی تھا تو پھر یقیناً وہ لوگ سیدھے گھر پر ہی آئے
ہوں گے اور آس پاس ہی یا تو منڈلا رہے ہوں گے یا پھر......'' اس نے جملہ ادھورا چھوڑ

دیا۔

سڑک کے کنارے کنارے، درختوں اور دیواروں کے سائے سائے ہم
سیٹھ وشواناتھ کی کوٹھی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد ہمیں ایک
آ گئی۔ وہ اسی جگہ کھڑی تھی جہاں وہ کار لا کر کھڑی کی گئی تھی جس میں مجھے اغوا کیا گیا تھا
اس کار کا ہیولا میں نے ہی دیکھا تھا۔ میں نے مہندر کا ہاتھ دبایا اور ہم دونوں
ٹھٹک گئے۔

☆======☆======☆

ہم دونوں تیزی سے پہلو والی سڑک پر مڑ گئے اور چکر کاٹ کر عقبی راستے سے
گزرتے ہوئے اس کار کے پیچھے آ نکلے جسے دیکھ کر ہم دونوں ٹھٹکے تھے۔ میں اور مہندر
دونوں ہی خاموش تھے۔ شاید مہندر بھی میری طرح یہی اندازے لگا رہا ہوگا کہ یہ کار کس کی
تھی۔ ہم دونوں پوری طرح چوکنا تھے اور نہایت آہستگی کے ساتھ کار کی طرف بڑھ رہے
تھے کہ عقب سے ایک آواز گونجی۔ ''شیرازی!''

یہ آواز میرے لیے غیر متوقع تھی۔ غالباً ہم دونوں ہی نے ایک ساتھ پلٹنا چاہا تھا کہ
اسی آواز نے پھر کہا۔ ''نا، ناسیدھے چلتے رہو اور کار میں بیٹھ جاؤ۔'' یہ آواز سالارِ اعظم کی
تھی۔

''جناب! آپ یہاں کیسے؟'' میں نے اس وقت جان بوجھ کر سالار کا لفظ استعمال
نہیں کیا تھا کیونکہ اس وقت مہندر بھی میرے ساتھ تھا۔ مہندر نے کچھ کہنا چاہا تھا کہ میں نے
اس کا ہاتھ پکڑ کر دبا دیا۔ ہم دونوں خاموشی سے کار میں بیٹھ گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک
ہیولا سا ہمارے پاس سے گزر کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کے سر پر بھاری سی
پگڑی تھی اور شانوں پر موٹی سی چادر پڑی تھی جس کی وجہ سے ہم اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے
تھے۔

''تمہارے ساتھ غالباً مہندر ہے؟'' سالار کی آواز ابھری، ساتھ ہی کار بھی چل
پڑی۔

''جی ہاں!'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر میں حیران ہوں آپ اچانک یہاں کیسے آ
پہنچے۔ آپ تو......''

''بعض تشویشناک اطلاعات کے سبب اور تمہاری حماقتوں کی وجہ سے۔'' سالار نے
جواب دیا۔ غالباً اس نے مجھے اپنا جملہ پورا کرنے سے روکا تھا کیونکہ اس کے بعد میں یہی
کہنا چاہتا تھا کہ وہ تو پروگرام کے مطابق فرنٹیئر گئے تھے۔

"مگر جناب!" اس مرتبہ مہندر نے کہا تھا۔ "شیرازی نے تو کوئی غلطی نہیں کی۔"

"لاعلمی، بے عملی زندگی میں باعث رحمت ہو سکتی ہے لیکن عملی زندگی میں موت کے فرمان کے سوا کچھ نہیں! شاید تمہیں یہ جان کر خوشی ہو گی کہ تمہارے دوست کا نام ہندوستان بھر کی پولیس میں خطرناک اور مطلوبہ شخص کی حیثیت سے گشت کرانے کی تجویز ہے۔ میں نہیں کہتا کہ شیرازی کے لیے ایسے خطرات پیدا کرنا دانشمندی نہیں ہے۔ بہر حال، شیرازی جی! میں بڑی دیر سے تمہارا منتظر تھا۔ اب مجھے رپورٹ دو، مکمل رپورٹ! ویسے مہندر میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے شیرازی سے دوستی نبھائی۔ مجھے تم دونوں کی دوستی پر فخر ہے۔ اس ملک کی دو عظیم قوموں میں اگر اس قسم کا اتحاد ملکی سطح پر بھی ہو جائے تو ہندوستان کا یا ہی پلٹ جائے۔"

"ہماری دوستی اس عظیم مشن کی دین ہے جو ہمارے پیش نظر ہے۔" مہندر نے جواب دیا۔

"تم ایسے نوجوان ہی اس غلام ملک کی آزادی کی ضمانت ہیں۔" سالارِ اعظم نے کہا۔ "ہاں شیرازی! میں نے تم سے رپورٹ دینے کے لیے کہا تھا۔"

کار چلتی رہی اور میں بمبئی میں پیش آنے والے تمام واقعات سالار کو سناتا رہا۔ خاص طور پر میں نے شانتا بمفورڈ سے حاصل ہونے والی معلومات نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیں۔ اس دوران میں سالار نے چند سوالات بھی کیے اور وضاحتیں بھی طلب کیں۔

جب میں سب کچھ بتا چکا تو کار میں چند لمحے خاموشی چھائی رہی، پھر سالار نے مجھ سے دریافت کیا۔ "اب تم اپنے تینوں قیدیوں کا کیا کرو گے؟"

"شانتا بمفورڈ ایک ایسا شخص ہے جس سے ابھی ہم شاید اور بھی مفید معلومات حاصل کر سکیں۔ ماوالنکر کو اس لیے زندہ رکھا گیا ہے کہ اس عورت کو رہا کرایا جا سکے جسے اس نے داشتہ بنا کر رکھا ہے اور چونی لال صرف اس لیے زندہ ہے کہ اس سے تنظیم کے لیے وہ سونا حاصل کیا جا سکے جو اس نے جمع کر رکھا ہے۔"

"ہوں!" سالارِ اعظم نے کہا۔ "مہندر! تم ایسے لوگ جو ہماری تنظیم میں شامل نہ ہو کر بھی ہندوستان کی آزادی کے لیے ہر خطرے سے گزرنے اور زندگی پر کھیل جانے کے تیار ہو، تنظیم انہیں اپنا سپاہی سمجھتی ہے، غیر رسمی رکن سمجھتی ہے۔ اگر تم چاہو تم اس تنظیم کے با قاعدہ رکن بھی بن سکتے ہو لیکن پھر تمہیں تنظیم کے تمام اصولوں کی سختی سے پابندی کرنا ہو گی۔"

"آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے جناب!" مہندر نے جواب دیا۔ "میں بے شک کسی ایسے ہی راہبر کی تلاش میں تھا۔"

"تو بس آج سے تم اس تنظیم کے رکن ہو۔" سالار کی بھاری اور کھرکھراتی آواز گونجی۔ "تنظیم کے کچھ بنیادی اور غیر تحریری اصول ہیں، شیرازی تمہیں وہ تمام اصول بتا دے گا۔ بنیادی بات تنظیم اور ہندوستان سے وفاداری ہے۔ ہندوستان کا ہر دشمن خواہ وہ گورا ہو یا کالا، خواہ اس کا تعلق کسی بھی مذہب یا فرقے سے ہو، وہ تنظیم کا بھی دشمن ہے۔ اسے قدم قدم پر نقصان پہنچانا ہمارا شعار ہے۔"

اور یوں مہندر بھی تنظیم کا رکن بن گیا۔ سالار کے اس فیصلے سے مجھے جتنی خوشی ہوئی، وہ بیان سے باہر ہے۔ کار مخصوص رفتار سے چل رہی تھی۔ ہم دونوں دوست ایک دوسرے کو مبارکباد دے چکے تو سالارِ اعظم نے ہدایت دی کہ اب ان تین مجرموں کو ہمیں اس کے حوالے کر دینا ہو گا۔ ان سے متعلق باقی کام کی تکمیل کی ذمے داری اب سالار نے خود اپنے ذمے لے لی تھی، ساتھ ہی اس نے ہمیں یہ بھی ہدایت کی تھی کہ ہم صبح ہی جمشید کو اس کے گھر سے مہندر کے اس بنگلے میں منتقل کر دیں جہاں تینوں مجرموں کو رکھا گیا ہے۔

ان ہدایات کے بعد گفتگو کا موضوع ہندو مسلم آویزش کو ہوا دینے کے لیے انگریز کی سازش پر آ گیا۔ سالار نے بتایا تھا کہ انگریز کی یہ پالیسی ہمیشہ سے رہی ہے لیکن اب سیاسی سطح پر کانگریس، خلافت کمیٹی اور مسلم لیگ میں جو اتحاد پیدا ہو گیا ہے، وہ واقعی اس کے لیے خطرہ ہے، اس کا توڑ اسے کرنا ہی ہے۔ ہندوستان جیسی بڑی منڈی کو انگریز آسانی سے تو ہاتھ سے نہیں جانے دے گا، سو اس مرتبہ اس نے ہندو مسلم منافرت کو ہوا دینے کے لیے دوسرے طریقے بھی اختیار کرنے کی ٹھانی ہے۔ انگریز کی یہ سازش زیادہ خطرناک ہے۔

"کیا ایسا ممکن نہیں کہ انگریز اپنے ایجنٹوں کے ذریعے ہندوستان کے اہم لیڈروں کو قتل کرا دے اور پھر......" میں نے کہا۔

"نہیں، اس وقت ایسا براہِ راست اقدام انگریز مناسب نہیں سمجھے گا۔ اس وقت تو ملکی جو نوعیت بنی ہے، اس میں اس قسم کے اقدامات سے تمام ہندوستان انگریزوں کے خلاف اور بھی متحد ہو جائے گا۔ وہ پہلے اس اتحاد کو شکوک و شبہات پیدا کر کے کمزور کرنا چاہتا ہے۔ ایک مرتبہ اتحاد ختم ہوا تو ہندو، مسلم ایک دوسرے سے بہت دور اور ایک دوسرے کے مقابل آ کھڑے ہوں گے۔ پھر وہ انہیں آپس میں لڑا کر ان کی قوت کو منتشر کرے گا۔"

اس وقت کار، گیٹ وے آف انڈیا کے قریب پہنچ چکی تھی۔ سالار نے کار کی رفتار کم

کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''شیرازی! آس پاس دیکھو۔ شانتا کا ڈرائیور وحید یہیں
کار لیے کھڑا ہوگا۔ پونے بارہ ہو رہے ہیں۔''

اس وقت مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ سالارِ اعظم حالات اور واقعات کے بارے میں
کتنی کڑی نظر رکھتا ہے۔ شانتا کے مکان پر ہونے والے واقعات سے لے کر اب تک
میں شانتا کے ڈرائیور وحید کو تو بھولا ہوا ہی تھا۔ شانتا اسے وہاں نہ ملتا تو وہ اس کے گھر پہنچ
اور پھر ہماری کارگزاری وقت سے پہلے ہی طشت از بام ہو جاتی، پھر شاید ہم وہ دونوں کام
بھی نہ کر پاتے جن کے لیے ہم نے چونی لال اور ماوالنکر کو زندہ رکھا تھا۔ یہی وہ کام تھے
جو ہمیں صبح تک نمٹانے تھے۔

''آپ کو بہت یاد رہا جناب! اس وحید کو تو ہم بھول ہی گئے تھے۔'' مہندر نے کہا۔
وہ بھی شاید میرے ہی انداز میں سوچ رہا تھا۔

''اس میں تمہاری عمر اور جذباتیت کو زیادہ دخل ہے۔ تم ذرا سی کامیابی پر خوشی سے
دیوانے ہو جاتے ہو اور ذرا سی ناکامی پر مایوس۔ دونوں صورتوں میں تم بعض اہم باتوں
بھول جاتے ہو۔ ناتجربے کاری اسی کو کہتے ہیں۔''

مجھے شانتا بمفورڈ کی کار اور اس کے قریب کھڑا ہوا وحید بھی نظر آ گیا۔ اس نے کار
ایک سنسان مقام پر کھڑی کر رکھی تھی۔ میں نے جب سالار کو بتایا تو اس نے کار روک دی۔

''اچھا اب تم لوگ گھر جاؤ۔''

''آپ سے ایک درخواست ہے جناب!'' مہندر نے کہا۔

''کہو۔''

''پہلے وعدہ کیجیے کہ آپ میری درخواست کو ٹھکرائیں گے نہیں۔''

سالارِ اعظم ہنسا، یہ ہنسی عجیب سی تھی۔ ''چلو، تمہاری کارکردگی کے انعام کی خوشی میں
وعدہ۔''

''جناب میری درخواست ہے کہ آپ مجھے میزبانی کا شرف بخشیں۔ پتاجی اور لالی
آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔''

''ایسی ملاقات کا کیا فائدہ کہ میزبان اپنے مہمان کا چہرہ ہی نہ دیکھ سکے۔''

اس وقت مجھے مہندر کی شخصیت پر رشک آیا۔ وہ واقعی گفتگو کرنے کا ماہر تھا، بلکہ
جراُتمند بھی۔ میرا خیال تھا کہ تنظیم کے کسی فرد نے سالار سے آج تک اس نوعیت کی
درخواست کبھی نہ کی ہوگی۔ خود سالار کی گفتگو سے بھی یہ بات عیاں تھی مگر وہ کیونکہ وعدہ

کر چکا تھا اس لیے اب اس سے پھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''ٹھیک ہے مہندر بیٹا!'' سالار نے چند جملوں کے تبادلے کے بعد کہا۔ ''میں کسی
رات ایک اور دو کے درمیان تمہارے مکان کے عقبی حصے سے چوروں کی طرح داخل
ہو کر تمہاری میزبانی کا لطف اٹھاؤں گا۔''

اور اسی رات پونے دو بجے سالار، مہندر کے گھر موجود تھا۔ ہم اس وقت ڈرائنگ
روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ملازمین سونے کے لیے جا چکے تھے۔ اچانک کھڑکی پر
ہلکی سی دستک ہوئی، ساتھ ہی سرگوشی ابھری۔ ''مہندر!'' اس وقت سالار کی آمد غیر متوقع
تھی۔ ہمارے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ سالارِ اعظم اپنا وعدہ پورا کرنے اسی رات
پہنچ جائے گا۔

پھر ڈرائنگ روم کی تمام بتیاں بجھا دی گئیں۔ صرف ایک کمرے میں بلب روشن تھا
جس کی ہلکی سی روشنی ڈرائنگ روم میں آ رہی تھی۔ ڈرائنگ روم میں اندھیرا ہونے کے بعد
سالارِ اعظم ایک سایہ بنا ہوا داخل ہوا۔ اس کا تمام جسم ایک سیاہ چغے میں چھپا ہوا تھا۔
چہرے پر حسبِ معمول نقاب موجود تھی۔ وہ اندر آتے ہی دروازے کے ساتھ پڑے
ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''آداب، وشواناتھ!'' سالارِ اعظم نے کہا۔

''آداب!'' سیٹھ وشواناتھ نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی لالی نے سالارِ اعظم
کو ''انکل'' کہہ کر آداب کہا۔

پھر وشواناتھ کے کہنے پر سالارِ اعظم نے آزادی، جدوجہد آزادی اور ہندوستان
کی قومی اتحاد پر اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیا۔

''مگر انکل؟'' ایک موقع پر لالی نے کہا۔ ''آپ نے اپنے لیے جو راہ اختیار کی ہے،
اسے دیکھتے ہوئے تو آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔''

''میں اپنے دوستوں میں آیا ہوں بیٹا لالی!'' سالار نے کہا۔ ''میں تم سب سے اسی
طرح واقف ہوں جس طرح گوشت ناخن سے، پھر سیٹھ وشواناتھ تو وہ شخص ہے جس کی حب
الوطنی کا گواہ عمر سوبانی جیسا شخص ہے۔ عمر سوبانی کے توسط سے تمہارے پتاجی نے ہماری
تنظیم کی کتنی مدد کی ہے، شاید تمہارے پتا بھی نہ بتا سکیں۔''

''عمر سوبانی مجھ سے کہیں عظیم اور دیالو شخص ہے، وہ دیوتا ہے دیوتا! جو اس سے مانگو،
اس کے پاس ہو تو ضرور مل جاتا ہے۔ انکار کرنا اس کے ہاں پاپ ہے۔''

''سمجھے بیٹا لالی!'' سالار نے کہا۔ ''اور عمر سوبانی تمہارے پتا کی دریا دلی کا ثبوت ہے۔ ایسے لوگوں کے گھر جانا، میں اپنے لیے سعادت سمجھتا ہوں۔''

''آپ ویسے بھی پتا سے ملے ہیں انکل، بغیر نقاب کے!'' لالی نے پوچھا۔

''ہاں چند ایک ملاقاتیں ہوئی ہیں۔'' سالار نے کہا۔ ''بس معمولی سی لیکن مفید۔''

''تو آپ انکل کو پہچان گئے پتا جی!'' لالی نے سیٹھ وشوانا تھ سے مخاطب ہو کر کہا۔

''تمہارے پتا تو کیا، مجھے تو مہندر بھی نہیں پہچانا اور شیرازی بھی۔'' سالار نے کہا۔ ''البتہ تم سے یہ میری پہلی ملاقات ہے لالی بیٹا!''

''انکل میں آپ کو دیکھنا چاہتی ہوں۔'' لالی نے کہا۔

''آج کے دن میں دوسرا وعدہ کر رہا ہوں۔'' سالار نے کہا۔ ''جب بھی منارہ ہوا، میں اپنی رونمائی کی ابتدا تم سے ہی کروں گا۔''

''انکل آج!'' مجھے لالی کا یہ انداز بہت ہی پسند آیا۔

''یہ ممکن تھا، اگر تمہیں مصوری کا شوق نہ ہوتا۔'' سالار نے جواب دیا۔ ''مجھے ڈر ہے تم ایک نظر ہی دیکھ کر بعد میں اپنی مصورانہ صلاحیتوں سے میری تصویر بنا لو گی۔''

''ہائے انکل! تو آپ یہ بھی جانتے ہیں!'' لالی نے حیرانی کا اظہار کیا۔

''اگر یہ سب نہ جانتا ہوتا، تو مہندر کی دعوت پر اتنی آسانی سے نہ آ جاتا۔'' سالار نے جواب دیا۔ ''ہاں سیٹھ وشوانا تھ! میں یہاں ایک اور مقصد کے تحت بھی آیا ہوں۔ میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ آج مہندر بھی ہماری تنظیم کا رکن بن گیا ہے۔ میرا اپنا بیٹا بھی اس تنظیم کا رکن ہے۔ وہ بھی اس وقت اپنے گھر سے دور، ماں باپ سے دور اپنا فرض انجام دے رہا ہے اور میں مطمئن ہوں۔ میں تمہیں یہ اطلاع دے رہا ہوں تا کہ تم بھی مہندر کے اس فیصلے سے آگاہ ہو جاؤ۔''

''میرا دھن دولت...... '' سیٹھ وشوانا تھ نے جواب دیا۔ ''سب ہندوستان کی آزادی کے لیے وقف ہے۔ مہندر اور لالی بھی میرا دھن دولت ہیں۔ میرا سب سے عزیز سرمایہ ہیں۔ میں انہیں بھی اپنی طرف سے وقف کرتا ہوں۔''

''تم واقعی عظیم ہو سیٹھ وشوانا تھ!'' سالار کی آواز کپکپا کر رہ گئی تھی۔ ''اب تنظیم نے مہندر کے ماں باپ کی جگہ لے لی ہے۔ تنظیم کے احکام مہندر کے لیے تمہارے احکام سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔''

''آپ یقین رکھیں سالار! میں کبھی اس معاملے میں مہندر کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔'' سیٹھ وشوانا تھ کا چہرہ جوش سے سرخ ہو گیا تھا۔

''انکل! مجھے بھی بنا لیجیے تنظیم کا رکن۔'' اس مرتبہ لالی نے کہا تھا۔

''اگر میری بیٹی میدانِ عمل میں ہوتی تو میں شاید بنا لیتا مگر ابھی وہ بہت چھوٹی ہے۔ مجھے نہیں پتا کہ اگر وہ تمہاری عمر کی ہوتی تو میرا رویہ کیا ہوتا۔''

''آپ کی ایک بیٹی جوان ہے انکل! وہ بیٹی میں ہوں لالی، پتا جی آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں''۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔'' سیٹھ وشوانا تھ نے بڑے عزم سے کہا۔ ''جھانسی کی رانی اور چاند بی بی بھی کسی کی بیٹیاں تھیں۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے ان کی راہ پر چلنے کا فیصلہ کیا ہے۔ سالار! اگر تمہاری تنظیم کے اصولوں پر کوئی حرف نہ آتا ہو تو میری درخواست ہے کہ اس کو بھی رکن بنا لیا جائے۔''

''دیکھیے انکل! اب انکار نہ کیجیے گا ورنہ میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گا۔'' لالی نے نخرا لگایا۔

''سیٹھ وشوانا تھ!'' سالار کی آواز گونجی۔ ''تمہارے گھرانے کو آج دو اعزاز حاصل ہو رہے ہیں۔ پہلا یہ کہ تمہاری بیٹی آزادیِ ہند کے لیے جدوجہد کرنے والی اس تنظیم کی پہلی رکن بن رہی ہے۔ دوسرا یہ کہ تمہارا گھرانا ہندوستان کا پہلا گھرانا ہے جس کا ہر فرد اس تنظیم میں کسی نہ کسی انداز سے شامل ہے۔ میں اس گھرانے کو تنظیم کی طرف سے سلام کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر سالار نے تعظیمی انداز میں ہاتھ اٹھایا۔

''آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔'' سیٹھ وشوانا تھ نے کہا۔

اسی دوران میں لالی، سالار کی طرف بڑھی: ''ہائے انکل! اوہ سالار! آپ کتنے اچھے ہیں۔''

''تم مجھے سالار نہیں، انکل ہی کہو گی بیٹا لالی۔'' سالار نے لالی کو اپنے شانے سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم میری بیٹی ہو۔'' یہ کہتے ہوئے سالار کی آواز بھرا گئی۔ ''سیٹھ وشوانا تھ! ہو سکتا ہے تم منگو کی طرف سے خطرہ محسوس کر رہے ہو۔ آج صبح تک اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ تنظیم ایسے لوگوں سے نمٹنا خوب جانتی ہے۔''

اس کے بعد دو تین منٹ اور گفتگو رہی، پھر سالار جس طرح آیا تھا اسی طرح چلا گیا۔ ابھی ہمیں ایک کام اور کرنا تھا۔ ہمیں سالار کے حکم کے مطابق جمشید کو اس کے گھر سے

بائی کلہ، مہندر کے بنگلے میں منتقل کرنا تھا۔ اس بنگلے کی چابیاں مہندر پہلے ہی گیٹ وے آف انڈیا پر سالار کے حوالے کر چکا تھا اور سالار نے کہا تھا کہ جب ہم جمشید کو لے کر وہاں پہنچیں گے تو چابیاں ہمیں تالے ہی میں مل جائیں گی۔

سالار کے جانے کے کچھ دیر بعد میں اور مہندر گھر سے اس کام کی تکمیل کے لیے... اور جب واپس آئے تو رات کے چار بج رہے تھے۔

اس رات جب میں لیٹا تو میں نے خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ مہندر اور... حالات نے جس طرح مجھ سے قریب کیا تھا اور جس طرح وہ میری خفیہ کارروائیوں... نوعیت سے واقف ہو کر ان میں شریک ہو گئے تھے، میں ذہنی طور پر اس سے بہت پریشان رہتا تھا۔ ہر وقت یہی خوف اور ڈر تھا کہ اگر سالار کو اس کا علم ہو گیا تو شاید میرے لیے تنظیم کی طرف سے کوئی بہت ہی سخت سزا تجویز ہو مگر اس رات یہ تمام ڈر اور خوف ختم ہو گیا تھا۔ اس رات میں بہت خوش تھا۔ ایک بوجھ تھا کہ میرے ذہن سے اتر گیا تھا۔

صبح ناشتے پر بھی لالی کا یہ اصرار برقرار تھا کہ میں، مہندر اور سیٹھ وشواناتھ یہ اندازہ لگائیں کہ سالارِ تنظیم کے پیچھے کون سی شخصیت چھپی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کا نسوانی تجسس پوری طرح بیدار تھا۔ اس موقع پر سیٹھ وشواناتھ نے کہا۔ ''وہ اپنی شخصیت کو راز میں رکھنا چاہتا ہے تو اس کی کوئی وجہ بھی ہو گی، اس میں مصلحت کا کوئی تقاضا بھی ہو گا لہٰذا بہتر ہے اسے ایک مقدس راز سمجھ کر راز ہی رہنے دیا جائے۔ ہمیں اس راز کو کھولنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔''

ابھی ہم ناشتے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ عمر سوبانی کا ایک ملازم آ گیا۔ وہ میرے اور مہندر کے لیے پیغام لایا تھا۔ عمر سوبانی نے ہمیں فوراً اپنے گھر بلایا تھا۔ کام کی نوعیت کیا تھی، اس کے بارے میں ملازم کو کچھ معلوم نہیں تھا البتہ ملازم نے مجھ سے اتنا ضرور کہا تھا: ''آپ جو خط لائے تھے اس کا جواب لکھ لیا ہے۔ صاحب وہ جواب آپ کو دینا چاہتے ہیں۔''

گویا معاملے کا تعلق تنظیم سے ہی تھا۔ ہم دونوں فوراً روانہ ہو گئے۔

ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنے کے لیے انگریز کی جس سازش کا علم ہمیں شانتا بمفورڈ کے توسط سے ہوا تھا، تنظیم نے فیصلہ کیا تھا کہ اس سازش کو پھلنے پھولنے اور پنپنے سے پہلے ہی کچل دیا جائے۔ یہ سازش ایک ایسی بھڑکتی ہوئی آگ کی مانند تھی کہ اگر شروع ہو جاتی تو پورا ہندوستان اس میں بھسم ہو جاتا۔ اس آگ کو جو انگریز بھڑکانا چاہتا تھا، ہندو اور مسلمان

...ہی اپنی فہم و فراست سے روک سکتے تھے۔ کانگریس اور خلافت کمیٹی اور پھر مسلم لیگ ...وقت کسی نہ کسی طور پر ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع تھیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ...اتحاد کو زیادہ مستحکم کیا جاتا اور اس کے خلاف ہونے والی سازش سے ہندوستان کے سرکردہ لیڈروں کو آگاہ کر دیا جاتا۔

اس وقت ہم اس مہم کے پہلے مرحلے کے طور پر، مالا بار ہلز میں محمد علی جناح کی کوٹھی پر موجود تھے کیونکہ ان دنوں محمد علی جناح ہندو مسلم اتحاد کو عملی شکل دینے کے لیے سب سے زیادہ فعال نظر آتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایسی مثبت کوششیں کی تھیں کہ انہیں ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا جانے لگا تھا۔

محمد علی جناح نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ جب میں نے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تو وہ آپ تھے، شعلہ نفس نوجوان جس نے ولایتی کپڑوں کی ہولی کے موقع پر گاندھی جی کی بے معنی سیاست پر نکتہ چینی کی تھی، خوب!''

اس کے بعد میں نے اور مہندر نے مل جل کر انگریزوں کی سازش کے بارے میں محمد علی جناح کو آگاہ کیا، انہیں بتایا کہ کس طرح ہندوستان کے لوگوں کو آپس میں لڑانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ یہ سب کچھ بتانے کے لیے محمد علی جناح کو پریل میں اپنی تقریر کے بعد لالی کے اغوا، پھر اپنے اوپر بیتی داستان اور رہائی معمولی رد و بدل کے ساتھ سنائی اور ان سے درخواست کی کہ وہ انگریز کی اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے جو ہو سکتا ہے کریں۔

محمد علی جناح یہ باتیں سن کر کچھ دیر سوچتے رہے، پھر انہوں نے اپنی تیز نگاہ میرے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا۔ ''جوان! تم نے جو کہانی سنائی ہے، اس میں بہت سے جھول ہیں۔ تمہاری یہ کہانی جھوٹ اور سچ کی آمیزش سے تیار کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود، تمہارا یہ تمہارے جذبے کی صداقت کا مظہر ہے۔ تم نے جو کچھ بھی کہا ہے، خلوص اور نیک نیتی سے کہا ہے۔ تمہارا مقصد بھی وہی ہے جو تم نے بیان کیا ہے، یعنی تم بس یہی چاہتے ہو کہ ہندوستان کے سرکردہ لیڈر کسی طرح انگریز کی اس سازش کا سد باب کریں مگر تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟''

''اس لیے کہ جناب، اگر اس وقت یہ اتحاد ختم ہو گیا یا کمزور ہو گیا تو یہ ملک برادر کشی کے ایک بہت بڑے مقتل میں تبدیل ہو جائے گا، پھر اس ملک کی آزادی اور بھی دور ہو جائے گی۔''

''تم بہت جذباتی بھی ہو اور جوشیلے بھی۔'' محمد علی نے کہا۔ ''سیاست، اجتماعی

نفسیات کا کھیل ہے۔ اس وقت ہندو مسلم اتحاد جو قائم ہے مصنوعی اور عارضی ہے۔
مصلحتوں کے تحت وجود میں آیا ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سمجھ رہے
کہ وہ اپنے مقصد کے لیے دوسرے کو احمق بنا کر استعمال کر رہے ہیں۔ اس اتحاد
بدیر ختم ہونا ہی ہے، خواہ اس کے لیے انگریز سازش کرے یا نہ کرے۔ یقین مانو
آزادی کی منزل آج بھی اتنی ہی دور ہے جتنا سن چودہ یا سن اٹھارہ میں تھی۔"

"گویا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے کچھ
کریں گے۔"

"یہ تم نے کیسے سمجھ لیا نوجوان! میں اس سلسلے میں جو کچھ ہو سکے گا، کروں گا، یہ جانتے
ہوئے بھی کہ یہ سب کچھ بے سود ہوگا۔"

"بے سود!" مہندر نے حیرانی سے کہا۔

"ہاں بے سود۔" محمد علی جناح نے کہا۔ "ہندوستان کے لیڈروں کے ساتھ
مصیبت یہ ہے کہ وہ تانگے میں جتے ہوئے اس گھوڑے کی مانند ہیں جو سواریوں کی
مرضی کے مطابق لے کر جاتا ہے۔ یہاں بوجھ کھینچنے والے کو لیڈر کہا جاتا ہے۔ یہ لیڈر
بھی جذباتی مسئلے کو اٹھا کر عوام کو مشتعل کر سکتے ہیں مگر ان کی توانائیوں کو صحیح رخ پر موڑنے
کی ہمت اور جرأت نہیں رکھتے۔ پھر مشتعل عوام کی مرضی کے مطابق یہ لوگ اپنی سیاست
کرتے ہیں، وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے۔"

محمد علی جناح نے جو کچھ کہا تھا، صحیح کہا تھا۔ مہندر نے اس مرحلے پر کہا۔ "مگر جناب
اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس صورت حال کو درست کرنے کی کوشش ہی نہ کی جائے۔"

"میں یہ کوشش کر رہا ہوں۔ اس سے پہلے گوکھلے یہی کوشش کرتے ہوئے ختم ہو
گئے۔ بہر حال نوجوان!" محمد علی جناح پھر مجھ سے مخاطب تھے۔ "میں نے تمہارے بارے
میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہی تھیں۔ سوبانی کے کارخانوں کے احاطے میں بھڑکائے
جانے والے الاؤ کے موقع پر تم نے جو تقریر کی تھی، اس کی اکا دکا باتیں مجھ تک پہنچی ہیں۔
مجھے بتاؤ کہ آخر تم کس سمت میں جدوجہد کر رہے ہو؟"

"جناب! میں ایک ایسی تنظیم کا رکن ہوں جو انگریز حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد
پر یقین رکھتی ہے۔ جو سیاست کے ذریعے نہیں، اسی طاقت کے ذریعے انگریز کو ہندوستان
سے نکالنا چاہتی ہے جس کے بل بوتے پر اس نے ہندوستان کو غلام بنایا ہے۔ ہم
ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کا بازوئے شمشیر زن قرار دیتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ

گرمیاں پورے عروج پر ہوں گی تو آپ کی سیاسی جدوجہد تیزی سے اپنی منزل کی
طرف بڑھے گی۔ اس وقت ہمارے سیاسی لیڈر سیاسی اصلاحات اور ہوم رول کی بھیک
مانگ رہے ہوں گے، مکمل آزادی کا مطالبہ کر رہے ہوں گے۔"

محمد علی جناح کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "کاش ایسا ہو سکتا۔ کاش ہندو مسلم اتحاد خلوص اور
نیک نیتی کے ساتھ صرف ہندوستان کی آزادی کے لیے قائم ہوتا مگر ایسا نہیں ہے۔ ہندو اس
ملک کے مسلمان کو غلام بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ وہ انگریز سے صرف اپنے لیے مراعات
چاہتا ہے، مسلمان کو مراعات دینا نہیں چاہتا۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ اسی لیے ہوئی کہ ہندو نے
شور مچایا تھا کہ تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو کچھ فائدہ پہنچتا تھا۔ اس طرز عمل سے
ہندوؤں نے مسلمانوں کو خود سے بہت دور دھکیل دیا اور مسلمان ہندوستان میں رہتے
ہوئے اپنے قومی تشخص کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اب ہندوستان ایک قوم کا نہیں،
دو قوموں کا وطن ہے اور دوسری قوم جو عددی اعتبار سے کم سہی اپنے لیے وہی مراعات
طلب کر رہی ہے جو اکثریتی قوم طلب کر رہی ہے۔"

"تو آپ ایک پائیدار ہندو مسلم اتحاد سے مایوس ہیں؟"

"مایوسی کا لفظ میری لغت میں نہیں ہے مگر فی الحال یہ دونوں قومیں ایک دوسرے
سے تصادم ہونے کی راہ پر بڑھ رہی ہیں۔ موجودہ اتحاد محض ریت کی دیوار ہے، محض عقل کا
تقاضا ہے۔ یہ دونوں قومیں کسی مشترکہ مقصد کے لیے متحد نہیں ہوئیں۔ تحریک خلافت سے
ہندوؤں کو کوئی سروکار نہیں۔ ان کے درمیان مستحکم اتحاد کے لیے کوئی قومی مقصد نہیں۔" محمد
علی جناح ایک لمحے کے لیے رکے اور ان کی تیز آنکھیں خالی دیوار کو گھورتی رہیں۔ "شاید
تمہیں یاد ہو، میں نے آج سے تین برس پہلے اسی شہر بمبئی میں انگریز حکومت سے مطالبہ کیا
تھا کہ ہم ہندوستان کے لیے نیشنل آرمی کے خواہش مند ہیں، اس کے لیے کرائے کے تنخواہ
دار فراہم کرنا نہیں چاہتے۔ یہ ایک عظیم مطالبہ تھا، ایک عظیم مقصد تھا، ایک مشترکہ اور
قومی مقصد تھا مگر میرے اس مطالبے کی حمایت میں کسی ہندو لیڈر نے ایک لفظ نہیں کہا
تھا۔ میں نے مسلم آرمی کے قیام کا مطالبہ نہیں کیا تھا، نیشنل آرمی کے قیام کا مطالبہ کیا تھا۔
اس مطالبے کو پورے ہندوستان کا مطالبہ بنا دیا جاتا تو مجھے یقین ہے کہ نیشنل آرمی قائم
ہو چکی ہوتی۔ یہ وہ دور تھا جب انگریز، جنگ میں مصروف تھا۔ اسے ایسا کرنا ہی پڑتا اور پھر
ہم جدوجہد کی طرف تیزی سے قدم بڑھا چکے ہوتے، آزادی کے قریب پہنچ گئے
ہوتے۔ اب پھر ہم بیس پچیس برس پیچھے چلے گئے ہیں۔"

محمد علی جناح خاموش ہو گئے۔ کمرے میں ایک سناٹا پھیل گیا۔ نیشنل آ... نطالبے کی اہمیت اس دن میری سمجھ میں آئی۔ اس دن پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا ... جناح وہ سیاستداں ہیں جو اپنی سیاست کی حکمت عملی مستقبل سے مربوط کر کے بناتے ...

"کچھ بھی ہو جناب!" میں نے کہا۔ "ہم نے بہت چھوٹے پیمانے پر مسلح جد... پروگرام بنایا ہے۔ کامیابی اور ناکامی کا خیال کیے بغیر ہم اس راہ پر بڑھنے کا فیصلہ ... ہیں۔"

"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ میں ہر طرح تم سے تعاون کے لیے تیار ... مگر اتنا سوچ لو کہ تم نے ایک غلط وقت پر اور غلط ملک میں اس راہ پر چلنے کا فیصلہ کیا ... یہاں تمہیں کوئی اتاترک شاید ہی ملے اور اگر اتاترک مل گیا تو اسے شاید ہی کوئی عصمت انونو یا انور جمال پاشا مل سکے۔"

محمد علی جناح کے پاس سے ہم واپس آئے تو ہم دونوں ہی خاموش تھے۔ "ہم غلط سمت میں سفر کر رہے ہیں؟" مہندر نے کافی دیر بعد مجھ سے کہا۔

"ہم ایک کاز کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہمارا مقصد ہمارے سامنے ہے۔ ہمارا سفر اسی سمت ہے۔ ضروری نہیں منزل پر پہنچنے والے ہم ہی ہوں۔ یہ بھی ہے کہ ہم راہ میں مرکھپ جائیں اور ہمارے پیچھے آنے والے منزل پر پہنچیں۔ فتح کرنے والی فوج کا ہر سپاہی تو زندہ نہیں بچتا۔ زندہ بچنے والے اس لیے فتح مند ہوتے کہ دوسروں نے ان کی طرف بڑھنے والے وار کو اپنے اوپر روک لیا تھا۔"

بہرحال محمد علی جناح نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ سرکردہ لیڈروں سے رابطہ قائم کر کے انہیں اس نئی انگریز سازش سے آگاہ کریں گے اور ایک مرتبہ پھر ہندو مسلم اتحاد کی اور مشترک بنیادوں پر استوار کرنے کی سرتوڑ کوشش کریں گے۔

اسی دن شام کو میں اور مہندر، عمر سوبانی کی کوٹھی پر موجود تھے۔ عمر سوبانی نے گاندھی جی اور چند لیڈروں کو رات کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا اور صبح ہی ہمیں بتا دیا تھا کہ وہ گاندھی جی کو شام کے وقت ہی اپنے بنگلے پر لے آئیں گے، وہ اسی وقت ہماری ان سے ملاقات کرا دیں گے۔ ہم جس وقت وہاں پہنچے، گاندھی جی ایک اور ہندو رہنما کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ آج انسٹھ ساٹھ برس بعد کافی سوچنے پر بھی مجھے یاد نہیں آ رہا کہ گاندھی جی کے ساتھ ہندو لیڈر کون تھا۔ کبھی خیال آتا ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی نہیں بلکہ کوئی اور صاحب تھے مگر قیاس یہی ہے کہ وہ جمنا داس دوار کا داس ہی تھے۔

گاندھی جی میرے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آئے۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی گلے لگا لیا۔ "بڑے جیالے اور لڑاکا جوان ہو" انہوں نے کہا۔ "مجھے تمہاری وہ تقریر پسند آئی تھی مگر ابھی وہ راہ اختیار کرنے کا وقت نہیں آیا جس کے تم خواہش مند ہو۔"

اس کے بعد میں نے اور مہندر نے گاندھی جی سے اپنی ملاقات کا مقصد بتایا، انہیں انگریز کی سازش سے آگاہ کیا۔ گاندھی جی نے ہماری باتیں سنیں اور پھر آنکھیں بند کیے گیان دھیان میں مصروف ہو گئے۔ کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں، مہندر، جمنا داس اور عمر سوبانی سب منتظر تھے کہ دیکھیے اس مسئلے میں گاندھی جی کی طرف سے کیا ارشاد ہوتا ہے۔

پھر گاندھی جی کی تیز اور باریک سی آواز ابھری۔ "جمنا داس! سنا تم نے! بتاؤ تمہاری رائے کیا ہے؟"

"بات یہ ہے مہاتما جی!" جمنا داس نے کہا۔ "ہندو مسلم ایکتا کی ضرورت سب ہی محسوس کرتے ہیں۔ اس کے خلاف انگریز کی سازش بھی کوئی نئی بات نہیں مگر عمر نے ہم تک یہ بات پہنچانے کے لیے اس وقت دو گواہوں کی ضرورت محسوس کی، یہ نئی بات ہے۔ لگتا ہے عمر کو یا تو اس بات پر یقین نہیں آیا یا اسے ہم پر بھروسا نہیں کہ ہم اس کی بات پر یقین کر لیں گے۔"

جمنا داس نے بڑی چالاکی سے یہ بات کہی تھی۔ اس میں جو زہر پنہاں تھا، وہ محسوس کیا جا سکتا تھا۔ مہندر نے فوراً ہی کہا۔ "آپ غلط سمجھے ہیں جمنا داس جی! ضرورت عمر سوبانی نے نہیں۔ ہم نے محسوس کی تھی۔ یہ بات تو عمر سوبانی کو ابھی اور اسی وقت معلوم ہوئی ہے۔ ہم نے تو ان سے بس اتنی درخواست کی تھی کہ ہماری ملاقات گاندھی جی سے کرا دیں، ہم انہیں ایک اہم اطلاع دینا چاہتے ہیں، ایسی اطلاع جو ہندوستان کے قومی اتحاد کے لیے بہت ضروری ہے۔ ہم عمر صاحب کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست کو ٹھکرایا نہیں۔"

"دھیرج، بالک دھیرج!" جمنا داس نے کہا۔ "زیادہ ابال نہ دکھاؤ۔ سیدھے سیدھے بتاؤ، چاہتے کیا ہو؟"

"ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے سرکردہ لیڈر انگریز کی اس سازش کو ناکام بنانے کی کوشش کریں۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت کہاں سے یہ آگ بھڑک اٹھے۔ آپ اس آگ کو پھیلنے سے روکیں۔ ہندو مسلم ایکتا تو ہر

صورت میں قائم رکھیں۔"

"یہ بات تم ہم سے کہہ رہے ہو۔" جمنا داس نے کہا۔ "مہاتما جی نے کہا ہے
سوراج کا قیام عدم تشدد ہی سے ہوسکتا ہے مگر خلافت کے لیڈر، محمد علی اور شوکت علی عدم تشدد
کو اہمیت نہیں دیتے۔ وہ تشدد کا پرچار کر رہے ہیں۔ وہ حکومت سے ٹکر لینے کی باتیں کر رہے
ہیں۔ پھر بھی ہم ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ یہ بات تم مسلمانوں کو سمجھاؤ۔"

"محمد علی اور شوکت علی کے بارے میں ایسا مت کہو جمنا داس!" گاندھی جی گیان
دھیان سے برآمد ہوئے اور انہوں نے چھت پر آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا۔ "یہ دونوں
ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تم انہیں نہیں سمجھا سکتے۔" گاندھی جی رکے، پھر انہوں نے مجھ سے کہا
"سنو نوجوان! میری زندگی، ہندو مسلم ایکتا اور بھائی چارے کے لیے وقف ہے۔ عدم
تشدد کا پرچار اسی لیے ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی ہتیا کرتے
رہیں اور کیا چاہتے ہو تم لوگ؟" انہوں نے ہم سے سوال کیا۔

"ہم چاہتے ہیں جناب کہ آپ اس معاملے کو کانگریس کی سطح پر اٹھائیں۔ عمر سوبانی
اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے خلافت کمیٹی کے پلیٹ فارم سے انگریز کی اس سازش کو
عوام تک پہنچائیں۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی یہ کام مسلم لیگ سے بھی کرا سکتے ہیں۔ ہم
اس سلسلے میں محمد علی جناح سے بھی مل چکے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے ہندوستان کی اہم
پارٹیوں کو آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا ہے۔ ہم نے اپنا وہ فرض پورا کر دیا ہے جو
اس دیس کی طرف سے ہم پر عائد ہوتا تھا۔"

"اور اب تم کیا کرو گے؟" جمنا داس نے کہا۔

"ہم وہی کچھ کریں گے جو ان حالات میں وطن پرستوں کو کرنا چاہیے۔" مہندر نے
کہا۔ "یہ وقت صرف بدیسی کپڑوں کو آگ لگانے کا نہیں، نہ چرخہ کاتنے کا یا عدم تعاون کی
تبلیغ کرنے کا ہے۔ یہ وقت میدان عمل میں کود پڑنے کا ہے۔ ہم آپ کو جلد ہی بتا دیں گے
کہ ہم کیا کر سکتے ہیں۔"

"تم لوگ ہندوستان کو جہنم بنا دو گے۔" جمنا داس نے کہا۔

"جہنم تو یہ دیس اس وقت بھی ہے۔" مہندر نے کہا۔ "ہم سب غلامی کے جہنم کا
ایندھن ہیں۔"

"تم لوگ انقلابی بنتے ہو۔" گاندھی جی نے کہا۔ "مگر شاید انقلابی کی روح سے آشنا
نہیں ہو۔ انقلابی وہ ہوتا ہے جو انقلاب کے لیے کام کرنے سے قبل اپنی حفاظت کا فن سیکھ

پھر بغیر کوئی جان لیے مرجانے کا حوصلہ پیدا کرے۔"

"ہم نے مارنے اور مارے جانے کے گر سیکھ لیے ہیں مہاتما جی!" میں نے کہا۔
"میں اور میرے ساتھی ہر وقت جان ہتھیلیوں پر لیے پھرتے ہیں۔ ہم اس دیس کی آزادی
کی خاطر کٹ مرنے کے لئے تیار ہیں اور اس کے ہر دشمن کو جان سے مارنے کے لیے
مستعد اور چوکنا ہیں۔ ہم نے جو راہ اختیار کی ہے، وہ پھانسی کے پھندے کی طرف جاتی
ہے۔ اس کے باوجود ہم ہراساں نہیں۔"

"ٹھیک ہے بالک!" جمنا داس نے کہا تھا۔ "تم نے اپنی بات مہاتما کو پہنچا دی،
مہاتما نے تمہیں جواب دے دیا، اب اور کیا چاہتے ہو!"

پھر ہم وہاں سے چلے آئے تھے۔ عمر سوبانی نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس معاملے سے
آگاہ کرنے کے لیے مولانا محمد علی جوہر اور شوکت علی کے پاس اپنا پیغامبر روانہ کریں گے۔
انہوں نے اس سلسلے میں اپنی بھرپور کوشش کرنے کا وعدہ بھی کیا۔

وہاں سے واپسی پر ہم دونوں ہی افسردہ تھے۔ محمد علی جناح کا تجزیہ درست معلوم ہو
رہا تھا۔ ہندو اور مسلمان اس وقت اتحاد کا راگ تو الاپ رہے تھے لیکن اس اتحاد میں خلوص
کا فقدان تھا۔ دونوں فریق اس اتحاد کے لیے اپنے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔
ان کے سامنے کوئی مشترکہ مقصد نہیں تھا۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ
انگریز نے جو سازش تیار کی ہے، اس کا توڑ کرنا ان لیڈروں کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ اس
کے توڑ کے لیے واضح اور براہ راست، دوٹوک عمل کی ضرورت تھی اور یہ بات اس وقت کی
ہندوستانی سیاست کی روش کے منافی تھی۔

انگریزوں کی اس گھناؤنی سازش کے انکشاف سے ہم نے جو خطرات محسوس کیے
تھے ایک ہفتے کے اندر ہی ان خطرات کی گھنٹیاں مختلف صوبوں میں بج چکی تھیں۔ ان دنوں
تنظیم کے کارکنوں کے اجتماعات ہر دوسرے دن بمبئی میں ہو رہے تھے۔ بائی کلہ میں مہندر کا
گھر عارضی طور پر تنظیم کا مرکز بن گیا تھا۔ شانتا بمفورڈ سے حاصل ہونے والی اطلاعات
کے پیش نظر ہی سالار نے مختلف صوبوں میں تنظیم کے کارکنوں کو چوکنا کر دیا تھا۔ انہیں
ہدایت تھی کہ جونہی انہیں اپنے صوبے میں اس قسم کی سازش کی اطلاع ملے، وہ فوراً اس سے
آگاہ کریں۔ یہ خبریں خفیہ الفاظ میں بذریعہ تار سالار کو پہنچ رہی تھیں۔ کس پتے پر، یہ ہمیں
معلوم نہ تھا۔

خطرے کی گھنٹیاں بہار، سی پی، بنگال اور مدراس میں بجی تھیں۔ بہار، سی پی اور

بنگال کے صوبوں میں دو دو رضا کاروں کی پارٹیاں بھیج دی گئی تھیں جبکہ میں، مہندر اور لالہ لی اس دستے میں شامل تھے جنہیں مدراس میں، موپلوں کے علاقے میں جانا تھا۔ سالار نے بنگال کا رخ کیا تھا۔

ہم چاروں ٹرین سے مدراس پہنچے جہاں تنظیم کے ایک کارکن نے ہماری میزبانی کی۔ اسی شام اس نے ہمیں اطلاع دی کہ ہندو مسلم فسادات کے لیے انگریز نے موپلا کے ایک دور افتادہ قصبے تروڑنگری کو مرکز بنایا ہے۔ اگلے ہی دن ہم پہلی ٹرین سے کوئمبٹوز کالی کٹ پہنچے اور وہاں سے تروڑنگری۔

تروڑنگری، ایک سرسبز اور شاداب قصبہ تھا۔ ہر طرف ہریالی تھی، گہری ہریالی جس سے آنکھوں میں ٹھنڈک سی اترتی محسوس ہوتی تھی اور ذہن میں طمانیت کا احساس بیدار ہو جاتا تھا۔ درختوں کے پتوں اور گھاس کا اتنا گہرا رنگ میں نے ہندوستان میں کہیں اور نہیں دیکھا۔ فضا میں ہر وقت پھولوں اور پھلوں کی بھینی بھینی اور میٹھی میٹھی مہک گھلی رہتی، رنگ برنگے خوشنما اور خوبصورت پرندے ہر وقت چہچہاتے رہتے۔ یہاں کی زمین سونا اگلتی تھی مگر غریب کا شتکاروں کے لیے ہرے بھرے لہلہاتے کھیتوں میں صرف بھوک اگا کرتی تھی۔ دھرتی کا سینہ چیر کر اس سے فصلیں حاصل کرنے والے صرف افلاس اور غربت کے کھلیان جمع کرتے تھے۔ ان کے لیے دق، سل اور دمے کی بیماریوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سود در سود کی لعنتیں ان کے لیے انگریز کا سب سے بڑا تحفہ تھیں جو 1855ء کے ایکٹ نمبر اٹھائیس کی عطا تھیں۔ یہ لعنت جو مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ختم کر دی گئی تھی، انگریز نے ہندو ساہو کاروں کو خوش کرنے اور مسلمانوں کو اقتصادی طور پر کمزور کرنے کے لیے خاص طور پر مسلمان زمینداروں کی بیخ کنی کی خاطر سود در سود کی لعنت کو قانونی تحفظ فراہم کیا۔ چنانچہ اس قانون کے بعد چند سو روپیوں کے عوض ہندو مہاجن، بنئے اور ساہو کار لاکھوں روپے کی ڈگریاں عدالت سے کراتے۔ مراد آباد کے ایک رئیس پر چند سو روپے کے عوض کئی لاکھ کی ڈگری ہوئی اور اس کی تمام جائیداد نیلام ہو گئی۔ کلکتہ ہائی کورٹ سے ایک مہاجن نے تین سو پچاس روپے کے قرضے کے عوض سوا سات لاکھ روپے کی ڈگری کرائی۔ الہ آباد ہائی کوٹ نے چار سو روپے کے قرضے پر ایک مہاجن کے حق میں تقریباً ستر ہزار روپے کی ڈگری جاری کی۔ یہی صورت حال مالا بار میں بھی تھی۔ یہاں بھی ہندو ساہو کاروں نے سود در سود کا چکر پھیلا کر مسلمانوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا۔ وہ اپنی ہی زمین پر مزدوروں کی طرح کام کرتے اور غلاموں کی طرح مہاجنوں اور ساہو کاروں کو خراج

دیتے۔ انگریزوں نے ان بنیوں، ساہو کاروں اور مہاجنوں کو ایک قانون بنا کر وحشیانہ لوٹ کھسوٹ کی عام اجازت دے دی تھی۔

یہی وہ اسباب تھے جن کی بنا پر قدرت کے تراشیدہ اس گوشۂ سکوں کو چند خونخوار درندوں نے اکثریت کے لیے جہنم بنا کر رکھ دیا تھا۔ جب ہم تروڑنگری پہنچے تو ہم نے اس قصبے کو نفرت اور کشیدگی کی گرفت میں پایا۔ ہم تحریکِ خلافت کے کارکن احمد علی کے مہمان تھے۔ احمد علی ہماری تنظیم کا بھی رکن تھا بلکہ بنیادی طور پر ہماری ہی تنظیم کا رکن تھا۔ اس نے ہمیں بتایا تھا کہ تروڑنگری میں حالات جان بوجھ کر بے حد خراب کر دیے گئے تھے۔ ہندو زمیندار اور انگریز انتظامیہ جان بوجھ کر حالات کو خراب کر کے ہندو مسلم تصادم کی راہ ہموار کر رہی تھی۔ ''مجھے امید نہیں، آپ کچھ کر سکیں گے۔ آپ بہت دیر میں یہاں پہنچے۔ کسی وقت بھی لاوا پھوٹ سکتا ہے، کسی وقت بھی آگ بھڑک سکتی ہے۔''

''یہاں کے مقامی رہنما، تحریکِ خلافت اور کانگریس کے مقامی رہنما کیا خاموش تماشائی بنے ہیں؟ کیا وہ آنے والے طوفان کی طرف سے آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں؟'' مہندر نے سوال کیا تھا۔

''بات یہ ہے کہ یہاں معاملات نے بالکل ہی مختلف رنگ اختیار کر لیا ہے بلکہ انہیں مختلف رنگ دے دیا گیا ہے۔ سارا معاملہ ایک ہندو ساہو کار اور اس کے چار مقروض کاشتکاروں کے درمیان تنازعے سے شروع ہوا۔ ایسے تنازعے عام ہیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی جھگڑا اس نوعیت کا اٹھتا ہی رہتا ہے۔ بدقسمتی یہ کہ وہ ہندو ساہو کار کانگریسی ہے اور چاروں مسلمان کاشتکار تحریکِ خلافت سے وابستہ ہیں اور اس کے سرگرم کارکن ہیں۔ جب یہ جھگڑا شروع ہوا تو تحریکِ خلاف کے مقامی رہنماؤں نے اس ساہو کار سے مل کر کہا کہ وہ فی الحال یہ جھگڑا نہ اٹھائے۔ پرنس آف ویلز دورے پر آنے والا ہے، اس کے بعد وہ جو چاہے کارروائی کرے تا کہ اس وقت تک کسی قسم کی بدمزگی نہ ہو۔ تحریکِ خلافت کے رہنماؤں نے یہ بات اپنے طور پر کی تھی۔ ان بے چارے کاشتکاروں نے تو اس سلسلے میں انہیں بیچ میں لانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی مگر......'' احمد علی خاموش ہو گیا۔

''مگر کیا؟'' میں نے سوال کیا۔

''مگر......'' اس نے مہندر کی طرف دیکھا، پھر بڑے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ ''معاف کیجیے مہندر صاحب! یہاں معاملے کو دوسرا رنگ دے دیا گیا۔ اس ساہو کار نے ان سے تو وعدہ کر لیا کہ وہ ایسا ہی کرے گا لیکن اگلے دن ان چاروں کو گرفتار کرا دیا۔

خلافت کے لیڈروں نے پھر اس سے ملاقات کی تو اس نے انہیں دھتکار دیا۔ پھر
دوسرے کانگریسی ہندو لیڈروں کے پاس گئے مگر وہ بھی سب کے سب ساہوکار تھے
اس معاملے میں کوئی تعاون کرنے کے لیے تیار نہیں۔ انہوں نے اسے ہندو مسلم
رنگ دے دیا۔ انہوں نے کہا کہ تحریکِ خلاف سے کانگریس کے تعاون کا مطلب
ہے کہ کانگریسی ہندو، مسلمانوں کے حق میں اپنے قانونی حقوق سے بھی دستبردار ہو
جائیں۔"

"یہ طبقاتی تحفظ کا معاملہ ہے میرے دوست!" مہندر نے کہا۔ "ہر
کاشتکاروں کی جگہ اگر ہندو کاشتکار ہوتے تو بھی ان ساہوکاروں کا یہی رویہ ہوتا۔ ساہوکار
کی نہ کوئی سیاسی جماعت ہوتی ہے، نہ کوئی دھرم، ساہوکار بس ساہوکار رہتا ہے۔
بنیادی طور پر صرف دو طبقوں میں بٹی ہوئی ہے، ظالم اور مظلوم کے طبقوں میں!"

"اور اب کیا صورتِ حال ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"اب بدقسمتی یہ ہے کہ وہ چاروں کاشتکار تو رہا ہو گئے۔ ان کی رہائی کے بعد
ہندو زمیندار کے ہاں ڈاکا پڑا۔ زمینداروں اور ساہوکاروں نے اس پر ہنگامہ کھڑا کر
انہوں نے یہ مؤقف اختیار کیا کہ یہ ڈاکا مسلمانوں نے جوابی اقدام کے طور پر مارا۔
اب ان دنوں یہ ہندو زمیندار اور مہاجن یہ افواہیں پھیلا رہے ہیں کہ مسلمان یہاں بڑے
پیمانے پر اسلحہ جمع کر رہے ہیں۔ میں بہرحال پوری دیانت سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ افواہیں
قطعی غلط ہیں البتہ یہ افواہیں پھیلا کر وہ خود اسلحہ جمع کر رہے ہیں۔"

اس کے بعد میں، مہندر اور لالی ایک وفد کی شکل میں کانگریس کے مقامی لیڈروں
سے ملے، انہیں وقت کی نزاکت کا احساس دلایا، قومی اتحاد کی اہمیت سمجھائی اور پھر ان سے
درخواست کی کہ وہ تروڑنگری میں بھائی چارہ قائم کرنے کی خاطر اس قصبے کو کشت و خون سے
بچانے کے لیے مسلمانوں سے راضی نامہ کر لیں۔ اس پر انہوں نے ہمیں جواب دیا کہ
مسلمان تیار ہو جائیں تو انہیں ایسا کرنے پر کوئی اعتراض نہیں۔

وہاں سے ہم خوش خوش تحریکِ خلافت کے رہنماؤں اور بعض موپلا سرداروں کے
پاس گئے جو ٹھنگل کہلاتے تھے۔ ان سب لوگوں کو احمد علی پہلے ہی تحریکِ خلافت کے
میں جمع کر چکا تھا اور بتا چکا تھا کہ ہم تینوں، ہندو لیڈروں کے پاس کس مقصد کے تحت گئے
ہیں۔ ہم نے ان سب کو جب ہندو ساہوکاروں اور کانگریسی لیڈروں سے اپنی بات چیت
سے آگاہ کیا تو انہوں نے بھی بہت مسرت کا اظہار کیا اور طے یہ ہوا کہ اسی دن بعد مغرب

دونوں طرف کے لیڈر مل بیٹھیں گے اور مکمل صلح، ہم آہنگی اور بھائی چارے کا اعلان کر دیں
گے۔ اس ملاقات کے لیے مقام کا تعین انہوں نے ہندو رہنماؤں کی مرضی پر چھوڑ دیا۔

ہم ان کی رضامندی لے کر جب ہندو لیڈروں کے پاس پہنچے تو وہاں ماحول ہی
بدلا ہوا تھا۔ جب ہم نے اپنی دانست میں انہیں خوشخبری سنائی تو انہوں نے بڑی رکھائی سے
کہا۔ "تم لوگ خلافتیوں کے ایجنٹ ہو اور ہمیں بے وقوف بنانے آئے ہو۔ بس سیدھے
یہاں سے چلے جاؤ۔ ہم جانتے ہیں تم موپلوں کے لیے ہتھیار لے کر آئے ہو۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے چاچا جی!" لالی نے اس معمر ساہوکار سے کہا جس نے ہندو
ساہوکاروں کی نمائندگی کرتے ہوئے ہم پر اسلحہ لانے کا الزام لگایا تھا۔ اس کا نام سیتا
مورتی تھا۔

"تم نہ بولو لالی!" میں نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "سیتا مورتی جی! آپ کو کسی
نے غلط بہکایا ہے۔"

"بس میں نے کہہ دیا چلے جاؤ۔ ہم سب جانتے ہیں۔ تم نے ہندوؤں کے خون سے
ہولی کھیلنے کا پروگرام بنایا ہے۔ ہم تمہاری چال سمجھ گئے ہیں۔" سیتا مورتی غصے سے جھاگ
اُگل رہا تھا۔

پھر میں نے اور مہندر نے انہیں بہت سمجھایا مگر انہیں نہ معلوم کس نے پٹی پڑھائی تھی
کہ وہ ہماری بات سننے کے روادار ہی نہ تھے۔ وہ سب یہی رٹ لگائے ہوئے تھے کہ ہم
مسلمانوں کے لیے ہتھیار لے کر آئے ہیں۔ جھلا کر مہندر ناتھ نے کہا تھا۔ "تم سب انگریز
کے پٹھو ہو۔ تم بلاوجہ افواہیں پھیلا کر یہاں انسانوں کے خون سے ہولی کھیلنے پر تلے ہوئے
ہو۔ تم لوگوں کے گھروں اور املاک کو نذرِ آتش کر کے الاؤ بھڑکانا چاہتے ہو۔"

اس پر وہاں موجود ساہوکاروں نے اور بھی سخت رویہ اختیار کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ہم
جو کچھ کر رہے ہیں، ہندو مسلم ایکتا کے لیے نہیں، ہندوؤں کو نقصان پہنچانے کے لیے کر
رہے ہیں۔ انہیں ڈر تھا کہ اگر وہ جھک گئے یا انہوں نے ذرا سا بھی کمزوری کا مظاہرہ کیا تو
ان کے کاشتکار شیر ہو جائیں گے اور انہوں نے جو رقمیں قرض دی ہیں، ڈوب جائیں گی۔
"ہم کانگریس کے لیے اپنے قانونی حقوق سے دستبردار نہیں ہوں گے۔" کرشنا مورتی نے
فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"یہ کون کہتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہماری تو آپ سے اتنی گزارش ہے کہ اس وقت،
صرف چند ماہ کے لیے، پرنس آف ویلز کے دورے تک اس ایکتا کو قائم رکھا جائے جو

برسوں بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں قائم ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اور پھر یہ مسلمان، افغانوں کی مدد سے اس ملک پر قبضہ کر لیں، کیوں؟'' سیتا مورتی نے کہا۔ اس کے بعد سیتا مورتی نے ریشمی رومال تحریک کا ذکر کیا۔ ''تم لوگ بڑے دغاباز ہو، بغل میں چھری رکھ کر منہ سے رام رام جپتے ہو۔''

ہم اس وقت ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ ہم مشرق اور مغرب کے فاصلوں پر تھے۔ تنگ آ کر مہندر نے کہا۔ ''سنو سیتا مورتی! میں ہندو ہوں۔ میں نے ایک ہندو گھرانے میں جنم لیا ہے۔ میرا خاندان برہمن ہے۔ یہ میری بہن ہے، لالی! میں اس کی جان کی سوگند کھاتا ہوں اگر یہاں، تروڑنگری میں ایک بھی انسان کا خون بہا، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان یا کوئی اور اگر تمہاری اور انگریز کی ملی بھگت سے انسانی لہو کی ایک بوند بھی زمین پر گری تو میں...... میں اپنے ہاتھوں سے تیری تکا بوٹی کر دوں گا۔ یاد رکھنا سیتا مورتی، ایک برہمن زادے نے اپنی بہن کی سوگند کھائی ہے۔''

مہندر کا لہجہ اس وقت بڑا خوفناک اور سرد تھا۔ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ سیتا مورتی کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ ''سنا تم نے، سنا تم نے!'' اس نے وہاں موجود اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہا۔ ''یاد رکھنا اس نے کیا کہا ہے۔ گواہ رہنا اس نے کیا کہا ہے۔''

''ابے ان سے کیا کہہ رہا ہے۔'' مہندر ناتھ واقعی بے حد برہم تھا۔ ''کہے تو لکھ کر دے دوں سیتا مورتی، ملیچھ، ذلیل!'' وہ غصے سے کانپ رہا تھا۔ ''اگر اس قصبے کی زمین پر انسانی خون کی ایک بوند بھی گری تو، تو زندہ نہیں رہے گا۔''

ہم سب نہایت شکستہ دل، افسردہ و ملول اور تھکے تھکے وہاں سے لوٹے۔ ہم پر شکست کا احساس غالب تھا۔ ہم نے خلافت کے لیڈروں اور موپلا سرداروں کو اپنی ناکامی سے آگاہ کیا اور احمد علی کے ساتھ اس کے گھر آ گئے۔

امید کی وہ کرن جو کانگریسی لیڈروں سے پہلی ملاقات میں پیدا ہو گئی تھی، قتل ہو چکی تھی۔ اس کا تازہ تازہ خون شفق بن کر آسمان پر پھیل گیا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ تاریکیاں پھیلتی اور بڑھتی جا رہی تھیں۔

مگر ہم اس شکست سے بد دل ہو جاتے تو پھر گویا ہم اپنے مقصد سے مخلص نہیں تھے۔ ہم نے اپنی تنظیم کی روح کو نہیں سمجھا تھا۔ ہم ناامیدی اور مایوسیوں کے ماحول ہی میں تو مصروف جدوجہد تھے۔ ہم نے جو راہ اختیار کی تھی، وہ انہی مایوسیوں، ناکامیوں، اور

ہے بھری پڑی تھی۔ ہم اس بات سے بھی واقف تھے کہ آخری فیصلہ کن جنگ میں ہم نہیں ہوں گے۔ ہم تو ان مجاہدین کے لیے ہراول کا کام کر رہے تھے جنہیں فتحیاب ہونا تھا، جنہیں اس دیس کے دشمنوں کو فیصلہ کن شکست دینا تھی، جنہیں اس ملک میں غیر ملکی حکومت کی میت کو دفن کرنا تھا۔ جنہیں فرنگی اقتدار کی ارتھی کو چتا پر رکھ کر پھونکنا تھا۔

اگلے دن ہم تروڑنگری کے گلی کوچوں میں گھوم رہے تھے، میں، مہندر، لالی اور جمشید! ہم نے ان لوگوں سے ملاقات کی جو سنجیدہ تھے اور نیک نام تھے۔ ہم نے جگہ جگہ تقریریں کیں۔ ان تقریروں کا لب لباب یہی تھا کہ تروڑنگری کے لوگ آپس میں بھائی چارہ قائم رکھیں۔ ہمارا پیغام، محبت کا پیغام تھا۔ اس نیک کام میں تروڑنگری کے چند نوجوان ہمارے ساتھ شامل ہو گئے ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ عام آدمی نے جو امن اور سکون چاہتا ہے، ہماری ان باتوں کو توجہ سے سنا، ان کی اہمیت کو جانا۔

ان تقریروں میں مہندر اور میں، دو مختلف انداز سے ایک ہی بات کر رہے تھے۔ مہندر بڑے اعتماد سے بار بار ایک ہی بات گھما پھرا کر مختلف انداز میں کہہ رہا تھا تاکہ لوگ اس کی بات کو ذہن نشیں کر لیں۔ ''دوستو! دوستو!'' وہ انہیں مخاطب کرتا۔ ''ذرا سوچیں غور کریں، اس وقت تروڑنگری میں ایسی فضا پیدا کر دی گئی ہے جس کی بنا پر ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو اپنا دشمن سمجھ رہے ہیں۔ افواہیں پھیلائی گئی ہیں کہ مسلمانوں نے ہتھیار جمع کر لیے ہیں۔ لڑنے کے لیے بڑے بڑے چھرے بنائے ہیں۔ ہم پر یہ الزام بھی لگایا گیا ہے کہ ہم مسلمانوں کے لیے ہتھیار لائے ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ دوستو، یاد رکھو تمہارا آپس میں کوئی جھگڑا نہیں یہ جھگڑا ساہوکاروں اور مہاجنوں کا، کاشتکاروں سے ہے۔ آج میں فضا میں انسانی خون اور جلے ہوئے مکانوں کی بو سونگھ رہا ہوں مگر میں دیکھ رہا ہوں کہ اس خون میں کسی ساہوکار کا خون شامل نہیں ہے۔ جلے ہوئے مکانوں میں کوئی مکان کسی مہاجن کا نہیں ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ ان ساہوکاروں اور مہاجنوں نے اپنے اور کاشتکاروں کے جھگڑے کو ہندو اور مسلمان جھگڑے میں تبدیل کر دیا ہے۔ انہوں نے آپ کو غلط بتایا ہے کہ آپ کے دھرم کو خطرہ ہے۔ یہ غلط ہے کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کو جب قتل کر رہے ہوں گے تو وہ اپنے دھرم کے لیے جنگ کر رہے ہوں گے۔ میں بتاتا ہوں۔ اس میں صرف کاشتکار، مزدور اور غریب کا خون بہے گا۔ قتل کرنے والا قتل ہونے والا دونوں ہی مظلوم ہوں گے اور ظالم اپنی حویلیوں میں بیٹھا قہقہے لگائے گا۔ کوئی ساہوکار، قتل نہیں ہوگا۔ یقین جانو، تمہارا آپس میں کوئی جھگڑا نہیں۔ تمہارا

جھگڑا تو اس درندے سے ہے جو نہ کانگریسی ہے، نہ خلافتی، نہ ہندو ہے نہ مسلمان۔ وہ ساہوکار اور مہاجن ہے، جو سود خور ہے، جو تمہارا خون چوستا ہے۔''

اور میں اپنی تقریر میں سیاسی حالات پر روشنی ڈال رہا تھا۔ میں انہیں بتا رہا تھا کہ ہم اتنی دور سے محض اس لیے آئے ہیں کہ ہمیں پتا چلا تھا کہ یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑانے کے لیے فضا تیار کی گئی ہے۔ میں نے بتایا کہ انگریز نے اپنے پٹھوؤں کے ساتھ مل کر پورے ہندوستان میں، ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنے کے لیے فرقہ وارانہ فسادات کو بھڑکانے کی سازش تیار کی ہے کیونکہ اسے ہندوستان کی ان دو بڑی قوموں کا اتحاد پسند نہیں۔ یہ اتحاد اس کے لیے خطرہ ہے۔ پھر وہ لوٹ مار نہیں کر سکے گا۔

دن بھر کی اس تگ و دو کے بعد ہم کچھ مطمئن تھے۔ لوگوں کی سمجھ میں ہماری باتیں آرہی تھیں، ان لوگوں کی سمجھ میں جو امن اور سکون چاہتے تھے۔ شام تک ترو ڑنگری کی گلی کوچوں سے ہندو مسلم ایکتا کے نعرے ابھر رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ٹولیاں بنا کر نعرے لگاتے ہوئے گھوم رہے تھے۔ ہم اس وقت خلافت کے دفتر میں بیٹھے تھے اور لوگ ہم سے آکر مل رہے تھے۔ نوجوان میں بڑا جوش و خروش تھا۔ اسی دوران میں ہمیں اطلاع ملی کہ ہندو ساہوکاروں میں سخت خوف و ہراس ہے انہوں نے اپنا ایک ہرکارہ کالی کٹ دوڑا دیا ہے۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ وہ فرقہ وارانہ کشیدگی جو ہم نے ترو ڑنگری میں گزشتہ روز محسوس کی تھی اس وقت محبت اور یگانگت سے بدل گئی تھی۔ اس کا احساس احمد نے دلایا۔ اس نے بتایا تھا کہ کوئی ایک ماہ بعد یہ پہلا موقع ہے کہ ہندو نوجوان بھی تحریک کے قریب آرہے ہیں۔

''بس دو تین دن ہمیں اور مل گئے تو ہم اس زہر کو جو یہاں گھول دیا گیا ہے ختم کر دیں گے۔'' میں نے کہا تھا۔

مگر ایسا نہ ہوا۔ انگریز اور اس کے پٹھو ہمیں اتنی مہلت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے کہ احمد علی نے ہمیں جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے بتایا۔ ''کالی کٹ سے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فوج اور پولیس کی جمعیت لے کر ترو ڑنگری آچکا ہے۔ ممتاز موپلا شہریوں کے مکانات کو گھیر لیا گیا ہے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اس وقت سیتا مورتی کے گھر ہے۔ بہتر ہے، تم سب یہاں سے چلے جاؤ۔''

''مگر کیوں؟'' میں نے دریافت کیا۔

''احتیاطاً۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ تم گرفتار کر لیے جاؤ۔ تمہاری حفاظت میری ذمے داری ہے۔''

''مگر اس وقت ہم کہاں جائیں گے؟''

''میں نے اس کا انتظام پہلے ہی کر رکھا ہے۔'' احمد علی نے کہا۔ پھر ہم چاروں احمد علی کے گھر سے ایک نوجوان کی رہبری میں نکلے۔ ابھی ہم ایک گلی میں داخل ہوئے ہی تھے کہ ہم نے بھاری قدموں کی آوازیں سنیں۔ میں نے پلٹ کر گلی کے نکڑ سے دیکھا۔ اندھیرے میں فوج اور پولیس کا ایک ایک دستہ احمد علی کے مکان پر پہنچ چکا تھا۔

ہم تیزی کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ پندرہ منٹ مختلف گلیوں اور کوچوں سے گزر کر ہم ایک مکان میں داخل ہو رہے تھے۔ اس مرتبہ ہم ڈھلّ کے مہمان تھے۔

صبح ہمیں اطلاع ملی کہ انگریز فوج اور پولیس نے کئی مسلمان گھروں کی تلاشی لی ہے۔ کئی افراد کو گرفتار کر لیا ہے۔ فوج اور پولیس ہتھیاروں کی تلاش میں تھی۔ جب مشتبہ افراد کے گھروں سے ہتھیار برآمد نہیں ہوئے تو خلافت کے دفتر کی تلاشی لی گئی۔ وہاں بھی ناکامی ہوئی تو فوج اور پولیس نے مسجد میں گھس کر تلاشی لی مگر انہیں کوئی ہتھیار نہیں ملا۔ ایک مسلمان کے گھر سے کاٹھ کباڑ سے ایک زنگ آلود چھرا برآمد ہوا۔ کئی مسلمانوں کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ گرفتار شدگان میں علی مالیار بھی شامل تھا۔ علی مالیار کو مسجد سے گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کی عمر ستر برس تھی۔ وہ ترو ڑنگری کے مسلمانوں ہی میں نہیں بلکہ ہندوؤں میں بھی بہت عزت کی نظروں سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ نہ صرف مذہبی رہنما تھا بلکہ مسلمانوں کا سیاسی رہنما بھی تھا اور موپلا سردار یعنی تھنگل بھی تھا۔ مسجد کی بے حرمتی اور علی مالیار کی گرفتاری کی خبر سے موپلوں میں اشتعال پھیل گیا تھا۔ ان کو مزید مشتعل کرنے کے لیے، ان کا مذاق اڑانے کے لیے ترو ڑنگری کے مہاجنوں نے اپنے کارکنوں سے کام لیا۔ فوج اور پولیس، مسلمانوں کی بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کر کے مطمئن تھی۔ انہوں نے ایک اسکول کو اپنا مستقر بنا لیا تھا اور انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ان کی حفاظت میں بیٹھا نئی چالیں چل رہا تھا۔ انہوں نے مہاجنوں کے ان کارندوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جو صبح ہی سے جتھوں کی صورت میں ترو ڑنگری کے گلی کوچوں میں دل آزار نعرے لگاتے پھر رہے تھے۔

یہ سب کچھ تھا مگر ہماری گزشتہ دن بھر کی کارروائیوں اور تقریروں کا ابھی تک ترو ڑنگری کے لوگوں پر اثر تھا۔ میں، احمد علی، مہندر، جمشید اور لالی پھر مصروف ہو گئے تھے۔ مہندر اور لالی امن پسند اور سنجیدہ و معقولیت پسند ہندوؤں سے ملتے پھر رہے تھے جبکہ میں

اور جمشید موپلوں سے مل رہے تھے، انہیں پُرامن رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ ہماری کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دن، مہاجنوں اور ساہوکاروں کے کارندوں کی تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود امن اور سکون سے گزر گیا۔

اگلے روز بھی ہماری یہ سرگرمیاں جاری تھیں کہ ہمیں اطلاع ملی کہ انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ہماری ان کوششوں کی اطلاع مل گئی ہے اور اس نے ہماری گرفتاری کے احکام جاری کر دیے ہیں۔ یہ احکام سیتا مورتی کی رپورٹ پر جاری کیے گئے ہیں جس میں نے مہندر کی جانب سے اسے جان سے مار دینے کی دھمکی کا ذکر کیا تھا۔

اس اطلاع کے بعد ہم ڈھل کے گھر سے اسکول کے ہیڈ ماسٹر کے گھر منتقل ہو گئے یہ کوارٹر، اسکول کے احاطے میں ہی ایک طرف بنا ہوا تھا۔ آمد و رفت کے لیے ایک دروازہ ایسا بھی تھا جو احاطے کے باہر کھلتا تھا اور گھر میں جانے کے لیے اسکول کے احاطے سے گزرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ احمد علی اور ڈھل نے ہماری منتقلی کے لیے دو تین متبادل جگہیں بتائی تھیں اور میں نے ان میں سے اسی کوارٹر کو پسند کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ہیڈ ماسٹر کا کوارٹر کیونکہ اسکول کے احاطے میں ہی ہے جس کو انگریز فوج اور پولیس نے اپنا مستقر رکھا ہے لہٰذا کسی کو بھول کر بھی یہ خیال نہیں گزرے گا کہ پولیس کو مطلوب افراد نے انہی کے قرب میں پناہ لی ہو گی۔ پھر ہیڈ ماسٹر سرکاری ملازم تھا اور اس سے یہ توقع عبث تھی کہ وہ حکومت کے مجرموں کو اپنے گھر پناہ دے گا۔ ویسے بھی وہ سرکاری حلقوں اور سرکار کے پٹھوؤں میں محترم سمجھا جاتا تھا۔

اس رات ہم نے دو بڑے بڑے پوسٹر اسکول کے احاطے کی دیوار اور بازار میں ایک نمایاں جگہ چسپاں کیے۔ یہ پوسٹر انجمن محبانِ وطن کی جانب سے تھے جن میں موپلوں اور ہندوؤں کو اس امر پر مبارکباد دی گئی تھی کہ انہوں نے مہاجنوں اور ساہوکاروں کے کارندوں کی تمام اشتعال انگیزیوں کے باوجود امن و سکون قائم رکھ کر انگریز کی سازش ناکام بنا دی اور ثابت کر دیا کہ ان کا اتحاد اٹوٹ ہے۔

ترووڑنگری میں ان پوسٹروں کی خوب شہرت ہوئی مگر اس پر جوابی کارروائی بھی خوب ہوئی۔ مہاجنوں اور ساہوکاروں کے کارندوں نے اس دن محمد علی جوہر اور شوکت علی کے پتلے جلائے، خلافت مردہ باد کے نعرے لگائے اور ہر وہ ترکیب کی جس سے مسلمان مشتعل ہو سکتے تھے۔ دوسری طرف احمد علی کو بھی گرفتار کر لیا گیا اور ترووڑنگری میں اعلان کر دیا گیا کہ آگرے سے آئے تین نوجوانوں اور ایک لڑکی کو پناہ دینے والے شخص کو گرفتار کر لیا جائے گا

اس کا تمام اثاثہ بحقِ سرکار ضبط کر لیا جائے گا۔

ہم اب اپنی کوششوں کو ایک قطعی اور فیصلہ کن رخ دینے کے لیے تیار تھے۔ ان تین دنوں میں ہم نے احمد علی اور اس کے ایک ساتھی کی مدد سے موپلوں کو انگریزوں کے خلاف ایک منظم کارروائی کے لیے استوار کر لیا تھا۔

اسی رات ہم اپنے منصوبے کو آخری شکل دے چکے تھے۔ رات بارہ بجے جبکہ شہری آرام کی نیند سو رہے تھے، فوج اور پولیس کے مستقر میں خاموشی چھا گئی۔ ہم چار افراد اپنی پناہ گاہ سے ہیڈ ماسٹر کی آشیرواد کے ساتھ نکلے۔ پانچ سرکاری عمارتوں اور دفاتر کو ایک ساتھ نذرِ آتش کر دیا گیا۔ تمام قصبے میں جاگ ہو گئی۔ ایک شور اور ہنگامہ مچ گیا۔ فوج اور پولیس کے دستے مختلف ٹکڑیوں میں ان مقامات پر پہنچ گئے جہاں یہ وارداتیں ہوئی تھیں۔ ایک وقت کئی جگہ آگ بھڑکنے کے سبب آگ بجھانے والے عملے کو خاصی دقت پیش آ رہی تھی۔

آتش زنی کے بعد ہم چاروں پھر واپس اپنی کمین گاہ پہنچے۔ اسکول کے احاطے میں اس وقت خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف چند سنتری اسکول کے گیٹ پر پہرا دے رہے تھے۔ ہم نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اسکول میں پوچھ گچھ کے لیے رکھے گئے پانچ قیدیوں کو رہا کرایا۔ ان قیدیوں میں احمد علی بھی شامل تھا۔ ان پانچوں کی حالت بے حد خستہ تھی۔ ان کے جسم گرم گرم لوہے سے داغے گئے تھے۔ احمد علی کی حالت سب سے زیادہ نازک تھی۔ اس کے سر کے بال جھلسے ہوئے تھے۔ سر اور ماتھے کی کھال جھلس کر سکڑ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں کبوتر کے خون کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔ ان پانچوں کو ہم نے فوراً ہی ایک بیل گاڑی سے کالی کٹ روانہ کر دیا۔

صبح بہت چمکیلی اور روشن تھی حالانکہ فضا میں اب بھی جلتی ہوئی عمارتوں کا دھواں موجود تھا۔ اس صبح ترووڑنگری کے لوگوں نے پھر قصبے میں دو مقامات پر انجمن محبانِ وطن کے پوسٹر پڑھے۔ پھر ان پوسٹروں کا مضمون جلد ہی ہر شخص کی زبان پر تھا حالانکہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے ان پوسٹروں کو دیواروں سے اکھاڑ لیا گیا۔ ان پوسٹروں کے ذریعے انجمن محبانِ وطن نے آتش زنی کی وارداتوں کی ذمے داری قبول کرتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کے دشمنوں کے خلاف اعلانِ جنگ میں کیا تھا۔

میں اس وقت پوسٹ آفس کی سلگتی ہوئی عمارت کے پاس مجمعے میں کھڑا تھا۔ میرے جسم پر اس وقت جو لباس تھا، اس سے میں ہندو معلوم ہوتا تھا۔ میری آنکھوں پر سیاہ چشمہ

تھا۔ فوج اور پولیس لوگوں کو سلگتی ہوئی عمارت کے ملبے سے دور رکھے ہوئے تھی۔ میں
گھڑی دیکھی)۔ اب پندرہ منٹ رہ گئے تھے۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا پیچھے ہٹ
اب صرف پانچ منٹ باقی تھے۔

ٹھیک پانچ منٹ بعد ایک سمت سے لوگ بڑھے۔ وہ سب تحریکِ خلافت اور
محمد علی جوہر کی حمایت میں نعرے لگا رہے تھے۔ نعروں کی آوازیں سن کر جلتے ہوئے
آفس کے سامنے جمع افراد چھٹنے لگے۔ پھر اسی طرح نعرے لگاتے ہوئے مجمعے سے کسی
چیخ کر کہا۔ ''حملہ ہوگیا، حملہ ہوگیا!''

حملہ کہاں ہوا تھا، کس نے کیا تھا، اس کے متعلق کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ پھر کیا تھا،
مچ گئی۔

پانچواں منٹ پورا ہو چکا تھا۔ ''وقت ہوگیا۔'' میں نے آواز لگائی۔ اس بھگدڑ
کسی کو یہ احساس بھی نہیں ہوا ہوگا کہ آواز لگانے والا میں تھا۔ ساتھ ہی میں نے ایک
سا پٹاخا سڑک پر پھینک دیا۔ وہ پٹاخا کسی کے جوتے تلے آکر پھٹا۔ اس کے ساتھ ہی غل
سے کئی غلے نکل کر پوسٹ آفس کے سامنے متعین فوجیوں اور پولیس والوں کے لگے۔
پے در پے تین چار باڑھیں ماری گئیں۔

اسی وقت دوسری سمت سے لوگ واپس بھاگتے ہوئے آئے۔ ''حملہ ہوا۔
آوازیں ابھریں۔

''کس طرف؟'' کسی نے پوچھا۔

''ادھر۔'' جواب آیا۔

''نہیں ادھر۔'' کسی اور طرف سے آواز ابھری۔

فوج اور پولیس نے اپنی رائفلیں اس طرف کردیں جدھر سے ان پر غلوں کی
پڑی تھی۔ لوگ پھر اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ نعروں میں شدت آگئی۔ ہجوم اس وقت
مسلم اتحاد کے نعرے لگاتا ڈاکخانے کی سلگتی ہوئی عمارت کے سامنے سے گزر رہا تھا۔
وقت دوسری سمت سے فوج اور پولیس پر غلوں کی باڑھ ماری گئی۔ ہوائی فائر کا حکم دیا
ایک افراتفری مچ گئی۔ مجمع منتشر ہوگیا لیکن تھوڑی دور جا کر لوگ ٹھہر گئے۔

کسی نے انہیں سمجھایا تھا کہ موقع پر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نہیں ہے اس لیے فوج
پولیس مجمعے پر فائرنگ نہیں کرسکتی پھر تھوڑی ہی دیر میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ فوج اور پولیس
بھاری جمعیت لے کر وہاں پہنچ گیا۔

لوگوں نے اسے دیکھ کر پھر پُر جوش انداز میں ہندو مسلم اتحاد کے نعرے لگائے۔
میں بھی اس مجمعے میں شامل تھا بلکہ اس مجمعے کی قیادت کر رہا تھا۔ میری ذمے
داری تھی کہ یہاں کم از کم ایک گھنٹے اور یہی ہنگامہ جاری رکھا جائے اور انتظامیہ کو یہ
دلایا جائے کہ اس وقت تروڑنگری کا یہ مقام عوام کے اشتعال کا مرکز بنا ہوا ہے۔
ابھی اس ہنگامے کو صرف نصف گھنٹہ گزرا تھا کہ تروڑنگری کے تین مختلف علاقوں سے
سیاہ دھویں کے مرغولے آسمان کی طرف ابھرتے نظر آئے۔ ''آگ، آگ!'' اس
طرح ہی شور اٹھا۔

گویا اب میرا کام ختم ہو چکا تھا۔ تین اور سرکاری دفاتر اور عمارتوں کو آگ لگا دی
پروگرام کے مطابق اب ہمیں وہاں سے منتشر ہو جانا تھا۔ مجمعے سے اس مرتبہ کئی پتھر
کئی پٹاخے چھوٹے، فوج اور پولیس نے جواب میں پھر ہوائی فائر کیے، اس کے بعد
وہاں سے تتر بتر ہونا ہی تھا۔

اس دن شام تک قصبے میں کئی جگہ چھاپے پڑے، کئی افراد گرفتار ہوئے مگر وہ لوگ
جنہوں نے لوگوں کو جلوس کی شکل میں منظم کیا تھا، پولیس اور فوج کی جانب سے پہلی ہوائی
فائرنگ کے بعد ہی تروڑنگری سے فرار ہو چکے تھے۔ اب ان تک پہنچنا پولیس کے لیے فی
الحال ممکن نہ تھا۔ ان لوگوں میں ڈھل بھی شامل تھا۔

تروڑنگری کی غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ یہ بیشتر کاشتکار اور کھیت مزدور تھے۔
غربت اور افلاس میں کفنائی ہوئی زندہ لاشیں تھیں۔ ہندو اگرچہ یہاں اقلیت میں تھے مگر
مسلمانوں سے زیادہ بہتر حالت میں تھے۔ وہ سرکاری ملازم تھے یا پھر زمیندار، مہاجن،
ساہوکار اور تاجر ہر شعبہ زندگی ان کے تابع تھا۔ اگر یہاں کے مسلمان اٹھ کھڑے ہوتے
ہندوؤں کے خلاف کارروائیوں کا آغاز کر دیتے تو ہندوؤں کا صفایا کرنے میں انہیں
دیر نہ لگتی مگر ہندوؤں کو انگریزوں کی حمایت اور تحفظ حاصل تھا۔ پھر تمام معیشت ہندوؤں
کے ہاتھ میں تھی اس لیے یہاں کے مسلمانوں نے اپنی غربت اور پسماندگی، اپنی بے بسی
اور بے کسی کا احساس کرتے ہوئے کبھی ان کے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کی جسارت نہیں
کی۔ وہ خوف اور دہشت میں زندہ رہتے تھے۔ انہوں نے بھوک اور فاقہ کشی سے سمجھوتہ کر
لیا تھا۔ وہ ہندوؤں کی مخالفت کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔

اسی روز ان ہمارے پروگرام کے مطابق موپلوں نے انگریزوں کے خلاف اپنی طاقت
کا مظاہرہ کیا تھا۔ انگریزوں سے ان کی یہ نفرت مذہبی بنیادوں پر تھی۔ وہ سب انگریز کے

دشمن تھے کیونکہ انگریز نے اس وقت کے سب سے بڑے اسلامی ادارے، یعنی
جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا۔

اس دن موپلوں کے اس مظاہرے کا سب سے خوش کن پہلو یہ تھا کہ تمام
جذبے کے باوجود میں نے اس مجمعے کو اپنے مقصد سے منحرف نہیں ہونے دیا تھا۔
اپنی تمام نفرت کا اظہار ہندو مسلم اتحاد کے دشمنوں کے خلاف کیا تھا اگرچہ گزشتہ دو
دوران میں ہندو ساہوکاروں اور مہاجنوں کے کارندوں نے کئی مرتبہ جتھوں کی صور
گشت کرتے ہوئے مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے تحریکِ خلافت اور اس کے
کے خلاف اشتعال انگیز نعرے لگائے تھے۔ اس دن ایک بھی نعرہ ہندوؤں کے خلا
لگایا گیا تھا۔ مجھے فخر تھا کہ اس دن میں نے اپنے منصوبے کے اس حصے کو نہایت کام
پورا کیا تھا۔ ہماری کامیابی کا تمام تر انحصار اسی بات پر تھا کہ جذبات کے ریلے کو
کی طرف نہ مڑنے دیا جائے۔

ساڑھے بارہ بجے تک میں، مہندر اور جمشید وقفے وقفے سے پھر
پاٹھک کے کوارٹر پہنچ چکے تھے اور لالی ہم سے ایک ایک تفصیل کرید کرید کر پوچھ
"تم اگر عملی سیاست میں ہوتے تو ایک کامیاب لیڈر رہتے۔" مہندر نے میری کا
پر تبصرہ کیا تھا۔

ہیڈ ماسٹر پاٹھک نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا تھا۔ وہ بھی ایک انقلابی
دل بھی آزادئ وطن کی خواہش میں الاؤ بنا ہوا تھا۔ اسی کی وجہ سے ہمیں اپنے منصو
جامہ پہنانے کے لیے چند ایسے سرفروش ملے تھے جو خود بھی پاٹھک کی طرح آز
خاطر جان سے گزرنے کے لیے تیار تھے۔ شام تک ہمیں اپنی اس کامیابی کے نتائج
گیا۔

پھڈکر کی رپورٹ ان نتائج کی آئینہ دار تھی۔ وہ ہیڈ ماسٹر پاٹھک کا ایک شا
تھا اور ان دنوں ریلوے میں ملازم تھا۔ "تمام تروڑنگری ہندو مسلم اتحاد کے نعروں
رہا ہے۔ ہندو اور مسلمان گلے مل رہے ہیں۔ ہر طرف اعتماد اور محبت کی گرمی فضا
ہوئی ہے۔ ایک دوسرے سے بے اعتمادی اور خوف کا غبار دھل چکا ہے۔ ساہوکا
مہاجنوں میں خوف اور دہشت پھیل گیا ہے۔ وہ فریادیں لے کر انگریز ڈسٹرکٹ
کے پاس گئے ہیں۔ انہیں اپنی جان کے لالے پڑ گئے ہیں۔ خود انگریز ڈسٹرکٹ
اور انگریز فوج اور پولیس کے ساتھ آنے والے انگریز افسران بوکھلا کر رہ گئے ہیں

نے تروڑنگری کی صورتِ حال کا جائزہ پیش کرتے ہوئے کہا۔ "مگر ایک اور تشویشناک
بات یہ ہے کہ سمبتند اڈالیار تروڑنگری پہنچ چکا ہے۔ حامد شمناز پہنچنے والا ہے۔"

میرے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ یہ دونوں حضرات لجسلیٹو کے رکن ہیں،
انگریز کے پٹھو ہیں۔ ان دونوں کا کام صرف یہی ہے کہ اس علاقے میں موپلوں اور
ہندوؤں میں مستقل کشیدگی قائم رکھی جائے۔ ان کی اس موقع پر یہاں آمد کا مطلب صرف
یہی ہوسکتا ہے کہ حالات کو خراب کر دیا جائے۔

ہیڈ ماسٹر پاٹھک نے بھی اس خیال سے اتفاق کیا۔ "بظاہر یہ دونوں حضرات بہت
بے ضرر معلوم ہوتے ہیں۔" اس نے ہمیں بتایا۔ "زبان کے بہت میٹھے ہیں لیکن ان کے من
میں زہر ہی زہر ہے۔ یہ دونوں صرف انگریز کے ذہن سے سوچتے ہیں۔"

"تو کیا ان کی آمد سے واقعی حالات پھر بگڑنے کا خطرہ ہے؟" مہندر نے پوچھا۔

"ان کے کاٹے کا کوئی علاج نہیں۔" پاٹھک نے بتایا۔ "یہ انگریز کے شکرے ہیں
جنہیں وہ ہندوستانیوں کے شکار کی خاطر استعمال کرتا ہے۔ یہ اپنے شکار پر جھپٹتے ہیں۔ پہلے
اس کی آنکھیں پھوڑ دیتے ہیں، پھر انگریز بڑھ کر مجروح کو شکار کر لیتا ہے۔"

تو کیا ان دونوں کی آمد سے ہماری تمام کوششیں خاک میں مل جائیں گی؟ کیا خلوص
و محبت کی وہ لہر دم توڑ جائے گی جس میں اس وقت تروڑنگری غسل کر رہا تھا اور اپنے وجود
سے نفرتوں اور کدورتوں کا غبار دھو رہا تھا؟ کیا ہمیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا؟ یہ اور ایسے
ہی بے شمار تشویشناک سوالات میرے ذہن میں کچوکے لگا رہے تھے۔

"یہ لوگ کس مقصد کے لیے آئے ہیں؟ ہمیں اس کا علم ہونا چاہیے۔" مہندر نے
کہا۔

"مڈالیار کہاں ٹھہرا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"سیتا مورتی کے ہاں۔ وہ دونوں بڑے گہرے دوست ہیں۔" پھڈکر نے جواب
دیا۔ "اور حامد شمناد یہاں اکثر آتا رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ ڈاک بنگلے میں ٹھہرتا ہے۔ یہاں آ کر
یہ لوگ مقامی باشندوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ مڈالیار کسی مسلمان سے ملاقات نہیں
کرتا۔ شمناد کسی ہندو سے ملن کا روادار نہیں۔ ایک ہندوؤں کا بہی خواہ بنتا ہے دوسرا
مسلمانوں کا ہمدرد۔"

اس کے بعد ہم نے انجمن محبانِ وطن کی جانب سے دو خط لکھے اور ان کی دو دو نقلیں
تیار کیں۔ ایک خط حامد شمناد اور اسی عبارت کا دوسرا خط مڈالیار کے نام تھا جس میں ان سے

کہا گیا تھا کہ وہ ترونگری کی فضا کو زہر آلود نہ کریں، یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مل جل کر بھائیوں کی طرح رہنے دیں۔ مادرِ وطن کی کوکھ نہ اجاڑیں، اپنے نطفے کو کسی انگریز کی اولاد میں تلاش نہ کریں۔ ان کا باپ کوئی انگریز نہیں ہندوستانی تھا۔ ان کی ماں کوئی میم نہیں ہندوستانی تھی۔ ان کے نام یہ خط ہم نے بہت سخت الفاظ میں لکھا تھا۔ دوسرا خط ترونگری کے مسلمانوں اور ہندوؤں کے نام تھا جس میں انہیں اس بات پر مبارکباد دی گئی تھی کہ انگریزوں کے پٹھوؤں کی تمام تر کوششوں کے باوجود انہوں نے بھائی چارہ برقرار رکھا تھا۔ انہیں خبردار کیا گیا تھا کہ وہ انگریز اور اس کے کاسہ لیسوں سے ہوشیار رہیں۔ وہ مسلمانوں اور ہندوؤں سے لڑانے کے لیے انتہائی پستیوں میں اتر سکتے ہیں، انتہائی شرمناک اقدام کر سکتے ہیں۔ انہیں چاہیے کہ وہ انگریز اور اس کے کتوں کی ہر سازش کو ناکام بنا دیں۔ ان خطوط کو ان کی منزل تک پہنچانے کی ذمے داری پھڈکر کو سونپی گئی۔

''تت تم کون ہو؟'' حامد شمناد میرے سامنے مسہری پر بیٹھا تھا۔ میرے ہاتھ میں پستول تھا اور حامد شمناد پر خوف طاری تھا۔

ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ ہم نے دو دن میں اپنی کوششوں سے جو نتائج حاصل کیے ہیں انہیں ضائع نہیں ہونے دیں گے۔

☆======☆======☆

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا۔ بس غصے سے اس کو گھورتا رہا۔

پھڈکر کی روانگی کے بعد ہم نے جو پروگرام بنایا تھا، اس کے مطابق مہندر کو اس وقت سیتا مورتی کے ہاں مڈالیار کے سامنے یہی کردار ادا کرنا تھا جو میں ادا کر رہا تھا۔ میں رات کا اندھیرا پھیلتے ہی، جمشید کے ساتھ ڈاک بنگلے آیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر پاٹھک نے ہمیں اس ڈاک بنگلے کا محلِ وقوع اور ڈاک بنگلے کا نقشہ سمجھا دیا تھا۔ یہ ڈاک بنگلا آبادی سے قدرے ہٹ کر اسٹیشن سے تھوڑے فاصلے پر ایک باغ میں بنا ہوا تھا۔ ہم جس وقت یہاں پہنچے تو حامد شمناد آچکا تھا۔ ڈاک بنگلے میں خوب رونق تھی۔ میں موقع پا کر لوگوں کی نظروں سے بچتا بچاتا ڈاک بنگلے کے اس کمرے میں پہنچ گیا تھا جو حامد شمناد کے لیے خواب گاہ کے طور پر تیار کیا گیا تھا۔ اس وقت حامد شمناد ڈرائنگ روم میں بیٹھا لوگوں سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے اس کی مسہری کے نیچے چھپ جانے میں کوئی دقت نہیں ہوئی تھی۔ جمشید کو میں نے باہر ہی چھوڑ دیا تھا۔ ڈاک بنگلے کے آس پاس بھی کئی گھنے درخت تھے۔ جمشید کو انہی میں سے کسی درخت پر ہونا چاہئے تھا۔ اگر وہ کوئی خطرہ دیکھتا یا مجھے کسی مدد کی ضرورت ہوتی تو ہم ایک دوسرے کو

...پرندوں اور جانوروں کی آواز نکال کر خبردار کرتے۔ ان مخصوص آوازوں کی مشق ہم ...کرتے رہتے تھے اور جمشید کے تنظیم میں شامل ہونے کے بعد میں نے اسے اور مہندر ...کو اس کی مشق کرا دی تھی۔

...مسہری کے نیچے چھپے ہوئے مجھے کئی باتوں کا علم ہو چکا تھا۔ میرے اندازے کے ...حامد شمناد کی آمد کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ موپلوں میں موجود اپنے ممنون احسان یا ...لوگوں کے توسط سے یہ پتا چلانے کی کوشش کرے کہ یو پی سے آنے والے چار ...کی پارٹی جن میں ایک لڑکی بھی شامل ہے، ترونگری میں کہاں ٹھہری ہوئی ہے۔ ...نے پناہ دی ہے اور کس نے انہیں یہاں بلایا ہے۔ اس نے اپنے اعتماد کے لوگوں ...یقین دلایا تھا کہ جو کوئی ان چاروں کا پتا چلائے گا۔ وہ اسے دو ہزار روپے انعام دلوائے ...پھر انہی ملاقاتوں کے دوران میں اسے انجمن محبانِ وطن کی جانب سے وہ خط بھی ملا تھا ...ہم نے پھڈکر کو دیا تھا۔ اس خط پر بھی اس نے اپنے ان لوگوں سے بات چیت کی تھی۔ ...شمناد نے ان لوگوں کو بتایا تھا کہ آنے والے چاروں اجنبی ایک ایسی ہندو تنظیم سے تعلق ...رکھتے ہیں جس کا مقصد ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کو شدھی کرنا ہے۔ یہ تنظیم تحریکِ ...خلافت کی سخت دشمن ہے اور اس نے اپنے چار خطرناک آدمیوں کو یہاں اس لیے بھیجا ہے ...کہ یہاں کے مسلمانوں کو جو تحریکِ خلافت میں پیش پیش ہیں، نقصان پہنچائیں۔ اس کی یہ ...باتیں سن کر میں دل ہی دل میں کھول کر رہ گیا۔

اس کے بعد وہ اپنے ان معتمد لوگوں سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا لیکن درمیان ...میں وہ ان لوگوں کو یہ تاکید بھی کرتا رہا کہ وہ یو پی سے آنے والے چار اجنبیوں کے بارے ...میں پتا چلائیں کہ وہ کہاں چھپے ہوئے ہیں۔

پھر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ بھی حامد شمناد سے ملنے آیا۔ حامد شمناد اسے لے کر اپنی خواب ...گاہ میں آ گیا اور دروازہ بند کر کے اس سے رازداری میں باتیں کرنے لگا۔ اس گفتگو کا لب ...لباب یہ تھا کہ ''وہ'' کام رات کو ہو جائے گا۔ اسے چاہیے کہ صبح وہ اپنے لوگوں سے ...شہر کے دوسرے حصے پر شدت کے ساتھ عمل کرائے۔ اس کام کے لیے اس نے حامد ...کو کچھ رقم بھی دی تا کہ ایجنٹوں کو ان کے کام کا معاوضہ دیا جا سکے۔ پھر ڈسٹرکٹ ...مجسٹریٹ نے اس سے معلوم کیا کہ چار اجنبیوں سے متعلق کوئی رپورٹ ملی یا نہیں۔ حامد ...نے اس کا جواب نفی میں دیا مگر ساتھ ہی انجمن محبانِ وطن کی جانب سے ملنے والا وہ ...خط ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حوالے کر دیا جو اسے ملا تھا۔ پھر اس خط پر ان دونوں میں تبادلۂ

خیال ہوا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بتایا کہ انجمنِ محبانِ وطن کے بارے میں یوپی کی طرف سے ایک اطلاع آئی تھی۔ وہاں ایک موقع پر اس تنظیم کا نام سننے میں آیا۔ مرکزی حکومت نے تمام صوبائی حکومتوں کو ہدایت کی ہے کہ اگر اس انجمن کی سرگرمیوں کے بارے میں کہیں کوئی اطلاع ملے تو مرکز کو فوراً اس سے آگاہ کیا جائے۔ شاید وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ انجمن کہاں کہاں مصروفِ عمل ہے۔ اس کے بعد ان دونوں میں کچھ اور رسمی باتیں ہوئیں، پھر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور حامد شمناد وہاں سے چلے گئے۔

اس کے بعد میں کچھ نہ سن سکا۔ حامد شمناد اب باہر لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی مانند اس کمرے میں پہنچ رہی تھیں جس میں مسہری کے نیچے چھپا ہوا تھا۔ سخت گرمی کی وجہ سے اور پسینے کے مارے میرا بُرا حال تھا۔ میرا اور جمشید کا اندازہ تھا کہ ہمیں اپنا اصل کام کرنے کا موقع شاید رات کو بارہ بجے ملے گا۔ اس وقت تک ہمیں اپنی اپنی جگہ دم سادھے بیٹھا رہنا ہوگا۔

میں سوچ رہا تھا کہ آخر ڈسرکٹ مجسٹریٹ نے جس کام کی طرف اشارہ کیا تھا اس کی نوعیت کیا ہوگی۔ اس کام کا دوسرا حصہ کیا ہوسکتا ہے جس کو انجام دینے کے لیے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے شمناد کو کچھ رقم دی تھی۔ اس کی نوعیت مجھے کچھ ایسی ہی معلوم ہوتی تھی جس کے لیے بمبئی میں منگو کے گروہ کے ذریعے مجھے اغوا کرایا گیا تھا۔ میرا دل گواہی دے رہا تھا کہ جو کچھ بھی انگریز مجسٹریٹ نے کہا تھا، اس کا تعلق کسی انتہائی گھناؤنے کاروبار سے تھا۔ جو کچھ ہونے والا تھا، اسی رات ہونے والا تھا۔ اس کا توڑ کرنے کے لیے ہمارے پاس وہی رات تھی مگر توڑ کے لیے ضروری تھا کہ ہمیں معلوم ہوتا کہ کیا ہونے والا تھا۔ اس کے لیے میرے پاس صرف ایک ہی ذریعہ تھا اور وہ تھا حامد شمناد۔

پھر میرے ذہن میں مہندر کا خیال آیا۔ اسے اس وقت سیتا مورتی کے ہاں ہونا چاہیے تھا اور کسی طرح مڈالیار تک پہنچ کر یہ معلوم کرنا تھا کہ وہ اس وقت تروڑنگری کیوں آیا تھا۔ پاٹھک اور پھڈکر کا کہنا تھا کہ لجسلیٹو کے ان دونوں اراکین کا وہاں پہنچنا خالی از علت نہیں تھا۔ تو کیا مہندر کو بھی اب تک اس سازش کا کچھ علم ہوگیا ہوگا؟ میں سوچتا رہا۔

گھنٹے نے بارہ بجائے، پھر لمحے کٹ کٹ کرتے گزرتے رہے۔ ساڑھے بارہ بجے حامد شمناد خدا خدا کر کے واپس آیا۔ فضا میں اُلو کی ایک چیخ گونجی۔ یہ اشارہ تھا، مہندر کا۔ آواز کافی دور سے آئی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ مہندر وہاں پہنچ چکا تھا۔ جواب میں بلی کی میاؤں کی صدا گونجی تھی۔ یہ قریب کی آواز تھی اور یقیناً جمشید نے مہندر کو مطلع کیا تھا کہ وہ

کے پاس پہنچ رہا تھا۔

مہندر یقیناً اپنا کام ختم کر کے واپس آ گیا تھا۔ میں اپنی جگہ چوکنا ہوگیا۔ حامد شمناد لباس تبدیل کر کے مسہری پر لیٹ چکا تھا۔ میں انتہائی آہستگی اور احتیاط کے ساتھ رینگ کر مسہری کے نیچے سے نکلا اور ایک دم کھڑے ہو کر حامد شمناد سے کہا۔ ”آواز نکالی تو گولی مار دوں گا، خاموشی سے اٹھ کر بیٹھ جاؤ!“

”تت..... تم کون ہو؟“ حامد شمناد نے ہکلاتے ہوئے کہا، ساتھ ہی وہ مسہری پر اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔

میں اسے نفرت اور غصے سے گھورتا رہا۔

”تت..... تم کون ہو؟“ حامد شمناد نے پھر کہا۔

”انجمن محبانِ وطن۔“ میں نے جواب دیا۔ ”تم ہماری ہی تلاش میں تھے۔“

”مم..... مگر تم یہاں کیسے......“ اس نے پھر ہکلا کر کہا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورتِ حال سے کیسے نمٹے۔

”اپنی مرضی سے!“ میں نے جواب دیا۔ ”تمہیں ہماری تلاش کیوں ہے؟“ میں نے اس سے براہِ راست سوال کیا۔

”حکومت..... حکومت کا حکم ہے۔“ حامد شمناد نے کہا۔

”تو تم حکومت کے وفادار ہو، انگریز کے غلام! تم اس ملک کے دشمن ہو، کیوں؟“ میں نے اس بار اپنا لہجہ سخت کرلیا۔

”تم غلط سمجھ رہے ہو۔“ حامد شمناد نے کہا۔ ”ایسا نہیں ہے۔“

”جھوٹ مت بولو۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے ٹھیک ٹھیک جواب چاہئیں۔ مجھے بہت کچھ معلوم ہے، سمجھے! اگر تم نے غلط جواب دیا تو میں تمہیں گولی مارنے سے دریغ نہیں کروں گا۔ تمہیں جہنم میں پہنچاتے ہوئے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“ میں نے پستول کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ”میں اب تم سے چند سوال کروں گا، اس کے بعد تین تک گنوں گا، تم نے اس سے قبل جواب نہیں دیا تو گولی مار دوں گا۔ تم نے غلط جواب دیا تو بھی گولی مار دوں گا، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تمہارے پاس آیا تھا؟“

”آیا تھا۔“ اس نے فوراً جواب دیا۔

”کام کے بارے میں کیا رپورٹ دی تھی؟“ میں نے کہا۔ اس نے کیونکہ فوراً ہی جواب نہیں دیا تھا میں نے گننا شروع کیا۔ ”ایک......“

"آج رات ہو جائے گا۔"

"فرقہ ورانہ فساد کیسے شروع ہوں گے؟" میں نے اندھیرے میں تیر پھینکا۔ "......دو......"

"جی، فسادات......" اس کے حلق میں جیسے بلغم اٹک گیا۔

"ایک......دو......" میں نے گنتی شروع کر دی۔

"ہندوؤں پر حملے سے۔" حامد شمناد نے جواب دیا۔

"اس کام کے لیے تم نے کن لوگوں کو خریدا ہے؟" میں نے کہا۔ "جواب صحیح

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں نے کسی کو نہیں خریدا۔" حامد شمناد نے گھگیا کر کہا۔

"تمہارا لہجہ بتا رہا ہے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے تمہیں کس تقریب میں دی ہے؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں نے تمہیں پہلے ہی بتا کہ ہمیں انگریزوں اور تم جیسے ان کے پٹھوؤں کی سازش کے بارے میں سب کچھ علم ہے۔ مجھے حکم ہے تمہیں قتل کر دیا جائے لیکن مجھے یہ بھی اختیار ہے کہ اگر تم نے ہم سے تعاون ہمیں ٹھیک ٹھیک جوابات دیے تو تمہاری جان بخش دوں۔ بتاؤ تم نے کس کو اس کام پر کیا ہے؟ ظاہر ہے ہندو مسلم فسادات کے لیے تم نے اپنے جیسے کچھ ضمیر فروشوں کو خرید گا۔" اس کے ساتھ ہی میں نے گنتی شروع کر دی۔ "ایک......دو......"

"علی کافور کو۔"

اسی وقت باہر سے کتے کے پلے کے ٹیاؤں ٹیاؤں کرنے کی آواز ابھری۔ یہ اشارہ تھا خطرہ قریب آ جانے کا۔ مطلب یہ تھا کہ کتے یعنی پولیس یا فوج سر پر آ پہنچی میں اس اشارے کو سن کر چونک پڑا۔ میں نے فوراً حامد شمناد سے کہا۔ "اب تم اس کو میں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ دائیں بائیں دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے آواز نکالنے کی ضرورت ہے۔"

حامد شمناد اٹھ کر کونے میں دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

"تم پانچ منٹ تک یہاں اسی طرح خاموشی سے کھڑے رہو گے، خواہ کچھ ہو نہیں نکالو گے۔ اگر تم نے اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی یا شور مچایا تو اوپر روشندان میں ساتھی بیٹھا ہے اس کے پستول کی گولی تمہیں جہنم میں پہنچا دے گی۔" میں نے کہا اور اس کمرے سے نکل آیا اور دوسرے کمرے میں داخل ہو کر باغ میں کھلنے والے دروازے کے پاس آ گیا۔

دوسری طرف کئی افراد کے قدموں کی آوازیں ابھر رہی تھیں۔ میں دروازہ آہستگی سے کھول کر باہر آ گیا اور تیزی سے لپک کر سامنے درختوں کے جھنڈ میں پہنچ گیا جہاں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ ابھی میں وہاں پہنچا ہی تھا کہ ایک درخت کی آڑ سے آواز آئی۔

"اِدھر آ جائیے۔" یہ آواز جمشید کی تھی۔

"مہندر کہاں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"چلئے، یہاں سے جلدی چلئے۔" جمشید نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

درختوں اور پودوں سے گزرتے ہوئے ہم ڈاک بنگلے کے احاطے کی دیوار تک پہنچ گئے اور درخت پر چڑھنے کے بعد ایک شاخ سے اچھل کر دیوار کے پار زمین پر چھلانگ لگا دی۔ اسی وقت ہم نے ڈاک بنگلے میں شور اور چیخ پکار کی آوازیں سنی۔

"مہندر کہاں ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"پتا نہیں۔ ہیڈ ماسٹر پاٹھک کے ہاں پولیس نے چھاپا مارا ہے۔ پاٹھک کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔"

"تو لالی؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"لالی محفوظ ہے۔" جمشید نے جواب دیا۔ "پھڈکر نے بتایا ہے وہ سیتا مورتی کی کوٹھی کے باہر ایک درخت پر بیٹھا تھا۔ مہندر کوٹھی میں تھا۔ کوئی ایک گھنٹہ پہلے وہاں پولیس کا دستہ پہنچا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ہیڈ ماسٹر پاٹھک کو پولیس کی حراست میں وہاں سے جاتے دیکھا۔ پھڈکر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ وہاں سے اتر کر سیدھا دوڑتا ہوا ہیڈ ماسٹر کے کوارٹر پہنچا اور لالی کو وہاں سے اپنے گھر منتقل کر دیا۔ اس کا مکان ریلوے اسٹیشن کے پاس ہی ہے۔ پھڈکر، لالی کو وہاں چھوڑ کر پھر سیتا مورتی کی کوٹھی پر گیا ہے۔ وہ لالی کو اپنے گھر چھوڑ کر ہمیں اطلاع دینے کے لیے یہاں آیا تھا۔ لالی نے ہی اسے اُلو کی آواز کا اشارہ بتایا تھا۔"

یہ رپورٹ بہت پریشان کن تھی۔ "تو اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔ میری کچھ بھی تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب ہمارا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔

"ہم پھڈکر کے گھر ہی چل رہے ہیں۔" جمشید نے کہا۔ "اس نے مجھے پتا سمجھا دیا ہے، بالکل آسان ہے۔"

"تم، تم سیدھے سیتا مورتی کی کوٹھی جاؤ۔ وہاں معاملات کو دیکھو۔" میں نے کہا۔ "میں پھڈکر کے مکان پر جاتا ہوں اور لالی سے ملتا ہوں، وہاں حالات دیکھ کر فوراً پہنچتا

ہوں۔ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ لگے گا مجھے۔ اچھا خدا حافظ!''

ہم دونوں علیحدہ ہو گئے تھے۔ میرے ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ خطرناک اندیشے میرے ذہن میں سر ابھار چکے تھے اور سب سے بدترین اندیشہ یہ تھا کہ ہم پھڈکر پر اعتماد کر کے کہیں غلطی تو نہیں کی۔ اس معاملے میں جو بات اس کی مخالفت میں وہی اس کے حق میں بھی تھی۔ اگر وہ ہمارا مخالف تھا تو پھر اس نے عین اس وقت کیوں خبر کیا تھا جب پولیس وہاں پہنچ چکی تھی۔ یہ بات اس کے حق میں تھی کہ وہ ہمارا مخالف نہیں لیکن یہ بھی تو ہو سکتا تھا وہ وہاں محض اس لیے آیا ہو کہ یہ دیکھ سکے، آیا ہم پھنس چکے ہیں نہیں۔

بہر حال میں چوکنا تھا۔ میں ریلوے لائن کے ساتھ الگ تھلگ بنے ہوئے اس کوارٹر کے پاس پہنچ چکا تھا جہاں پھڈکر کی اطلاع کے مطابق اس وقت لالی کو موجود ہونا تھا۔ میں سبز گھاس سے بھرے ہوئے میدان پر سینے کے بل کھسکتا ہوا اس مکان کا چکر لگا تھا۔ تمام ماحول پُرسکون تھا۔ پھر میں نے دیوار کے قریب پہنچ کر آہستہ سے کوئل کی آواز نکالی۔ چند لمحوں بعد مجھے اس اشارے کا جواب کوئل کی آواز میں مل گیا۔ لالی اندر تھی۔ کوئی خطرہ نہیں تھا۔ پھڈکر کے بارے میں میرے اندیشے غلط تھے۔ میں چوکنا انداز میں چلتا ہوا دروازے کے پاس پہنچا اور آہستہ سے دستک دی۔ ''لالی!'' میں نے سرگوشی میں کہا۔

دروازہ کھل گیا۔ لالی اندر موجود تھی۔ ایک کمرے کے اس کوارٹر میں اندر لالٹین بڑے اداس انداز میں پیلی پیلی زرد روشنی بکھر رہی تھی۔ ''شیرازی جی!'' وہ میرے سینے سے لگ گئی۔ اس وقت وہ بُری طرح کپکپا رہی تھی۔ ''بھیا کہاں ہیں؟''

''لالی، میری لالی! حوصلے سے کام لو۔'' میں نے کہا۔ ''تم ایک وطن پرست لڑکی ہو۔''

لالی سے مجھے اس سے زیادہ معلوم نہ ہو سکا تھا جتنا کچھ جمشید نے بتایا تھا لیکن اتنا اندازہ بہر حال ہو گیا کہ پھڈکر ایک وفادار اور مخلص وطن پرست تھا۔ پھر بھی اس وقت ذرا سا بھی خطرہ مول لینے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ مجھے فوری طور پر سیتا مورتی کی کوٹھی پر پہنچنا تھا، وہاں جا کر حالات معلوم کرنے تھے اور مہندر کا پتا چلانا تھا۔ اس وقت مجھے خود پر بہت غصہ آیا۔ میں جلدی میں یہ بھی تو بھول گیا تھا کہ جمشید سے یہی کہہ دیتا، وہ پھڈکر سے فوراً رابطہ قائم کرے۔ میں اسے یہ معلوم کرنے کے لیے روانہ کر سکتا تھا کہ ہیڈ ماسٹر پاٹھک کے بارے میں پولیس کو کس نے اطلاع دی تھی۔ اس انداز پر سوچتے ہوئے ایک مرتبہ پھر

مجھے کا احساس ہوا۔ پاٹھک کے بارے میں جس نے بھی اطلاع دی ہوگی، اسے پھڈکر کے بارے میں بھی معلوم ہوگا۔

''لالی! جلدی کرو، یہاں سے فوراً نکل چلو۔'' میں نے بے تابی سے کہا۔ اب میں اس پنجرے میں ایک پل کے لیے بھی نہیں رہنا چاہتا تھا۔

ہم وہاں سے نکل آئے مگر سوال یہ تھا کہ آخر یہ رات ہم کہاں گزاریں گے؟ لالی کو کہاں چھوڑا جائے؟ جمشید اور پھڈکر کے پاس پہنچنا بھی ضروری تھا۔ پھر رات کے وقت میں میرا اور لالی کا سڑکوں پر نکلنا بھی ہمیں مشتبہ بنا سکتا تھا۔ پھر میں نے ایک فیصلہ کیا۔

میں لالی کو ساتھ لے کر پھر ڈاک بنگلے پہنچا جو آبادی سے الگ تھلگ واقع تھا۔ ڈاک بنگلہ چاروں طرف سے باغ میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے آس پاس کوئی عمارت بھی نہیں تھی۔ اندھیرے کا سہارا لے کر تیز تیز قدموں ڈاک بنگلے کے احاطے کی عقبی دیوار سے قریب پہنچے تھے مجھے یقین تھا کہ پولیس اب تک پورے باغ کو چھان چکی ہوگی اور میری تلاش سے مایوس ہو چکی ہوگی۔ یہ بہر حال ایک قیاس ہی تھا۔ میں راستے ہی میں لالی کو بتا چکا تھا میں نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ اس مرتبہ پھر میں نے اسی درخت کو دیوار پھلانگنے کا ذریعہ بنایا جس کے ذریعے ہم پہلے وہاں سے فرار ہوئے تھے۔ دیوار پر جھکے ہوئے گدے میں رسی باندھ کر اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گرہیں لگانے کے بعد میں نے پہلے لالی کو درخت پر چڑھایا، پھر خود چڑھا اور رسی کھول کر لالی کے ساتھ احاطے کے اندر کود گیا۔

ڈاک بنگلا تاریک پڑا تھا۔ شاید حامد شمشاد کو وہاں سے منتقل کر دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے واقعے کے بعد اس کا وہاں رکنا بعید از فہم ہی تھا۔ میں دل ہی دل میں ان لوگوں کی کم عقلی پر مسکرایا لیکن اس وقت یہی کم ہمتی ہمارے لیے پناہ کا سبب بننے والی تھی۔ ڈاک بنگلے کے ملازمین کے کوارٹر، اصل عمارت سے تھوڑے فاصلے پر احاطے کی اس دیوار کے ساتھ بنے ہوئے تھے جو اس وقت بنگلے کی عمارت کی دوسری طرف تھی۔ درختوں کے ایک جھنڈ میں لالی کو چھوڑ کر میں نے دونوں پہلوؤں سے اس سمت کا جائزہ لیا جہاں ملازمین کے کوارٹر تھے۔ وہاں اب بھی دو افراد کھڑے ہوئے ان واقعات پر گفتگو کر رہے تھے جو کوئی گھنٹہ بھر پہلے وہاں پیش آئے تھے۔ ان کی باتوں سے میرے اس خیال کی بھی تصدیق ہو گئی کہ حامد شمشاد وہاں سے جا چکا ہے اور ڈاک بنگلا بالکل خالی ہے۔ پھر وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے اپنے کوارٹروں میں چلے گئے۔

میں واپس جا کر لالی کو اپنے ساتھ لے آیا۔ ایک بڑا سا گملا برآمدے کے ساتھ
ہوا تھا۔ میں نے لالی کو کاندھوں پر سوار کیا اور اس گملے پر چڑھ گیا۔ میں نے
برآمدے کی چھت پر چڑھا دیا جہاں سے وہ کمروں کی چھتوں پر آسانی سے پہنچ سکتی تھی۔
''اچھا لالی!'' میں نے آہستگی سے کہا۔ ''میں رات ختم ہونے سے پہلے
یہاں سے لے جاؤں گا۔''
وہ چھت پر سینے کے بل لیٹی ہوئی تھی۔ ''میں تمہارا انتظار کروں گی۔'' اس نے
لٹکایا اور میں نے اس کی انگلیوں کو چوم لیا۔
''مہندر بھی میرے ساتھ ہوگا۔'' میں نے اس کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں تھام
اس نے میرے ہاتھ کو کھینچ کر اپنے لبوں سے لگا لیا، پھر کہا۔ ''میں تمہیں جانتی
میرے دیوتا!'' اس کی آنکھوں کی نمی میری انگلیوں کو بھگو گئی۔ اس کے لہجے میں
میرے دل میں کانٹا بن کر اتر گئی۔ ''میں تم پر بوجھ بن گئی ہوں۔''
''نہیں، تمہاری تربیت ہو رہی ہے۔ اچھا خدا حافظ!''
''خدا حافظ!''
جس وقت میں وہاں سے چلا، دور اسٹیشن سے پرے، لائن پار میں نے آگ
شعلوں کو آسمان کی طرف لپکتے دیکھا۔ بہت دور میدان میں جیسے کسی نے الاؤ سا جلا
تھا۔ میں بہت تیزی سے سیتا مورتی کی کوٹھی کی طرف جا رہا تھا۔ میری اور میرے ساتھ
کی کوشش تھی کہ تروڑنگری کو اس آگ میں بھسم ہونے سے بچایا جائے جو انگریز اور ان
پٹھو بھڑکانے پر تلے ہوئے تھے۔ میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہا۔ اس وقت میں نے
دور سے ایسا شور بھی اٹھتے سنا جیسے بہت بڑا مجمع نعرے لگا رہا ہو۔
سیتا مورتی کی کوٹھی میں بلب روشن تھے۔ وہاں ایک عجیب سی پُراسرار سر
احساس ہوتا تھا۔ دو افراد برآمدے میں کھڑے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے تھے۔
کمروں میں بھی کچھ افراد بیٹھے نظر آ رہے تھے۔ گیٹ پر مسلح پولیس والے موجود تھے
نے ایک گھنے درخت کی آڑ لے رکھی تھی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ پھڈکر اور جمشید اس
کہاں ہوں گے۔ ویسے کوٹھی کی اس سمت جدھر میں کھڑا تھا، وہ یقیناً نہیں تھے کیونکہ
مرتبہ کوئل کی آواز نکال چکا تھا۔ یہ آواز اتنی بلند تھی کہ آس پاس کے درختوں تک پہنچ
سکتی تھی۔ میں نے آس پاس کا جائزہ لیا۔ فضا میں دور سے ہوا کے دوش پر تیز
آوازیں آ رہی تھیں۔ یہ آوازیں نعروں کی تھیں اور دور آ... ان پر سرخی موجود تھی جیسے

بڑا انگارہ اپنی سرخ سرخ روشنی بکھیر رہا ہو۔
ایک لمبا چکر کاٹ کر میں کوٹھی کی دوسری سمت پہنچا۔ یہاں درخت زیادہ بھی تھے اور
گھنے بھی۔ چھپنے کے لیے اس سے بہتر مقام اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ یہاں سے کوٹھی کا
بڑا حصہ نظر آتا تھا۔ میں ادھر پہنچا ہی تھا کہ میں نے مخصوص اشارہ سنا۔ چند لمحوں بعد میں اس
درخت پر موجود تھا جہاں جمشید نے ڈیرا جما رکھا تھا۔
''پھڈکر کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''میں نے اسے بھیج دیا تھا۔'' جمشید نے کہا۔ ''شاید میں نے اسے وہاں بھیج کر غلطی
کی ہے۔''
''کہاں بھیجا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔
''یہ معلوم کرنے کے لیے کہ پولیس ہیڈ ماسٹر پاٹھک تک کس طرح پہنچی اور یہ بھی
معلوم کرانے کے لیے کہ کیا مہندر بھی پولیس کے نرغے میں ہے؟'' جمشید نے جواب دیا۔
''تم نے اچھا کیا۔ ویسے کیا مہندر کے بارے میں کچھ علم نہیں ہو سکا؟'' میں نے
جمشید سے سوال کیا۔
''وہ اندر ہی ہے، عقبی حصے میں!'' جمشید نے بتایا۔ ''پھڈکر کے جاتے ہی میں نے
یہ سوچ کر کہ شاید مہندر عقبی حصے میں ہو، ادھر گیا تھا۔ وہاں مجھے اپنے اشارے کا جواب مل
گیا تھا۔''
''تو پھر تم یہاں کیوں ہو؟'' میں نے پوچھا۔
''دراصل طے یہی ہوا تھا کہ وہ کوٹھی کی اسی سمت پھڈکر سے آ کر ملے گا۔'' جمشید
نے جواب دیا۔
''ٹھیک ہے، تم یہیں رہو۔ میں پیچھے جاتا ہوں۔'' میں نے اسے جواب دیا۔
''ویسے پھڈکر کب تک واپس آئے گا؟''
''اب اسے آ ہی جانا چاہیے۔'' جمشید نے جواب دیا۔
پھر میں نے جمشید کو لالی کے بارے میں بتایا، اور اسے اپنے ان خدشات سے بھی
آگاہ کیا جن کی بنا پر میں نے یہ اقدام کیا تھا۔
میں کوٹھی کی عقبی سمت جانے کے لیے درخت سے اترنے ہی والا تھا کہ پانچ چھ افراد
بہت تیز تیز چلتے اور باتیں کرتے ہوئے کوٹھی کی سمت بڑھتے نظر آئے۔ وہ بہت مشتعل
دکھائی دے رہے تھے۔ خاصی دور ہونے کے باوجود ان کی تیز آوازیں، رات کے سناٹے

کی وجہ سے ان کی باتوں کے چند الفاظ ہم تک بھی پہنچ ہی گئے۔ ''مندر...... آگ...... آگ۔''

''اف میرے خدا۔'' میں بڑبڑایا۔ ''تو کیا وہ کامیاب ہو گئے! جمشید! ہماری تگ و دو شاید بے سود ہی ثابت ہوئی۔''

''کیوں کیا ہوا؟'' جمشید شاید اس نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تھا جس پر میں پہنچا تھا۔

''مندر کو آگ لگوا دی گئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے بعد یہاں کیا کچھ ہوگا اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اچھا، تم ٹھہرو، میں چلا۔''

عقبی حصے میں آ کر میں ایک درخت پر چڑھ گیا۔ یہ درخت دیوار سے خاصا دور لیکن اس کا ایک مضبوط گدا دیوار تک گیا تھا اور اس کی شاخیں اندر احاطے میں سایہ کیے ہوئے تھیں۔ میں آہستہ آہستہ کھسکتا ہوا دیوار کی طرف جانے والے گدے پر جس حد تک سکتا تھا، چلا گیا۔

کوٹھی کے عقبی حصے میں سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ یہاں کوئی شے حرکت نہیں کر رہی تھی۔ میں نے کوئل کی آواز نکالی۔ اس اشارے کا جواب فوراً ہی دائیں طرف کے گوشے سے آیا جہاں گہری تاریکی چھائی ہوئی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں گھنی جھاڑیاں یا پودے لگے ہوئے ہیں۔

پھر میں نے اسی سمت ہلکی سی سرسراہٹ محسوس کی جیسے کوئی جھاڑیوں سے گزر کر بڑھ رہا ہو۔ پھر میں نے ایک سائے کو درخت کی سمت آتے دیکھا۔ سایہ درخت کے پاس آ کر دیوار کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔

''مہندر۔'' میں نے بہت دھیمی آواز میں کہا۔

''شیرازی! تم جاؤ۔'' مہندر کی ہلکی سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

''وقت بہت کم ہے،'' میں نے پھر کہا۔ ''میری مدد کی ضرورت ہے۔''

''تم جاؤ۔'' اس کی آواز آئی۔ ''پھڈکر کے پاس ملنا۔''

میں دوبارہ اس پیڑ تک پہنچ گیا جس پر جمشید چڑھا ہوا تھا۔ چند لمحے بعد میں بھی پیڑ پر تھا۔ اب مجھے خیال آیا تھا کہ مجھے علی کافور کا پتا بھی چلانا تھا جسے حامد شمشاد نے ہندو مسلم فساد کی آگ بھڑکانے کا کام سونپا تھا۔ پھڈکر واپس آ گیا تھا۔ اس کی اطلاعات بڑی خوفناک تھیں۔ کوئی ایک گھنٹہ ہوا پانچ موپلوں کے قتل کی خبر ایک قریب کے گاؤں سے تروڑ نگری پہنچی تھی۔ اس خبر کے ساتھ خون میں بھیگی ہوئی دو قمیصیں بھی تروڑ نگری میں موپلوں

ٹھہنگل کے پاس پہنچی تھیں۔ دوسری طرف اسٹیشن کے پاس ایک قدیم خستہ حال ایک مندر کو نذر آتش کر دیا گیا۔ وہ سرخی، اسی آگ کی تھی اور ہوا کے ساتھ آنے والے شور کی آواز موپلوں کے نعروں کی تھی۔

''اف میرے خدا!'' میں بڑبڑایا۔ ''یہ کیسے وحشی درندے ہیں جنہوں نے انسانوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔'' میں نے تاسف سے اپنے ہاتھ ملے۔ ''اور ہاں یہ پتا چلا کہ مسٹر ...ک کے بارے میں کس نے اطلاع دی تھی؟''

''میرے ایک دوست نے۔'' پھڈکر نے بڑے دکھ سے کہا۔ ''مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ آپ نے لالی دیوی کو وہاں سے منتقل کر دیا ہے۔ میں وہاں گیا تھا۔ لالی وہاں موجود نہیں تھی تو میں پریشان ہو گیا تھا۔ جمشید نے بتایا تو میری جان میں جان آئی۔''

''اب کیا ہوگا پھڈکر؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا کرنا چاہیے؟''

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' پھڈکر نے کہا۔

''یہ علی کافور کون ہے، جانتے ہو؟'' میں نے دریافت کیا۔

''علی کافور، کالی کٹ کا ایک بدمعاش ہے۔ وہ یہیں رہتا ہے۔'' پھڈکر نے جواب دیا۔ ''کیوں کوئی خاص بات؟''

''جو کچھ ہونے والا ہے۔ علی کافور کا اس میں بہت بڑا ہاتھ ہوگا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں مل سکے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ کسی ٹھہنگل ہی سے معلوم ہو سکتا ہے۔'' پھڈکر نے جواب دیا۔ ''کیا ہونے والا ہے؟''

''وہی سب کچھ جس کے خلاف ہم جدوجہد کر رہے ہیں۔''

جمشید نے ''شش'' کر کے ہمیں چپ ہو جانے کو کہا۔ سیتا مورتی کے ہاں جو لوگ جمع ہوئے تھے وہ گویا اب رخصت ہو رہے تھے۔ سب لوگ برآمدے میں کھڑے الوداعی الفاظ کہہ رہے تھے۔ پھر لوگ رخصت ہوتے گئے۔ رات کا سناٹا اور گہرا ہو گیا۔ سیتا مورتی اور ... باقی تمام لوگوں کو رخصت کر کے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں کوٹھی کی تیز بتیاں ایک ایک کر کے بجھ گئیں۔ اب صرف کم روشنی کے چند بلب ایک سوگوار سا تاثر پیدا کر رہے تھے۔

وقت گزر رہا تھا۔ آخر مہندر وہاں کیوں رکا ہوا تھا؟ وہ کیا کرنا چاہتا تھا؟ میرے خیالات ایک مرتبہ پھر مہندر کی ذات پر مرتکز ہو گئے تھے۔

کوئی نصف گھنٹے بعد کوٹھی کے ایک کمرے میں روشنی ہوئی۔ اس کے چند منٹ
اسی کمرے سے گولی چلنے کے ساتھ ہی ایک بھیانک اور دلدوز چیخ ابھری۔ پھر اس کوٹھی
جاگ ہوگئی۔ گیٹ پر متعین سپاہی بھی لپک کر برآمدے کی طرف بڑھے۔ کوٹھی میں ایک
مچ گیا۔ چند منٹ بعد مہندر ہمارے پاس پہنچ گیا اور ہم تینوں تیزی کے ساتھ وہاں سے
لیے۔ اب ہم جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتے تھے۔

☆======☆======☆

اس کے پانچویں دن ہم مدراس میں تھے۔

ہماری یہ مہم قطعی ناکام رہی تھی۔ ٹھیک اس وقت جب کہ ہم کامیابی کے قریب
انگریز نے اپنے شاطر اور شیطانی ذہن سے وہ چال چلی جو ہر فراست اور فرزانگی کو جنو
اور دیوانگی میں بدل سکتی تھی۔ دو تین دن کی کوششوں سے ہم نے تروڑنگری کے باشند
میں محبت، اخوت اور بھائی چارے کے جو جذبات بیدار کیے تھے، وہ انگریز کی ایک
انسانی، وحشیانہ اور مکروہ چال سے نفرتوں اور کدورتوں میں تبدیل ہو کر رہ گئے تھے۔

وہ رات اور اس کے بعد تین دن ہم نے پھڈکر کے ایک دوست کے گھر گزار
تھے۔ اس کا یہ دوست بھی ریلوے میں ملازم تھا اور مسلمان تھا۔ میں اور مہندر اسی رات لا
کو بھی ڈاک بنگلے سے لے آئے تھے۔ میں نے مہندر سے کہا تھا کہ ہمیں آخری کوشش کرنا
چاہیے تو اس نے کہا تھا۔ ''میں تمہارے ساتھ ہوں مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہم نے جو کچھ
تھا، وہ تباہ ہو چکا ہے۔'' پھر بھی میں نہ مانا تھا۔ میں نے علی ملیار کے بھائی سے ملاقات
تھی، اس کے توسط سے موپلوں کے ٹھکانوں سے ملا تھا مگر میں انہیں نہیں سمجھا سکا۔
موپلوں کے قتل کی خبر کوئی معمولی نہ تھی۔ انہیں ایک قریبی گاؤں میں قتل کیا گیا تھا۔ افواہ
تھی کہ انہیں ہندوؤں نے مارا تھا اور پھر اس گاؤں کے موپلوں نے دو خون آلود قمیصیں
تروڑنگری بھیجی تھیں۔ یہ قمیصیں بھیجنا ایک پیغام تھا۔ ان قمیصوں میں جو خون جذب ہوا تھا
اپنا خراج مانگ رہا تھا۔ موپلوں کا یہی کہنا تھا۔ اب موپلوں پر فرض تھا کہ وہ تروڑنگری
اپنے بھائیوں کے خون کا بدلہ یہاں کے ہندوؤں سے لیں۔

میں نے آخری مرتبہ انہیں سمجھایا کہ یہ سب کچھ انگریز کی چال ہے۔ اگر موپلے ا
گاؤں میں قتل کیے گئے ہیں تو انہیں انگریزوں نے قتل کیا ہوگا اور اپنے ایجنٹوں کے ذریعے
خون آلود قمیصیں یہاں بھجوائی ہوں گی۔ میں نے انہیں بتایا کہ انگریز نے ہندوؤں اور
مسلمانوں کو لڑانے کے لیے کیا ترکیبیں کی ہیں، کیا اسکیم بنائی ہے مگر میری ان گزارشات

نکلا۔ میں تو جیسے اندھوں، گونگوں اور بہروں سے مغز ماری کر رہا تھا۔
گفتگو کے بعد انگریز کی ساری اسکیم میری سمجھ میں آگئی تھی۔ اس نے جو
مندر سے مورتی کے ہاں سنا تھا، اس کے بعد ہی اس نے وہاں ٹھہر کر اپنی قسم پوری کرنے کا
ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ٹڈالیار کو بتایا تھا کہ قریبی گاؤں میں پانچ مسلمانوں
کے ان کی قمیصیں تروڑنگری بھجوادی گئی ہیں اور تروڑنگری کے ایک قدیم مندر کو نذر
نے کے انتظامات کر دیے گئے ہیں۔ پھر کسی شخص نے آکر ٹڈالیار کو کچھ اطلاع دی
کے بعد ٹڈالیار کچھ دیر کے لیے باہر چلا گیا تھا۔ چند لمحے بعد اس نے واپس آکر
مجسٹریٹ کو سرگوشی میں کچھ بتایا تھا اور پھر ہیڈ ماسٹر پاٹھک کو اندر طلب کیا گیا تھا جو
ے ملاقات کے لیے آیا تھا۔ ٹڈالیار اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ، پاٹھک سے، یوپی سے
والوں کے بارے میں گفتگو کرتے رہے تھے اور اسے یہ فرض سونپا گیا تھا کہ وہ
کے طلبہ کے ذریعے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ وہ چاروں اجنبی کہاں مقیم
ٹھک پُرجوش انداز میں ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ تب اچانک ہی ٹڈالیار اس پر
گیا اور اس نے پاٹھک کو بتایا کہ وہ نہ صرف حکومت کو دھوکا دے رہا ہے بلکہ اپنے
بھائیوں سے بھی غداری کر رہا ہے کیونکہ وہ چاروں اس کے گھر میں پناہ گزین ہیں۔
نے اس کی تردید کی تو اس شخص کو پیش کیا گیا جس نے مخبری کی تھی۔ پھر چند منٹ بعد
ک کو گرفتار کر کے لے جایا گیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے پولیس کو حکم دیا تھا کہ پاٹھک
زندگی ہی میں اس کے گھر چھاپا مارا جائے اور چاروں کو گرفتار کیا جائے۔ ڈسٹرکٹ
ٹ نے پھر اپنے ساتھ آئے ہوئے ایک فوجی افسر کو ہدایت کی کہ وہ بھی واپس جائے
سٹر کے گھر کا محاصرہ کرلے تا کہ ملزمان فرار نہ ہو سکیں۔

مہندر جانتا تھا کہ وہاں لالی کے سوا کوئی نہیں ہے مگر اس وقت وہ ایسی جگہ چھپا ہوا تھا
ے اس کا نکلنا ممکن نہ تھا۔ وہ اپنی بہن کے لیے پریشان تھا مگر اس نے یہی سوچا کہ
جذباتی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ اگر وہ آزاد رہا تو لالی کی رہائی کے لیے کوئی اقدام
وہ کوشش کر سکتا ہے، اگر گرفتار ہو گیا تو لالی کی رہائی کے لیے کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔
چھپا رہا۔ اسے وہاں سے نکلنے کا موقع نہ مل سکا اور جب اسے اس جگہ سے ہٹ
ملا تو بہت دیر ہو چکی تھی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اطلاع دی گئی تھی کہ پاٹھک
کی گرفتاری عمل میں نہیں آسکی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اپنے سر کے بال نوچتا اور
رہا۔ مہندر کو لالی کی طرف سے اطمینان ہو گیا تو اس نے ٹھنڈے دل سے

حالات کا جائزہ لیا۔ تروڑنگری میں ہندو مسلم فسادات کے لیے تمام انتظامات مکم
تھے۔ انسانی خون بہہ چکا تھا اور مہندر نے اپنی قسم پوری کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

وہ بھیانک چیخ جو ہم نے درخت پر بیٹھے ہوئے سنی تھی، سیتا مورتی کی
تھی۔ مہندر نے اسے بیدار کر کے گولی ماری تھی۔

پھر ہم وہاں سے چل دیے تھے اور لالی کو لے کر پھڈکر کے دوست کے
پناہ لی تھی اور ایک مرتبہ پھر موپلوں کو معقولیت پسندی اور عقل و دانش کا راستہ دکھا
ناکام ہو کر مایوس و دل گرفتہ واپس آئے تھے۔

انگریز ہمیں شکست دے چکا تھا۔

اس رات ہم پر ایک اور حقیقت کا انکشاف بھی ہوا تھا۔ تروڑنگری میں فضا
تھی، کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی مگر انگریز فوج اور پولیس رات کے وقت کہیں بھی ہمیں
پر نظر نہیں آئی حالانکہ گزشتہ شب ہی کئی سرکاری عمارتوں کو آگ لگا دی گئی تھی۔ دن
یہ عمل دہرایا گیا تھا۔ یہ ایسے حالات تھے جن میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کو
میں ہونا تھا مگر یوں لگتا تھا کہ انگریزوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

صبح پھڈکر کا دوست خبر لایا کہ رات کو تروڑنگری سے گزرنے والی ایک
ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے حکم سے روکی گئی۔ یہ ٹرین تروڑنگری پر نہیں ٹھہرتی تھی۔ ڈ
مجسٹریٹ، فوج اور پولیس کے اس دستے سمیت جو یہاں اپنے ساتھ لایا تھا، واپس
کٹ چلا گیا۔

تمام رات جلتے ہوئے مندر سے آگ کے شعلے بھڑکتے رہے، تمام شب مو
آبادی سے نعروں کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ صبح یہ خبر عام ہو چکی تھی کہ فوج اور پولیس
نگری کے لیے چتا میں تبدیل ہو گئے۔ نعروں کی آوازیں، چیخوں، کراہوں، بین اور
میں تبدیل ہو گئیں۔ اگلے دو دن تروڑنگری میں آگ اور خون کی ہولی کھیلی جاتی رہی۔

موپلا بغاوت کا آغاز ہو چکا تھا۔

تب یوں ہوا کہ انگریز کی قانون پسندی بیدار ہو گئی۔ وہی ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ
تروڑنگری کو جہنم بنا کر رات کے اندھیرے میں فوج اور پولیس لے کر فرار ہوا تھا،
پچاس انگریز فوجیوں کا ایک دستہ لے کر تروڑنگری میں آ دھمکا۔ متحارب موپلا
ہندوؤں پر مشین گن سے زبردست فائرنگ کرائی گئی۔ یہ فائرنگ اتنی شدید تھی کہ چند
میں ایک ہزار افراد ہلاک اور چند سو زخمی ہو گئے۔ ان متحارب گروہوں کو چاروں

ہزار مارا گیا تھا۔ فوجیوں اور پولیس والوں کو حکم تھا کہ وہ گولی اس طرح چلائیں کہ کم
لیاں ضائع ہوں اور زیادہ سے زیادہ انسان شکار کیے جائیں۔

ہم چاروں بھی یہ وحشیانہ کھیل دیکھ رہے تھے۔ اس وقت ہم اس میدانِ جنگ سے
ہی فاصلے پر محفوظ مقام پر تھے۔ لوگ دیوانہ وار جان بچانے کے لیے چاروں
بھاگ رہے تھے۔ انگریز فوجی اور پولیس ان بھاگتے لوگوں کا تعاقب کر رہے تھے۔
گئے لوگوں کو پناہ دینے کے لیے گھروں کے دروازے کھل رہے تھے۔ ہم نے ایک
دفتر کے برآمدے میں پناہ لے لی تھی کہ چند افراد بھاگتے ہوئے اس دفتر کے
میں داخل ہوئے۔ ایک انگریز فوجی لیفٹیننٹ اور ایک پولیس افسران کے تعاقب
خل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور وہ شکاری کتوں کی مانند اپنے شکار
اقب میں تھے۔ ہم چاروں نے ان دونوں کو گھیر کر ہلاک کر دیا اور ان کی لاشیں ایسی
پھینک دیں جہاں آسانی سے کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔

یہ تھی اس موپلا بغاوت کی ابتدا جو خود انگریز نے اپنے خلاف برپا کرائی تھی اور یہی
بات تھی جس نے ہندو مسلم اتحاد کو سخت ضعف پہنچایا تھا۔ اس کی گونج لجسلیٹو کے اگلے
میں بھی سنائی دی جہاں بعض ہندو اراکین نے کھل کر مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا
نہوں نے مولانا محمد علی شوکت علی پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیا۔ ان اراکین میں جمنا
دوارکا داس بھی شامل تھے۔

میرا خیال ہے کہ یہ واقعہ جلیانوالہ باغ سے بھی زیادہ شرمناک واقعہ ہے مگر اس سے
شرمناک بات شاید یہ ہے کہ ہماری تاریخ کی کتابوں میں جو ہمارے بچوں کو پڑھائی
ہیں، یہ واقعہ اول تو موجود ہی نہیں اور اگر کہیں اس کا ذکر ہوتا ہے تو نہایت سرسری
میں۔

یہاں میں اپنی سرگزشت سے ہٹ کر ایک اور بات بھی آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ
بغاوت تروڑنگری میں اس قتلِ عام پر ہی ختم نہیں ہو گئی۔ یہ آگ سلگتی رہی۔ موپلا
میں جلتے بھنتے رہے۔ پھر چند ماہ بعد ایک اور ہنگامہ ہوا۔ اس مرتبہ ہنگاموں کا مرکز ملا
تھا جہاں کوئی ڈھائی ہزار موپلا گرفتار ہوئے اور وہ واقعہ پیش آیا جو انگریزوں کے
عہد حکومت کا انتہائی بھیانک مرقع ہے۔ ملاپورم سے ایک سو گرفتار شدگان کو
لے جانا تھا۔ ٹرین میں ان کے لیے کسی بوگی کا انتظام نہ ہو سکا تو ریلوے کے انگریز
مال گاڑی کا ایک ڈبا فراہم کر دیا۔ یہ ڈبا دس فٹ چوڑا اور بارہ فٹ لمبا تھا۔ اس

کی اونچائی صرف چھ فٹ تھی۔ اس مختصر سے ڈبے میں ایک سو قیدیوں کو اس طرح ٹھونسا
جیسے بوری میں اناج بھرتے ہیں۔ وہ گاڑی جس میں ڈبا لگایا گیا، شام سوا سات
ملاپورم سے روانہ ہوئی۔ مختصر سے اس ڈبے میں ان بدقسمتوں کے لیے سانس لینا بھی
گیا۔ حبس اتنا شدید تھا کہ ان میں سے کئی بے ہوش ہو گئے۔ جو ہوش میں تھے چیخنے
ساڑھے دس بجے جب یہ ٹرین اولاوک کوٹ کے اسٹیشن پر رکی تو انہوں نے شور مچایا
کو پیٹا۔ وہ پانی کے لیے شور مچا رہے تھے، ہوا کے لیے شور مچا رہے تھے مگر کرنل ہمفری
جو انہیں لے جا رہا تھا، صرف یہی جواب دیا کہ انہیں پانی نہیں مل سکتا۔ ٹرین پھر چل پڑی
پیاسے موپلوں نے پسینے میں تر اپنے بنیانوں اور قمیصوں کو چوس کر اپنی پیاس بجھائی۔ رات
ساڑھے بارہ بجے جب یہ ٹرین پدانور پہنچی تو زندہ افراد بیہوش تھے۔ چون افراد مر
تھے۔ بلیک ہول سے زیادہ ہیبت ناک واقعہ ہو چکا تھا۔ ان سو افراد میں صرف دو ہندو
جو ہلاک ہوئے۔ لجسلیٹو میں جب مسلمان ممبروں نے یہ واقعہ پیش کیا تو ان غیر سرکا
اراکین نے جو ایک معاہدے کے تحت غیر سرکاری مسلم اراکین کے ساتھ ووٹ دیا کر
تھے، اس معاملے پر مسلم اراکین کا ساتھ نہیں دیا۔ خود حامد شمناداس دن ایوان میں حاضر
ہوئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوری ہوتی گئی۔ وہ ہندو مسلم اتحاد جسے انگریز ا
لیے خطرہ سمجھتا تھا کمزور سے کمزور تر ہوتا گیا۔ بعض اوقات قدرت بھی انسان سے اس
ظلم کا کیسا بدلہ لیتی ہے۔ ایسا ہی انتقام قدرت نے بھی انگریزوں سے لیا۔ ٹرین
موپلوں کی ہلاکت کے اس واقعے کے کچھ ہی عرصے بعد کئی انگریز فوجی بھی ایسے ہی وا
سے دوچار ہوئے۔ کراچی سے انگریز فوجی، دہلی آ رہے تھے کہ راستے میں ٹرین کے پ
خراب ہو گئے۔ حبس اور گرمی سے باون انگریز فوجی ہلاک ہو گئے۔ قدرت نے انصاف
دیا لیکن انسان کا انصاف دیکھیے۔ انگریز نے موپلوں کو ہلاک کرنے والے انگریز ف
افسروں کو تو تحفظ دیا لیکن انگریز فوجیوں کی ہلاکت پر اتنا شور ہوا کہ سیکرٹری آف اسٹیٹ
مستعفی ہونا پڑا۔

بہرحال تروڑنگری میں انگریزوں کے مظالم اور شقی القلبی کے مظاہرے دیکھنے
بعد چوتھے روز ہم بڑی مشکل سے فرار ہوئے اور پانچویں دن مدراس پہنچے۔ پھڈ
ہمارے ساتھ تھا کیونکہ تروڑنگری میں اب اس کا رہنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہاں
بات میں اور آپ کو بتا دوں کہ تروڑنگری میں فائرنگ سے ہلاک ہونے والے جن لوگوں
شناخت کیا گیا تھا، ان میں ہیڈ ماسٹر پاٹھک بھی شامل تھا۔ انگریزوں نے یقیناً

ت میں پیش کرنے کے جھنجٹ سے بچنے کے گولی مار دی ہوگی۔ جو سرکاری بیان جاری
یں کہا گیا کہ ہنگاموں کے دوران میں ایک لیفٹیننٹ اور پولیس افسران اپنے
یوں سے بچھڑ گئے تو انہیں موپلوں نے مار دیا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ موپلے آمادۂ
وت تھے جس کی بنا پر انتظامیہ کے لیے کارروائی کرنا ضروری ہو گیا تھا تاکہ شہریوں کے
ن و مال کا تحفظ کیا جا سکے۔

موپلا بغاوت پر پورے ہندوستان میں ہاہاکار مچی۔ ان دنوں پریس پر چونکہ
ہندوؤں کا غلبہ تھا یا ایسے افراد کا جو انگریز کی ہر بات پر آمنا صدقنا کہا کرتے تھے لہٰذا اس
کو موپلوں کی بغاوت سے تعبیر کیا گیا۔ اس دوران میں پیش آنے والے واقعات کو غلط
گ دیا گیا۔ کہا گیا کہ کئی مندروں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ کئی ہندوؤں کو مارا گیا۔ کئی
ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنا لیا گیا مگر کسی نے یہ نہ پوچھا کہ جن دو دنوں میں یہ واقعات
ہوئے، انگریز انتظامیہ کہاں سوئی ہوئی تھی۔ انگریز ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یہ جانتے بوجھتے کہ
حالات نازک ہیں، کیوں فوج اور پولیس سمیت وہاں سے چلا گیا تھا۔ ویسے حقیقت یہ ہے
کہ ان دو دنوں میں صرف ایک پرانا مندر جلایا گیا تھا اور یہ مندر وہی تھا جسے خود انگریزوں
نے آگ لگوائی تھی۔ دو دن کے فسادات میں دس افراد مارے گئے تھے۔ دو ہندو تھے اور
ٹھ مسلمان موپلا، کیونکہ ہندو مسلح اور تیار تھے۔ کسی ہندو کو بھی مسلمان نہیں بنایا گیا تھا اور
اگر ایسا تھا بھی تو انگریز فوج کی اس وحشیانہ اور سفاکانہ کارروائی کے بعد انہیں پھر اپنا دھرم
اختیار کرنے سے کون روک سکتا تھا مگر یہ وہ سوالات تھے جو مسلمانوں کی زبان پر تھے ان
ن کو اخبارات میں جگہ نہیں ملتی تھی۔ تمام ہندو پریس اور انگریزوں کے پروردہ اخبارات
ایک ہی راگ الاپ رہے تھے کہ موپلوں نے ہندوؤں پر بڑا ظلم کیا ہے۔ موپلوں نے
یک خلافت کے زیر اثر ہندوؤں اور انگریزوں کے خلاف اعلانِ جہاد کر دیا ہے۔

بہرحال مدراس پہنچنے کے دو دن بعد ہم بمبئی پہنچ چکے تھے اور پھڈ کر لکھنؤ چلا گیا تھا۔
نے خلیق الزماں کے نام ایک خط بھی بھیجا تھا کہ وہ پھڈ کر کی ہر ممکن مدد کریں۔

☆======☆======☆

ہم بہت دل گرفتہ و افسردہ تھے۔ ہمیں جو کام سونپا گیا تھا، ہم اس میں ناکام رہے
تھے۔ ہمارے لیے نئی ہدایات نہیں تھیں، سوائے اس پیغام کے کہ ہم لوگ بس گھر میں محدود
ہو کر رہ جائیں۔ یہ پیغام ہمیں عمر سوبانی کی معرفت ملا تھا۔ اس دوران میں ہم نے بمبئی کے
اخبارات کے پرانے شمارے دیکھے تو پتا چلا کہ بمبئی میں نو افراد کے لاپتا ہونے پر خوب

خوب لے دے ہوئی تھی۔ ان میں سے چھ سیاسی پارٹیوں کے مقامی لیڈر تھے اور تین ایک
سرکاری دفتر میں ملازم تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ سالار نے شانتا بمفورڈ کے ساتھ
تمام لاشوں کو منتقل کرا کے ٹھکانے لگوا دیا تھا۔

میں نے اس عرصے میں ایک کام کیا۔ تروڑنگری میں پیش آنے والے تمام واقعات
کو میں نے قلم بند کر لیا اور ایک ایک تفصیل اس رپورٹ میں لکھی۔ تین دن بعد سالار رات
کے وقت اپنی مخصوص ہیئت میں ہمارے سامنے موجود تھا۔ وہ لالی کو سیٹھ وشوا ناتھ کے گھر
سے لے کر پہنچا تھا۔

ہم نے تروڑنگری میں پیش آنے والے واقعات مختصراً سالار کو بتائے اور پھر میں نے
اسے اپنی تحریری رپورٹ پیش کر دی جس پر سالار نے کہا۔ ''شیرازی! تم نے اور تمہارے
ساتھیوں نے زندگی کی جو راہ اختیار کی ہے، وہ ایسی ہے جس میں ہر اگلا لمحہ موت کی
نوید لے کر آ سکتا ہے۔ اس زندگی کا بنیادی اصول یہ ہے کہ نہ وقت کا بھروسا کرو نہ کسی کی
ذات پر، حتیٰ کہ اپنی ذات پر بھی نہیں! ٹھیک ہے، تم نے یہ رپورٹ نیک نیتی کے ساتھ تنظیم
کے لیے لکھی ہے مگر اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ تمہیں اپنے اوپر ضرورت سے زیادہ ہی اعتماد
ہے۔ تم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کہ اس مکان میں تم بالکل محفوظ ہو۔ پولیس یا سرکاری
کارندے یہاں تک نہیں پہنچ سکتے مگر ایسا نہیں ہے۔ اس کا مظاہرہ تم تروڑنگری میں
ہیڈ ماسٹر پاٹھک کی گرفتاری، اس کے گھر پر چھاپے اور پھڈ کر کے وہاں سے فرار ہونے کی
شکل میں دیکھ سکتے ہو۔ کبھی اس بات پر یقین نہ کرو کہ تم محفوظ ہو۔ ہندوستان میں تمہارے
لیے کوئی جائے اماں نہیں۔ کسی بھی لمحے پولیس اور سی آئی ڈی تم تک پہنچ سکتی ہے۔ بتاؤ ایسا
ہے یا نہیں؟''

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''ایسا ہی ہے۔''

''تو بتاؤ، اگر پولیس ایک دن پہلے یہاں پہنچ جاتی تو کیا یہ رپورٹ، پولیس تمہارے
خلاف استعمال نہ کرتی؟ کیا تم خود پولیس کو اپنے خلاف تمام ثبوت مہیا کرنے کا وسیلہ نہ
بنتے؟'' سالار ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ اس نے ہم سب کو باری باری گھورا۔
کمرے میں گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایسا سناٹا! جس میں ہم اپنے دلوں کی دھڑکن صاف سن
سکتے تھے۔ ''بتاؤ شیرازی! جواب دو۔''

''آپ درست کہہ رہے ہیں۔'' میں نے کمزور سے لہجے میں جواب دیا۔

''اسے کہتے ہیں حالات کی طرف سے چشم پوشی، خوش فہمی اور غفلت۔'' سالار نے

غصے سے کہا۔ ''اس ذرا سی غفلت سے تم سب مصیبت میں گرفتار ہو سکتے تھے، تنظیم
کے تار و پود بکھر سکتے تھے۔'' سالار کی شعلہ بار آنکھیں نقاب کے سوراخوں سے انگارے
برسا رہی تھیں۔ ''بتاؤ، کیا میں نے جھوٹ کہا ہے؟''

''جی نہیں!'' اس مرتبہ میری آواز بھی کمزور تھی۔ سالار نے جو کچھ کہا تھا ٹھیک ہی کہا
تھا۔ مجھے واقعی اس بارے میں یقین نہیں تھا کہ ہم یہاں محفوظ ہیں۔

''بہر حال۔'' سالار نے رپورٹ کی ورق گردانی کرتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اس
رپورٹ میں اپنے تمام ساتھیوں اور اپنے تمام مددگاروں کے اصلی نام استعمال کیے ہیں۔
اس طرح تم نے سب لوگوں کے ساتھ دشمنی کی ہے اور سب سے بڑھ کر اپنی تنظیم کے ساتھ
جس کے لیے تم نے اپنی جان تک داؤ پر لگا دی ہے۔ یہ سب کچھ تم نے نادانستگی میں کیا ہے،
لاعلمی میں کیا ہے جو اس لیے ناقابلِ معافی ہے کہ تم اس مہم میں اپنے دستے کے سربراہ تھے۔
میں تمہیں بتاتا ہوں کہ ہماری جیسی تنظیموں کے اراکین کو کبھی کبھار اس قسم کی رپورٹیں لکھنی
پڑتی ہیں مگر انتہائی مجبوری کے عالم میں اور اس وقت جب کہ انہیں یہ رپورٹیں کہیں دور اور
فوراً ہی کسی کو بھیجنی ہوتی ہیں۔ رپورٹ لکھنے کے بعد وہ انہیں اپنے ساتھ نہیں رکھتے۔ فوراً
انہیں روانہ کر دیا کرتے ہیں کیونکہ ایسی تنظیمیں ایسے رابطے اختیار کرتی ہیں جو انتہائی محفوظ
ہوتے ہیں۔ پھر اکثر اوقات ایسی رپورٹوں میں افراد اور مقامات کے نام بھی فرضی لکھے
جاتے ہیں کیونکہ تنظیم کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کون سا سرفروش کس جگہ کام کر رہا ہے اور اسے
کیا ذمے داری سونپی گئی ہے۔ اس کے ساتھیوں میں کون کون شامل ہیں۔'' سالار خاموش
ہو گیا، پھر چند لمحے خاموشی کے بعد کہا۔ ''مگر یہاں تمہیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ تم ایک مہم
سے لوٹ کر آئے تھے۔ جمشید اور لالی اب تم سے علیحدہ تھے۔ صرف تم اور مہندر ساتھ تھے۔
اگر تم گرفتار ہو جاتے تو لالی اور جمشید سے تمام معلومات تنظیم کو مل جاتیں، کیوں؟''

''جی ہاں!'' میں نے کہا اور مہندر کی طرف دیکھا، پھر جمشید اور لالی کی طرف۔ ان
سب کی آنکھوں میں بے چینی اور اضطراب تھا۔

''تم سب ایک بات یاد رکھو۔ تم اپنے حافظے پر اعتماد کرنا سیکھو۔ اس بات سے نہ
ڈرو کہ تم کوئی اہم بات بھول جاؤ گے۔ انتہائی مجبوری کے عالم میں رپورٹیں تحریر کرو، فرضی
نام رپورٹ میں لکھو اور رپورٹ لکھنے کے بعد فوراً ہی اس کی منزل کی طرف روانہ کر دو۔
متحرک آدمی کم خطرے میں ہوتا ہے۔ تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے شیرازی!'' سالار
خاموش ہو گیا، پھر اس نے لالی سے کہا۔ ''لالی! بٹیا جاؤ، ایک بالٹی لے آؤ۔''

بالٹی آ گئی تو سالار نے رپورٹ میری طرف پھینکتے ہوئے کہا۔
''اسے جلا دو۔''
میں نے رپورٹ کے کاغذات بالٹی میں ڈالے اور ماچس سے آگ لگا دی۔
''اب تمہیں جو کچھ مزید بتانا ہے، زبانی بتاؤ۔''
میں نے تمام باتیں دہرانا شروع کیں، رپورٹ بالٹی میں جلتی رہی۔
رپورٹ سننے کے بعد سالار نے کہا۔ ''تمہیں اس غلطی کی سزا بھگتنا ہوگی۔'' اس
لہجہ بہت سرد تھا۔ ''آج سے اگلے احکام تک تم اس دستے کے سربراہ نہیں ہوگے۔ مہندر اس
دستے کی قیادت کرے گا۔ تم اس کے تحت کام کرو گے۔ بولو منظور ہے تمہیں؟''
''میں نے اس وطن کے لیے جان دینے کا عہد کیا ہے سالار! میں نے تنظیم سے
وفاداری کا عہد کیا ہے۔ مجھے کسی دستے کا سربراہ بننے سے کبھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں
ایک عام آدمی کی حیثیت سے بھی کام کروں گا۔''
''مگر جناب!......'' مہندر نے کچھ کہنا چاہا۔
''اگر مگر کچھ نہیں مہندر! تم شیرازی کے دوست ہو تو تنظیم کو اس سے کوئی غرض نہیں۔
بولو تمہیں کوئی اعتراض ہے؟''
''جی نہیں!'' مہندر نے کمزور سے لہجے میں کہا۔
''اب سنو، ایک اور بات!'' سالار نے کہا۔ ''بمبئی میں حکومت کے چھ بردہ فروشوں کو
اس محکمے کے چار افراد کے ساتھ مفقود الخبر ہو جانا جن کے توسط سے وہ بردہ فروش اس قوم کو
فروخت کر رہے تھے، معمولی بات نہیں ہے۔ یہ معاملہ سی آئی ڈی تک پہنچ گیا ہے جہاں
ذہین افسروں نے اس واقعے کو تروڑنگری کے واقعات اور امروہے کے واقعات سے
وابستہ کر دیا ہے۔ شیرازی! تمہارے گھر چھاپا پڑا ہے۔ تمہارے والد کو اپنی صفائی پیش
کرنے میں خاصی دقت پیش آئی ہے۔ ان کی خان بہادری خطرے میں پڑ گئی تھی مگر وہ
ٹھہرے حکومت کے نمک خوار، انہوں نے تمہیں عاق کر دیا ہے۔ تمہاری والدہ رو رو کر بے
حال ہو گئی ہیں۔ اب وہ حکومت کو بتا کر بمبئی آ چکے ہیں اور تمہاری تلاش میں ہیں۔'' سالار
نے کچھ دیر توقف کر کے کہا۔ ''مہندر! تم بھی حکومت کی نظر میں مشتبہ افراد کی فہرست میں
داخل ہو چکے ہو۔ اگرچہ میں نے منگو اور ٹینی کا انتظام کر دیا تھا مگر پھر بھی پولیس تمہارے
بارے میں، شکوک و شبہات میں مبتلا ہے۔ پولیس خاموش اس لیے ہے کہ تمہارے خلاف
اس کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے۔ بہرحال اگر کبھی تم سے پوچھ گچھ کی جائے تو پولیس

بتاؤ گے کہ وہ دن جو تم نے بمبئی سے روانگی سے لے کر بمبئی واپسی تک گزارے ہیں،
پونا میں ایک دوست کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے گئے تھے۔ تمہارا یہ دوست سرکاری
محکمہ جنگلات سے اس کا تعلق ہے۔ اس کے متعلق تفصیلات تمہیں بعد میں بتا دی
جائیں گی۔'' سالار خاموش ہو گیا۔
میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں نے مہندر کی طرف دیکھا۔ اس کی
آنکھوں میں جیسے مسرت کے دیے روشن تھے۔ میرا ذہن امی میں الجھا ہوا تھا۔
''شیرازی، مہندر، لالی اور جمشید! سنو، ایک بات یاد رکھو۔ اگر کبھی تم پولیس کے ہتھے
چڑھ جاؤ اور وہ تم سے تنظیم کے بارے میں سوالات کریں یا تم سے پوچھے کہ تم نے تنظیم کے
لیے کیا کیا کام کیے ہیں تو تمہیں ہر سوال کا جواب نفی میں دینا ہے۔ تم ہر بات سے انکار
کرتے چلے جانا۔ انکار میں تمہاری بچت ہے۔ انکار ہی میں تنظیم کا بھلا ہے۔ انکار ہی
تمہاری فتح ہے۔ تمہارا انکار ہی اس ملک کے لیے سب سے زیادہ مفید ہے۔ انکار ہی کرتے
رہنا، خواہ تمہیں کتنے ہی تشدد سے گزرنا پڑے، خواہ تم خود کو موت کے کنارے ہی کیوں نہ
محسوس کرو۔ یاد رکھو، جب تک تم انکار کرتے رہو گے تمہاری جان بچی رہے گی جس لمحے تم
نے اقرار کیا، اسی وقت سے تمہاری زندگی کے آخری لمحوں کی گنتی شروع ہو جائے گی۔''
سالار نے ایک نظر ہم چاروں پر ڈالی۔ کمرے میں سناٹا پھیل گیا تھا۔ ''بولو میری بات سمجھ
میں آ گئی؟''
''جی ہاں۔'' ہم چاروں نے سحر زدہ انداز میں بیک وقت کہا۔
''شیرازی!'' سالار کی آواز گونجی۔ ''اب تم یہاں نہیں رہو گے۔'' یہ کہہ کر سالار
نے اپنے لباس سے ایک کارڈ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ ''اب تم اس پتے پر منتقل ہو جاؤ
گے۔ وہاں تمہیں تین دن رہنا ہے۔ اس عرصے میں تم نہ کسی سے ملو گے، نہ کہیں باہر جاؤ
گے۔''
میں نے کارڈ کو ایک نظر دیکھ کر اسے اپنے جیب میں ڈال لیا۔ کارڈ پر باندرہ کے
علاقے میں کسی عمارت کا نام اور فلیٹ نمبر لکھا ہوا تھا۔
''میں خود تمہیں وہاں اتار دوں گا۔'' سالار نے کہا۔ اس کے بعد سالار نے جمشید کو
مخاطب کیا۔ ''جمشید! تم اپنے گھر جا سکتے ہو۔ تم پر پولیس کو ابھی تک کوئی شبہ نہیں ہے۔
مہندر اور لالی! تم اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ، ہاں جمشید تم بھی میرے ساتھ ہی چلو گے۔ میں
تمہیں تمہارے گھر کے پاس اتار دوں گا۔'' سالار پھر ایک لمحے کے لیے رکا۔ ''اچھا لالی،

شیرازی اور جمشید! تم دوسرے کمرے میں جاؤ، مجھے مہندر کو کچھ ہدایات دینا ہیں۔"
لوگ اٹھ کر ایک کمرے کی طرف بڑھنے لگے تو سالار کی آواز پھر آئی۔ "میری بات یاد رکھنا اگر کبھی تم پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤ تو کسی حالت میں کسی بات کا اقرار نہیں کرنا۔ اگر مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ گے، جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گے، بس ہر بات سے، ہر چیز سے لاعلمی ظاہر کرتے رہنا، انکار کرتے رہنا۔"

ہم تینوں کمرے میں آ گئے۔ سالار کوئی نصف گھنٹے تک مہندر سے گفتگو کرتا رہا۔

☆======☆======☆

باندرہ کے اس فلیٹ میں تین دن بند رہنا ایک طرح سے میری سزا تھی۔ بائی کلہ میں وشوا ناتھ کے مکان سے نکلتے وقت سالار نے مجھے بتایا تھا۔ اس نے یہ بات سب کے سامنے کہی تھی اور مجھ سے سختی کے ساتھ کہا تھا کہ تین دن تک اس فلیٹ سے مجھے قطعی نہیں نکلنا ہے۔ "خواہ پولیس آ جائے یا زلزلہ، آگ لگ جائے یا کوئی اور آفت آ جائے، تین دن کی تنہائی تمہاری سزا ہے۔"

میں نے فلیٹ میں آ کر اس کا جائزہ لیا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ باورچی خانے میں اتنا سامان تھا کہ اگر مجھے وہاں ایک مہینے بھی رہنا پڑتا تو کھانے کے لیے مجھے باہر نہ جانا پڑتا۔ یہ فلیٹ دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرے میں ایک مسہری پر صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ دوسرے کمرے میں فرش پر قالین بچھا ہوا تھا۔ وہاں دو الماریاں بھی موجود تھیں جن میں کتابیں بھری ہوئی تھیں اور چند کرسیاں دیوار کے سہارے رکھی تھیں۔

ایک کمرے کے آگے بالکونی بنی ہوئی تھی۔ دوسرے کمرے میں اسی سمت سڑک کی جانب کھڑکیاں کھلتی تھیں۔ فلیٹ کا جائزہ لے کر میں نے اطمینان سے کپڑے بدلے اور مسہری پر لیٹ گیا۔ میرا ذہن اس وقت لکھنؤ میں تھا جہاں میری امی تھیں، میری بہن تھی، پھر خان بہادر، یعنی ابا جان کی طرف میرے ذہن کی رو منتقل ہو گئی اور میں سوچنے لگا کہ باپ بیٹے کے اندازِ فکر میں اس قدر اختلاف بھی قدرت کا تماشا ہے۔ وہ خان بہادر تھے، انگریز کی وفاداری ان کی نس نس میں رچی بسی تھی۔ اس وفاداری پر وہ فخر کرتے تھے اور ان کا بیٹا انگریزوں کا دشمن تھا، انگریزوں کا باغی تھا اور ان لوگوں کے خلاف نبرد آزما تھا جو انگریزوں سے وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ مجھے اس بات پر شرمندگی محسوس ہوتی تھی کہ میں ایک خان بہادر کا بیٹا ہوں لیکن یہ میری مجبوری تھی کہ میں اپنی ولدیت سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ ایک سوال میرے ذہن میں اکثر پیدا ہوتا تھا اور کبھی اس کا جواب نہ دے پاتا تھا۔

پھر وہ سوال میرے ذہن میں در آیا تھا۔ اگر کبھی اس تنظیم کی خاطر، اس ملک کے کاز کی خاطر میں نے خود کو اپنے ابا جان کے مقابل پایا تو میرا کیا رویہ ہو گا؟ مگر آج میں اس بارے میں اپنے طور پر فیصلہ دے سکتا تھا۔ یقیناً اگر کبھی ایسا موقع آیا تو اپنی تنظیم اور اپنے کاز کو مقدم سمجھوں گا۔ سیتا مورتی، حامد شمشاد اور میرے ابا جان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ یہ سب میری مخالفت میں صف آرا تھے۔ یہ سب ان لوگوں میں شامل تھے جن سے مجھے کوئی ہمدردی نہ تھی۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں سو گیا۔ میں نے رات بھر بہت پریشان خواب دیکھے۔ کبھی دیکھا کہ میری لاش کفنائی ہوئی رکھی ہے اور امی جان بین کر رہی ہیں مگر کسی کمرے سے ابا جان کے قہقہے ابھر رہے ہیں۔ کبھی میں نے دیکھا کہ میں اپنے کمرے میں موجود ہوں، میز کے ساتھ ایک کرسی پر صدرِ عدالت کی مانند بیٹھا ہوں۔ مہندر ابا جان کے خلاف فردِ جرم پڑھ رہا ہے اور میں ان کی موت کا حکم صادر کر رہا ہوں۔

دروازے پر زوردار دستک سن کر میں بیدار ہو گیا۔ کون ہو سکتا ہے، کون آ سکتا ہے؟ میرے لیے کوئی راہِ فرار نہ تھی۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دودھ والے کو دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا اور میں نے دیگچی میں دودھ لے لیا۔

جبری تنہائی میں وقت کس قدر سست روی سے گزرتا ہے، یہ وہی لوگ جان سکتے ہیں جو اس آزار سے گزرے ہوں۔ میں نے الماری میں رکھی ہوئی کتابوں سے دل بہلانا چاہا مگر وہ سب کتابیں میرے کسی کام کی نہیں تھیں۔ تمام کتابیں سائنس کے مختلف موضوعات سے متعلق تھیں جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہو سکتا ہے یہ تمام کتابیں جان بوجھ کر وہاں رکھی گئی ہوں تاکہ میں اپنی دلچسپی کا کوئی سامان پیدا نہ کر سکوں۔

تمام دن اسی کوفت میں اور جھلائے ہوئے گزر گیا۔ اگلا دن بھی اسی طرح گزرا۔ یہ اس فلیٹ میں میری دوسری رات تھی۔ ابھی مجھے وہاں ایک اور دن گزارنا تھا، ایک اور شب بسر کرنا تھی۔ بے کار ہونے کی وجہ سے مجھ پر تھکن کا احساس غالب تھا۔ ایک کاہلی تھی کہ میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ ذہن ہر وقت سویا سویا رہتا تھا۔ اس رات مجھے بڑی دیر بعد نیند آئی۔

ابھی مجھے سوئے ہوئے بمشکل ایک گھنٹہ ہوا تھا کہ میری آنکھ پھر کھل گئی۔ میں جھٹکے سے اٹھ بیٹھا اور زور سے کہا۔ "کون ہے؟"

"خاموش ہو جاؤ۔" میں نے دروازے میں ایک انسانی ہیولا کھڑے دیکھا۔

"کیا مطلب ہے؟ کون ہو تم؟" مجھے اب یاد آیا تھا کہ شام کو دودھ لینے کے لیے
نے دروازہ بند نہیں کیا تھا۔ مجھ پر کچھ اتنی ہی جھلاہٹ اور کاہلی سوار تھی۔

"سنا نہیں کیا کہا میں نے تم سے!" اس کے لہجے سے اکھڑپن ظاہر ہو
تھا۔ "خاموش رہو ورنہ میں گولی مار دوں گا۔"

"میرے پاس کچھ نہیں ہے۔" میں نے اس سے کہا۔

"خاموش رہو" اس نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ پھر وہ میری مسہری کے
سامنے دیوار کے ساتھ گزرتے ہوئے کھڑکی تک پہنچ گیا۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ
مفرور معلوم ہوتا تھا۔ کھڑکی سے پردے کھسکا کر اس نے باہر دیکھا۔ اس کے پستول کا رخ
اب بھی میری طرف تھا۔

"پستول رکھ لو" میں نے کہا۔ "میں بھی تمہاری طرح پولیس سے چھپا ہوا ہوں۔
دن ہو گئے ہیں۔ پرسوں تک اور مجھے یہاں رہنا ہے۔ ہم دونوں دوستوں کی طرح رہ
ہیں۔"

"ٹرٹر بند کرو" اجنبی نے کہا اور سوئچ تلاش کر کے بلب روشن کر دیا۔ وہ لمبا تڑنگا
کسرتی جسم کا جوان تھا۔ اس کے جسم پر کھلاڑیوں کا سا لباس تھا۔ چہرے سے خشونت او
درندگی جھانکتی تھی۔ اس کے باوجود وہ مجھے پسند آیا۔ دو دن بعد مجھے ایک آدمی سے گفتگو
کا موقع مل رہا تھا۔ جھلاہٹ اب بھی مجھ پر طاری تھی۔ مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ
پولیس سے چھپ کر یہاں آیا تھا۔ اگر اس نے کسی کو قتل بھی کر دیا تھا یا کہیں ڈاکہ ڈالا تھا تو
مجھے کوئی سروکار نہیں تھا۔ میں نہ اسے پولیس کے حوالے کر سکتا تھا نہ اس فلیٹ سے نکل سکتا تھا۔

"دیکھو مسٹر!" میں نے کہا۔ "میں بھی بڑا گرم مزاج ہوں۔ میں نے تم سے کہا
ہے کہ میں خود پولیس سے چھپ کر یہاں پڑا ہوا ہوں تو اس میں کوئی غلط بات نہیں ہے۔
میں تمہیں نقصان پہنچانا چاہتا تو اس وقت پہنچا سکتا تھا جب تم کھڑکیوں کی طرف گئے تھے۔
یہ دیکھو یہ پستول بھرا ہوا ہے۔" میں نے تکیہ ہٹا کر اسے دکھایا جس کے نیچے سیاہ پستول
ہوا تھا۔ "مگر میں جانتا ہوں کہ اس طرح کسی کے فلیٹ میں گھسنے والے، قانون سے بھاگے
والے ہی ہوتے ہیں اس لیے مجھے تم سے کوئی خطرہ محسوس نہ ہوا۔ ہاں اگر تم پولیس والے
ہوتے تو شاید اب تک لاش میں تبدیل ہو چکے ہوتے۔ بس اب یہ پستول رکھ لو اور اطمینان
سے باتیں کرو۔"

"تمہارا یہ پستول خالی ہوگا" اجنبی کو ابھی تک میری بات پر یقین نہیں تھا۔

میں نے ہاتھ اٹھا دیے اور مسہری سے اتر گیا۔ "خود دیکھ لو پستول بھرا ہوا ہے یا
"

اس نے بڑھ کر پستول اٹھایا، ہاتھ میں تولا اور واپس بستر پر ڈال دیا۔ اس کے ساتھ
اس نے اپنا پستول گلے میں ہاتھ ڈال کر پتلون کی بیلٹ میں لگا لیا۔ پستول اس طرح
غائب ہو گیا جیسے کسی کوڑے کے ڈھیر میں سوئی گم ہو جائے۔

"تم نے دیکھا نہیں" میں نے اس سے کہا۔ "پستول میں چھ گولیاں ہیں۔ میں
نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔"

وہ ہنسا۔ "اسے ہاتھ میں لیتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس پستول میں گولیاں
موجود ہیں۔ ابھی تم شاید اناڑی ہو، کیوں؟" وہ ذرا دیر کے لیے رکا۔ "بہرحال مجھے خوشی
ہے کہ میں اس فلیٹ میں آ پہنچا۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ پچھلے برس
میں بڑھیا کے ہاں جا پھنسا تھا۔"

"شاید کوئی بڑی تلخ یاد ہے۔" میں نے مسہری پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"کوئی اتنی تلخ یاد بھی نہیں ہے۔" اجنبی نے کہا۔ "اس بے چاری نے بڑی آؤ بھگت
کی لیکن جب میں اس کے فلیٹ سے نکلا تو کم بخت نے شور مچا دیا، لینا، پکڑنا، پکڑو، پکڑو۔"

"تمہیں یہاں ایسا کوئی خطرہ پیش نہیں آئے گا۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"بہرحال۔" اس نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمہاری نیند میں خلل پڑا۔" اس نے بھی
خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔ "ویسے تم کام کے آدمی معلوم ہوتے ہو؟" اس نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"میں نے زندگی بھر کوئی کام نہیں کیا، کوئی مفید کام جو تمہارے کام آسکے۔ نہ اب
ارادہ ہے کہ کوئی کام کیا جائے۔" میں نے جواب دیا۔ "کیا ضرورت ہے کام کرنے کی!"

"گویا تم کوئی لمبا ہاتھ مار چکے ہو؟" اس نے کہا۔

"پتا نہیں تم لمبا ہاتھ کسے کہتے ہو؟" میں نے جواب دیا۔ "کہو تو چائے بناؤں
اپنے لیے۔ مجھے افسوس ہے اس وقت میں کوئی خاطر مدارات نہیں کر سکتا۔"

"پلوا سکتے ہو تو پلوا دو!" اس نے کہا۔

میں باورچی خانے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے تھا۔ چائے کا پانی چولہے
پر چڑھاتے ہوئے میں بولا۔ "تم کوئی پیشہ ور ہی دکھائی دیتے ہو۔ بڑے عیش میں گزر رہی ہو

ادھر ادھر کی باتوں میں وقت گزر گیا۔ اب ہم دونوں چائے پی رہے تھے۔ اس نے

اٹھ کر پردہ ذرا سا کھسکا کر نیچے سڑک کا جائزہ لیا۔

''کیا دیکھ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''پولیس کے کتے اب بھی نیچے جمع ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''وہ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ آؤ دیکھو۔''

میں اٹھ کر کھڑکی کے پاس آیا۔ نیچے واقعی پولیس بڑی سرگرم دکھائی دیتی تھی۔ سالے ڈیڑھ دو گھنٹے یہیں سر ٹکراتے رہیں گے، پھر واپس چلے جائیں گے۔ ویسے بتا سکتے ہو کہ میں یہاں کب تک رہ سکتا ہوں؟''

''پرسوں صبح میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''تم چاہو تو یہاں ٹھہر سکتے ہو مگر ایک درخواست ہے، میرا دوست بہت نفاست پسند ہے۔ چیزیں مت پھیلانا۔ جو چیز لے جانا چاہو لے جانا مگر ان کی فہرست بنا کر میز پر رکھ جانا تاکہ اسے پولیس میں رپورٹ درج نہ کرانا پڑے۔''

''یا تو تم مذاق کر رہے ہو یا پھر تمہارا دوست بہت خوش ذوق معلوم ہوتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ویسے میں یہاں کل رات تک رہنا چاہتا ہوں۔''

''اسے تم اپنا ہی گھر سمجھو۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے تمہارا نام کیا ہے؟''

''تمہارا کیا خیال ہے، کیا میں اپنا اصل نام تمہیں بتا دوں گا؟'' اس نے سوال کیا۔

''نہ بتاؤ، کیا فرق پڑتا ہے۔ دوبارہ تو ملاقات کا کوئی امکان نہیں۔'' میں نے کہا۔

دو دن تنہا رہنے کے بعد مجھے ایک شخص سے باتیں کرنے کا موقع مل رہا تھا۔ میں اپنی تمام کوفت اور کلفت گفتگو کے ذریعے دور کر رہا تھا۔ وہ اجنبی بھی خاصا دلچسپ تھا۔ ہم بڑی دیر تک گفتگو کرتے رہے، پھر سونے کے لیے لیٹ گئے۔ اس نے کمرے میں قالین پر سونا ہی پسند کیا تھا جب کہ میرا اصرار تھا کہ اسے مسہری پر سونا چاہیے کیونکہ وہ میرا مہمان تھا۔

ذہنی تکان اس اجنبی سے گفتگو کی بنا پر دور ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے بڑی گہری نیند سویا۔ صبح اس نے مجھے بیدار کیا۔ اس کے ہاتھوں میں چائے کی پیالی تھی۔ ''بیدار ہو جایئے جناب!'' وہ بڑا تر و تازہ تھا۔

دن بھر ہم آپس میں ہنسی مذاق کرتے رہے، کاغذ پر ڈرافٹ کے خانے بنا کر ڈرافٹ کھیلتے رہے۔ رات بھیگنے پر وہ خدا حافظ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

☆======☆======☆

دروازہ بہت زور سے دھڑ دھڑایا جا رہا تھا۔

میری آنکھ کھل گئی۔ کون ہو سکتا ہے۔ ''کون ہے؟'' میں نے آواز دی۔

''دروازہ کھولو۔'' ایک سخت آواز سنائی دی۔ ''پولیس!''

مجھے دروازہ کھولنا ہی تھا۔ وہ فلیٹ میرے لیے اس وقت پنجرا ہی ثابت ہوا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس مرتبہ میں بچ نکلا تو سالار کو یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ تنظیم کے لوگوں کو ایسی جگہ ٹھہرایا جانا چاہیے جہاں سے نکلنے کے کم از کم دو راستے تو ہوں۔

دروازے پر دو مسلح پولیس والے اور ایک سادہ لباس والا موجود تھا۔ ''مسٹر آفاق آپ ہی!''

''کیا بات ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔ ''آپ کس لیے آئے ہیں؟'' پولیس کی آمد پر میں حیران رہ گیا۔

''آپ کو ہیڈ کوارٹر چلنا ہے، ہمارے ساتھ!'' سادہ لباس والے نے کہا۔ اس کا لہجہ سخت تھا۔

''کیا آپ مجھے گرفتار کر رہے ہیں؟ مجھے وارنٹ دکھایئے!'' میں نے کہا۔ میں یونہی خود کو ان لوگوں کے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔

''نہیں۔'' سادہ لباس والے نے کہا۔ ''ایک شخص کو شناخت کرانا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ رات سے یہیں رہا ہے۔''

''یہاں کسی نے کوئی وقت نہیں گزارا۔'' میں نے سختی سے کہا۔

''ہمیں یقین ہے۔'' سادہ لباس والے نے کہا۔ ''اس نے بتایا ہے کہ آپ نے اس کے ساتھ دن بھر ڈرافٹ کھیلا ہے۔ اس کے لیے آپ نے ایک سادہ کاغذ پر بساط کھینچی تھی جو کمرے میں میز پر رکھی ہوئی ہے۔ آپ ہمیں اجازت دیں تو اطمینان کر لیں۔ بساط نہ ہوئی تو ہم آپ کو زحمت نہیں دیں گے۔'' یہ کہہ کر سادہ لباس والا فلیٹ میں جانے کے لیے بڑھا۔

مجھے اس وقت خود پر بڑا غصہ آیا۔ اس اجنبی کے چلے جانے پر میں خود ہی بڑی دیر تک تنہا طور پر ڈرافٹ کھیلتا رہا تھا اور اب بھی وہ بساط اور اس کی گوٹیں میز پر رکھی تھیں۔ میں نے کاغذ کی گولیاں بنا کر تیار کی تھیں۔ ''تلاشی کا وارنٹ بھی ہے آپ کے پاس؟''

سادہ لباس والا طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ''آپ بلاوجہ پریشان ہو رہے ہیں۔ وہ شخص

دس نمبری ہے۔ رات اس نے ایک شخص کو قتل کر دیا تھا مگر وہ کہتا ہے قتل اس نے نہیں کیا۔ اس کا کہنا ہے کہ کل رات آٹھ بجے سے آج رات تک وہ آپ کے ساتھ رہا ہے۔ آپ چل کر اس کی شناخت کر لیں۔ اگر وہی شخص ہے تو آپ کو ایک بیان دینا ہوگا کہ وہ جو کہہ رہا ہے، سچ ہے۔ آپ جانتے ہیں ہماری کیا مجبوریاں ہوتی ہیں۔ ہماری بھی یہ خواہش ہوتی کہ کسی شخص کو بلاوجہ جھوٹی شہادت کی بنیاد پر دھر لیا جائے۔''

بہر حال مجھے ان کے ساتھ جانا ہی پڑا۔ میں نے فلیٹ میں تالا ڈالا اور ان کے ساتھ چل پڑا۔ زینے اتر کر ہم نیچے آئے تو وہاں ایک کار کھڑی تھی۔ میں دونوں مسلح والوں کے درمیان بیٹھا اور کار چل پڑی۔ پھر مجھے بے بس کر دیا گیا، میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ ''مجھے افسوس ہے مسٹر آفاق شیرازی!'' سادہ لباس والے کی آواز آئی۔ ''اس وقت ہم آپ کو سی آئی ڈی کے خفیہ ہیڈ کوارٹر لے جا رہے ہیں۔ یہ ہیڈ کوارٹر خفیہ ہے لہٰذا ہم نہیں چاہتے کہ کوئی بھی شخص اس کے محل وقوع سے آگاہ ہو۔ یہ پٹی اس لیے آپ کی آنکھوں پر باندھی گئی ہے۔''

''تمہارا یہ طریقہ کار مجرموں کا سا ہے۔'' میں نے غصے میں جواب دیا۔ ''پولیس یا سرکاری ادارے اس انداز میں کام نہیں کرتے۔''

''آپ کو مجرموں کے طریق کار سے خوب واقفیت ہے مسٹر شیرازی!'' سادہ لباس والے نے کہا۔ ''آپ کو جلدی معلوم ہو جائے گا کہ آپ کا سابقہ مجرموں سے ہے یا پولیس والوں سے!''

میں کس چکر میں پھنس گیا تھا، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ پتا نہیں، یہ پولیس والے تھے یا کوئی اور اگر یہ پولیس والے ہی تھے تو ان کے کام کرنے کا انداز مختلف تھا۔ پھر میرا ذہن تنظیم کی طرف مڑ گیا تو کیا انہیں یہ علم ہو گیا ہوگا کہ میں کسی چکر میں پھنس گیا ہوں؟ یقیناً ہی ہو گا۔ کیونکہ جب مجھے قید تنہائی کی سزا دی گئی تھی تو یقیناً اس بات کی نگرانی بھی کی گئی ہوگی کہ میں سالارِ اعظم کی ہدایات کی خلاف ورزی تو نہیں کر رہا ہوں۔

''کیا سوچنے لگے مسٹر شیرازی؟'' سادہ لباس والے کی مکروہ آواز سنائی دی۔ ''اس وقت خفیہ کے احکام سے لے جائے جا رہے ہو۔ خفیہ کا طریق کار پولیس سے مختلف ہے۔''

میرے پیٹ کے مسلز جیسے سکڑ سے گئے۔ میرے حلق میں ایک گولا سا اٹک گیا۔ میں نے گہرا سانس لے کر اس جسمانی اور عضلاتی تناؤ کو دور کرنا چاہا۔ ''تو وہ دس نمبری...

...'' میں نے کہا اور فوراً ہی مجھے اپنی حماقت کا احساس ہو گیا مگر اب تیر نکل چکا تھا۔

''تو آپ اسے صرف کہانی سمجھ رہے ہیں۔ کیا کوئی اور معاملہ بھی ہے جس کی بنا پر آپ میں دلچسپی لے سکتی ہے، یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ ویسے وہ دس نمبری ہمارا ہی آدمی تھا۔'' سادہ لباس والے نے کہا۔

سفید لباس والے کے لہجے سے وہ رعونت ظاہر نہیں ہوتی تھی جو عام پولیس والوں کا ہوتی ہے۔ نہ اس کے اندازِ گفتگو سے بے رحمی اور سفاکی عیاں تھی۔ اس کا لہجہ دوستانہ تھا مگر میں نے اس لہجے میں بناوٹ اور تصنع محسوس کیا تھا۔ پھر ایک جگہ کار رک گئی۔ میں کار سے اترا۔ ان میں سے ایک نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے لے کر بڑھنا شروع کیا۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر ہم کسی کمرے میں داخل ہوئے جہاں جگہ جگہ مڑتے ہوئے ہم پھر زینے اتر رہے تھے۔ مجھے کچھ ایسا لگا تھا جیسے میں کسی دفتر میں پڑی ہوئی مختلف میزوں کے درمیان سے گزرا ہوں۔ نیچے جانے والی سیڑھیاں کافی تھیں۔ یہاں سیلن کا سا احساس ہوا۔ شاید ہم کسی تہہ خانے میں اتر رہے تھے۔ سیڑھیاں اتر کر میں بڑھا۔ یہاں ہمارے قدموں کی گونج بہت نمایاں تھی، گویا ہم کسی تہہ خانے میں تھے اور یہ تہہ خانہ بالکل خالی تھا جہاں سامان یا تو تھا ہی نہیں اور اگر تھا تو بہت کم۔

تو گویا میں گرفتار ہو چکا تھا۔ کیا میں اس گرفتاری سے نجات پا سکوں گا؟ ایک بہت بڑا سوال میرے ذہن میں بار بار گونج رہا تھا۔ کیا یہ لوگ واقعی مجھے اسی شخص کی شناخت کے لیے لائے ہیں؟ میں نے پھر سوچا مگر ساتھ ہی مجھے اپنی حماقت بھی یاد آ گئی۔

پھر مجھے ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا۔ ''پٹی اتار لو مسٹر آفاق شیرازی!''

میں نے پٹی آنکھوں سے اتار دی۔ میں ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ کوئی دس فٹ کے فاصلے پر ایک میز کے پیچھے تین افراد بیٹھے تھے۔ میز کی دونوں طرف دو مسلح سپاہی موجود تھے۔ ان کی رائفلیں میری ہی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ سادہ لباس والا ایک طرف ہاتھ باندھے ایک ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ یہ واقعی ایک تہہ خانہ ہی تھا۔ ہر طرف ستون ہی ستون تھے جس کا مطلب یہی تھا کہ یہ کسی بلند و بالا عمارت کا تہہ خانہ تھا۔ میرے منہ پر تیز روشنی پڑ رہی تھی۔ یہ روشنی سامنے میز کے ساتھ ہی رکھی تھی اور اس کا رخ میرے چہرے کی طرف تھا۔

''تم لوگ کون ہو؟''

''ہم نے تمہیں یہاں پوچھ گچھ کے لیے بلایا ہے؟'' سامنے میز پر دائیں جانب

بیٹھے ہوئے کرخت چہرے والے نے کہا۔

"تم نے اسے بتایا نہیں۔" درمیان والے شخص نے کہا۔ اس کی باریک اور تیز آواز سیٹی کی طرح گونجی۔

"میں نے بتایا تھا مگر اسے یقین ہی نہیں آیا۔" سفید لباس والے نے کہا۔

"اسے اپنا کارڈ نہیں دکھایا تھا؟" میز کی بائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص نے سوال کیا۔ سادہ لباس والے کے سر کی جنبش کو نفی میں دیکھ کر اس نے کہا۔ "اپنا کارڈ دکھاؤ، امن پسند شہری قانون سے تعاون کرتے ہیں۔" اس کے لہجے سے مکاری ٹپک رہی تھی۔

سادہ لباس والے نے جیب سے اپنا کارڈ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ ایسا کارڈ میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ کارڈ شانتا بمفورڈ کا تھا جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔

اسی وقت تہہ خانے میں قدموں کی آواز ابھری۔ میں نے دائیں جانب دیکھا، اوپر سے ایک اور باوردی سپاہی مستعد انداز میں میز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل بھی تھی۔ اس نے یہ فائل سادہ لباس والے کو دی اور واپس چلا گیا۔ سادہ لباس والے نے چند قدم بڑھ کر یہ فائل درمیان میں بیٹھے ہوئے شخص کو دے دی۔ فائل پر سرخ حروف میں "خفیہ" کا لفظ چمکتا نظر آیا تھا۔

خمیدہ ناک اور گھنی بھنووں والے شخص نے فائل کا معائنہ کیا۔ اس کا انداز ایسے گدھ کا تھا جو کسی مردہ لاش کو نوچنے سے پہلے اس کا معائنہ کرتا ہے۔ اس وقت مجھے عدالت کا منظر یاد آیا جو ہم نے چند دن قبل لگائی تھی اور جس نے قوم کے چھ دلالوں کو موت کی سزا سنائی تھی۔ "ہوں۔" خمیدہ ناک والے نے کہا۔ "اپنی رپورٹ پیش کرو۔" اس نے سادہ لباس والے سے کہا۔ سادہ لباس والے نے تمام رپورٹ پیش کر دی۔ مجھے اس کے حافظے پر بڑا رشک آیا۔ ترتیب وار تمام واقعات سناتے ہوئے اس نے اپنی اور میری گفتگو بھی لفظ بہ لفظ دہرا دی تھی۔ اس کے خاموش ہونے پر خمیدہ ناک والے نے مجھ سے کہا۔ "اب تم تمام پتے کھول دو۔"

"کون سے پتے؟" میں نے حیران سے پوچھا۔

"ہم جانتے ہیں گزشتہ دس دن کے دوران میں تمہاری کیا کیا مصروفیات رہی ہیں۔"

"پھر تو تمہیں بہت مایوسی ہوئی ہوگی۔" میں نے جی کڑا کر کے کہا۔ "ظاہر ہے

مطلب کا آدمی نہیں ہو۔"

اس کی تیز آنکھیں میرے دماغ میں گھس رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں ایک سنگدلانہ چمک تھی۔ میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے پسینے کی ایک لکیر گردن سے ریڑھ کی ہڈی کے آخری سرے تک پہنچ گئی ہو۔ اس کی گھنی بھنویں سکڑ کر آپس میں مل گئیں۔ کیا یہ واقعی خفیہ کے لوگ ہیں؟ کیا انہیں سب کچھ معلوم ہے؟ میں نے سوچا۔

"آفاق شیرازی!" اس کی باریک آواز چیخ میں تبدیل ہو گئی۔ "میں جھوٹ بولنے والے کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔ تمہاری نجات اسی میں ہے کہ سب کچھ صاف صاف اور سچ سچ اگل دو۔" میں کپکپا کر رہ گیا۔ "شانتا بمفورڈ کو جانتے ہو؟"

"شانتا ہمارے اسکول میں چپراسی تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "بمفورڈ کو میں نہیں جانتا۔ میں کسی انگریز کو نہیں جانتا۔" میں نے نہایت اعتماد سے کہا لیکن اندر ہی اندر میں ایک نامعلوم خوف میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"لطیفے مجھے پسند نہیں۔" اس نے نہایت سرد لہجے میں کہا۔ "اس کے ہاتھ باندھ دو۔" اس نے سادہ لباس والے سے کہا اور میز پر رکھے ہوئے سیاہ بکس کو کھول کر اس میں سے ایک چمکتا ہوا چاقو نکال لیا۔

سادہ لباس والے نے میرے ہاتھ کرسی کی پشت کے ساتھ موڑ کر رسی سے باندھ دیے۔ اس وقت اس کا چہرہ میرے پیچھے تھا۔ اس کی ہلکی سی سرگوشی سنائی دی۔ "سچ سچ بتا دو ورنہ بہت برا حشر ہوگا۔"

یہ سرگوشی سن کر میرے جسم کے ہر عضو میں کپکپاہٹ سی پیدا ہو گئی۔

خمیدہ ناک والا جھلملاتا چاقو لیے کرسی سے اٹھا۔ اس نے ایک نظر فائل پر ڈالی اور میری طرف بڑھا۔

"شانتا بمفورڈ، شام دت، چونی لال، مول چند، ماوالنکر، طیب جی، قادر مٹھا، سیتا مورتی، حامد شمشاد، مُلّا لیار، پاٹھک، احمد علی۔" وہ ایک ایک نام کو واضح انداز میں پکارتا رہا۔ "ان میں سے کسی نام کا کوئی شخص تمہارے ذہن میں ابھرتا ہے؟"

میں نے آنکھیں جھپکائیں۔

"بمبئی سے مدراس، مدراس سے کالی کٹ، کالی کٹ سے ترونگری، وہاں سے پھر راستے واپس بمبئی۔" اس نے کہا۔ "کچھ یاد آیا؟"

میرا سانس رک گیا اور دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ موت کو اس قدر قریب میں نے

استاد منگو کے ٹھکانے پر بھی محسوس نہیں کیا تھا۔ ان لوگوں کو سب کچھ معلوم تھا۔ انکار بے سود تھا۔ مجھے اپنی امی یاد آئیں، اپنی بہن یاد آئی، اپنے ابا جان یاد آئے۔ اس کے ساتھ ہی انگریز سے ان کی وفاداری یاد آئی۔ ایک نفرت سی میرے سے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ سب کچھ ایک لمحے سے بھی کم میں ہوا۔

"کچھ یاد آیا؟" سرد اور زرد آنکھوں والے نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں سب کچھ علم ہے۔ خفیہ والوں کو حرام تنخواہ نہیں ملتی، ہم حکومت کی آنکھیں ہیں، ایسی آنکھیں جو ہر وقت جاگتی رہتی ہیں۔"

"میں کسی شخص کو نہیں جانتا۔ میں کبھی مدراس نہیں گیا، کبھی کالی کٹ نہیں گیا اور کبھی اس نگری نہیں گیا جس کا نام تم نے لیا تھا۔"

"ابھی یاد آجائے گا۔" اس نے کہا۔ پھر اس نے تیزی سے میرے کان کی لو پکڑی۔ اگلے لمحے اس کے ہاتھ میں میرے کان کی لو کا تھوڑا سا حصہ تھا۔ اس کی انگلیاں خون سے سرخ ہو گئی تھیں۔ گرم گرم خون کی ایک لکیر میری گردن سے اتر کر شانے تک پہنچ گئی تھی۔ میرے کان کی لو میں انگارے سے بھر گئے تھے۔

"بولو کچھ یاد آیا؟"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو!" میں نے جی کڑا کر کے تکلیف پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

"اگر تم نہیں بتاؤ گے تو میرے پانچ کہتے ہی یہ دونوں سپاہی گولی چلا دیں گے۔" اس نے کہا۔

میں نے میز کی دونوں جانب کھڑے ہوئے سپاہیوں کو دیکھا جنھوں نے بندوق کے نشانے ٹھیک کر لیے تھے۔

"احمق! پاگل! میں کچھ نہیں جانتا۔ تم مجھے مارنا ہی چاہتے ہو تو بہانے کیوں تراش رہے ہو۔" میں نے چیخ کر کہا۔ میں اس گومگو کی صورتِ حال کو مزید برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"ایک...... دو...... تین......" اس نے گنتی شروع کی۔

کیا میں پانچ کی گنتی تک ثابت قدم رہ سکوں گا؟ شاید نہیں میں نے سوچا۔ حامد شمشاد بھی جی چھوڑ بیٹھا تھا۔ اس وقت میرے تمام حواس جیسے سن ہو گئے تھے۔

مگر اس نے تین کے بعد کچھ نہ کہا۔ ایک طویل وقفے کے بعد وہ خمیدہ ناک میرے چہرے پر جھک آئی۔ اس کی سکڑی ہوئی گھنی بھنوؤں کے نیچے اُلو جیسی زرد زرد آنکھیں میری

آنکھوں پر جم گئیں۔ "سنو مسٹر آفاق شیرازی! مجھے تم سے کوئی دشمنی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری موت کو آسان بنادوں۔ ہمیں تمہاری تمام سرگرمیوں کا علم ہے۔ وہ فائل دیکھ رہے ہو، اس میں میرٹھ سے لے کر تروڑنگری تک تمام رپورٹیں ہیں۔ میں خاص طور پر شملے سے آیا ہوں۔ تمہیں علم نہیں شاید کہ ہم تم تک تمہارے والد کی بدولت پہنچے ہیں۔ تم سچ سچ سب بیان کرلو۔ تمہارے والد نے حکومت سے تمہاری بخشش کرالی ہے۔ تمہیں معاف کر دیا جائے گا۔ تم سرکاری گواہ بنا لیے جاؤ گے ورنہ......"

"ورنہ کیا ہوگا؟" میں نے دریافت کیا۔

"ورنہ ہمیں حقیقت اگلوانے کے سینکڑوں طریقے آتے ہیں۔" وہ پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے جیب سے سیاہ سگریٹ کیس نکال کر اس میں سے سگریٹ نکالی اور اسے جلا کر کہا۔ "تمہارے والد نے وائسرائے سے مل کر تمہاری زندگی کی بھیک مانگ لی ہے مگر یہ بھیک تمہیں اسی صورت میں ملے گی کہ تم رضاکارانہ طور پر سب کچھ مان لو، اپنے تمام جرائم کا اعتراف کرلو۔"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔" میں نے جواب دیا۔

"سوت ندی کا پل اڑانا، حکومت کے چھ وفاداروں کو اور چار ملازمین کو اغوا کرنا اور تروڑنگری میں ہنگامے کرنا، کیا تم انہیں جرائم نہیں سمجھتے؟" اس نے سوال کیا۔

زندگی، زندگی، خوبصورت دنیا۔ خوبصورت لالی! لالی کی بڑی بڑی آنکھیں میرے شعور پر محیط ہو گئیں۔ مجھے اس کے ہونٹوں کا لمس یاد آیا۔ مجھے اپنی والدہ کا چہرہ یاد آیا۔ یہ سب کچھ خوبصورت ہے۔ یہی زندگی ہے۔

"اپنے پتا کی محبت یاد کرو۔ اپنی ماتا کو یاد کرو۔" اس کی آواز ابھری۔

ماتا، یہ دھرتی میری ماتا ہے۔ میں مادرِ وطن کا سپاہی ہوں۔ مجھے اپنے وہ بے شمار عہد یاد آئے جو میں نے ارضِ وطن سے کیے تھے۔

"میں نے کچھ نہیں کیا، کچھ نہیں کیا، میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے سالارِ اعظم کی ہدایت یاد آئی۔ اگر کبھی پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤ تو کسی بات کا اقرار نہ کرنا، ہر بات کو جھٹلانا۔ ہر بات سے انکار کرنا۔ ہر بات سے لاعلمی ظاہر کرنا، اسی میں تمہاری جیت ہے۔ اسی میں تمہارے بچنے کا امکان ہے۔ یہ الفاظ یاد آتے ہی میں نے اپنے اندر ایک اعتماد سا محسوس کیا۔ یہ لوگ معلومات حاصل کیے بغیر مجھے نہیں مار سکتے۔ میں نے سوچا۔ میرے زخمی کان سے ایک ٹیس سی اٹھی۔ انسان کو جب زندہ رہنے کی آس ہوتی

ہے تو ساری تکلیفیں، سارے درد جیسے جاگ اٹھتے ہیں۔ چند لمحے قبل میرے اعصاب
حس سے ہو گئے تھے۔ موت کے کربناک تصور کے سبب میں کچھ بھی تو نہیں سوچ سکتا تو
میں زخمی کان سے اٹھنے والی ٹیسوں کو بھی بھول گیا تھا۔

"تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔" اس زرد رو نے سرد لہجے میں کہا۔ "ہم تمہاری
پولیس کے حوالے کریں گے، ہماری رپورٹ یہ ہوگی کہ تم قانون سے فرار ہونے کی کوشش میں
مارے گئے ہو۔"

"تم مجھ سے جھوٹی باتوں کا اعتراف کیوں کرانا چاہتے ہو؟" میں نے کہا۔ "میں
کہتا ہوں ان معاملات سے میرا کوئی تعلق نہیں مجھے نہیں پتا تم کن باتوں کے بارے میں
پوچھ رہے ہو؟"

"چلو ہم یہ بات مان لیتے ہیں۔ تم اسی لیے ان سب باتوں کو جھٹلا رہے ہو کہ تمہیں
زندگی عزیز ہے۔ یہ زندگی تمہیں ان جرائم کا اعتراف کرنے کی صورت میں بھی مل سکتی
ہے۔ سیکرٹری آف اسٹیٹس کا خط پڑھو۔" اس نے میز پر بیٹھے ہوئے ایک شخص کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔

دائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص نے فائل کھول کر کاغذات الٹ پلٹ کیے اور پھر
ایک کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنا شروع کی۔ اس خط کا لب لباب یہ تھا۔

> ہز میجسٹی کی حکومت، خان بہادر کو یہ یقین دلاتی ہے کہ اگر ان
> کے بیٹے آفاق شیرازی نے اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا جن کی
> نوعیت انتہائی گھناؤنی ہے تو خان بہادر کی خدمات کے صلے میں
> حکومت ان کے بیٹے سے رحم کا سلوک کرے گی اور ان کے بیٹے
> کو حکومت کے باغیوں کے خلاف سرکاری گواہ بنا کر اس کی
> جان بخش دے گی۔

خط ختم ہو چکا تھا۔ "سنا تم نے۔" شکرے نما شخص نے پھر میرے پاس آ کر کہا۔
"جرائم کا اعتراف کرو، یا اپنے بقول غلط باتوں کا، دونوں صورتوں میں تم زندہ رہو گے
صرف اعترف کر لو اور زندہ رہو۔" وہ پیچھے ہٹا۔ "ہم نے تمہاری جانب سے اعترافی بیان
تیار کر لیا ہے۔" اس نے مڑ کر سادہ لباس والے سے کہا۔ "اقرار نامہ لاؤ۔"

سادہ لباس والا میز کی طرف بڑھا۔ کرخت چہرے والے نے سادہ لباس والے کو
ایک اور فائل اٹھا کر دی۔ اس نے فائل میں سے ایک کاغذ نکالا اور اسے فائل پر رکھ کر

سامنے کر دیا۔

"پڑھ لو۔" شکرے نما انسان کی آواز ابھری۔

میں نے وہ بیان پڑھا۔ مختصر سے مضمون میں یہ ان تمام واقعات کا اعتراف تھا میں
شریک تھا۔ یہ مضمون میری زندگی کا پروانہ تھا، میری زندگی پیغام تھا، اس زندگی کا
جو میر جعفر اور میر صادق کو ملی تھی۔ تاریخ میرا نام بھی انہی افراد کی فہرست میں رقم
کرے گی۔ انکار کرتے رہو، اعتراف ہرگز نہ کرو، خواہ تم خود کو موت کی دہلیز پر ہی کیوں نہ
محسوس کرو۔ سالار کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ یہ بھی زندگی کا پیغام تھا، آبرومندانہ
زندگی کا پیغام!

اے خدا مجھے استقامت عطا فرما! میں نے دل ہی دل میں اپنے رب سے دعا کی،
پھر بولا۔ "یہ سب جھوٹ ہے۔ میں اس پر دستخط نہیں کروں گا۔"

"کیا حماقت کر رہے ہو!" سادہ لباس والے نے سرگوشی میں کہا۔

"بکواس مت کرو!" میں زور سے چیخا۔ "میں دستخط نہیں کروں گا۔"

شکرے جیسا شخص میز پر اپنی کرسی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "آخری موقع دے رہا
ہوں۔ میرے گنتی گننے سے قبل اقرار کر لو۔"

خاموشی چھا گئی۔ میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔

میں خوفزدہ نہیں تھا مگر ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ میرے جسم سے پھوٹ رہا تھا۔ میں اس کیفیت
کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ "گنتی گنو، اُلو کے پٹھو! گنتی گنو! میں اقرار نہیں کروں گا۔ مجھے
کچھ معلوم نہیں، میرا اس سے کوئی تعلق نہیں جو کچھ تم نے اس بیان میں لکھا ہے۔ گنتی گنو!"
میں پوری قوت سے دہاڑا۔

گنتی شروع ہو گئی۔

"ایک!" اس نے کہا۔ ساتھ ہی دونوں مسلح سپاہیوں نے بندوقوں کے بٹ کاندھوں
سے لگا کر نال کے ساتھ اپنی آنکھیں لگا دیں۔ "اوہو، تمہارا تو تمام چہرہ پسینے میں بھیگ
گیا۔"

"گنتی گنو! جلدی سے یہ سب ختم کر دو اور گولی چلا دو۔" میں دیوانوں کی طرح چیخا۔

"دو!" اس کی سرد آواز ابھری۔ "حماقت نہ کرو۔ اگر یہ سب کچھ جھوٹ ہے تو بھی تم
کیا اپنی جان گنواتے ہو؟"

"گنتی گنو!" میں پھر بولا۔ اب میں نے آنکھیں بند کر لیں اور کلمۂ طیبہ کا ورد کرنے

لگا۔ میں اپنے وطن پر قربان ہو کر سرخرو ہونا چاہتا تھا۔

''تین!'' وہی سرد آواز ابھری۔ ''کوئی ذہین آدمی یوں خودکشی نہیں کرتا۔''

''تم ذلیل، کتے، میں نہیں جانتا تم کیا کہہ رہے ہو۔ ختم کرو...... گولی چلاؤ!''

''چار!'' ہر قسم کے جذبات سے عاری اس کی سرد آواز ابھری۔ ''اس کے بعد جو ہندسہ کہوں گا اس کے ساتھ ہی گولیاں چلیں گی۔ پھر میں تمہیں کوئی مشورہ بھی نہیں دے سکوں گا۔''

''تیرے مشورے کی ایسی تیسی!'' میں پاگلوں کی طرح چیخا اور آنکھیں بند کرلیں۔

''چلاؤ گولی!'' دونوں سپاہیوں نے زور سے ایڑیاں بجائیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ گولی چلنے کی آواز پہلے سنوں گا یا پہلے میرے گولی لگے گی؟ اس وقت میں کلمہ پڑھنا بھی بھول گیا تھا۔ میں ان گولیوں کا منتظر تھا جو مجھے چھید کر اس دنیا سے میرا رابطہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے والی تھیں۔ اس وقت کسی کا خیال بھی میرے ذہن میں نہیں تھا، نہ امی کا، نہ ابا کا، نہ لالی کا۔ میرا ذہن اس وقت بالکل خالی تھا۔

☆======☆======☆

''مجھے تمہاری جوانی اور حماقت پر رحم آرہا ہے۔'' اس کی آواز ابھری۔ ''میں نے تمہیں مہلت دینے کا فیصلہ کیا ہے، رات بھر کی مہلت! تم آزادی سے گھوم پھر سکو گے، جہاں چاہو گے جا سکو گے لیکن ہمارے آدمی تمہاری نگرانی کرتے رہیں گے تاکہ تم فرار نہ ہو سکو۔ ویسے اگر تم فرار ہوئے تو ہم لالی کو ہلاک کر دیں گے۔ جانتے ہو نا لالی کون ہے؟'' وہ ایک لمحے کو رکا۔ ''اس کی آنکھیں باندھ دو اور اسے کسی مناسب جگہ چھوڑ آؤ۔''

میری آنکھیں باندھ دی گئیں۔ کپڑے کی رگڑ سے میرے کان کی لو میں پھر جیسے سوئیاں سی بھر گئیں مگر مجھے یہ تکلیف بہرحال برداشت کرنا تھی۔ ایک مرتبہ پھر مجھے کار میں بٹھا دیا گیا۔ سفر پھر شروع ہوا۔ کافی دیر بعد کار رکی۔ سادہ لباس والے نے کہا۔ ''چلو، کار سے اترو! اور ہاں فرار ہونے کی کوشش نہ کرنا، یہ میرا مخلصانہ مشورہ ہے۔''

میں نے کار سے اتر کر احتیاط سے پٹی کھولی۔ کپڑا کان کی زخمی لو سے چپک کر رہ گیا تھا۔ سامنے ایک کار کی عقبی روشنیاں دور ہوتی جا رہی تھیں۔

میں اس وقت باندرہ ہی کے علاقے میں تھا اور ایک سنسان سی گلی میں کھڑا تھا۔ آہستہ آہستہ میں اس فلیٹ کی طرف بڑھ گیا جہاں سے میری گرفتاری عمل میں آئی تھی۔ فلیٹ تک پہنچتے پہنچتے میں نے دو تین مرتبہ پلیٹ کر دیکھا۔ ہر موقع پر خود سے چالیس پچاس گز کے فاصلے پر ایک شخص کو میں نے اپنے تعاقب میں دیکھا۔ اس وقت مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ پلٹ کر اس کی طرف لپکتا۔ میں اس وقت فلیٹ پہنچ کر اس صورتِ حال پر غور کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس صبح تک کی مہلت تھی۔ مجھے اپنا تعاقب کرنے والے سے پیچھا چھڑانے کی بھی جلدی نہیں تھی۔ مجھے اطمینان سے یہ غور کرنا تھا کہ اگر میں فرار ہونے میں کامیاب ہو بھی گیا تو میری منزل کیا ہو گی؟ مجھے کہاں جانا ہو گا؟

میں نے فلیٹ میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا ہی تھا کہ مہندر کی آواز آئی۔ ''خوش آمدید شیرازی!'' اس کا لہجہ سخت تھا۔ ''تم سے کہا گیا تھا کہ تین دن تک تم یہاں سے نہیں

نکلو گے۔'' پھر میرے زخمی کان اور قمیص کے کالر پر خون دیکھ کر اس نے تشویش سے کہا۔ ''کیا ہوا؟ کہاں سے آ رہے ہو؟''

میں نے اسے تمام واقعات سنائے تو وہ اور بھی فکر مند ہو گیا۔ ''مگر یہ سب کیسے ہوا؟''

''یہ ہم تھوڑی دیر بعد بھی سوچ سکتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''پہلے چائے پلاؤ۔ بڑی ذہنی اذیت سے گزرا ہوں۔ اس وقت ایسا لگ رہا ہے جیسے میں میلوں کا سفر کر کے آیا ہوں۔ ویسے تم یہاں کیسے؟''

مہندر نے میرے زخمی کان کی ڈریسنگ کی۔ فرسٹ ایڈ کا سامان فلیٹ ہی میں موجود تھا۔ اس دوران میں اس نے میرے ساتھ پیش آنے والے واقعات کی دیگر تفصیلات بھی معلوم کیں۔ چائے بناتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا۔ ''ہمیں آج صبح ہی یہاں سے نکل چلنا ہے۔ ہم سیدھے شملے جائیں گے۔ سالار کا کہنا ہے کہ یہ مہم اب تک کی تمام مہموں سے زیادہ اہم ہو گی۔ اس میں خطرات زیادہ ہیں لیکن کامیابی کی صورت میں اس کے نتائج بہت اہم اور دور رس ثابت ہوں گے۔ ویسے شیرازی! تنظیم کی طرف سے اس مہم کا انچارج میں ہی ہوں گا لیکن......''

''نہیں مہندر آگے کچھ نہ کہنا۔'' میں نے کہا۔ ''سالار کا فیصلہ درست ہے۔''

''مگر اس رپورٹ کو لکھنے میں تو خود میں بھی تمہارا شریک تھا۔'' مہندر نے کہا۔ ''جو غلطی تم نے کی تھی، اس میں میرا بھی تو حصہ تھا۔''

''کچھ بھی ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ذمے دار میں ہی تھا اس لیے اس غلطی کی بھی تمام تر ذمے داری مجھ پر ہی عائد ہوتی ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔''

میں مسہری پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر کے اپنے ذہن کو آزاد چھوڑ دیا۔ میں ایک ایسی صورتِ حال سے گزر کر آیا تھا جس نے میرے اعصاب اور ذہن دونوں ہی کو منتشر کر دیا تھا۔ میں ذرا سکون کے ساتھ لیٹنا چاہتا تھا۔ میں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا کہ مہندر دو پیالیاں چائے بنا کر لے آیا۔ میں نے چائے پینے کے دوران میں مہندر کو قید تنہائی میں پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کیا اور اس خیال کا اظہار کیا کہ وہ اجنبی جو اچانک ہی بیچ میں آ دھمکا تھا یقیناً پولیس ہی کا کوئی آدمی تھا مگر ان لوگوں نے جو طریقہ کار اختیار کیا تھا، بہرحال پولیس والوں کا نہیں تھا۔

''اس کے بارے میں خود معلوم ہو جائے گا۔ پہلے ہمیں یہاں سے نکلنے اور

کرنے والے سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرنا چاہیے مگر لالی...... انہوں نے لالی کو بھی دھمکی دی ہے۔''

''ہم ان سے پیچھا چھڑا کر سب سے پہلے گھر جائیں گے۔ لالی کو بھی ہمارے ساتھ ہی جانا ہے۔ انہیں اس فلیٹ کا پتا تو معلوم ہی ہے۔''

میں نے جواب دیا۔

''بہر حال تمہاری نگرانی کرنے والا ایک ہو یا دو، یا زیادہ، ان سے پیچھا چھڑانا تو ہے، تیار ہو جاؤ۔''

میں تیزی سے زینے اترتا ہوا نیچے آیا۔ وہ شخص جو میری نگرانی پر متعین تھا شاید نیچے ہی کے پاس کھڑا تھا۔ اس بلاک سے باہر آتے ہی وہ میرے پیچھے لگ گیا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا سگریٹ کی ایک دکان پر آ کھڑا ہوا۔ یہاں پہنچ کر میں بلاک سے باہر آنے والے کو دیکھ سکتا تھا۔

سگریٹ کا پیکٹ خرید کر میں نے ایک سگریٹ جلائی۔ میرا تعاقب کرنے والا سڑک کی دوسری جانب کھڑا تھا۔ مہندر کو باہر آتے دیکھ کر وہ وہاں سے بڑھ گیا۔

رات کافی گزر چکی تھی۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں۔ اس وقت مہندر کو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ میرا تعاقب کرنے والا کون تھا! اب میں ایسی گلی سے گزر رہا تھا جو نسبتاً تنگ اور طویل تھی۔ اس گلی سے کوئی گلی دائیں بائیں نہیں پھوٹتی تھی۔ اس وقت میں گلی کا تین چوتھائی حصہ طے کر چکا تھا۔ میرا تعاقب کرنے والا میرے پیچھے تھا اور اس کے پیچھے مہندر، میری نگرانی پر صرف ایک ہی شخص مقرر کیا گیا تھا۔ میں نے ٹھہر کر پیچھے دیکھا۔ وہ شخص اپنی جگہ ٹھہر گیا تھا۔ پھر میں نے اس کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ دو تین سیکنڈ وہ اپنی جگہ کھڑا رہا، پھر اس نے بھی جلدی جلدی واپس چلنا شروع کر دیا۔ وہ بہت تیزی سے قدم اٹھا رہا تھا اور بار بار مڑ کر مجھے بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ میں نے رفتار اور تیز کر دی، پھر یقیناً دوڑنا شروع کر دیا۔ اس کی رفتار بھی تیز ہو گئی۔ وہ شاید اس صورت حال کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ بار بار وہ پیچھے مڑ کر مجھے بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی رفتار اور تیز کر دی۔ اب وہ دیوانوں کی طرح بھاگ رہا تھا۔ پھر وہ مہندر کے پاس سے گزرا ہی تھا کہ مہندر کی ٹانگ چل گئی اور وہ بڑی زور سے گلی میں گرا۔

ہم دونوں نے اسے بے بس کر دیا۔ بے بس تو وہ خود ہی ہو چکا تھا۔ اس کا سر سیڑھی سے ٹکرایا تھا اور وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہم نے بس اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے تھے اور منہ

پر پٹی باندھ دی تھی، پھر ہم تیزی کے ساتھ وہاں سے دوڑ گئے تھے۔ اس کے بعد ہم
مہندر کی کار تک پہنچ گئے تھے

☆======☆======☆

اب ہم شملے میں تھے۔ ہم نے بمبئی چھوڑنے سے قبل سوچا تھا کہ سالار کو
واقعات سے کسی نہ کسی طرح آگاہ کر دیا جائے جو اس رات میرے ساتھ پیش آئے تھے۔
مہندر کا خیال تھا کہ شملے روانہ ہونے سے پہلے سالار ہمیں یقیناً کچھ نہ کچھ ہدایات دے گا
مگر سالار نے نہ ذاتی طور پر ہم سے ملاقات کی نہ تنظیم کا کوئی نمائندہ ہی ہمیں کوئی پیغام
دینے آیا۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ ہمیں اپنی تازہ مہم سے متعلق نئی ہدایات شملے
میں ملنا تھیں۔

اسٹیشن سے جب تک ٹرین روانہ نہیں ہو گئی ہم بہت بے چین اور چوکنا رہے۔
چاروں، یعنی میں، لالی، مہندر اور جمشید تیسرے درجے میں سفر کر رہے تھے۔ لالی زنانہ
ڈبے میں تھی۔ ہم تینوں گو ایک ہی ڈبے میں تھے لیکن ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر
بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود ہمارے خدشات بے بنیاد ہی ثابت ہوئے۔

شملے پہنچ کر ہم لکڑ بازار کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ جمشید کے ذمے یہ کام تھا کہ
چھوٹے شملے یا منجولی میں ایک مناسب مکان کرائے پر حاصل کرنے کی کوشش کرے۔
زمانہ ویسے بھی سردی کی آمد آمد کا تھا۔ سیزن ختم ہو رہا تھا اس لیے وہاں مکان کا ملنا زیادہ مشکل
نہ تھا۔ شملے میں ان دنوں جو رونق تھی وہ اس لیے تھی کہ وہاں لیجسلیٹو کا اجلاس ہو رہا تھا۔

جمشید نے چھوٹے شملے میں ایک مکان تلاش کر ہی لیا اور ہم وہاں منتقل ہو گئے۔
اب ہمیں وہاں ہدایات کا انتظار کرنا تھا۔ ہمیں کیا کام کرنا تھا، کیا مہم ہمیں درپیش تھی، اس کا
علم ہمیں ابھی تک نہیں تھا۔ اگلے دن ہی صبح دودھ والا جب دودھ دینے آیا تو اس نے لالی کو
ایک بند لفافہ دیا۔ "بی بی جی! مہندر صاحب کے لیے ایک صاحب نے یہ چٹھی دی ہے۔"

"وہ صاحب کہاں ہیں؟" میں نے لالی کی آواز سنی تو لپک کر دروازے پر آیا۔
دودھ والا ایک سمت اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے ادھر دیکھا، دور سڑک پر ایک شخص
تیز قدم اٹھاتا جا رہا تھا۔

دودھ والا، دودھ دے کر جا چکا تھا مگر میں اور لالی وہیں چوبی راہداری میں کھڑے
رہے۔ وہ شخص جس کے بارے میں دودھ والے نے بتایا تھا کہ اس نے مہندر کے نام خط
دیا تھا، اب وہ پتھریلی سڑک کو چھوڑ کر پہاڑ کی ناہموار سطح پر چڑھنے لگا تھا۔ غالباً اس کی

کوشش یہی تھی کہ وہاں سے جلد از جلد دور پہنچ جائے۔ سڑک بل کھا کر گھومتی ہوئی اوپر جاتی
تھی یوں سڑک سے چل کر وہ کافی دیر میں اوپر پہنچتا۔ اس کے جسم پر بھاری اور لمبا
کوٹ، سر پر فلیٹ ہیٹ اور گلے میں مفلر، دیکھتے ہی دیکھتے وہ تیزی سے پتھروں اور
چٹانوں اور پہاڑی ٹیلوں کے درمیان سے گزرتا ہوا اوپر سڑک پر پہنچ گیا، وہاں سے اس
نے مڑ کر دیکھا۔ کافی فاصلے کی وجہ سے اب وہ صرف ایک ہیولا ہی رہ گیا تھا۔ پھر فلیٹ
ہیٹ کے نیچے اس کی آنکھوں پر چشمہ بھی تھا اور مفلر بھی اس کے منہ پر لپٹا ہوا تھا لہٰذا اس کی
شکل دیکھنا قطعی ناممکن ہو گئی تھی۔ میں اور لالی چوبی راہداری میں کھڑے ہوئے اسے دیکھتے
رہے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر گویا ہمیں الوداعی سلام کیا اور پلٹ کر سڑک پر بلندی کی طرف
جانے لگا، پھر ذرا ہی دیر میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

مجھے ایسا لگا تھا کہ وہ شخص سالار ہی تھا اور اسی وجہ سے میرے دل میں بڑی شدت
سے یہ خواہش نے سر ابھارا تھا کہ اس کا تعاقب کروں اور اس کی شخصیت سے آگاہ ہو
جاؤں مگر پھر میں نے اسی شدت سے اس خواہش کو کچل بھی دیا تھا۔ مجھے اس کی چال میں
چند لمحوں کے لیے شناسائی کی ایک جھلک بھی محسوس ہوئی تھی۔ اس کی چال مجھے جانی پہچانی
لگی تھی لیکن چند لمحوں بعد اس کی رفتار کا انداز میرے لیے پھر اجنبی ہو گیا تھا اور میں اس
اُلجھن میں چند لمحوں کے لیے میں نے واقفیت محسوس کی تھی اپنے کسی واقف کار سے،
سوچتا ہی رہ گیا۔

حسب توقع لفافے میں سالارِ اعظم کا پیغام ہی تھا۔ مہندر نے وہ پیغام پڑھ کر اسے
فوراً ہی جلا دیا تھا اور ہم تینوں میں سے کسی کی اتنی جرأت نہ تھی کہ مہندر سے اس پیغام کا
مضمون دریافت کر لیتے کیوں کہ وہ ہمارا گروپ لیڈر تھا۔ اگر اسے سالارِ اعظم کی طرف
سے ہدایت ہوتی تو وہ خود ہمیں اس پیغام کی نوعیت سے آگاہ کر دیتا۔

ناشتہ کرنے کے بعد مہندر، جمشید کے ساتھ وہاں سے روانہ ہو گیا۔ چلتے وقت اس
نے مجھ سے کہا تھا کہ میں بس گھر میں ہی رہوں اور باہر نہ جاؤں۔ اس نے مجھے سختی سے
تاکید کی تھی کہ میں کھڑکیوں کے پاس بھی نہ جاؤں۔ اس نے دروازہ بھی ہر وقت اندر
سے بند رکھنے کی تلقین کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر کوئی دروازہ کھٹکھٹائے بھی تو صرف لالی ہی
دروازہ کھٹکھٹانے والے سے سوال جواب کرے دروازہ ہرگز نہ کھولے البتہ میں، مہندر
یا جمشید کی مخصوص دستک پر دروازہ کھول سکتا تھا۔ میرے پوچھنے پر مہندر نے بتایا تھا کہ ایسا
کرنا ہمارے اور تنظیم کے حق میں بہتر ہے۔ حکومت کو یہ اطلاع پہنچ چکی تھی کہ لکھنؤ کے خان

بہادر شیرازی کا بیٹا، آفاق شیرازی، یعنی میں شملے پہنچنے والا ہوں۔

یہ بات میرے لیے باعث اطمینان تھی کہ میں انگریز حکومت کی نظر میں خطرناک باغی بن چکا تھا۔ مجھے فخر تھا کہ انگریز حکومت کا باغی ہونے کے ناتے سے استبداد اور نوآبادیاتی استحصال کے خلاف برسرپیکار محب وطن افراد کی فہرست میں شامل ہو چکا تھا تاہم مجھے پریشانی اس بات کی تھی کہ حکومت کو میری آمد کی اطلاع مل گئی تھی اور شملے میں میری نقل و حرکت محدود ہو کر رہ گئی تھی۔

بہر حال وہ میری زندگی کا سب سے حسین ترین دن تھا۔ آج بھی اس دن کی یاد آتے ہی میرے ذہن میں چراغاں سا ہو جاتا ہے۔ لگتا ہے کہ اچانک سیاہ آسمان پر ستاروں کی محفل سج گئی ہو، بنات النعش گردوں آسمان کی وسعتوں میں آوارہ و عریاں ہو گئی ہوں۔ ڈب اکبر کے ستاروں نے چھپر کھٹ کے گرد لڑیاں پرو دی ہوں، زمین سے آسمان تک کہکشاں نے نور پھیلا دیا ہو، سدیمیں سمٹ کے حجلۂ نور میں تبدیل ہو گئی ہوں۔ اس دن میں نے اور لالی نے شملے کے خنک ماحول کی گرم گرم اور مہکتی تنہائیوں میں جتنا طویل وقت گزارا، پھر کبھی تنہائی میں اس کے ساتھ اتنے قریب رہنے کا موقع نہ ملا۔ لالی تو اس دن جیسے پاگل ہو گئی تھی۔ مہندر اور جمشید وہاں سے گئے تو وہ دیر تک راہداری میں کھڑی انہیں دیکھتی رہی، پھر دروازہ بند کر کے واپس آئی تو اس کے سانس الجھے ہوئے تھے۔ فرش پر اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ مدہوشی کی سی کیفیت میں ڈولتی ہوئی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔

میں نے لالی کو اپنے بازوؤں میں بھر کر اسے پوری قوت سے بھینچ لیا۔ میری کوشش تھی کہ یا تو میں اس کے وجود میں سما جاؤں یا وہ میرے وجود کا حصہ بن جائے، دوئی ختم ہو جائے۔ اس کی آنکھوں میں شبنمی ستارے اتر آئے تھے، اس کے ہونٹوں پر وہ نمی پھوٹ آئی تھی جو گلاب کی پنکھڑی پر اوس کے لمس سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا تمام وجود بے ترتیب سانسوں سے متموج تھا۔ میرا چہرہ اس کے چہرے پر جھکا تو اس نے ایک دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ اپنی آنکھیں موند لیں، میرے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے مس ہوئے تو اس کے لانبے بازو میری گردن کے گرد آ گئے۔

کیسی شیرینی تھی، کیف و مستی کا کیسا عالم تھا، کیسا نشہ تھا، جسموں سے پھوٹتی ہوئی کیسی مہکار تھی۔ اس حسن اور اس واردات کو لفظوں میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ جذبے اپنے آپ میں ایک زبان ہوتے ہیں اور یہ زبان احساس کی زبان ہوتی ہے۔ لفظ انہیں بیان کرتے ہوئے مضمحل اور بے جان ہو جاتے ہیں۔

لالی کا یہ اضطراب اور بے چینی اس کے خوف کی عطا تھی۔ ہمیں کچھ پتا نہ تھا اگلا لمحہ یا آنے والا دن ہمارے لیے کیا پیغام لانے والا تھا۔ ہم سب لمحۂ موجود میں زندہ تھے اور اس لیے زندہ تھے کہ آنے والی نسلیں غلامی کے طوق سے آزاد ہو جائیں۔ ہم سب جانتے تھے کہ گزرنے والا دن ہمیں قید و بند، صعوبتوں اور اذیتوں، کالے پانی اور پھانسی سے قریب لے جا رہا ہے۔ ہم کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھے۔ ہم صرف یہ جانتے تھے کہ اپنی ہر کارروائی سے، اپنے لیے انگریزوں کے قانون کی گرفت کو زیادہ سخت کرتے چلے جا رہے ہیں۔ اپنے لیے مفر اور بچاؤ کی ہر راہ مسدود کرتے جا رہے ہیں۔

میں نے لالی کو آہستگی سے علیحدہ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ ''ارے لالی! یہ تمہاری آنکھوں میں آنسو!''

پھر وہ بلک ہی تو پڑی تھی۔ ''ہاں میرے دیوتا!'' اس نے سسکیاں لے کر کہا تھا۔ ''میں ڈرتی ہوں۔ آنے والے وقت سے ڈرتی ہوں۔ میں تمہارے لیے پریشان ہوں۔''

''پگلی!'' میں نے کہا تھا۔ ''ہمیں اس طرح ہراساں نہیں ہونا چاہیے۔ یہ سوچو لالی، اگر اس راہ میں مارے گئے تو کیا ہوا۔ آنے والے زمانے میں کوئی بھی شیرازی سے اس کی آزادی نہیں چھین سکے گا۔''

مگر آج میں سوچتا ہوں، اس وقت میں نے کتنی احمقانہ بات کہی تھی۔ وہ انسانی قدریں جنہیں مضبوط کرنے کے لیے ہم اس دور میں ہر خطرے سے گزرنے کے لیے تیار تھے، وہ اعلیٰ اقدار جن پر ہمیں یقین تھا، جو ہمارے لیے اس دور میں مشعل راہ تھیں آزادی کے باوجود ہر گزرتے دن کے ساتھ، غلامی کے خاتمے کے باوجود کمزور سے کمزور تر ہوتی [illegible]۔

اس دن دیر تک ہم اپنی جدوجہد کے حال اور مستقبل کے خطرات پر گفتگو کرتے رہے۔ اسی دوران میں کئی مرتبہ مدہوشی اور سرشاری کے جذبات بھی ہم پر غالب آئے اور بیشتر اس وقت ہوا جب ہم تجزیہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے کہ ہماری ناکامی یقینی ہے۔ پھر لالی میرے شانے سے سر ٹکا دیتی اور مہکتے ہوئے سانسوں کے درمیان اس کی آواز پھوٹتی۔ ''ہائے شیرازی جی پھر کیا ہوگا۔ اگر تم نہ رہے تو میں کیا کروں گی!''

''تم اسی راہ پر بڑھتی رہو گی۔'' میں نے ایسے ہی لہجے میں اس سے کہا تھا۔

''تمہارے بغیر تو میں کوئی محفوظ ترین سفر بھی نہیں کر سکتی شیرازی جی!'' اس نے کہا تھا۔ ''تمہارے بغیر میرے لیے اس دنیا میں کچھ بھی تو نہیں رکھا شیرازی جی!''

میں نے اس سے وعدہ لینا چاہا تھا کہ وہ میرے بغیر بھی جدوجہد کی راہ ترک نہ
کرے گی تو اس نے بڑی خوب صورتی سے بات کو ٹال دیا تھا لیکن جذبات و ہیجان کے
دوسرے لمحے میں جب میں نے پھر اس سے وعدہ کرنے کا اصرار کیا تو اس نے
گھنٹیاں بجاتے ہوئے کہا تھا۔ ''میرے دیوتا! تم سمجھتے ہو گے کہ میں پاگل ہوں
بتاؤں، بس مجھے یقین سا ہے کہ میں ایک نہ ایک دن اپنے دیوتا پر اپنی جان نچھاور کر دوں
گی اور اس اطمینان کے ساتھ مر جاؤں گی کہ میں نے اپنی زندگی کا مقصد پالیا ہے۔''
میں نے لالی کے گال پر ہلکی سی چپت لگا کر کہا۔ ''پگلی کہیں کی۔ ایسی باتیں نہیں
کرتے۔''

اس نے اپنے گال پر میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ''شیرازی جی! میں جو اتنی پاگل ہو
جاتی ہوں، جانتے ہو اس کی کیا وجہ ہے؟'' اس کی بڑی بڑی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''اس کی
وجہ صرف یہ ہے کہ مجھے اس انجام کی خبر ہے، جانتی ہوں کہ برہمن کی موت میرا مقدر ہے۔
ہم اور تم کبھی ان خوب صورت لمحوں کی انتہا کو نہیں پہنچ سکیں گے۔ یہ لمحے، یہ خوب صورت
لمحے، یہ سلگتے ہوئے یونہی ہمیشہ تشنہ رہیں گے۔ ان لمحوں کی تکمیل کبھی نہیں ہو گی مگر میں چاہتی
ہوں، میں چاہتی ہوں......'' وہ میرے شانوں سے ٹک گئی۔ ''شیرازی جی! میرے دیوتا!
میں بکھر رہی ہوں، مجھے سمیٹ لو۔'' اس نے کہا۔ میں نے اپنے جسم میں ایک اینٹھن سی
محسوس کی، میٹھا میٹھا سرور آگیں درد میرے رگ و پے میں دوڑ گیا۔ میں نے اسے بازوؤں
میں بھینچ لیا۔ ''اور زور سے شیرازی جی! اور زور سے!'' اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں
کہا۔

میری گرفت اور سخت ہو گئی۔

''میں چاہتی ہوں شیرازی جی! بس اس عالم میں مجھے موت آجائے۔'' میں نے
اس کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں سے بند کرنا چاہا کہ وہ یہ جملہ مکمل نہ کر پائے مگر میرے ہونٹ
اس جملے کی تکمیل کے بعد ہی اس کے ہونٹوں سے پیوست ہوئے تھے۔

''تو تم وہ وعدہ نہیں کرو گی۔'' میں نے لالی سے کہا۔

''ایک شرط پر، اگر میں تم پر نثار ہو گئی۔ اگر میں تم سے پہلے مر گئی تو تم کسی اور سے
شادی کرو گے۔'' اس نے میرے بازوؤں کے حلقے سے آزاد ہو کر کہا۔

''تم جانتی ہو لالی!'' میں نے کہا۔ ''اس وقت ہم اور تم اتنے قریب ہو کر بھی اتنے
دور کیوں ہیں؟ جذبات کے تیز و تند دریا کے باوجود ہم دونوں دو مخالف کناروں پر کیوں

ہیں۔ کون ہمیں اس دریا میں چھلانگ لگانے اور باہم ایک دوسرے میں جذب ہو
جانے سے روک رہا ہے؟''

''میں جانتی ہوں شیرازی جی!'' لالی نے کہا۔

''میں تمہارے بغیر اپنی زندگی کو نامکمل سمجھتا ہوں لالی!'' میں نے کہا۔ ''میں جانتا
ہوں لالی کا مکمل وجود میرے اور صرف میرے لیے ہے۔ اس وجود کے ہر انگ کی ہر مستی
میرے لیے ہے، میرا یہی یقین......''

''اور میرے دیوتا!'' لالی نے میرے ہاتھ کی انگلیاں اپنی انگلیوں میں پھنساتے
ہوئے کہا۔ ''میں بھی یہی سمجھتی ہوں شیرازی جی! ہمارا یہی یقین تو ہے جو ہمیں جذبات
کے تند دریا میں بہا نہیں لے جاتا۔ اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا تو شاید اب تک
''

میں نے لالی کو آگے کچھ نہ کہنے دیا اور اس یقین کے ساتھ کہ لذتِ وصل ہمارا مقدر
ہے، اپنی روح کی تشنگی کو اور بڑھانے کے لیے اس کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیے۔
کہ اسی یقین کی بے تابانہ شدتوں کے ساتھ لالی نے بھی مجھے بھینچ لیا۔

جسم و جاں کے تقاضے شدید تھے۔ مذاہب کا فرق ہمارے درمیان سدِ راہ نہ تھا۔ ہم
شدت سے ایک دوسرے کے طالب و مطلوب تھے۔ مگر ایک مقدس عہد تھا جو ہمیں
دریا میں داخل ہونے سے روک رہا تھا۔ یہ عہد تھا، اس مقدس سرزمین سے جس کی
آزادی کے لیے ہم سر سے کفن باندھ کر نکلے تھے۔ ہم نے اپنے لیے لذتِ وصل اس وقت
تک کے لیے حرام کر رکھی تھی جب تک لیلیٰ وطن آزادی سے ہم آغوش نہ ہو اور آزادی کی صبح
نہ ابھرتی۔

پھر بھی یہ مسرت کیا کم تھی کہ میں تھا، لالی تھی اور تنہائی تھی۔ بے پناہ مسرتوں کے ہجوم
میں ہیجانوں سے بوجھل آنکھوں میں نمی لیے ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، پھر لالی کی
آنکھوں سے آنسو ڈھلک آئے۔ مترنم ہنسی کے ساتھ وہ بلک اٹھی، جلترنگ جیسے رو دیا۔
میری آنکھوں میں بھی نمی تھی، میرے ہونٹوں پر بھی ہنسی تھی!
سرور آگیں مسرت سے چور اور نڈھال لمحے، جلترنگ کی غمزدہ دھن پر آہستہ آہستہ
سرکتے رہے۔

☆======☆======☆

''دوستو!'' سالارِ اعظم کی آواز ابھری۔ ''پہلے شملے میں ہماری صرف ایک مہم تھی

اب ہمیں دو مہمیں درپیش ہیں، ایک سیاسی اور دوسری ایک اہم سرکاری افسر کے اغوا
سالارِ اعظم کی آواز خاموشی میں ڈوب گئی۔

یہ اسی دن کے ڈھلنے پر ابھرنے والی رات تھی۔ ہم چاروں کے علاوہ کامریڈ
اور کامریڈ کوہستانی بھی وہاں موجود تھے۔ ہم سب کرسیوں پر ایک گول میز کے گرد
تھے، میز پر لالٹین رکھی تھی جس کی لو مدھم کر دی گئی تھی۔ سالار برابر کے کمرے میں
تھا۔ ہم اس کی صرف آواز سن سکتے تھے۔

''شانتا بمفورڈ نے ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنے کے لیے جس سازش کی نشاندہی
تھی، اس کا حکومت کی اعلیٰ ترین سطح سے اعلان ہونے والا تھا۔ لارڈ چیلمسفورڈ کا دور
جسے ہندوستان کے مسلمان لارڈ چلم پھوڑ کہا کرتے تھے۔ اس کی جگہ لائیڈ جارج
لارڈ ریڈنگ کو ہندوستان کا وائسرائے بنا کر بھیجا تھا۔ لارڈ ریڈنگ یہودی ہے، لائیڈ
کی طرح مسلمانوں کا بدترین دشمن بلکہ اس سے بھی دو ہاتھ آگے! لارڈ ریڈنگ
ہندوستان آمد کا مقصد یہی ہے کہ انگریزوں نے مسلمانانِ عالم کے خلاف جو مجموعی
تیار کی ہے، ہندوستان میں اس پر شدت سے عمل کرایا جائے۔ لارڈ ریڈنگ کا تقرر
میڈی ٹرینین پالیسی کو کامیابی سے ہمکنار کرانا ہے تاکہ بحیرۂ روم، نہر سوئز، بحیرۂ احمر
فارس پر اس کا مکمل کنٹرول ہو جائے اور اس کے جہاز برطانیہ سے آسٹریلیا تک کی
ٹوک کے بغیر جا سکیں۔ اس مقصد کے لیے اس نے ان سمندروں کے ساتھ ساتھ
مسلمانوں کی قوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ ترکی کے حصے بخرے کر دیے ہیں۔ اب
علاقے میں اسے آنکھیں دکھانے والی کوئی بڑی قوت موجود نہیں۔ اس کامیابی کے بعد
ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد سے پیدا ہونے والی قوت کو کیسے برداشت کر
ہے۔ لارڈ ریڈنگ ہندوستان اسی لیے بھیجا گیا ہے کیوں کہ برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج
یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ ہندوستان میں موجود اس کا وائسرائے لارڈ چیلمسفورڈ اسے
مشورے دیتا رہے کہ ترک خلافت کا مسئلہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مرضی کے مطابق
کیا جائے۔ یہودی وائسرائے لارڈ ریڈنگ کو بنیادی طور پر یہ فرض سونپا گیا ہے کہ وہ
ہندو مسلم اتحاد ختم کرا دے۔''

سالار ایک مرتبہ پھر خاموش ہو گیا۔ یہ اس کا خاص انداز تھا۔ جب وہ کوئی اہم
نکتہ یا اہم بات ہمیں ذہن نشیں کرانا چاہتا تھا تو تھوڑی دیر بعد خاموش ہو جاتا
ایک ایک بات ہمارے دماغ میں بہ آسانی بیٹھ جائے۔

''یہ عیار اور مکار شخص، یعنی لارڈ ریڈنگ.....'' سالار نے پھر کہنا شروع کیا۔ ''کل
بحیثیت وائسرائے اپنی پہلی پالیسی تقریر کرنے والا ہے۔ اس تقریر کی ایک نقل مجھے کسی
ذریعے سے مل گئی ہے۔ اس تقریر کو تم پڑھو گے تو پتا چلے گا کہ اس نے کتنی چالاکی سے
مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا ہے، ساتھ ہی ہندوؤں اور اینگلو انڈینز کو کتنی خوب صورتی
سے مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا ہے۔ اس تقریر میں خاص طور پر ترو ڑنگری کے واقعات کو
توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ اس نے الزام لگایا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں اور دوسری
قوموں کو قتل کیا اور ان کی املاک کو لوٹا ہے مگر ہم جانتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے، بہرحال مجھے پتا
چلا ہے کہ لارڈ ریڈنگ نے اس سلسلے میں مسٹر رنگا چاریہ، اینگلو انڈین نمائندے کرنل ہنری
گڈنی اور جمنا داس دوارکا داس سے ملاقات کی ہے۔ مسٹر رنگا چاریہ لیجسلیٹو میں تحریکِ
التوا کا نوٹس دینے پر تیار ہو گئے ہیں۔ باقی دونوں افراد اس تحریک کی حمایت پر آمادہ ہیں۔
لارڈ ریڈنگ کے ایما پر اب یہ حضرات، لیجسلیٹو کے ہندو اور اینگلو انڈین ارکان سے
ملاقاتیں کر رہے ہیں اور انہیں موپلا بغاوت کے بارے میں غلط بیانیوں سے مسلمانوں کے
خلاف اکسا رہے ہیں۔ مقصد صرف یہ ہے کہ لیجسلیٹو میں ڈیموکریٹک پارٹی کے نام سے جو
ہندو مسلم اتحاد قائم ہے، وہ ختم کر دیا جائے اور یوں ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا کر
ان کی قوت کو منتشر کر دیا جائے جو انگریزوں کی میڈی ٹرینین پالیسی کے لیے سب سے بڑا
خطرہ بن گئی ہے۔''

''مگر جناب!'' مہندر نے کہا۔ ''آپ کی گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم دراصل اس
بڑی تحریک ہی کا ایک حصہ ہیں جو اس وقت ہندوستان میں جاری ہے جب کہ بنیادی طور
ہماری تحریک کا مقصد اس سے کہیں مختلف ہے۔ ہماری تنظیم کا بنیادی مقصد تو انگریزوں کی
سرکاری مشینری پر ضرب لگا کر اسے معطل کرنا ہے۔''

''ہاں، ہمارا مقصد یہی ہے۔'' سالار نے کہا۔ ''اور ہم اپنے نصب العین پر قائم
ہیں۔ میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب پھر کہتا ہوں کہ سیاسی سطح پر اس وقت جو ہندو مسلم اتحاد
ہے، وہ محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ یہ اتحاد محض دکھاوے کا ہے۔ اس اتحاد کو بالآخر ختم ہونا
ہے۔ یہ اتحاد جتنی زیادہ دیر قائم رہے اتنا ہی اچھا ہے کیوں کہ یہ اتحاد ہمارے عظیم تر
مقصد کے لیے بھی بہت اہم ہے اسی لیے ہماری کوشش یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں
مسلمانوں اور ہندوؤں کو آپس میں لڑانے کے لیے انگریز نے جو منصوبہ بنایا ہے اسے ناکام
یہ وہ قوت ہے جس سے انگریز ہراساں ہے اور جسے منتشر کرنے کے لیے اس نے

نہایت عیاری سے ایسا جال پھیلایا ہے جس میں ہندوستانیوں کا پھنس جانا لازمی
ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہندوستان کے لوگوں کو اس جال میں نہ پھنسنے دیں ہماری
کوشش بھی ہمارے اصل کاز کو تقویت پہنچائے گی۔ سیدھے سادے انداز میں اسے یوں
سمجھو کہ جس چیز کو انگریز اپنے لیے خطرناک سمجھتا ہے، وہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔
سالارِ اعظم کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے معدوم ہوگئی۔

چند لمحے کمرے میں سناٹا چھایا رہا، پھر سالارِ اعظم کی آواز نئی توانائی کے ساتھ
ابھری۔ ''مہندر اور جمشید، اس سلسلے میں تمہارے ذمے یہ فرض ہے کہ تم لیجسلیٹو کے ان
ارکان سے ملو جن کا تعلق ڈیموکریٹک پارٹی سے ہے۔ انہیں بلا کم و کاست بتاؤ کہ ترونگری
میں واقعات کس طرح پیش آئے، حالات کو کس طرح خراب کیا گیا، انگریز انتظامیہ نے
کس طرح ان فسادات کا اہتمام کرایا۔ لیجسلیٹو کے دو ارکان نے انگریزوں کے ایما پر
ترونگری میں کیا کردار ادا کیا۔ ہمارے پاس وقت کم ہے۔ کل لارڈ ریڈنگ اپنی یہ زہریلی
تقریر کر رہا ہے۔ اس کے بعد ایک دن کا وقفہ ہوگا اور لیجسلیٹو کا اجلاس شروع ہو جائے گا
جس میں رنگا چاریہ، موپلا بغاوت سے متعلق اپنی تحریک التوا پیش کرنے کا نوٹس دے گا۔
لارڈ ریڈنگ نے اسے اس پر آمادہ کیا ہے۔ اس کے سامنے حالات کی غلط اور گمراہ کن
تصویر پیش کی گئی ہے۔ تم دونوں رنگا چاریہ سے ملو، اسے تمام واقعات بتا کر اس ارادے
سے باز رکھو۔ لارڈ ریڈنگ کی کوشش ہے کہ اس تحریک التوا کے سہارے ہندو مسلم منافرت
کو بھڑکا دے، ہندو مسلم اتحاد کی اس فضا کو مسموم کر دے جو اس وقت پورے ہندوستان میں
قائم ہے۔ کرنل گڈنی اور جمنا داس [illegible] ملنے کی کوشش ہی نہ کرنا۔ کیوں کہ یہ صرف وقت
ضائع کرنے والی بات ہوگی۔ رنگا چاریہ کے بعد تم لیجسلیٹو میں ڈیموکریٹک پارٹی کے
دوسرے ارکان سے بھی ملنا اور انہیں اس بات پر آمادہ کرنا کہ موپلا بغاوت سے متعلق تحریک
التوا کا کوئی نوٹس بھی پیش کیا جائے تو وہ اس کی سخت مخالفت کریں۔'' سالار خاموش ہوگیا۔
چند لمحوں بعد اس نے پھر کہا۔ ''بیٹے لالی! ہم چائے پئیں گے، انگیٹھی پر پانی رکھ دو۔''

لالی نے کمرے میں دہکتی ہوئی انگیٹھی پر پانی رکھ دیا۔ اس دوران میں ہم ایک
دوسرے سے سرگوشیاں کرتے رہے۔ کچھ دیر بعد سالار کی آواز پھر ابھری۔ ''ہاں اب
لوگوں کے لیے ایک اطلاع بھی ہے۔ تمہارے ساتھیوں نے میرٹھ میں اناج کی منڈی تباہ کر
دی ہے۔ اس مرحلے پر یہ کارروائی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ انگریزوں کے ایوان
حکومت میں اس واقعے سے زلزلہ آ گیا ہے کیوں کہ اس قسم کے واقعات انہی دنوں میں

آسام، بہار، سی پی اور اڑیسہ میں بھی ہوئے ہیں۔ وہاں ہونے والے واقعات میں
ہماری تنظیم کا براہِ راست کوئی ہاتھ نہیں لیکن میرٹھ میں یہ کارروائی ہماری تنظیم ہی نے
کی ہے۔ بہرحال انگریز حکومت تمام واقعات کو ایک منظم سازش اور ایک منظم گروہ کا نتیجہ
سمجھتی ہے۔ ہمیں انگریز حکومت کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔
میں تمہیں بتاؤں کہ یہ کام تمہارے ساتھی غزنوی اور اس کے گروپ کا ہے۔ غزنوی تمہیں
اس کی تفصیلات بتا دے گا۔''

مجھے سخت حیرانی ہوئی۔ غزنوی اور کوہستانی شام سے وہاں تھے لیکن انہوں نے اپنی
کارروائی کے بارے میں ایک لفظ نہیں کہا تھا۔

''اور دوسری مہم کیا ہے؟'' مہندر نے دریافت کیا۔

''یہ پہلا موقع ہے کہ تنظیم کے دو گروپ ایک دوسرے کی مہم کی نوعیت سے واقف
ہیں اور اس لحاظ سے بھی یہ پہلا موقع ہے کہ تنظیم کے کئی افراد ایک دوسرے کے حقیقی ناموں
سے آگاہ ہوئے ہیں۔ صرف غزنوی اور کوہستانی ایسے ہیں جن کے اصل نام کسی کو معلوم
نہیں۔ خیر تو دوسری مہم کی نوعیت سنو۔ برطانوی دفتر خارجہ کا ایک اہم افسر بھی لارڈ ریڈنگ
کے ہمراہ یہاں آیا ہے۔ اس کا نام کیمبرلے ہے۔ اس کی آمد ایک نہایت اہم مشن کے سلسلے
میں ہے۔ فارن آفس اور ڈیفنس کے بعض افسروں اور کارندوں پر مشتمل ایک خصوصی سیکشن
اس کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ اس مشن کا تعلق برطانیہ کی میڈی ٹرینین پالیسی ہی سے
ہے۔ کیمبرلے مشن کی اصل نوعیت کا علم نہیں ہو سکا ہے لیکن اس کی اہمیت کا اندازہ یوں لگایا
جا سکتا ہے کہ اس کی آمد کو بالکل خفیہ رکھا گیا ہے۔ یہ شخص برطانوی فوج میں بھی رہ
چکا ہے۔ پتا چلا ہے کہ اس کا تعلق اسلحہ سازی ہے۔ اس کے قریبی حلقوں کا کہنا ہے کہ
قدرت نے ایک شیطانی دماغ پایا ہے۔ اسی دماغ کی بدولت وہ فوج سے دفتر خارجہ میں
آیا ہے۔ ہندوستان میں اس کی آمد خالی از علت نہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ انگریز،
مشرقِ وسطیٰ سے مشرقِ بعید تک تمام علاقوں میں ایشیائی عوام کے خلاف اپنی تمام
کارروائیوں کو ہندوستان ہی سے کنٹرول کرتا ہے۔ خصوصاً مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے
خلاف ان کا فوجی مستقر یہی ہندوستان ہے۔ اڑتی سی خبر ملی ہے کہ یہ شخص یہاں ہندوستان
میں کسی بھیانک منصوبے پر عمل درآمد کے لیے حکمت عملی تیار کر رہا ہے۔ ہمیں اس شخص
کو اغوا کرنا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس پر برطانیہ میں بیٹھے ہوئے بے رحم شاطروں کو
اعتماد ہے۔ ہمیں اس شخص کو اغوا کرنا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ انگریز کی سازش کیا

ہے۔ لالی بیٹے چائے بنی؟''

ہم سب کے دل دھڑک رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید سالارِ اعظم میرے سپرد کرے گا کیوں کہ مہندر کو دوسری سیاسی مہم سونپی گئی تھی۔ لالی نے چائے پہلے سالارِ اعظم کو پیش کی، پھر ہم سب کے سامنے گرم گرم چائے کی پیالیاں رکھ دیں۔

چائے پیتے ہوئے سالارِ اعظم نے کہا۔ ''اس خطرناک مہم کا سربراہ کوہستانی غزنوی اور شیرازی اس کے ساتھ ہوں گے۔ شیرازی اس مہم کی حکمت عملی کا ابتدائی خاکہ تیار کرے گا اور اس خیال کو ملحوظ رکھے گا کہ اس مہم کو ہر قیمت پر کامیاب ہونا ہے۔ اس ابتدائی خاکے میں غزنوی اور کوہستانی کے مشورے سے ترمیم و تبدیلی کے بعد حتمی حکمت عملی تیار کی جائے گی۔''

گویا سالارِ اعظم اب بھی مجھ سے ناراض تھا اسی لیے اس نے کوہستانی کو اس مہم کا سربراہ بنایا تھا

''جناب! میں بھی اس مہم میں......'' مہندر نے کہنا چاہا۔

''میں تمہارے جذبات کو بخوبی سمجھ سکتا ہوں۔'' سالارِ اعظم نے کہا۔ ''مگر میں نے تمہیں ایک زیادہ اہم اور نازک مہم سپرد کی ہے۔ اس مہم میں ہماری کامیابی، ہمارے کاز کے لیے مناسب فضا ہموار کرے گی، پھر میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ شملے میں موجود تنظیم کے تمام سرفروشوں کو خطرے میں ڈالوں۔''

میں سالارِ اعظم کو بمبئی میں اسپیشل پولیس کے ساتھ پیش آنے والے واقعات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔

میں نے اس سلسلے میں ابھی چند الفاظ ہی کہے تھے کہ سالارِ اعظم نے میری بات کاٹ دی۔ ''مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ اس وقت بھی تمہارے بعض سرفروش ساتھی تمہارے بے حد قریب تھے۔ وہ تمہیں کسی خطرے میں نہیں پڑنے دیتے۔''

پھر یہ اجلاس ختم ہوگیا۔ میں، غزنوی اور کوہستانی کے ساتھ ہی وہاں سے چلا آیا سالارِ اعظم کا کہنا تھا کہ اب مہندر، لالی اور جمشید کے ساتھ میرا رہنا مناسب نہیں تھا۔

☆======☆======☆

کہتے ہیں قدرت نے رات آرام کے لیے بنائی ہے لیکن میرے خیال میں یہ قوموں کے لیے درست ہے جو آزادی کے سورج میں غسل لیتی ہیں جب کہ اس دور ہندوستان اور اس کے باسی غلامی کی سیاہ رات میں زندہ تھے۔ ہمارے چاروں طرف

یوں اور ناامیدیوں کی تاریکیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ محکومی نے فضا کو دھواں دھواں کر رکھا تھا، سانس لینا بھی محال تھا۔ پورے ہندوستان کا دم گھٹ رہا تھا، ہندوستان کے باسی تازہ ہوا کے لیے ترس رہے تھے، ہم تاریک رات کے مسافر تھے۔ اس سیاہ شب دراز تھا اور ہم سیاہ تاریک رات کے سینے میں سینده لگانا چاہتے۔ ہم اس سورج تک پہنچنا چاہتے تھے جو اس گھپ اندھیری رات کی فصیلوں کے پیچھے تھا۔ ہم ایسے لوگوں کے لیے شام و سحر کے سلسلے بے معنی تھے۔ اس نوعیت کی مہمیں ہم رات ہی کو سر کرتے تھے جو ہمیں درپیش تھیں۔ سو اس رات بھی ایسا ہی تھا۔

یہ رات سالارِ اعظم کی جانب سے ہدایات ملنے کے بعد ساتویں رات تھی۔ اس میں مہندر کی نازک مہم ناکام ہوگئی تھی۔ وہ رنگا چاریہ کو موپلوں کی بغاوت سے متعلق التوا کا نوٹس دینے سے باز نہیں رکھ سکا تھا پھر بھی اس کی یہ مہم قطعی ناکام نہیں ہوئی تھی کہ لیجسلیٹو کے کئی ڈیموکریٹک اراکین کو مہندر نے تروژنگری میں پیش آنے والے اور حقائق سے آگاہ کر دیا تھا اور انہیں اس تحریک کی مخالفت پر آمادہ کر لیا تھا مگر اپنی کوشش میں کامیاب ہوگیا تھا۔ رنگا چاریہ، جمنا داس اور کرنل گڈانی نے اس کے نوٹس پر تقریر کرتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف خوب زہر اگلا، انہوں نے طور پر مولانا محمد علی جوہر کے خلاف خوب زہر اگلا اور ان پر مقدمہ چلانے کا مطالبہ بھی

اس عرصے میں ہم کیمبرلے کے اغوا کی منصوبہ بندی کرتے رہے۔ کیمبرلے ایک بنگلے میں مقیم تھا۔ یہ بنگلا آبادی سے ذرا ہٹ کر تھا۔ کیمبرلے کی اہمیت کا اندازہ بات سے لگایا جا سکتا تھا کہ اس کے تحفظ کے لیے سادہ لباس میں چار فوجی ہر وقت بنگلے پر موجود رہتے تھے۔ یہ چاروں فوجی انگریز تھے۔ ان کے علاوہ اس کا باورچی بھی انگریز ہی تھا۔ کیمبرلے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگ سکتا ہے کہ یہ وہ شخص تھا جو دن رات کسی بھی وقت، وائسرائے اور کمانڈر انچیف سے مل سکتا تھا۔

کیمبرلے کے اغوا کے لیے میں نے جو منصوبہ بنایا تھا، کوہستانی اور غزنوی نے اسے ترمیم اور تبدیلی کے بغیر منظور کر لیا تھا۔ میں نے کیمبرلے کے اغوا کا جو منصوبہ بنایا تھا، سب سے زیادہ اہمیت موقع واردات سے تیزی کے ساتھ محفوظ فرار کو دی تھی۔ ان شملہ کوئی معمولی شہر نہ تھا۔ شملے میں صرف وائسرائے کی یا پھر اعلیٰ سرکاری حکام کی سکتی تھیں۔ سرکاری کام میں استعمال ہونے والی گاڑیوں کے لیے پاس ہوتے

تھے۔ شملے کی دو سڑکیں ایسی تھیں جن پر ہر وقت پولیس کی کڑی نگرانی رہتی تھی۔ اس بنگلے سے جس میں کیمبر لے مقیم تھا، اگر ہم اپنی کمیں گاہ پہنچنا چاہتے تو انہی دو سڑکوں میں سے ایک کو استعمال کرنا پڑتا۔ رات کے وقت تین افراد کا کسی کو اغوا کر کے وہاں سے گزرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔

میں نے اس مہم کو سر کرنے کے لیے ایک نیا طریقہ اختیار کیا تھا۔ ہم کیمبر لے کو اغوا کر کے کسی سڑک سے گزرے بغیر، کسی پگڈنڈی کو اختیار کیے بغیر، زمین پر قدم رکھے بغیر موقع واردات سے صرف پانچ منٹ میں ایک فرلانگ دور پہنچ سکتے تھے۔ اگر عام مختصر ترین راستے سے بھی کوئی اس مقام تک پہنچنا چاہتا تو اس میں اسے چار پانچ میل کا چکر کاٹنا پڑتا اور کوئی تین گھنٹے لگتے۔

اس بنگلے کے عقب میں گہرے کھڈ تھے۔ جو یکے بعد دیگرے وسیع و عریض سیڑھیوں کے مانند نیچے ہی نیچے بڑھتے چلے گئے۔ بنگلے سے قدرے بلندی پر ایک چٹان تھی۔ یہ بڑی سی مسطح چٹان، ایک پہاڑ کے دامن میں تھی۔ ہم نے اس مسطح چٹان کو اپنے فرار کے سفر کے خاطر پلیٹ فارم کے طور منتخب کیا تھا جب کہ نشیب میں آخری کھڈ کے کنارے کو ہم نے سفر کے اختتام کے لیے پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ سفر کے آغاز اور اختتام کے لیے ان دونوں مقامات کے انتخاب میں سروے آف انڈیا کے ایک سرویر نے تھیڈ ولائٹ سے علاقے کا جائزہ لینے کے بعد ہماری مدد کی تھی۔ یہ سرویر ایک ہندو تھا۔ اپنے اندر ایک بے قرار انقلابی روح رکھتا تھا۔ وہ کامریڈ کوہستانی کا دوست تھا لیکن اسے ہم نے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ اس سرویر نے حساب کتاب لگا کر ہمیں بتایا تھا کہ ان دونوں مقامات کے مابین براہِ راست فاصلہ ایک فرلانگ سے پچیس تیس گز کم تھا۔

بلندی پر مسطح چٹان اور نشیب میں آخری کھڈ کو پلیٹ فارم کے طور استعمال کرنے کے لیے ہم نے چٹان سے بلندی پر اور نیچے آخری کھڈ میں دو بلند اور مضبوط درخت منتخب کیے تھے۔ یہ دونوں درخت رسی اور پلی کے نظام کے لیے دو ستونوں کا کام دینے والے تھے۔

کیمبرلے کے بنگلے کے آخری حصے میں پہاڑی کھڈوں کا یہ سلسلہ بالکل غیر آباد اور سنسان تھا کیونکہ اس حصے کی ڈھلان خطرناک طور پر نیم عمودی تھی جس پر اترنا چڑھنا خاصا دقت طلب تھا۔ اس علاقے میں ہماری بے ضرر سرگرمیوں کو دیکھنے والا کوئی نہ تھا اور اگر کوئی دیکھ بھی لیتا تو اس کے لیے اصل مقصد تک پہنچنا ناممکن تھا۔

ہم نے اپنی کارروائی کے پہلے مرحلے کا آغاز صبح سورج نکلتے ہی کر دیا تھا۔ یہ مرحلہ

ہم نے نشیب سے شروع کیا تھا۔ ہم ایک مضبوط ستلی کو نیچے نشیب سے لے کر چلے تھے اور اسے بنگلے کے نیچے کھڈ تک لے آئے تھے۔ یہ کام خاصا وقت طلب تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ یہ علاقہ درختوں سے محروم تھا۔ یہاں صرف جھاڑیاں اور پتھر تھے جن پر سے ستلی گزارنا ہمارے کچھ مشکل نہ تھا۔ ستلی کو مسطح چٹان سے اوپر پہاڑی پر واقع درخت تک پہنچانے کا دوسرا مرحلہ ہم نے غروب آفتاب کے فوراً ہی بعد مکمل کر لیا تھا۔

جب رات خاصی بھیگ گئی، وادی میں پھرنے والی آوارہ ہوا اور بھی تیز ہو گئی، لوگ گہری نیند کی آغوش میں چلے گئے تو ہم پلی اور رسی کے نظام کی تکمیل میں لگ گئے۔ بلندی اور نشیب میں ستونوں کے طور پر منتخب کیے جانے والے درختوں میں دو بڑی بڑی پلیاں باندھ دی گئیں۔ ان پلیوں اور نشیب سے بلندی تک آنے والی مضبوط ستلی کی مدد سے پون انچ موٹا پٹ سن کا رسا دوہرا کر کے دونوں پلیوں کے درمیان تان دیا گیا۔ یہ رسا ہم نے علی الصباح ہی نشیب میں پہنچا دیا تھا۔ اتنا لمبا رسا بنانے میں ہم نے خاصی محنت سے کام لیا تھا۔ درمیان میں آنے والے جوڑوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ لوہے کے تار سے اس طرح جوڑ دیا گیا تھا کہ جوڑ پر اس کی سطح قطعی ہموار رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی آدھا انچ موٹا رسا بھی دونوں درختوں کے درمیان تان دیا گیا۔ پون انچ موٹے رسے پر اس متحرک پلی کو چلنا تھا جس کے نیچے ہک میں ایک بڑا سا تھیلا لٹکایا جانا تھا جب کہ نصف انچ موٹی رسی کا مقصد پلی کی حرکت کو کنٹرول کرنا تھا۔

اس مرحلے کی تکمیل میں ہمیں رات کا ڈیڑھ بج گیا اور ہمارے فرار کی راہ مکمل ہو گئی۔ اس کام کی تکمیل کے بعد ہم نے ٹارچوں سے سگنل دے کر تیاری اور اطمینان کا اظہار کر دیا۔ اس معلق پل کی تیاری میں ہمیں نشیب سے مہندر، جمشید اور دوسر فروشوں کی مدد بھی حاصل تھی کیوں کہ ان رسوں کو جن پر پلی کو پھسلنا تھا۔ انتہائی سختی اور مضبوطی سے تاننا ضروری تھا تا کہ ان کے درمیان کم سے کم جھول رہے۔ اس کام کے لیے نشیب میں بنی ہوئی پن چکی کی طاقت استعمال کی گئی تھی جس پر ہم نے علی الصبح ہی قبضہ کر لیا تھا اور اس کا مالک ہمارے قبضے میں تھا۔ صورت حال یہ تھی کہ مہندر اپنے ساتھیوں سمیت نیچے تھا اور غزنوی مسطح چٹان کے عقب میں واقع پہاڑی پر اس درخت پر متعین تھا جو رسی اور پلیوں کے اس نظام کا بالائی ستون تھا۔ وہاں اس نظام کے تحفظ کی ذمے داری غزنوی پر عائد تھی۔ کیمبرلے کو اغوا کرنے کا کام مجھے اور کوہستانی کو انجام دینا تھا۔

رات کے ٹھیک دو بجے ہم اصل مہم سر کرنے کے لیے حرکت میں آ گئے۔ رسوں پر

پھسلنے والی پلی کی ہک میں ایک اور پلی لٹکا دی گئی۔ یہ پلی آدھے انچ کے اس رسے سے بندھی ہوئی تھی جس سے متحرک پلی کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔ ہم دونوں اس چھوٹی پلی سے لٹکے ہوئے پٹ سن کے بورے کے پیندے میں لگے ہوئے چوکور تختے پر کھڑے ہو گئے اور بورے کو اوپر کھینچ لیا گیا۔ اب ہم پلی سے لٹکے ہوئے تھے۔ اس وقت غزنوی نے ٹارچ کی روشنی سے نشیب میں اشارہ کیا۔ اگلے لمحے نیچے متحرک پلی کو کنٹرول کرنے والی رسی کو ڈھیل دی جانے لگی ساتھ ہی ہم اس تھیلے میں لٹکے ہوئے آہستہ آہستہ نیچے پھسلنے لگے۔

''خدا حافظ، کامریڈ!'' غزنوی نے کہا۔

''خدا حافظ!'' میں نے اور کوہستانی نے ایک ساتھ جواب دیا۔

ڈھیل بڑی آہستگی اور روانی کے ساتھ دی جا رہی تھی۔ میرے تلووں سے ایک عجیب سی سنسنی شروع ہوئی اور تمام جسم میں دوڑ گئی۔ چند ہی لمحوں بعد ہم مسطح چٹان پر تھے۔ میں نے ٹارچ جلا کر نشیب کی طرف اشارہ کیا۔ ڈھیل دینے کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اب ہم مسطح چٹان پر معلق تھے۔ ہمارا اندازہ درست ہی ثابت ہوا، تھیلا چٹان سے چند انچ اوپر تھا۔ متحرک پلی اب اس تیسری رسی سے بھی رکی ہوئی تھی جو ہک میں لٹکی ہوئی چھوٹی سی پلی کے گرد گھوم کر پٹ سن کر بورے سے بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اسی رسی کو جھٹکا دے کر غزنوی کو اشارہ دیا۔ غزنوی نے تیسری رسی کو ڈھیل دی اور بوری چٹان پر آ گئی۔ ذرا ہی دیر میں ہم اس بوری سے باہر تھے۔

''کتنا سنسنی خیز تجربہ ہے!'' کوہستانی نے کہا مگر میں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

ہم اس مسطح چٹان سے اتر کر کیمبرلے کے بنگلے کے عقب میں پہنچ گئے۔ اس بنگلے کا نقشہ ہمیں پہلے ہی فراہم کر دیا گیا تھا جس کا ہم نے کئی مرتبہ بغور مطالعہ کیا تھا۔ اس نقشے کو ذہن میں محفوظ کرنے کے بعد ہم اس بنگلے کے چپے چپے سے واقف ہو گئے تھے۔ پھر میں نے اور کوہستانی نے مسلسل چار راتیں جاگ کر، اس بنگلے میں موجود لوگوں کے معمولات کا مشاہدہ کیا تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ سادہ لباس میں چار مسلح فوجی محافظ ہر وقت اس بنگلے میں موجود رہتے ہیں۔ دو محافظ آرام کرتے ہیں اور دو پہرہ دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک ہر وقت گیٹ پر موجود رہتا ہے اور دوسرا، بنگلے کا چکر لگاتا رہتا ہے۔ کیمبرلے کے بارے میں یہ پتا چلا تھا کہ وہ رات گئے تک کام کرتا ہے۔ ہمارا مشاہدہ تھا کہ بنگلے کے ایک کمرے میں جو غالباً کیمبرلے کا سٹڈی روم تھا، رات تین بجے تک روشنی رہتی تھی۔ وہاں کیمبرلے کام کرتا ہوگا۔ ٹھیک تین بجے اس کمرے کی روشنیاں بجھ جاتی تھیں اور اس کے برابر والے

بتی جو اس کا شب خوابی کا کمرہ تھا، چند منٹ تیز روشنی رہتی پھر وہ گل ہو جاتی اور ہلکی روشنی باقی رہ جاتی گویا کیمبرلے سوا تین بجے تک سونے کے لیے لیٹ جاتا تھا۔ ... بجے بنگلے کے عقبی حصے میں گشت کرنے والا محافظ گیٹ پر آتا اور گیٹ کے محافظ ... کر تھرموس سے چائے نکال کر پیتا۔ یہاں دس پندرہ منٹ گزار کر وہ پھر چوکسی عقبی حصے کی طرف نکل جاتا اور کہیں برآمدے میں کسی ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ ... دو محافظ بنگلے کی انیکسی میں سویا کرتے جہاں کیمبرلے کا باورچی بھی رہا کرتا تھا۔

بنگلے کے عقبی حصے میں بڑا سا لان تھا جس کے اردگرد گھنی جھاڑیوں کی باڑھ تھی۔ ان ... میں ہم نے ان گھنی جھاڑیوں کے درمیان ایک ایسی جگہ تلاش کر لی تھی جہاں چاروں ہاتھ پیروں پر جھک کر لان میں داخل ہو سکتے تھے۔ لان کی سمت کیمبرلے کی ...گاہ کا دروازہ بھی کھلتا تھا اور اسٹڈی کا بھی۔ ٹھیک ڈھائی بجے جب میں نے گشتی عقبی محافظ کو گیٹ پر آتے دیکھا۔ میں نے ایک چھوٹا سا کنکر زور سے بنگلے کے عقب کی انداز اُس مقام کے پاس پھینکا جہاں کوہستانی موجود تھا اور پھر خود بھی لمبا چکر کاٹ ... جگہ پہنچ گیا جہاں سے ہم نے بنگلے کے احاطے میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ ... وہاں نہیں تھا۔ وہ احاطے میں داخل ہو چکا تھا۔ ذرا ہی دیر بعد میں بھی احاطے ...تک گیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ کوہستانی اس وقت بنگلے میں کس جگہ ہوگا۔

ابھی محافظ کو گیٹ پر گئے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے۔ ہمیں دس منٹ کے اندر بنگلے کے ...کمروں میں داخل ہونا تھا، یعنی کیمبرلے کی خواب گاہ میں یا پھر ڈرائنگ روم میں جو ...گاہ کے برابر ہی تھا۔

میرا خیال ہے کہ نہ صرف کیمبرلے بلکہ اس کے محافظ بھی یہی سمجھتے تھے کہ کیمبرلے ...کی خاطر کیے جانے والے انتظامات، محض حکومت کے اعلیٰ اہل کاروں کا سنکی پن ... یہ تاثر دینے میں خود کیمبرلے کا بھی ہاتھ رہا ہوگا اور اسی کی اجازت سے روزانہ ...محافظ ایک مخصوص وقت پر ایک جگہ جمع ہو کر چائے پیا کرتے ہوں گے۔ ان کی یہی ... ہوئی خود اعتمادی ہمارے حق میں سودمند ثابت ہوئی۔ بغیر کسی پریشانی اور ... میں جھاڑیوں کے درمیان سے رینگ کر چاروں ہاتھ پیروں کے بل دوڑتا ہوا ... جگہ پہنچا جہاں کوہستانی میرا منتظر تھا۔ میرے وہاں پہنچتے ہی کوہستانی نے سرگوشی ... بتایا کہ خواب گاہ کا عقبی دروازہ کھلا ہوا ہے۔ چند لمحوں بعد کوہستانی آہستگی سے ... کر خواب گاہ میں رینگ گیا۔ اسے کیمبرلے کی مسہری کے نیچے چھپنا تھا۔ میں

اسی دروازے کے سامنے برآمدے کے نیچے کیاری میں لگے ہوئے پودوں کے درمیان سادھ کر بیٹھ گیا۔

وقت کا دریا، قطرہ قطرہ بہتا رہا۔ لمحے ٹپ ٹپ گرتے رہے۔

عقبی حصے کا محافظ، احاطے کا چکر لگا کر برآمدے میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی کرسی کیمبر لے کی اسٹڈی کی کھڑکی کے سامنے تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا دھیمی آوازی میں کوئی محبت بھرا گیت گا رہا تھا۔ غالباً اسے رات کی ان تنہائیوں میں ہندوستان سے ہزاروں میل دور، انگلستان میں بیٹھی ہوئی اپنی محبوبہ یاد آ رہی تھی۔

پھر میں نے اسی کھڑکی سے کیمبر لے کی آواز سنی۔ ''چارلس!'' اس نے محافظ سے کہا۔ ''سب کچھ ٹھیک ہے۔''

''یس سر!'' محافظ نے کرسی سے کھڑے ہو کر جواب دیا۔ ''حسب معمول۔''

''گڈ نائٹ!'' کیمبر لے کی آواز ابھری۔

''گڈ نائٹ سر!'' محافظ نے جواب دیا۔

کیمبر لے نے کھڑکی بند کر لی۔ چند ہی لمحوں بعد اسٹڈی کی روشنیاں بجھ گئیں۔ کھڑکی سے آتی ہوئی روشنی کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ محافظ اپنی کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اپنی جگہ سمٹ کر اور ساکت ہو کر بیٹھ گیا۔ محافظ چلتا ہوا برآمدے کے آخری کونے تک گیا۔ اسی انداز میں پھر واپس جا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسی دوران میں کیمبر لے کی خواب گاہ کی روشنیاں بجھ گئی تھیں اور ہلکی نیلی روشنی پھیل گئی تھی۔ عقبی احاطہ اور برآمدہ اب مکمل تاریکی میں ڈوب گئے تھے۔

لمحوں کی پیمائش بڑھتی رہی، میرا دل اب زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ خواب گاہ سے کیمبر لے کے خراٹوں کی مدھم آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی ہماری سکیم کے آخری فیصلہ کن لمحات قریب آ پہنچے تھے۔ کوہستانی کو اب سوتے ہی میں کیمبر لے کو کلوروفارم سنگھا کر بے ہوش کرنا اور اس کے ہاتھ پیر باندھ دینا تھے۔ اس کام کی تکمیل کے بعد اسے خواب گاہ کے دروازے سے مجھے اشارہ کرنا تھا اور مجھے کرسی پر بیٹھے ہوئے محافظ کا انتظام کرنا تھا۔

میں نے جیب سے غلیل اور لوہے کا کانٹے دار غلہ نکال لیا۔ اعصاب شکن لمحے گزرتے رہے۔ میرے دانت ایک دوسرے پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے اور میرے جبڑوں میں ہلکا ہلکا سا درد محسوس ہونے لگا تھا۔ وقت تھا کہ گزر ہی نہیں رہا تھا۔ آخر کوہستانی نے خواب گاہ کے دروازے سے مجھے اشارہ کیا۔

میں آہستگی کے ساتھ کیاری سے رینگ کر باہر آیا۔ ہلکی سرسراہٹ ہوئی جو اس ماحول میں زور دار چیخ معلوم ہوئی تھی لیکن وادی میں پھرنے والی تیز آوارہ ہوا نے سرسراہٹ کی اس آواز کو اپنی سائیں سائیں کا ایک حصہ بنا لیا تھا۔ چارلس نامی محافظ اس احاطے کی طرف منہ کیے کوئی گیت گانے میں معروف تھا۔ میں گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھا ہوا اور پوری قوت سے غلیل کی موٹی اور سخت ربر کھینچ لی۔ اگلے لمحے لوہے کا کانٹے دار غلہ پوری بے رحمی کے ساتھ محافظ کی کھوپڑی میں کنپٹی کے آس پاس کہیں بیٹھ گیا اور وہ آواز نکالے بغیر ہی کرسی پر بے ہوش ہو گیا۔ پھر میں دوڑتا ہوا وہاں پہنچا۔ اس خیال سے کہ جلد ہوش میں آ کر وہ چیخنا نہ شروع کر دے۔ میں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونسا۔ اس کے ہاتھ پیر باندھنا بھی ضروری تھے۔ میں نے چند منٹوں میں یہ کام انجام دے دیا اور چارلس کو کرسی سے اٹھا کر برآمدے کے ساتھ ہی بنی ہوئی کیاری میں ڈال دیا۔ اس دوران میں کوہستانی بے ہوش کیمبر لے کو اپنے کاندھے پر لاد کر برآمدے میں آ چکا تھا۔

''تم اسے لے کر چلو۔'' کوہستانی نے مجھ سے کہا۔ ''میں اسٹڈی کی تلاشی لیتا ہوں، شاید کچھ اہم کاغذات ہاتھ لگ جائیں۔''

کوہستانی کی یہ تجویز مجھے پسند آئی تھی۔ میں نے بے ہوش کیمبر لے کو اپنے شانے پر لادتے ہوئے کہا۔ ''جلدی کرنا۔''

''بے فکر رہو۔'' کوہستانی نے سرگوشی میں جواب دیا اور خواب گاہ میں رینگ گیا۔ میں تیز تیز قدم اٹھاتا باڑھ کے اس حصے کی طرف بڑھ گیا جہاں سے ہم اندر آئے تھے۔

باڑھ کو پار کرنے کے لیے میں نے کیمبر لے کو زمین پر ڈال دیا اور اسے باڑھ سے باہر کی طرف گھسیٹنے لگا۔ اسی وقت ایک زوردار تحکمانہ آواز سنائی دی جو بنگلے کی طرف سے آئی تھی۔ کسی نے انگریزی میں کہا تھا۔ ''کون ہے؟'' اس کے ساتھ ہی بنگلے میں بھونچال سا آ گیا تھا۔ ایک بھگدڑ مچ گئی۔ پھر گولی چلنے کی آواز سنائی دی، ساتھ ہی کوہستانی کی چیخ بھی سنائی دی تھی۔ اس کے بعد پے در پے دو تین فائر ہوئے۔

میں پریشان ہو گیا لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت میرا سب سے اہم فرض یہ تھا کہ کیمبر لے کو رسی کے پل سے نشیب میں پہنچا دیا جائے۔ میں کیمبر لے کو کاندھے پر لادے تقریباً بھاگتا ہوا مسطح چٹان پر پہنچا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی سے نشیب اور بلندی پر موجود غزنوی کو خطرے کا سگنل دینے کے ساتھ، کیمبر لے کے اغوا میں کامیابی کا سگنل بھی دیا۔ غزنوی نے کیمبر لے کو بورے میں ڈالا اور اس مخصوص کارڈ پر جو ایک طرف سے سرخ اور

دوسری طرف سے سفید تھا، کتھئی رنگ کی پنسل سے مختصر سا پیغام لکھا۔

''خطرہ! پلی کو فوراً واپس بھیجو۔ سعدی! چ، پ۔''

مخصوص کارڈ، اس پر مخصوص رنگ کی پنسل سے یہ تحریر اور آخر میں ''چ، پ''
حروف مہندر کو یہ یقین دلانے کے لیے کافی تھے کہ میرا منصوبہ وہی تھا، اس میں کوئی گڑ
نہیں تھی۔ میں نے یہ کارڈ سیفٹی پن سے بورے میں لگا دیا اور بورے کو متحرک پلی سے لٹکا
دہرے رسے میں سے ایک رسے پر ہک سے لٹکا دیا اور رسی کو جھٹکا دے کر غزنوی کو اشارہ
کیا کہ وہ یہ پلی اوپر کھینچ لے۔ میں نے اس چھوٹی پلی میں دوسرے کارڈ پر غزنوی کے لیے
یہ پیغام لکھ کر بھیج دیا تھا کہ وہ اپنی جگہ انتظار کرے۔ متحرک پلی پھر اوپر آنے والی ہے۔

ذرا دیر بعد نشیب سے متحرک پلی کو ڈھیل دی جانے لگی اور کیمبرلے بورے میں
بند نشیب کی طرف جانے لگا۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے اس تمام کارروائی میں صدیاں گزر گئی تھیں۔ اس دوران
میں چند منٹ کے لیے بنگلے کے اندر پے در پے فائرنگ ہوئی تھی۔ میرا اندازہ تھا، کوہستانی
کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ آخری دم تک کیمبرلے کے محافظوں کو وہیں الجھائے رکھے تاکہ
مجھے کیمبرلے کو نیچے لے جانے کا موقع مل جائے۔

بنگلے کی طرف سے اب فائرنگ کی آوازیں نہیں آ رہی تھیں۔ البتہ وہاں سے
انگریزی میں چیخ و پکار ضرور سنائی دے رہی تھی۔ میں اب مسطح چٹان سے اتر کر پھر بنگلے کی
طرف تیزی سے بھاگ رہا تھا۔ بھرا ہوا پستول میرے ہاتھ میں تھا۔

میں باڑھ کے پاس اس مقام پر پہنچا تھا جہاں سے مجھے بنگلے کے احاطے میں داخل
ہونا تھا کہ جھاڑیوں سے مجھے آواز سنائی دی۔ ''شیرازی!''

یہ آواز میرے لیے حیرت اور استعجاب کا سبب تھی آواز سالارِ اعظم کی تھی۔

''جی جناب!''

''مجھے یقین تھا تم واپس آؤ گے۔'' سالارِ اعظم جھاڑی سے نکل کر باہر آیا۔

''کوہستانی زخمی اور بے ہوش ہے۔ کیمبرلے کا کیا کیا؟''

میں نے جلدی جلدی سالارِ اعظم کو سب کچھ بتا دیا۔

''یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ اب تم کوہستانی کو لے کر جاؤ۔''

اسی وقت بنگلے کے گیٹ کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں۔ اس
مرتبہ فائرنگ بڑی شدید تھی۔

''یہ کیا ہوا؟'' میں نے سالارِ اعظم سے دریافت کیا۔

''کچھ نہیں، وہ تمہارے ساتھی ہی ہیں اور محافظوں کی توجہ گیٹ ہی پر مرکوز رکھنا
چاہتے ہیں۔'' سالارِ اعظم نے تیزی سے کہا۔ ''اب تم جاؤ۔'' یہ کہہ کر سالارِ اعظم تیزی سے
آڑ لیتے ہوئے ساتھ ہوتا ہوا بنگلے کے سامنے والے حصے کی طرف بڑھ گیا۔

میں نے کوہستانی کو شانے پر ڈالا اور تھوڑی دیر بعد ہی مسطح چٹان پر پہنچ گیا۔ بنگلے پر
فائرنگ کی آوازیں پھر معدوم ہو گئی تھیں۔ مسطح چٹان پر پلی واپس آ چکی تھی۔

اصل منصوبہ یہ تھا کہ کیمبرلے کو اغوا کر کے مجھے اسی کے ساتھ نشیب میں جانا تھا
اور کوہستانی کو یہاں سے پیدل مستقر کی طرف لوٹنا تھا۔ کیمبرلے پہلے ہی نیچے جا چکا تھا اس
لیے مجھے کوہستانی کے ساتھ نیچے جانے میں کوئی قباحت نہیں رہی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو سالار
مجھے ہدایت دیتا۔

میں نے پہلے کوہستانی کے بے ہوش جسم کو تھیلے میں ڈالا اور پھر خود بھی تھیلے میں بیٹھ گیا
اس کے بعد میں نشیب اور بلندی کی طرف مہم کی تکمیل کا اشارہ دیا۔

چند منٹ بعد ہم نیچے پہنچ گئے تھے۔ پھر مہندر اور اس کے ساتھیوں نے پلیوں پر
لٹکے ہوئے رسے کو نیچے کھینچ لیا۔ اس رسے کو وہیں زمین میں دفن کرنے کے لیے سرِشام
مہندر اور اس کے ساتھیوں نے ایک گہرا گڑھا کھود لیا تھا۔ اس کے بعد درخت میں
بندھی ہوئی پلی بھی کھول لی گئی۔ بلندی پر یہی کارروائی غزنوی نے بھی مکمل کر لی اور وہاں
سے روانگی کا اشارہ دیا جس کا جواب مہندر نے بھی ٹارچ کی روشنی سے دیا۔

اس دوران میں کوہستانی کو ہوش آ گیا تھا۔ اس کے بازو میں گولی لگی تھی لیکن یہ بات
اس کی بے ہوشی کا سبب نہیں بنی تھی۔ اس نے بتایا کہ گولی لگتے ہی وہ لڑکھڑایا تھا اور اس کا
سر کسی کونے سے ٹکرا گیا تھا۔ یہ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ کوہستانی
اپنے پیروں پر چلنے میں کوئی وقت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ جلدی جلدی تمام کام مکمل کر
کے ہم نے پن چکی کے مالک کو بھی کھول دیا۔ ہم نے اسے دھمکی دی کہ اگر اس نے کسی سے
کچھ کہا تو پھر اس کی جان کی خیر نہیں ہو گی، ساتھ ہی مہندر نے اسے بیس روپے بھی انعام
کے طور پر دیے تھے۔

اب ہم اپنے مستقر کی طرف رواں تھے۔ ہماری مہم مکمل ہو چکی تھی۔

☆======☆======☆

میں اور کوہستانی اس کے بعد ایک ماہ کے لیے بس گھر میں ہی محدود ہو کر رہ گئے

تھے۔ یہ ہدایت ہمیں سالار کی طرف سے دی گئی تھی کیوں کہ شملے میں پولیس اور خفیہ
کارکن ہماری تلاش میں تھے۔

شملے میں موجود تمام ڈاکٹروں کے کلینک، ان کے گھروں اور کمپاؤنڈروں کے
گھروں پر بھی پولیس نگرانی کر رہی تھی۔ ریلوے اور شملے سے باہر جانے والے راستوں پر
بھی پولیس کی کڑی نگرانی تھی۔ پولیس اور خفیہ کا خیال تھا کہ کیمبرلے کو اغوا کرنے والوں
میں سے کم از کم ایک شخص یقیناً زخمی ہوا تھا جس کے علاج معالجے کے لیے ان کے خیال کے
مطابق ہمیں کسی نہ کسی ڈاکٹر کے پاس پہنچنا ہی تھا۔ اس امکان کے پیش نظر کہ شاید وہ زخمی
ہلاک ہو گیا ہو، قبرستان اور شمشان گھاٹ پر بھی پولیس کا پہرا تھا۔ کسی مردے کی تدفین سے
قبل یا کسی ارتھی کو چتا پر پھونکنے سے پہلے پولیس کے کارندے لاش کا جائزہ لے کر
اطمینان کر لیتے تھے۔

یہ تمام باتیں ہمیں جمشید سے معلوم ہوتی رہتی تھیں جو کیمبرلے کے اغوا کی اگلی صبح
ہمارے پاس منتقل ہو گیا تھا۔ وہی اب بیرونی دنیا سے ہمارے رابطے کا ذریعہ تھا۔ احتیاطاً
اگلے ہی دن اس نے کھانے پینے کا اتنا سامان گھر میں جمع کر دیا تھا کہ اب ہم گھر سے نکلے
بغیر بھی ایک ماہ تک بغیر بھوکے رہے اس گھر میں رہ سکتے تھے۔

پہلے دو دن کوہستانی کی حالت بہت خراب رہی۔ اس کا زخمی بازو پھول کر کپا ہو گیا
تھا۔ گھر میں اسپرٹ اور ٹنکچر کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسی سے میں زخم کی صفائی اور ڈریسنگ کرتا
تھا۔ تیسرے دن تنظیم سے وابستہ ایک ڈاکٹر انبالے سے ضروری دوائیں لے کر پہنچا۔ وہ
ایک ہفتے ہمارے ساتھ ہی مقیم رہا۔ اس کی پیشہ ورانہ توجہ اور مہارت سے کوہستانی کے بازو
کا زخم جلد ہی ٹھیک ہونے لگا۔ وہ ڈاکٹر ایک ہفتے قیام کے بعد واپس چلا گیا۔ اس نے ہمیں
ضروری دوائیں اور ان کے استعمال کا مکمل طریقہ سمجھا دیا تھا۔

کیمبرلے کے متعلق جمشید نے مجھے بتایا تھا کہ اسے سالار اعظم نے اگلی رات ہی
کہیں اور منتقل کر دیا تھا۔ مجھے نہ معلوم کیوں یہ یقین سا تھا کہ سالار اعظم اس پر تشدد کی انتہا
کر دے گا اور یہ بات اگلوا ہی لے گا کہ ہندوستان میں اس کی آمد کا مقصد کیا تھا۔

دو ہفتے بعد جمشید نے اطلاع دی کہ مہندرا اور لالی شملے سے بمبئی جا چکے ہیں۔ مہندرا کو
سالار اعظم نے اسی مہم کی تکمیل کے لیے بھیجا تھا جو ابتدائی طور پر مجھے سونپی گئی تھی لیکن پرنس
آف ویلز کے دورے کی منسوخی کے سبب وہ مہم ملتوی کر دی گئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر اس
نفری گروپ کا سربراہ مجھے مقرر کر دیا گیا تھا کیونکہ کوہستانی زخمی تھا۔

ہندوستان بھر میں ان دنوں ایک آگ لگی ہوئی تھی۔ مولانا محمد علی جوہر،
شوکت علی، شنکر اچاریہ، مولانا نصیر احمد، پیر غلام مجدد، مولانا حسین احمد کو ملک کے
مختلف حصوں سے گرفتار کر لیا گیا تھا۔ جس دن ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو شملے میں گرفتار کیا
گیا، ہم کیمبرلے کو اغوا کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ان رہنماؤں کی گرفتاریاں
خلافت کے کراچی اجلاس میں کی جانے والی تقریروں پر عمل میں آئی تھیں۔ اس
اجلاس میں جو قراردادیں پیش کی گئی تھیں، ان میں سے ایک قرارداد میں مسلمانوں کے لیے
فوج اور پولیس میں بھرتی ہونا حرام قرار دیا گیا تھا۔ ان رہنماؤں کی یہ گرفتاریاں
غیر متوقع نہیں تھیں کیوں کہ لارڈ ریڈنگ نے شاہی نمائندے کی حیثیت سے اپنی پہلی تقریر
میں اس امر کی جانب واضح اشارہ کر دیا تھا۔ اس موقع پر یہ گرفتاریاں حیران کن ضرور تھیں
کیوں کہ عام خیال یہی تھا کہ انگریز حکومت ان رہنماؤں کو پرنس آف ویلز کے دورہ
کے بعد گرفتار کرے گی۔ پھر یہی نہیں، گرفتاری کے بعد کراچی میں ان پر مقدمہ بھی چلایا
گیا اور نہایت عجلت کے ساتھ عدالتی کارروائی مکمل کر کے ان رہنماؤں کو دو دو برس کی
قید کی سزا دی البتہ شنکر اچاریہ کو رہا کر دیا گیا۔ اس مقدمے میں انگریزی حکومت نے
انصاف کے کئی تقاضے پورے نہیں کیے۔ کئی طے شدہ عدالتی روایات سے انحراف کیا اور یہ
ثابت کر دیا کہ ہر دور میں اصل قانون صرف اور صرف طاقت ہے۔ طاقت کے سامنے
اخلاق، اقدار اور روایات کچھ نہیں۔ آئین، قانون اور کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے،
وہ سب بے معنی ہے۔ سچ صرف وہی ہے جو طاقت کے بل پر اقتدار میں آنے والے کے منہ سے
نکلے۔ ہر مقدس قانون اس کی مرضی کا تابع ہوتا ہے۔

ان لیڈروں کی گرفتاری اور سزا کی بنا پر تمام ہندوستان صدائے احتجاج بن گیا تھا۔
جگہ جگہ احتجاج، جلسے، جلوس اور مظاہرے شروع ہو گئے۔ دہلی میں حکیم اجمل خان کی
صدارت میں، خلافت کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں پانچ سو علما کے فتوے کو چھپوا کر ملک بھر
میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس فتوے میں انگریزی فوج اور پولیس کی ملازمت
مسلمانوں کے لیے حرام قرار دی گئی تھی۔ اس فتوے کو پہلے ہی انگریز حکومت ضبط کر چکی
تھی۔ گاندھی جی بھی جو ابھی تک تحریک خلافت کے کراچی ریزولیشن پر خاموش تھے،
میدان میں آ گئے۔ انہوں نے کراچی ریزولیشن کی حمایت میں بیان دیا۔ پھر بمبئی میں
کانگریس کے رہنماؤں کے اجلاس میں بھی کراچی ریزولیشن کی تمام باتوں کو دہرایا
اس طرح سے ہندوستان نے سیاسی طور پر انگریز حکومت کے خلاف اعلانِ جنگ کر

دیا تھا، پھر ہر موقع پر ہندوستانیوں نے اس عزم کا اعادہ بھی کیا تھا کہ وہ پرنس آف ویلز
دورۂ ہند کا مکمل بائیکاٹ کریں گے۔

یہ وہ حالات تھے جن کی بنا پر مجھے اور میرے ساتھیوں کو یقین تھا کہ ہمیں جلد
اہم مہم پر روانہ ہونے کی ہدایات ملیں گی۔ سالار نے ہدایت کی تھی کہ وہ ہمیں شملے
وقت نکلنے کی اجازت دے گا جب کیمبرلے کے اغوا کا معاملہ سرد پڑ جائے گا اور میرا
تھا کہ اب انگریز حکومت شاید کیمبرلے کو صبر کر بیٹھی تھی۔ کوہستانی کے بازو کا زخم بھی
ہو گیا تھا لیکن یہ اندمال ابھی کچا ہی تھا۔ وہ اپنے بازو کو پوری قوت سے استعمال نہیں کر
تھا۔

پھر ایک سہ پہر کامریڈ غزنوی ہمارے درمیان موجود تھا۔ کیمبرلے کے اغوا کے
میری اس سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ وہ ہمارے لیے سالارِ اعظم کا پیغام لایا تھا۔ اس
میں سالار نے مجھے اور جمشید کو لکھنؤ پہنچنے کی ہدایت دی تھی۔ غزنوی اور کوہستانی کو کلکتہ
تھا۔ تنظیم ان دنوں اپنے کارکن ہندوستان کے ان شہروں میں پھیلا رہی تھی جہاں دورے
کے موقع پر پرنس آف ویلز کو پہنچنا تھا اور پھر ان سب لوگوں کو جنوری کے مہینے میں دہلی
تھا جہاں پرنس آف ویلز کے اعزاز میں ایک زبردست تقریب کا اہتمام کیا جانے والا

جمشید جو حسبِ معمول اسکینڈل پوائنٹ گیا ہوا تھا، رات گئے واپس آیا۔ شملے
اس کے کئی اینگلو انڈین دوست تھے۔ ان میں کچھ لڑکیاں بھی تھیں۔ یہ لوگ مختلف سرکاری
محکموں میں کام کرتے تھے۔ اس نے خاص طور پر شملے میں ان لوگوں سے دوستی اور
بڑھائی تھی جو محکمۂ خارجہ وفاع اور خفیہ میں ملازم تھے۔ ان لوگوں سے اسے بعض بہت
معلومات حاصل ہو جاتی تھیں۔

ہم بہت دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ ہماری گفتگو کے موضوعات یا تو وہ مہمیں تھیں
ہم اب تک سر کر چکے تھے یا وہ خطرات جو ہمیں درپیش تھے یا پھر وہ مہم جو ہمیں آنے والے
دنوں میں سر کرنا تھی۔ سفر کی تکان کے سبب غزنوی کی حالت بہت تباہ تھی۔ وہ
جمائیاں لے رہا تھا اور کئی مرتبہ سونے کی خواہش کا اظہار بھی کر چکا تھا چنانچہ رات کو
بجے ہم سب اپنے بستروں پر لیٹ گئے۔

رات کے کوئی تین بجے ہوں گے کہ میری آنکھ کھل گئی۔ اس وقت غزنوی کمرے
وسط میں کھڑا تھا اور جمشید نے اس پر پستول تان رکھا تھا۔ جمشید نے مجھے ٹھوکا دے
تھا۔ پہلے پہل تو میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ جمشید کیا کہہ رہا ہے اور جب اس کی

میں لپک کر اٹھا اور تیزی سے باہر راہداری میں کھلنے والا دروازہ بند کر دیا۔ جمشید
دروازہ ہی بند کرنے کے لیے کہہ رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس غدار سے پوچھو۔ اس نے ٹارچ سے باہر کسے اشارہ کیا تھا؟"

"کیا؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔

"میں مجبور ہو گیا تھا شیرازی!" غزنوی نے کہا۔ "انہوں نے میری بیوی، بہن اور
اغوا کر لیا ہے۔"

"ہوشیار رہو!" میں نے جمشید سے کہا اور لائٹ بند کر کے دروازے کی طرف
خطرہ سر پر آ گیا تھا۔ چار پانچ سپاہیوں پر مشتمل ایک پولیس پارٹی ان سیڑھیوں سے
جو ایک چھوٹے سے میدان پر ختم ہوتی تھیں اور اسی میدان کے ایک گوشے میں
بنا ہوا تھا جس میں ہم مقیم تھے۔ اس مکان کے چار حصے تھے۔ دو نچلی منزل میں اور
منزل پر! اس کے تینوں حصے سردیوں کی آمد آمد کی بنا پر خالی ہو چکے تھے۔ بس وہی
تھا جس میں ہم مقیم تھے۔

کوہستانی بھی بیدار ہو گیا تھا اور متحیر انداز میں اس صورتِ حال کو دیکھ رہا تھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" غزنوی نے پھر کہا۔ "انہوں نے میری بیوی، بچے اور بہن
کر لیا ہے۔" غزنوی کا لہجہ روہانسا تھا۔

"یقیناً ایسا ہی ہوا ہو گا!" میں نے ترش لہجے میں کہا اور عقبی دروازے کی طرف گیا
کے استعمال کے لیے تھا بھنگی اسی راستے سے آ کر گندگی صاف کرتا تھا۔ دوسری
پولیس کا ایک دستہ سیڑھیوں کے نیچے موجود تھا۔ میں نے آہستگی سے دروازہ بند

وقت مجھے اپنی احتیاطی تدبیر پر خود ہی پیار سا آ گیا۔ نہ معلوم وہ کیا خیال تھا جس
نے اس مکان سے فرار کی تیسری راہ بھی تیار کر رکھی تھی۔ یہ مکان کونے کا تھا
ایک حصہ نیچے کھڈ کی طرف تھا۔ اس سمت صرف کھڑکیاں ہی کھڑکیاں تھیں اور میں
کھڑکیوں کی درمیانی چوکھٹ کے درمیان ایک رسی کے دونوں سروں کو گرہ دے کر
تھا۔ یہ رسی اتنی لمبی تھی کہ نیچے کھڈ کی سطح تک جاتی تھی۔ میں تیزی سے کھڑکی کی
تھا اور اس رسی کو کھڈ میں پھینک دیا۔

"کوہستانی!" میں نے کہا۔ "چلو اترو، جلدی کرو۔" کوہستانی نے جوتے پہنے،

سرہانے سے اپنا پستول نکالا، وہ تھیلا اٹھایا جس میں فوری روانگی کے لیے ضرور
رہتا تھا اور کھڑکی کی طرف بڑھ گیا۔

’’نیچے جا کر پستول میں گولیاں بھر لینا۔‘‘ جمشید نے کہا۔ ’’تمہارے پستول کی
اس وقت غزنوی کی جیب میں ہیں۔‘‘

کوہستانی، رسی کے سہارے کھڈ کی طرف پھسل گیا۔

پھر میں اپنے بستر کی طرف بڑھ گیا۔ ’’میرے پستول میں بھی گولیاں ہیں یا نہ
میں نے دریافت کیا۔

’’ہاں!‘‘ جمشید نے جواب دیا۔ ’’کوہستانی کے بعد یہ میرے بستر کی طرف
کہ میں نے اسے نشانے پر لے لیا۔‘‘

’’میں سچ کہہ رہا ہوں کہ......‘‘

’’تم خاموش رہو۔‘‘ میں نے سختی سے غزنوی کی بات کاٹ دی، پھر اپنا پستو
تھیلا اٹھا لیا۔

مجھے اصولاً غزنوی کو فوراً گولی مار دینا چاہیے تھی۔ تنظیم کا اصول یہی تھا مگر میں
سوچ کر کہ اسے کسی وقت بھی گولی ماری جا سکتی ہے، ایسا نہیں کیا۔ میں نے اسے اس
زندہ رہنے دیا کہ یہ معلوم کیا جا سکے، اس نے پولیس کو ہمارے اور تنظیم کے بارے
کچھ بتایا ہے۔

میں نے غزنوی کو پستول کی زد پر لیتے ہوئے جمشید سے کہا۔

’’جمشید! اب تم نیچے جاؤ۔ تمہارے بعد غزنوی آئے گا۔ تم پستول کی زد پر
اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دینا اور منہ میں کپڑا ٹھونس دینا بلکہ نہیں، اس کا منہ پہلے
دو۔‘‘

’’کامریڈ! میں سچ کہہ رہا ہوں......‘‘ غزنوی کا لہجہ اب بھی روہانسا تھا۔

’’میں تمہیں، اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع دوں گا غزنوی!‘‘ میں نے
’’اب خاموش ہو جاؤ۔‘‘

جمشید نے غزنوی کے منہ میں رومال ٹھونس کر ایک کپڑا باندھ دیا، پھر اپنا تھیلا
پستول لے کر رسی کے سہارے کھڑکی سے نیچے کھڈ میں اتر گیا۔ اس کے بعد غزنوی کو
نیچے اترنا ہی پڑا۔ میں کھڑکی میں جھک کر اسے پستول کی زد پر لیے ہوئے تھا۔ نیچے
جمشید نے بھی اسے پستول کی زد پر لے رکھا ہوگا۔

نوی جب نصف رسی کا فاصلہ طے کر چکا تو میں تیزی سے اپنے کام میں مصروف
یں نے مٹی کے تیل کا کنستر اٹھایا اور چوبی فرش پر ہر طرف مٹی کا تیل چھڑک دیا۔
تمام کپڑوں اور بستروں پر بھی تیل چھڑک دیا۔ میرا تھیلا میرے شانے سے لٹکا ہوا
ب میں فرار کے لیے تیار تھا۔

یں نے پستول سے ایک فائر کیا اور خود ہی زور سے چیخ ماری، پھر دوسرا، تیسرا اور
ر کیا۔ ہر فائر کے ساتھ میں آوازیں بدل بدل کر آزاد ہندوستان زندہ باد کا نعرہ لگایا
ں کی تیلی جلا کر بستر پر پھینک دی۔ مٹی کے تیل سے بھیگے ہوئے کپڑے اور چوبی
ے دیکھتے ہی دیکھتے آگ پکڑ لی۔ دونوں طرف کے زینوں پر میں نے چڑھتے
کی آوازیں سنی تھیں جس وقت دروازوں کو تھپتھپایا جا رہا تھا، میں کھڑکی کی راہ سے
سہارے نیچے اتر رہا تھا۔ کھڈ میں جس جگہ میں اترا تھا، وہاں بچھو گھاس کے بڑے
ے تھے۔ میں ان سے گزر کر قدرے ہموار سطح پر آیا۔ بدن کے کھلے ہوئے حصوں
جہاں بچھو گھاس مس ہوئی تھی وہاں آگ اور جلن پھیل گئی تھی۔ کئی جگہ شیشے کے
جسم میں چبھے تھے مگر اس وقت مجھے ان تکلیفوں پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں
ے دونوں سروں پر لگی ہوئی گرہ کھولی اور رسی کو نیچے کھینچ لیا۔

مکان میں آگ خوب بھڑک رہی تھی۔ پولیس پارٹیاں مکان کے دونوں
ں کو توڑنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ایک ہنگامہ جاری تھا۔ اس وقت ہم چاروں کھڈ
ر نکل آئے تھے جہاں مکان میں بھڑکتی آگ کی روشنی بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں
میں آگ لگانے کا فیصلہ اسی لیے کیا تھا کہ پولیس فوری طور پر ہمارے فرار کی راہ
ے میں نہ سوچ سکے اور محض یہ اندازہ لگائے کہ ہم نے پولیس کے ہاتھوں گرفتار
بجائے خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ محب وطن افراد کے ایسے اقدامات کوئی نئی یا
نہ تھے۔ مجھے یقین تھا کہ آگ بجھنے کے بعد جب پولیس کو وہاں کوئی لاش نہ ملے
اس نتیجے پر پہنچنے میں کوئی دیر نہ لگے گی کہ ہم کھڑکیوں کی راہ انہیں جل دے کر
مگر اس وقت تک ہم پولیس کی پہنچ سے بہت دور جا چکے ہوں گے۔

مکان سے ہم فرار تو ہو گئے تھے لیکن اب مسئلہ کوئی جائے پناہ ڈھونڈنے کا تھا۔
چلتا ہوا اسی بارے میں سوچ رہا تھا۔ غالباً ہم میں سے ہر شخص یہی سوچ رہا تھا۔
آنے کے بعد ایک مقام پر پہنچ کر کوہستانی نے مجھ سے کہا تھا۔ ’’اب کہاں
ہے کامریڈ؟‘‘

''یہ موسم ایسا ہے کہ بہت سے مکان خالی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی ایسے مکان
میں پناہ لے لی جائے مگر ایسا مکان میرے خیال کے مطابق چھوٹے شملے میں ہونا
چاہیے۔''

''کیا اس سلسلے میں، میں کوئی مدد کرسکتا ہوں؟'' کوہستانی نے دریافت کیا۔ ''میں
دو ایک مکانات سے واقف ہوں اور میرا خیال ہے وہ محفوظ بھی ثابت ہوں گے۔''

''اس میں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے کہا۔

''اس لیے کہ آپ ہماری ٹیم کے کمانڈر ہیں۔'' کوہستانی نے کہا۔ ''اگر میں کمانڈر
ہوتا تو مجھے آپ سے پوچھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ غزنوی کے واقعے کے بعد
شاید آپ کو کسی پر اعتماد نہ رہا ہو۔''

اس کا آخری جملہ ایک طرح سے درست بھی تھا اور ایک اعتبار سے غلط بھی۔ میں
نے غزنوی کو امروہے میں پرکھا تھا، پھر کیمبرلے کے اغوا کی مہم میں اس نے ایک اہم ذمے
داری بہ خوبی انجام دی تھی۔ اگر اس کے دل میں پہلے سے کوئی کھوٹ ہوتا تو وہ کم از کم
کیمبرلے کے اغوا کو تو ناکام بنا ہی سکتا تھا، گویا جو کچھ ہوا تھا، کیمبرلے کی مہم کے بعد ہی ہوا
تھا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ سچ ہی کہہ رہا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ غزنوی کے بیوی، بچے اور بھائی کو
کرالیا گیا ہو۔ میرے ذہن میں، غزنوی کے بارے میں یکے بعد دیگرے کئی باتیں ابھر رہی
تھیں۔

''فی الحال کسی پناہ گاہ کی تلاش تمہاری ہی ذمے داری ہے۔'' میں نے گویا اس پر
اعتماد کا اظہار کردیا۔

''تو پھر آیئے۔'' کوہستانی دائیں جانب ایک پہاڑی پگڈنڈی پر مڑ گیا۔ ''اب ہم
بڑے شملے کے قریب ترین حصے کی طرف چلیں گے۔'' اب مجھے خیال آیا کہ جلتے مکان سے
فرار ہو کر اس طرف آنے میں میرے ارادے کو کوئی دخل نہیں تھا۔ مجھے پتا ہی نہ تھا کہ [illegible]
مجھے کس سمت جانا ہے۔ میں تو بس رسی کو کھینچ کر اسے لپیٹتا ہوا ان تینوں کے پیچھے آ گیا تھا۔
آگے جمشید تھا اس کے پیچھے غزنوی، پھر کوہستانی۔ اس نے یقیناً اس پگڈنڈی پر پہنچ کر [illegible]
بعد مجھ سے سوال کیا تھا کیوں میں پگڈنڈی سے آگے نکل گیا تھا۔

اب ہم اس پگڈنڈی پر چڑھتے ہوئے جا رہے تھے۔ سامنے شملے کی روشنیاں جھلملا
رہی تھیں۔

☆======☆======☆

اس مکان میں جس تک کوہستانی نے ہماری رہنمائی کی تھی، ہمارے قیام کو دوسرا دن
تھا۔ اگلے دن میں نے کسی کو وہاں سے نکلنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس مکان میں
ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ لہٰذا ہمیں کھانے پینے کے لیے باہر جانے کی ضرورت محسوس
نہیں ہوئی۔ یہ مکان کوہستانی کے کسی دوست کا تھا جس کی چابی کوہستانی کے پاس ہی تھی۔
کوہستانی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ شملے ہی کے قریب، سولن کا رہنے والا ہے۔ اس کا دوست
اپنے بیوی بچوں کے ساتھ ایک ماہ کے لیے انبالے گیا ہوا تھا اور گھر کی چابی اسے دے گیا
تھا۔ دوسرے دن میں نے جمشید کو باہر جانے کی اجازت دے دی۔ اس نے بتایا تھا کہ شملے
میں اس نے اپنے کسی اینگلو انڈین، دوست کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں مقیم ہے۔ پھر وہ عموماً
اس مکان سے جسے ہم نذرِ آتش کر کے فرار ہوئے تھے، مغرب کے بعد ہی نکلتا تھا لہٰذا میرا
خیال تھا کہ کسی نے اس بات پر غور نہیں کیا ہوگا کہ جمشید کا کوئی تعلق اس مکان سے بھی تھا۔

اس دوران میں غزنوی کا مسئلہ میرے ذہن پر بار تھا۔ اس کی غداری میرے لیے
تکلیف دہ تھی۔ اسے غداری کی سزا دینا ہی تھی۔ میرے دل میں غزنوی کے لیے ایک نرم
گوشہ تھا جو ابھی تک مجھے غزنوی کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنے سے باز رکھے ہوئے تھا۔

مقررہ وقت پر لکھنؤ پہنچنے کے لیے مجھے اور جمشید کو اگلے دن ہر صورت میں شملے سے
نکل جانا تھا لیکن اس میں سب سے بڑی قباحت غزنوی تھا۔ میں دن بھر سوچتا رہا۔ ہر پہلو
سے یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ غزنوی نے تنظیم سے غداری کی ہے اس لیے اسے انتہائی سزا ملنا
چاہیے، انتہائی سزا، یعنی موت!

بے شک وہ موت کی سزا کا مستحق تھا اس لیے کہ اس نے تنظیم سے غداری کی تھی۔
اس سے بھی درگزر کردیا جائے تو وہ اس لیے بھی موت کی سزا کا مستحق تھا کہ اس نے ہم
تینوں کی زندگیاں خطرے میں ڈال دی تھیں۔ اگر ہم اس کی بساط نہ الٹ چکے ہوتے تو گویا
اس کی تجویز کی ہوئی سزا کے مطابق موت کے دہانے پر پہنچ چکے ہوتے۔ ایک اعتبار
سے تو اس نے ہم تینوں کو سزائے موت سنائی تھی۔

غزنوی کا جرم بڑا سنگین تھا۔ اسے سنگین سزا ہی ملنا چاہیے تھی۔ اس کے ساتھ رحم کا
مطلب اپنے آپ کو اور تنظیم کو ہلاکت میں ڈالنا تھا۔ اسے معاف کرنا اس مقصد سے غداری تھا
جس کے لیے ہم سب اپنے سروں کو ہتھیلیوں کا چراغ بنائے ہوئے تھے۔

اس رات جب جمشید واپس آ گیا تو عدالت سجی۔ اس کا مدعی بھی میں تھا اور
منصف بھی میں۔ غزنوی اپنی صفائی میں اس کے سوا کوئی دلیل پیش نہ کر سکا کہ پولیس نے

اس کی بیوی، بہن اور بچے کو اغوا کر لیا تھا اور اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ تنظیم سے متعلق
ساتھیوں کے نام پتے بتا دے۔

"پولیس تم تک کس طرح پہنچی، تم پولیس کے مخبر کیسے بنے؟" میں نے اس سے سوال
کیا۔

"کیمبرلے کے اغوا کے بعد، ہدایات کے مطابق میں اگلے ہی روز یہاں سے
شہر، چوراچوری چلا گیا تھا۔ وہاں میں نے اپنے چچازاد بھائی کو جسے میں بڑا اچھا دوست
سمجھتا تھا، جو میرا ہم عمر ہے، جو بچپن سے میرے ساتھ پلا بڑھا ہے، پہلی مرتبہ اس تنظیم سے
اپنی وابستگی کے بارے میں بتایا۔ یہی میری غلطی تھی۔ وہ بھی حب الوطنی کا زبردست عل
دار تھا۔ میں نے تنظیم کے بارے میں اسے بتایا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بھی تنظیم میں شامل ہو
جائے اور اس طرح وہ دوستی اور رفاقت مزید پائیدار ہو جائے جو میرے اور اس کے
درمیان بچپن سے قائم ہے۔ اس نے ہامی بھر لی۔ یقین مانیے کہ میری مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ
رہا۔ پھر میں نے اسے تنظیم کی مختلف مہموں کے بارے میں بتایا اور کیمبرلے کے اغوا کے
بارے میں بھی بتا دیا۔ اس کے بعد وہ روزانہ مجھ سے تنظیم کے بارے میں معلومات حاصل
کرتا، اس کے اندازِ کار کے بارے میں پوچھتا، ساتھیوں کے بارے میں پوچھتا لیکن یہ
ایسی باتیں تھیں جن کے صحیح جواب میں نے اسے کبھی نہ دیے۔ پھر ایک دن میرے ایک
دوست نے جو پولیس میں ملازم تھا مجھے بتایا کہ میرا چچازاد بھائی میرے خلاف مخبر بن گیا
ہے۔ وہ دراصل خفیہ میں ملازم تھا اور اس نے یہ بات مجھ سے ہمیشہ چھپائے رکھی تھی۔
جونہی مجھے یہ خبر ملی میں نے وہاں سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا لیکن اسی رات میرے گھر پر
غنڈوں نے دھاوا بول دیا۔ میری بیوی، بچے اور بہن کو اغوا کر لیا گیا۔ ہنگامہ فرو ہونے کے
تھوڑی ہی دیر بعد پولیس وہاں پہنچی، اس پولیس پارٹی کے ساتھ خفیہ کا ایک اعلیٰ افسر بھی تھا
جو شملے سے کیمبرلے کے اغوا کے بارے میں پوچھ گچھ کے لیے وہاں گیا تھا۔ اس نے بہت
کچھ پوچھنا چاہا مگر میں انکار کرتا رہا۔ پھر مجھے پولیس ایک جگہ لے گئی جہاں میری بیوی،
بچے اور بہن کو رکھا گیا تھا۔ اس پولیس افسر نے میرے سامنے، میری بیوی اور میری بہن
کے کپڑے تار تار کر ڈالے، انہیں عریاں کر دیا، میرے بچے کو ٹانگوں کے بل لٹکا دیا۔ پھر
اس نے کہا۔ تیری بیوی اور تیری بہن صبح کو اس حالت میں بھی مل سکتی ہیں کہ اٹھنے کے قابل
نہ رہیں۔ پولیس کے یہ سانڈ رات بھر تیری آنکھوں کے سامنے ان کے جسموں کو بھنبھوڑتے
رہیں گے۔ پھر بھی تُو نے زبان نہ کھولی تو یہ بچہ جو میرے ہاتھوں میں ٹانگوں کے بل جھول

رہا ہے، سامنے دیوار سے جا ٹکرائے گا۔ اس کا بھیجا پاش پاش ہو جائے گا۔ پھر بھی نہیں
بولا تو تیری ماں کو ان سانڈوں کے آگے ڈال دیا جائے گا، اور میں نے محسوس کر لیا کہ
یہ دھمکی نہیں تھی۔" غزنوی بلک پڑا۔ "بتاؤ کامریڈ! میں کیا کرتا، میں کیا کرتا کامریڈ؟"
اس کی دردناک داستان سن کر میری رگوں میں جیسے خون کی گردش تھم کر رہ گئی تھی،
دھڑکنا بھول گیا تھا۔ کمرے میں ایک تکلیف دہ سناٹا پھیل گیا۔ غزنوی کی ہچکیاں
کمرے میں گونجتی رہیں۔ "سچ کہہ رہا ہوں کامریڈ، سچ...... اس دھرتی کی قسم، اپنی ماں کی
قسم، میری غلطی تھی کہ میں نے اپنے چچازاد بھائی کو نہ پہچانا، میں نے اسے تنظیم کے بارے
میں بتایا مگر میں نے وہ بھی تنظیم کی بھلائی کے لیے ہی کیا تھا مجھے کیا پتا تھا کہ یہ ہو جائے گا۔"
اس کی ہچکیاں اور بلند ہو گئیں۔

میں نے جمشید اور کوہستانی کی طرف دیکھا۔ وہ یوں سر جھکائے بیٹھے تھے جیسے وہی
مجرم ہوں۔ "تمہارا کیا خیال ہے جمشید؟" میں نے دریافت کیا۔ "تم نے ملزم کا بیان سن لیا
ہے۔"

"آپ جو فیصلہ بھی کریں میں اس سے متفق ہوں۔" جمشید کی کمزور آواز ابھری۔

"اور تمہارا کیا خیال ہے، کوہستانی؟"

"فیصلہ کیجیے، میں آپ کے ساتھ ہوں۔" کوہستانی نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

ان دونوں نے فیصلے کا بار مجھ پر ڈال دیا تھا۔ میں سر جھکائے سوچتا رہا، پھر میں نے
اس سے کہا۔ "غزنوی! اس کے باوجود تمہارے پاس ایک راستہ تھا۔"

"کون سا راستہ؟" غزنوی نے بھیگی آنکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے لرزتے لہجے
میں پوچھا۔

"یہ کہ تم اس صورتِ حال سے پہلی فرصت میں تنظیم کو آگاہ کرتے۔" میں نے کہا۔

"مگر مجھے موقع ہی کہاں ملا۔ وہ انسانیت سوز منظر دیکھنے کے بعد میں ٹوٹ کر رہ گیا۔
اگلے دن وہ مجھے وہاں سے شملے لے کر چل دیے۔"

"تم آج ہمارے پاس پہنچنے کے فوراً بعد ہمیں اس صورتِ حال سے آگاہ کر
سکتے تھے۔" میں نے کہا۔

"میں نے کئی مرتبہ سوچا کامریڈ!" غزنوی نے کہا۔ "مگر ہر مرتبہ برہنہ بیوی اور
بہن، پلے ہوئے سانڈوں اور اس خفیہ کے افسر کے ہاتھوں میں لٹکتا ہوا اپنے
بچے کا تصور میری آنکھوں میں پھر جاتا تھا۔" غزنوی نے کہا۔ "میں انہیں ان خبیثوں، ان

درندوں سے بچانا چاہتا تھا، بچانا چاہتا ہوں کامریڈ!"

"تم بہرحال تنظیم کے غدار ہو۔ میں تمہارے لئے سزائے موت تجویز کرتا ہوں۔"
میں نے اس تکلیف دہ صورتِ حال کو مختصر کرنے کے لیے کہا۔ یہ الفاظ کہتے ہوئے میرے
کانوں میں تیز سیٹیاں سی گونجنے لگیں۔ مجھے خود اپنی آواز اجنبی سی محسوس ہوئی۔

"نہیں...... نہیں...... نہیں!" غزنوی کی چیخیں مجھے بہت دور سے آتی سنائی دیں۔
میں نے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھا، ہر چیز گھوم رہی تھی، ہر چیز گڈمڈ تھی۔

"کیا کہا آپ نے؟" جمشید کو بھی جیسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔

"سزائے موت، یہی غداری کی سزا ہے۔ تنظیم کا یہی اصول ہے۔ اسے پھانسی
دینے کا انتظام کرو۔ صبح جب ہم اس گھر سے نکلیں گے تو اسے پھانسی دے کر نکلیں گے۔"
میں یہ کہہ کر اس کرسی سے اٹھ گیا جو صدرِ عدالت کی کرسی کے طور پر استعمال کی گئی تھی۔

"تمہارا فیصلہ غلط ہے کامریڈ، فیصلہ غلط ہے، غلط ہے!" غزنوی نے چیخ کر کہا۔

"کاش میرا فیصلہ غلط ہوتا تو اس سے زیادہ خوشی مجھے کسی بات سے نہ ہوتی۔" میں
نے واقعی بڑے دکھ سے کہا تھا۔ میری آواز بھرا گئی تھی، آنکھوں کے گوشوں میں نمی پھوٹ
آئی تھی اور میں خوب زور زور سے رونا چاہتا تھا۔ پھر میں بلک میں اٹھا۔ جمشید اور کوہستانی
بھی اپنی کرسیوں سے اٹھ گئے۔

"جمشید! کوہستانی!" غزنوی نے رحم طلب انداز میں کہا۔ "میں تمہارے آگے ہاتھ
جوڑتا ہوں۔ میں تم سے رحم کی بھیک مانگتا ہوں مجھے چھوڑ دو۔"

"اس کا منہ بند کر دو جمشید!" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ غزنوی کی آواز
جیسے میرا دل نوچ رہی تھی۔

وہ دونوں اس کے منہ میں رومال ٹھونس ہی رہے تھے کہ روشن دان پر مخصوص دستک
سنائی دی۔ ہم سب نے چونک کر اوپر دیکھا۔ اسی وقت سالارِ اعظم کی مخصوص کھرکھراتی
آواز سنائی دی۔ "تمہارا فیصلہ غلط ہے، دروازہ کھولو۔"

کوہستانی لپک کر دروازہ کھولنے گیا۔ میں نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ غزنوی کو
سزا سنانے کے بعد میرے سینے پر جو بھاری بوجھ آ پڑا تھا، ہٹ گیا۔ میں نے جمشید کی طرف
اور پھر غزنوی کی طرف دیکھا۔ غزنوی کی آنکھوں میں جہاں چند لمحے قبل موت
کی پرچھائیاں رقصاں تھیں، زندگی کی چمک عود کر آئی تھی۔

سالارِ اعظم کمرے میں آ گیا تھا۔ طے شدہ اصول کے مطابق لالٹین کی روشنی

کے کونے میں رکھ دیا گیا تھا۔

"میں دیکھ رہا ہوں شیرازی!" سالار نے کہا تھا۔ "تم لوگوں کو سزائے موت دینے
کا شوق ہو گیا ہے۔"

"حالات ہی ایسے تھے جناب!" میں نے کہا۔

سالارِ اعظم کے کہنے پر عدالت پھر سجی۔ میں ایک مرتبہ پھر صدرِ عدالت کی کرسی پر
بیٹھا تھا۔ سالار نے کہا تھا کہ وہ غزنوی کی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہے اور تنظیم کے ایک عام
رکن کی حیثیت سے۔ سالار نے کئی دلیلیں پیش کیں ان میں بیشتر دلیلیں خالص جذباتی
اور انسانی رشتوں کے تقدس کی بنیاد پر قائم کی گئی تھیں۔ اس کی آخری دلیل یہ تھی کہ قوانین
انسان کے تحفظ کے لیے بنائے جاتے ہیں، انسان کو قانون کا شکار بنانے کے لیے نہیں۔

میں نے ایک مرتبہ پھر تمام لوگوں کا جائزہ لیا اور نہایت مختصر بیان کے ساتھ یہ تمام
دلیلیں رد کر دیں۔ میں نے کہا۔ "قانون کو انسانی رشتوں اور جذباتیت سے کوئی علاقہ نہیں
ہوتا۔ وہ ایک خاص جرم کی خاص سزا مقرر کرتا ہے۔ انصاف، انسانی رشتوں اور ان کے
تقدس، دوستی، محبت اور نفرت سے بلند ہوتا ہے۔ انصاف کرتے ہوئے ان میں سے کسی چیز
کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔ اضطراری اور اضطرابی حالت میں سرزد ہونے والے جرائم سے
ان کی سنگینی کم ہو سکتی ہے، جرم کی نوعیت نہیں بدلتی البتہ سزا میں کمی یا تخفیف ہو سکتی ہے۔ یہ
درست ہے کہ انسان کے تحفظ کے لیے ہی قانون بنائے جاتے ہیں اور ہم نے اپنی تنظیم
کے لیے قوانین بنائے ہیں۔ یہ تنظیم ایسے محبِ وطن افراد پر مشتمل ہے جن کے سامنے انسان
کے بنائے ہوئے ہر معیار کے مطابق ایک اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ غزنوی نے انہی
انسانوں کی ہلاکت کا سامان کیا تھا۔ ہم غیر معمولی حالات میں کام کر رہے ہیں۔ ایک طرح
سے ہم حالتِ جنگ میں ہیں اس لیے ایسی صورت میں کسی بھی رکن کی معمولی لغزش اور
کوتاہی کو جس سے تنظیم خطرے میں پڑ سکتی ہو، معاف نہیں کیا جا سکتا۔ غزنوی کو ایک موقع ملا
تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو تمام حالات سے آگاہ کر دیتا، ایسا موقع جب کہ وہ تنظیم کے
ساتھیوں کو تمام خطرات سے آگاہ کر سکتا تھا مگر اس نے اس مرحلے پر بھی ایسا نہیں کیا۔
غزنوی اسی بنا پر غداروں کی فہرست میں شامل ہوتا ہے۔ میں سزائے موت بحال رکھنے کا
فیصلہ کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ کمرے میں گہرا سناٹا پھیل گیا۔

چند لمحے انتظار کے بعد کہ شاید سالارِ اعظم کچھ کہیں، میں نے پھر بولنا شروع کیا۔

"اب ہمارے پاس وقت کم رہ گیا ہے۔ غزنوی کو پھانسی کی سزا دینے کا انتظام کیا جا رہا
اس سے قبل کہ میں کرسی سے اٹھتا، سالار اعظم کی کھرکھراتی آواز ابھری۔"یہ
واقعات اور ایسے ہیں جو میں مناسب سمجھتا ہوں کہ اس وقت عدالت کے سامنے پیش کر
دیے جائیں۔ انسانی جان اتنی ارزاں نہیں ہوتی کہ اسے اتنی آسانی کے ساتھ سولی پر لٹکا
جائے۔ میں بتاتا ہوں کہ غزنوی نے واقعات کو بیان کرنے میں بعض حقائق سامنے لانے
سے گریز کیا ہے۔ ایسے حقائق جو اس کی زندگی کے ضامن بن سکتے ہیں۔ میں پوری دیانت
کے ساتھ عدالت کو بتاتا ہوں، اس کے باوجود کہ غزنوی کی بیوی، بہن اور بچہ اغوا کر لیے
گئے تھے، اس نے پہلی فرصت میں تنظیم کو تمام حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔"

پھر سالار اعظم نے تفصیل کے ساتھ وہ حالات بتائے جن کا لب لباب یہ تھا کہ شملے
سے جانے والے افسر نے اس کی بیوی اور بہن کو عریاں کرنے اور بچے کو ٹانگوں سے لٹکا کر
جھلانے کا مظاہرہ کرنے کے بعد اسے چھوڑ دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ شام تک یہ فیصلہ کر لے کہ
اسے حکومت سے تعاون کرتے ہوئے تنظیم کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے، بتاتا ہے یا
نہیں۔ اسے یہ بھی دھمکی دی گئی تھی کہ پولیس اس کی کڑی نگرانی کرتی رہے گی لہٰذا اسے فرار
ہونے کا خیال بھی دل سے نکال دینا چاہیے۔ سو وہ گھر پہنچا۔ اس نے اپنے طور پر ایک
منصوبہ بنایا اور اس منصوبے سے سالار اعظم کو ایک خط کے ذریعے آگاہ کر دیا۔ یہ خط غزنوی
نے اسی پولیس والے کو دے دیا تھا۔ جس نے اسے خطرے سے قبل از وقت آگاہ کر دیا تھا۔
وہ پولیس والا بھی تنظیم کے اراکین میں شامل تھا۔ سالار نے بتایا تھا کہ غزنوی ان چند
سرفروشوں میں سے ہے جنہیں یہ علم ہے کہ ہنگامی حالات میں سالار اعظم سے کس طرح
رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ پھر وہ بہت گھما پھرا کر پولیس والوں کو امروہے، لکھنؤ اور پھر بمبئی
لے گیا۔ وہ جانتا تھا کہ سالار اعظم بمبئی میں ہے اس لیے چاہتا تھا کہ جب پولیس کو لے کر
بمبئی پہنچے تو سالار اعظم کو پہلے سے تمام حالات کا علم ہو چکا ہو۔ بمبئی میں وہ اس پنواڑی سے
ملا جو اراکین کے درمیان رابطے کا کام دیتا ہے۔

سالار نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔ "اس پنواڑی سے میں دو دن قبل
مل چکا تھا اور اسے ایک لفافہ دے دیا تھا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ تین دن بعد میرا ایک
دوست آئے گا، اسے یہ لفافہ دے دینا اور کہہ دینا کہ میں اس کا انتظار نہیں کر سکا اس لیے
شملے چلا گیا ہوں۔ میں نے اس خط میں کیمبرلے کے اغوا کا اشاروں میں ذکر کیا تھا لیکن یہ
اشارے اتنے واضح تھے کہ شملے کے خفیہ افسر کو یہ سمجھنے میں کوئی دیر نہیں لگتی کہ خط میں

لے کا ذکر کیا گیا ہے۔ میں نے اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ کیمبرلے نے کیوں کہ
نہیں کھولی ہے لہٰذا اسے شملے سے منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اسی لیے میں شملے جا رہا
میں نے اپنے دوست سے یہ بھی کہا تھا کہ اب میں بمبئی میں موجود نہیں ہوں گا لہٰذا
ے کارکنوں کے سامنے وہ خود کو سالار اعظم کے طور پر پیش کرے۔ بہرحال غزنوی
پنواڑی کے پاس پہنچا۔ پولیس اس کے ساتھ سادہ لباس میں تھی۔ پنواڑی نے غزنوی
بتایا کہ میں شملے گیا ہوا ہوں اور اختر صاحب کے نام ایک لفافہ دے گیا ہوں جو دو دن
نے والے ہیں۔ پھر پولیس نے اس پنواڑی سے وہ خط لے لیا اور پوچھ گچھ کے لیے
اپنے ساتھ لے گئی۔ ہماری توقع کے مطابق خفیہ کا اعلیٰ افسر اس خط کے مضمون کی وجہ
غزنوی کو لے کر سیدھا شملے میں پہنچا۔ بعد کے واقعات تمہارے سامنے ہیں۔"

ہم سب بے یقینی کے عالم ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ "مگر جناب!" میں نے
"اگر ہم غزنوی کو اسی وقت جب اس نے پولیس والوں کو...... تو کیا پولیس کا چھاپا محض
اتھا۔ کیا...... مگر غزنوی پولیس سے کیسے رہا ہوا؟" میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا
کروں، کیا نہ کروں؟

"میں سب کچھ بتاتا ہوں۔" سالار اعظم نے کہا۔ "پہلے غزنوی کا منہ تو کھول دو۔"
جمشید نے لپک کر غزنوی کا منہ کھولا پھر اس کے ہاتھ بھی کھول دیے۔

سالار نے بتایا کہ پولیس کا چھاپا مصنوعی نہیں تھا بلکہ حقیقی تھا۔ یہ دوسری بات تھی کہ
ری گرفتاری یقینی ہو جاتی تو ایک بھی پولیس والا بچ کر وہاں سے نہیں جاتا کیوں کہ
نت برابر کے خالی مکان میں سالار کے ہمراہ تنظیم کے مسلح سرفروشوں کا ایک دستہ
تھا۔ وہ سب کے سب ماہر نشانے باز تھے اور ایسی پوزیشن میں تھے کہ اشارہ ملتے ہی
کرتے اور تمام پولیس والے ڈھیر ہو جاتے مگر یہ اقدام آخری مرحلے پر کیا جاتا،
نے بتایا کہ اس نے دن ہی میں اس مکان کا جائزہ لیا تھا اور کھڑکی کی طرف سے جائزہ
ئے رسی بھی اس کی نظر میں آ گئی تھی جس کا کچھ حصہ کھڑکیوں کی چوکھٹ پر پڑا ہوا
ن کے اس حصے کو دیکھ کر سالار نے یہ صحیح قیات قیاس کیا تھا کہ ہنگامی صورتِ حال میں
راستے فرار ہوں گے۔ پھر سالار نے یہ بھی بتایا کہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ غزنوی
ری کے بعد چوری چوری سے اسی سپاہی کو ہر جگہ ساتھ لے جایا گیا جو تنظیم کا کارکن
ن کا قدیم دوست تھا۔ اسی کے توسط سے غزنوی کو یہ بتایا گیا تھا کہ اسے کیا کرنا
ن کے ذریعے غزنوی کو میرے نام لالی کا ایک مختصر سا خط بھی دیا گیا تھا۔ یہ خط سالار

نے لالی سے بمبئی میں ہی لکھوالیا تھا۔ سالار نے ان حالات کو ایک خاص انداز میں
تک پہنچانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ آخر میں سالار نے کہا۔ ''خدا کا شکر ہے کہ سب اسی
طرح ہوا جیسے میں نے سوچا تھا۔''

غزنوی نے وہ خط جیب سے نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

سالار نے کہا۔ ''میں جانتا تھا کہ شیرازی، لالی کی تحریر سے آشنا ہے۔ اس خط کا
مضمون، غزنوی کی بے گناہی اور تنظیم سے اس کی وفاداری کا ٹھوس ثبوت ہے۔ اگر تم اس
وقت غزنوی کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کرتے جب پولیس نے چھاپا مارا تھا تو وہ یہ خط
پیش کر دیتا۔ بہرحال میں خوش ہوں کہ غزنوی آزمائش کے اس سنگین مرحلے پر پورا اترا
میں خوش ہوں کہ تم سب بھی اس امتحان میں کامیاب رہے کہ تم نے غزنوی کی تمام رفاقت
اور ماضی میں تنظیم کے لیے اس کی خدمات کا لحاظ کیے بغیر اس کے لیے وہی سزا تجویز کی
جس کا وہ مستحق ہو سکتا تھا اور اس سلسلے میں تم نے میری دلیلوں کو بھی درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔''

پھر ہم تینوں غزنوی سے باری باری گلے ملے۔ میں نے غزنوی سے معافی مانگی۔
غزنوی نے مجھے سینے سے چمٹاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں میرے دوست، معافی کی
ضرورت نہیں ہے۔ اگر تمہاری جگہ میں ہوتا تو میں بھی یہی فیصلہ کرتا۔''

میں جانتا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ ایسا ہی کرتا۔ وہ ایسا کر سکتا تھا کیوں کہ اس
نے انتہائی سنگین حالات میں بھی تنظیم سے اپنی وفاداری برقرار رکھی تھی۔

ہم اس وقت مسرت اور خوشی کے جذبات سے اتنے مغلوب تھے کہ سالارِ اعظم کی
موجودگی کو بھی ایک طرح سے فراموش کر بیٹھے تھے۔ اسی دوران میں سالارِ اعظم کی آواز
ابھری۔ ''بس بھئی!'' اس کا لہجہ جذبات سے بوجھل تھا۔ ''اب تم لوگوں کو یہاں سے رخصت
ہونے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ سب سے پہلے شیرازی اور جمشید کو جانا ہے تاکہ
مقررہ وقت پر لکھنؤ پہنچ سکیں۔ شیرازی! تمہیں لکھنؤ میں اپنی والدہ سے ملنے کی اجازت
ہے۔ اگرچہ تمہارا وہاں بھیجنا خطرے سے خالی نہیں کیوں کہ لکھنؤ میں تمہارے جاننے والے
بہت ہیں مگر تمہاری والدہ سخت بیمار ہیں۔ تمہیں ان سے ضرور ملنا چاہیے لیکن اگر خطرہ ہو تو
ملنے سے گریز کرنا۔ پرنس آف ویلز کے دورے کے بعد تنظیم چوراچوری کی پولیس سے
انتقام لے گی۔ اس کے بارے میں تمہیں مطلع کر دیا جائے گا۔ غزنوی اور کوہستانی ابھی
یہیں رہیں گے۔''

حالات پھر ایسے ہو گئے تھے کہ شملے سے ہمارے فرار کی راہیں کم و بیش مسدود ہو گئی

تھیں۔ پولیس اور خفیہ نے شملے کی ناکہ بندی اتنی سخت کر دی تھی کہ کسی ذی روح کا اس
کی نظر میں آئے بغیر جانا ممکن نہ تھا مگر سالار نے ہمارے فرار کا انتظام کر دیا تھا۔

میں اور جمشید تھوڑی ہی دیر بعد کوہستانی کی رہنمائی میں چھپتے چھپاتے ریلوے
کوارٹرز پہنچے اور ایک کوارٹر پر دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ کھلا گویا دروازہ کھولنے والا
ہمارے ہی انتظار میں بیٹھا تھا۔ وہ ریلوے انجن ڈرائیور تھا اور اگلی صبح سورج نکلنے سے پہلے
اسے ٹرین لے جانا تھا۔

''معلوم ہو گیا؟'' کوہستانی نے داخل ہوتے ہی اس سے دریافت کیا۔

''ہاں!'' ڈرائیور کے لہجے میں لرزش تھی۔ وہ بہت گھبرایا ہوا سا تھا۔ اس کے چہرے
پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

''کیا بات ہے، پریشان معلوم ہوتے ہو؟'' کوہستانی نے سوال کیا۔

''ہاں۔'' اس نے پھر اسی انداز میں کہا۔ ''یہ پہلا موقع ہے کہ میں ایسا کام کر رہا
ہوں، خیر!''

انجن ڈرائیور کی پریشانی بجا تھی۔ وہ ایک خصوصی ٹرین لے کر جا رہا تھا جس میں کئی
سول اور فوجی افسروں کو سوار ہونا تھا۔ وہ ایک سیدھا سادا فرض شناس سا شخص دکھائی دیتا
تھا۔ وہ بہت نروس قسم کا آدمی تھا کسی وقت بھی اس کے اعصاب جواب دے سکتے تھے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''یہ تمہاری اور میری خوش قسمتی ہے کہ میرے دونوں ساتھی
ایک ہی کوارٹر میں مقیم ہیں۔ تمہیں زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑے گی۔ میں نے رات ہی ان
سے کہہ دیا تھا کہ صبح انہیں لینے پہنچ جاؤں گا۔''

پھر اس نے کوہستانی کو اس کوارٹر کا پتہ بتایا جس میں اس کے وہ دونوں ساتھی رہتے
تھے جو انجن کی بھٹی میں کوئلہ جھونکتے تھے۔ جمشید کو وہیں انجن ڈرائیور کے پاس چھوڑ کر میں
کوہستانی کے ساتھ باہر آ گیا۔ ہم اس کوارٹر کی طرف بڑھ رہے تھے جس کا پتا انجن ڈرائیور
نے بتایا تھا۔

''یہ شخص نروس قسم کا ہے۔'' میں نے کوہستانی سے کہا۔ ''کسی وقت بھی بزدلی دکھا
سکتا ہے۔''

''نروس بھی ہے اور بزدل بھی!'' کوہستانی نے کہا۔ ''مگر ساتھ ہی اس وقت تک
قابلِ اعتبار بھی ہے جب تک اس پر کوئی افتاد نہ پڑے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ یہ میرے
ایک دوست کا دوست ہے، یہیں شملے کا رہنے والا ہے۔''

تھوڑی دیر میں ہم اس کوارٹر کے دروازے پر دستک دے رہے تھے جس کا پتہ انجن ڈرائیور نے بتایا تھا۔ وہاں شاید وہ دونوں، انجن ڈرائیور ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ دروازہ کھلا، میں فوراً پستول تان کر اندر پہنچ گیا۔

''خاموش رہنا!'' میں نے نہایت سخت اور دھیمے لہجے میں کہا۔ اس وقت میرے اور کوہستانی کے چہروں پر سیاہ رومال بندھے ہوئے تھے۔ صرف ہماری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

''کون ہے؟ مکھن!'' اندر سے اس کے دوسرے ساتھی کی آواز آئی۔

اس کے ساتھ ہی کوہستانی پستول لے کر اندرونی کمرے کی طرف لپکا۔ تھوڑی دیر میں ہم انہیں بے بس کر چکے تھے البتہ اس سے قبل ہم نے ان کی وردیاں اتروالی تھیں۔ ہم نے انہیں کس کر مضبوطی سے باندھا تھا اور ان کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیے تھے۔

اب میں ان میں سے ایک کی وردی پہن رہا تھا۔ پندرہ منٹ میں ہم تمام کاموں سے فارغ ہو کر پھر انجن ڈرائیور کے کوارٹر کی طرف رواں تھے۔ دوسری وردی میرے ہاتھ میں تھی جو جمشید کے لیے تھی۔

پورا پلان سالار نے پہلے سے طے کر لیا تھا۔ اس کام میں تعاون کے لیے انجن ڈرائیور کو خاصی رقم دی گئی تھی۔

انجن ڈرائیور ہمارا منتظر ہی تھا۔ ''سب کچھ ٹھیک ہو گیا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں۔'' کوہستانی نے جواب دیا۔ ''جب تک کوئی ادھر جائے گا ہی نہیں کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ ان پر کیا بیتی ہے۔''

اس کے بعد ہم اسپیشل ٹرین روانہ ہونے سے قبل شیڈ میں انجن ڈرائیور کے ساتھ چلے گئے۔ انجن ڈرائیور کے ساتھ ہی ہم اس انجن میں داخل ہو گئے جو اسپیشل ٹرین میں لگا ہوا تھا۔ اس کے انجن میں داخل ہوتے ہی دوسرا ڈرائیور جو انجن کو شیڈ سے پلیٹ فارم پر لایا تھا انجن سے اتر گیا تھا۔ اس نے یہ دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی کہ انجن کی بھٹی میں کوئلہ جھونکنے والے کون ہیں، کون نہیں۔ ظاہر ہے یہ سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ کہیں کسی گڑبڑ کا امکان معلوم نہیں ہوتا تھا۔

یوں شملے سے ہمارے فرار کا سامان ہوا۔ کالکا پہنچتے ہی ہم نے انجن ڈرائیور کو طے شدہ منصوبے کے مطابق باندھ دیا۔ ہم نے اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونسا اور پلیٹ فارم کی دوسری جانب، اتر کر ایک سمت بڑھتے چلے گئے۔

اگلے تین ماہ ہندوستان کی تاریخ میں بڑے ہنگامی رہے۔

بمبئی میں پرنس آف ویلز کے ساحل پر اترتے ہی احتجاجی ہنگامے شروع ہو گئے۔ اگرچہ کانگریس کی انتہائی کوشش تھی کہ پرنس آف ویلز کے دورے کا مقاطعہ کرتے ہوئے، احتجاج تشدد تک نہ پہنچے، لوگ صرف اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نعروں سے کریں لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ ایسا ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ وہاں مہندر کی قیادت میں ہماری تنظیم کے کارکن اس موقع پر ہر طرح تیار تھے۔ سالار کی سخت ہدایت تھی کہ اس موقع پر ہنگامے اتنی شدت اور قوت کے ساتھ ہوں کہ پورے ہندوستان میں دھوم مچ جائے اور دوسری جگہوں کے لوگوں کو بھی شہ ملے۔

ہجوم کی نفسیات اور ایسے ہجوم کی بہت مختلف ہوتی ہے جو کبھی اپنی نفرت کے اظہار کی خاطر احتجاج کے طور پر جمع ہو اور پھر ایسی صورت میں کہ وہ ایک ظالم، جابر اور غاصب حکمراں سے اپنی ناپسندیدگی کے اظہار پر آمادہ ہو۔ یہ ہجوم ذرا سی بات پر بھڑک سکتا ہے۔ گاندھی جی جو سیاست داں تھے، عوام کے مزاج کے نباض تھے۔ نہ معلوم وہ کیوں غلام قوم کے احتجاج کو عدم تشدد کا پابند بنانا چاہتے تھے۔ ہندوستان کے لوگوں اور بالخصوص ہندوؤں نے انہیں اپنا لیڈر مان لیا تھا۔ ہندوؤں نے انہیں مہاتما کا درجہ دیا لیکن اس مہاتما کے اس فلسفے کو قبول نہیں کیا جو عدم تشدد کا فلسفہ تھا۔ خود ان کی کانگریس پارٹی نے کبھی اس فلسفے کو دل سے نہیں اپنایا۔

سو بمبئی میں وہی کچھ ہوا جو ہم چاہتے تھے۔ ایسا ہنگامہ ہوا کہ گاندھی جی کو کہنا پڑا۔ ''میرے خوابوں کے شہر میں آگ لگ گئی۔''

بسوں اور ٹراموں کو جلا دیا گیا۔ دکانیں لوٹی گئیں۔ شراب خانوں پر سنگ باری ہوئی۔ پرنس آف ویلز کے استقبال کی تقریب درہم برہم ہو گئی۔ یہ خبر پورے ہندوستان میں پھیلی تو لوگوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ ہر جگہ مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان شہروں میں جہاں پرنس آف ویلز کو دورۂ ہند میں جانا تھا، وہاں پرنس کی آمد کے موقعوں پر ہڑتالوں اور ہنگاموں کی تیاریاں زور شور سے شروع ہونے لگیں۔ انگریز حکومت بوکھلا گئی۔ رضا کار تنظیمیں خلاف قانون قرار دے دی گئیں۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں لیڈروں اور کارکنوں کی گرفتاریاں ہوئیں مگر یہ طوفان نہ تھما۔ پرنس آف ویلز کے دورے کا مقاطعہ تشدد سے ہم آہنگ ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ پرنس آف ویلز کے دورۂ کلکتہ تک پورے ہندوستان میں گرفتار شدگان کی تعداد پچیس ہزار سے تجاوز کر گئی۔ یہ حکومت

ہند کے اعداد و شمار ہیں۔ عام خیال ہے کہ ہر صوبے سے اتنی ہی تعداد میں افراد گرفتار ہوئے
گئے۔ گاندھی جی نے پنڈت مالویہ کے توسط سے، انگریز حکومت سے مذاکرات کیے۔
مذاکرات کلکتے میں ہوئے، جہاں وائسرائے، شہزادے کے دورے سے متعلق انتظامات
کے سلسلے میں گیا ہوا تھا مگر یہ مذاکرات ناکام ہوگئے۔

وائسرائے کا کہنا تھا کہ اگر پرنس کی کلکتہ آمد کے موقع پر ہنگامے نہ ہوں تو سیاسی
بنیادوں پر گرفتار کیے جانے والے افراد رہا کر دیے جائیں گے لیکن گاندھی جی کا مطالبہ
کہ تمام سیاسی قیدیوں کو جن میں مولانا محمد علی جوہر اور ان کے ساتھی بھی شامل ہیں رہا کر دیا
جائے، تحریر تقریر، انجمن سازی اور صحافت کی آزادی بحال کی جائے۔ یہ مطالبہ
لارڈ ریڈنگ کو منظور نہ تھا۔

سیاسی سطح پر کی جانے والی یہ تمام کوششیں بے سود ہی ثابت ہوئیں۔ پرنس آف ویلز
کلکتہ پہنچا تو وہاں بھی ہنگاموں نے اس کا استقبال کیا۔ ویسے اس موقع پر دونوں فریق، یعنی
انگریز اور کانگریس، کوئی سمجھوتا کرنا نہیں چاہتے تھے۔ لارڈ ریڈنگ جانتا تھا کہ بنگال میں
ہنگامے ہوں گے، کیوں کہ یہ ہنگامے کانگریس نہیں وہاں موجود دوسری زیر زمین انقلابی
تحریکیں کریں گی اس لیے اس نے ایسی شرط رکھی تھی کہ سیاسی لیڈر اسے رہا نہ کرنے پڑیں۔
کانگریس بھی جانتی تھی کہ بنگال میں ہنگامے روکنا اس کے بس کی بات نہیں، سو وہ یہ وعدہ
کرنے پر تیار نہ تھی۔

بعد میں کانگریس، کلکتے میں ان ہنگاموں کی کلغی اپنے سر پر سجاتی رہی لیکن واقعہ یہ
ہے کہ یہ ہنگامے بنگال کی انہی زیر زمین انقلابی تحریکوں کی کوششوں کا نتیجہ تھے۔ یہ بھی
موقع تھا کہ تنظیم کا رابطہ خفیہ تحریکوں سے قائم ہوا اور ہماری کارروائیوں کو ایک نئی جہت
ایک نئی سمت ملی۔ بنگال اس دور میں بھی ہر دور کی طرح ایک ایسا آتش فشاں تھا جو تھوڑے
وقفے سے لاوا اگلتا رہتا تھا۔ جنگ پلاسی سے آج تک وہ ہر دور میں غاصبوں کے خلاف
مصروف پیکار رہا ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں ہندوستان میں سب سے پہلے آزادی کے
لیے مسلح جدوجہد کرنے والی تنظیمیں قائم ہوئی تھیں۔ یہی وہ سرزمین تھی جس کے انقلابیوں
کے لیے امریکہ میں مقیم ہندوستانیوں نے چندہ اکٹھا کر کے ایک جاپانی جہاز خریدا تھا اور
امریکہ میں اسے اسلحہ سے لدوا کر ہندوستان کے لیے بک کر دیا تھا۔ مجھے آج اس جہاز کا
نام یاد نہیں آ رہا، بہرحال تاریخ میں وہ واقعہ اسی جہاز کے نام سے رقم کیا جاتا ہے۔ یہ جہاز
سنگاپور سے بخیریت گزر گیا تھا لیکن ہندوستان پہنچنے سے قبل انگریز حکومت کو اس کی سن گن

مل گئی اور اسلحہ سے لدا ہوا یہ جہاز اس وقت انگریز بحریہ نے پکڑ لیا جب وہ جزائر انڈیمان
سے کلکتے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بنگال کے انقلابیوں کی جانب سے اسلحہ اسمگل کرنے کی یہ
کوشش تو ناکام ہوگئی لیکن یہیں سے بنگال میں زیر زمین تشدد پسند، دہشت پسند، تحریکوں کی
داغ بیل پڑی۔

پرنس آف ویلز کے دورۂ کلکتہ تک میں اور جمشید لکھنؤ میں ہی رہے۔ اس عرصے میں
دو مرتبہ میں پولیس کے ہتھے چڑھنے سے بچا۔ پہلی مرتبہ اس دن جب چودھری خلیق الزماں
گرفتار ہوئے تھے۔ اس رات میں انہی کے گھر تھا مگر پولیس کو اس کا علم نہیں تھا۔ دوسری
مرتبہ پولیس نے میری گرفتاری کے لیے گھر پر چھاپا مارا تھا مگر اس وقت میں جمشید سے ملنے
گیا ہوا تھا۔ میرے والد ان دنوں لکھنؤ میں نہیں تھا۔ وہ شملے اور دہلی کے درمیان شٹل کاک
بنے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے وہ خان بہادر تھے اور پرنس کا استقبال ان کا مقدس فرض تھا۔

اب ہماری منزل دہلی تھی۔ تنظیم کا پروگرام تھا کہ دہلی میں پرنس آف ویلز پر قاتلانہ
حملہ کیا جائے لیکن وہاں انتظامات اتنے سخت تھے کہ ہمیں کچھ کرنے کا موقع نہیں ملا حالانکہ
کمانڈر انچیف رالنس کے اے ڈی سی کی کوٹھی میں ہمارے چند رضا کار محمد یامین خان۔
نواب سیف اللہ خاں اور امیر اللہ خاں کے ملازموں کی حیثیت سے مقیم تھے لیکن ان میں
سے کسی کو وہاں کوئی کارروائی کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اگر ہماری تنظیم دہلی میں، پرنس آف
ویلز پر قاتلانہ حملہ کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو شاید ہندوستان کی آزادی کی راہ مختلف
ہوتی۔

پھر بھی دہلی میں ہم نے پرنس آف ویلز کی خدمت پر مامور ایک انگریز افسر کو اغوا کر
لیا اور اس کے اغوا سے ہم نے فائدہ بھی اٹھایا۔ اسی اغوا کی بنیاد پر ہم نے چورا چوری میں
غزنوی کے اہل خاندان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا انتقام لینے کا فیصلہ بھی کیا۔

ہم لوگ چورا چوری ٹھیک اس دن پہنچے تھے جس دن گاندھی جی کی صدارت میں
بردولی کے باشندوں نے اعلان کیا تھا کہ ہندوستان میں عام سول نافرمانی کی تحریک شروع
کرنے کے لیے بردولی مناسب ترین مقام ہے۔ اس کانفرنس نے بردولی کے محصول
دہندوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ آئندہ ہدایات تک حکومت کو لگان اور دوسرے محاصل ادا نہ
کریں۔ اس اعلان کے ساتھ ہی گاندھی جی نے حکومت کو الٹی میٹم دیا تھا کہ اگر اب بھی
حکومت ان کے مطالبات تسلیم کر لے تو وہ یہ سول نافرمانی ملتوی کر دیں گے۔ گاندھی جی کا
یہ الٹی میٹم بڑا پھسپھسا تھا جس میں حکومت سے براہِ راست تصادم سے گریز کرنے کی

خواہش پوشیدہ تھی۔

ہم سہ پہر کو چوراچوری پہنچے تھے۔ غزنوی ہمارے ساتھ تھا لیکن برقعے میں تھ
اسٹیشن پر غزنوی کے اسی دوست نے ہمارا استقبال کیا جس نے اسے سب سے پہلے مخبری
اطلاع دی تھی۔ اس کا نام اعجاز تھا۔ شملے سے واپسی پر اس نے پولیس کی ملازمت
استعفیٰ دے دیا تھا۔ ہم اس کے ساتھ اسی کے مکان پر اترے تھے۔

چوراچوری میں ہمیں ایک ایسی محفوظ پناہ گاہ کی ضرورت تھی جہاں کوئی ہم پر ہاتھ نہ
ڈال سکے۔ میں نے غور وخوض کے ایک بہت ہی دلیرانہ فیصلہ کیا اور اس کو عملی جامہ پہنانے
کا ارادہ کرلیا۔

سورج ڈھلے میں اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ ایک اعلیٰ پولیس افسر کے گھر پہنچا۔
اس کے گھر میں کل تین افراد تھے، وہ، اس کی بیوی اور اس کی جوان بیٹی! ان کے علاوہ ایک
ملازم تھا جو باہر کا کام کرتا تھا۔ وہ پولیس افسر ہم سے بہت تپاک سے ملا اور پھر ہم نے اس
کے مکان پر قبضہ کرلیا، اس کے گھر والوں کو یرغمال بنالیا۔ یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہوگیا
کہ خود مجھے بھی حیرانی ہوئی۔

''اب تم کمر میں سخت درد کی وجہ سے چل پھر نہیں سکتے۔'' حالات پر قابو پانے کے
بعد میں نے اس سے کہا تھا۔

''مم..... مگر کیوں؟'' اس نے گڑبڑا کر پوچھا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔''

''جو کچھ تم سے کہا جا رہا ہے وہی کرو۔'' میں نے سختی سے کہا۔ ''ہم سب غزنوی کے
دوست ہیں سمجھے!''

''غزنوی کون؟''

''وہ جس کی بیوی، بہن اور بچے کو پولیس کے غنڈوں سے اغوا کرایا گیا تھا۔''

اس کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں۔ ''تو..... تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''انتقام!'' میں نے کہا۔ ''پولیس سے انتقام!''

''مم..... میں نے کچھ نہیں کیا؟'' وہ گڑگڑا کر بولا۔

پھر وہ ہم سے تعاون کرنے پر آمادہ ہوگیا۔ ہمیں اس سے صرف اتنا تعاون درکار تھ
کہ وہ بیماری کا بہانہ کر کے گھر تک محدود ہو جائے تا کہ اس کی طرف سے کسی کارروائی کا
خدشہ نہ رہے۔ وہ تعاون کرنے پر مجبور تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ہم کون لوگ ہیں۔ وہ ہم سے
غائبانہ طور پر واقف تھا کیوں کہ ہم نے پرنس آف ویلز کی خدمت پر مامور انگریز افسر کو اغو

کہ انجمن محبانِ وطن کی جانب سے وائسرائے کو الٹی میٹم بھیجا تھا کہ اگر غزنوی کے اہل
ان کو رہا نہ کیا گیا تو ٹھیک اس دن جب پرنس آف ویلز دہلی میں اپنا دربار سجائے گا،
افسر کی لاش کسی مقام پر لٹکی پائی جائے گی اور اس دن جو بھی انگریز افسر نظر پڑا اسے گولی
ی جائے گی، خواہ اس کا نتیجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس الٹی میٹم کے نتیجے میں غزنوی کے
خاندان کو رہائی نصیب ہوئی تھی۔

یوں وہ پولیس افسر بیمار بن کر گھر پر پڑ گیا۔ اس کی بیوی اور لڑکی کو ہم نے ایک
رے میں بند کر دیا تھا اور غزنوی، پستول لے کر ان کے سر پر مسلط تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ
وہ پولیس افسر اپنی بیوی اور بچی کی جان کے خوف سے کچھ بھی نہ کر سکے گا۔

چوراچوری میں ہنگاموں کے لیے غزنوی کے اہل خاندان پر گزرنے والے
ات ہی کو بنیاد بنایا گیا۔ کانگریس اور خلافت کے ایک مشترکہ جلسے میں غزنوی کی بیوی،
اور بچے کو پیش کیا گیا اور ان کی تمام غم انگیز داستان غزنوی کے دوست اعجاز نے بڑے
ر انداز میں اور نمک مرچ لگا کر پیش کی تھی۔ میں مہندر کے ساتھ اس جلسے میں موجود تھا
اعجاز کے زورِ بیان پر متحیر تھا۔ جوں جوں وہ داستان کے آخری حصے کی طرف بڑھتا رہا،
ں میں غیض وغضب اور نفرت وغصے کی لہر دوڑتی چلی گئی۔

اگلے دن شام تک یہ داستان چوراچوری میں زبان زدِ عام ہوگئی۔ اس دن پھر ایک
جاجی جلسہ ہوا اور اس میں غزنوی کی بیوی نے روتے ہوئے تمام داستان سنائی۔ اس دن
راچوری کے ایک مضافاتی گاؤں میں چند کسانوں پر پولیس کے تشدد کے واقعات بھی
ن کیے گئے۔

اس دن چوراچوری میں پولیس کے خلاف اشتعال میں اور اضافہ ہوا۔ لوگوں نے
جلسے سے نکلنے کے بعد برسرِعام پولیس کے خلاف نعرے لگائے۔ جہاں کہیں کوئی پولیس
نظر آتا لوگ اس پر آوازے کستے، اسے گالیاں دیتے۔ اس کے بعد چوراچوری کے
ف علاقوں میں احتجاجی اجتماعات ہونے لگے۔ ان جلسوں میں، چوراچوری کے
ات میں پولیس کی زیادتیوں کی داستانیں بھی سنائی جاتیں۔

اشتعال بڑھتا رہا اور اس دن یہ اشتعال اپنی انتہا کو پہنچ گیا جب پولیس نے غزنوی
ست اعجاز کو گرفتار کرلیا۔ جس دن اعجاز گرفتار ہوا اسی رات غزنوی کا چچازاد بھائی
رفت میں تھا۔ اس نے بہت منت سماجت کی بہت رویا پیٹا مگر اس کو معاف کرنے کا
پیدا نہ ہوتا تھا۔

اور جب غزنوی اس کے سامنے آیا تو وہ اس کے قدموں پر گر گیا۔ وہ اسے دوستی کا
واسطہ دے رہا تھا، خاندان کا واسطہ دے رہا تھا مگر غزنوی نے اس کی ایک نہ سنی۔ غزنوی
نے اس کے منہ پر زوردار ٹھوکر ماری اور پھر اسے اپنی جان سے گزرنا پڑا۔

چوراچوری آئے ہوئے ہمیں یہ آٹھواں دن تھا جب غزنوی کے چچازاد بھائی کی
لاش ایک درخت سے لٹکی ہوئی پائی گئی۔ اس لاش کے ساتھ ایک بڑے لفافے پر بڑے
بڑے الفاظ میں لکھا تھا۔

چوراچوری کی بدمعاش پولیس کے لیے تحفہ۔
انجمن محبانِ وطن۔

ذرا ہی دیر میں یہ خبر چوراچوری میں عام ہوگئی کہ غزنوی کی مخبری کرنے والے اس
کے چچازاد بھائی کو غزنوی کے ساتھیوں نے ہلاک کر دیا ہے۔ چوراچوری میں اس سے قبل
ایک انگریز افسر کے اغوا کی داستان بھی پھیل چکی تھی جس کی جان بچانے کے لیے حکومت
نے غزنوی کے اہل خاندان کو رہا کیا تھا۔

اس سے اگلے دن وہ بدمعاش صورت پولیس والے نہایت خستہ حالت میں چورا
چوری کے مختلف علاقوں سے تلاش کیے گئے جنہوں نے غزنوی کے گھر میں گھس کر عورتوں کو
بے دردی سے پکڑا تھا اور جنہیں خفیہ کے اعلیٰ افسر نے سانڈ کہا تھا۔ ان دو واقعات سے
چوراچوری کے لوگوں کے حوصلے بلند ہوگئے۔ ان کے جوش و خروش کو مہمیز ملی۔ وہ خوش تھے
کہ اس دیس میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو ایک ظالم اور جابر حکومت کی آنکھوں
میں آنکھیں ڈال سکتے ہیں۔

چوراچوری میں فضا ہمارے لیے ہموار ہو چکی تھی۔ بارود کے ڈھیر میں بس چنگاری
دکھانے کی دیر تھی اور یہ چنگاری خود پولیس نے ہی لگائی۔ اس رات چوراچوری کی پولیس
نے بڑے پیمانے پر چھاپے مارے۔ وہ انجمن محبانِ وطن کے کارکنوں کو گرفتار کرنا چاہتی
تھی۔ اس کوشش میں اس نے کوئی لحاظ نہ کیا۔ جس پر ذرا بھی شک ہوا اس کے گھر پولیس
چڑھ دوڑی۔ ان چھاپوں کے دوران میں پولیس نے اپنی ''اعلیٰ روایات'' کے مطابق
زیادتیاں بھی کیں، لوگوں کو بے عزت بھی کیا لیکن ہم لوگ اس کے ہتھے نہ چڑھے۔ چڑھتے
چڑھتے بھی تو کیسے، ہم تو ایک ایسے شخص کے گھر میں تھے جہاں پولیس، چھاپا مارنے کا تصور
بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اور پھر اگلے دن چوراچوری میں پولیس کی ان کارروائیوں پر لوگوں نے احتجاج

ے کیے۔ لڑکے اسکولوں سے نکل آئے۔ لڑکے جدھر سے گزرتے سنگ باری کرتے
رتے۔ پولیس نے انہیں اس حرکت سے باز رکھنے کے لیے لاٹھی چارج کیا۔ کئی طلبہ کو
لیا گیا۔

دوسرے دن چوراچوری میں پولیس کی زیادتیوں کے خلاف ایک احتجاجی جلوس
پرنس آف ویلز کیوں کہ ابھی ہندوستان ہی میں تھا اس لیے حکومت کی جانب سے تمام
بوں کی انتظامیہ کو سخت ہدایت تھی کہ وہ مظاہرین سے کہیں بھی تعرض نہ کریں، جلوسوں کو
روک ٹوک گزرنے دیں۔ یہی وجہ تھی کہ کلکتے کے ہنگاموں کے بعد بھی اگرچہ ہندوستان
مختلف شہروں میں مظاہرے جاری تھے لیکن وہ پُرامن طور پر ختم ہو جاتے تھے کیوں کہ
س محض خاموش تماشائی بن کر رہ گئی تھی۔

مگر ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ چوراچوری میں ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

جلوس مختلف سڑکوں سے گزرتا ہوا غزنوی کے مکان پر پہنچا تھا جہاں کئی جیالے
جوانوں نے جلوس سے خطاب کیا تھا۔ وہاں سے یہ جلوس اس تھانے کی طرف بڑھا جہاں
غزنوی کے اہل خاندان کو اٹھانے کے لیے پولیس کا دستہ بھیجا گیا تھا۔ اب تک یہ جلوس
ل سے بھی گزرا تھا، کہیں بھی کوئی پولیس والا موجود نہ تھا۔ پولیس کو ہدایت تھی کہ وہ صرف
نے کی چہار دیواری تک محدود رہے اور جلوس خواہ کتنے ہی اشتعال انگیز نعرے کیوں نہ
ے کسی قسم کی کوئی کارروائی نہ کی جائے۔

مہندر اور صحرائی اس احتجاجی جلوس کے قلب میں تھے۔ میں اور جمشید جلوس کے پچھلے
ے میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ جلوس پُرزور نعرے لگاتا، پولیس کو برا بھلا کہتا ہوا
نے کے سامنے سے گزرتا رہا۔ نصف سے زیادہ جلوس تھانے کے سامنے سے گزر گیا۔
بے چین ہو گیا۔ وقت اور جلوس گزرتا جا رہا تھا۔ اگر جلوس کا پچھلا حصہ بھی تھانے کے
منے سے گزر جاتا تو پھر گویا ہمارا مقصد ہی حل نہ ہوتا۔

میں نے اب فوراً کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ لوگوں کو تو بس شہ ملنے کی دیر ہوتی
۔ وہ اس بات کے منتظر رہتے ہیں کہ کوئی پہلا پتھر چلا دے۔ میں نے پولیس کے خلاف
ن چار زبردست نعرے لگائے۔ ہجوم نے اس کا جواب دیا اور پھر میں نے جھک کر تین
پتھر اٹھائے، میری دیکھا دیکھی جمشید نے بھی پتھر اٹھا لیے۔ پھر میں نے پہلا پتھر چلا
یہ پتھر سیدھا ایک پولیس والے کے لگا۔ جمشید بھی مجھ سے پیچھے نہ رہا دو تین پولیس
ں کے پتھر لگے، پھر جلوس کے دوسرے لوگ بھی اس سنگ باری میں شامل ہو گئے۔

لوگوں کو شہ مل چکی تھی۔ اب انہیں کوئی روکنے والا نہ تھا۔

تھانے کے باہر متعین سپاہیوں نے ڈر اور خوف سے فائرنگ شروع کر دی۔ انہیں خطرہ ہو گیا تھا کہ کہیں مشتعل ہجوم ان پر حملہ نہ کر دے مگر اپنی حفاظت کے لیے فائرنگ کرنا ان کی بہت بڑی حماقت تھی۔ فائرنگ کی آواز سنتے ہی تمام جلوس تھانے کی طرف پلٹ پڑا۔ لوگ پولیس والوں سے بھڑ گئے۔ سپاہی فائرنگ کرتے ہوئے تھانے میں پسپا ہو گئے اور دروازے بند کر کے اندر بیٹھ گئے۔ انہیں پسپا ہونا ہی تھا کیوں کہ ان کے پاس گولیاں ختم ہو گئی تھیں۔ اس پسپائی میں ایک سپاہی مشتعل ہجوم کے درمیان پھنس گیا۔ وہ ذرا ہی دیر میں زندگی کی سرحد پار کر کے موت کی وادی میں جا سویا اور لوگوں نے جیسے فتح کے نشے میں سرشار ہو کر ایک زبردست نعرہ لگایا۔

ایک سپاہی کی موت سے ان کے حوصلے اور بڑھ گئے تھے۔ میں ابھی اس کارروائی سے مطمئن نہ تھا۔ لوگ تھانے کی طرف بڑھنے سے ہچکچا رہے تھے۔ ایک مرتبہ پھر انہیں راہ سجھانے اور جوش دلانے کی ضرورت تھی۔

میں نے زوردار آواز لگائی۔ ''ساتھیو! آؤ، آج ان کتوں کو مزا ہی چکھا دیں۔''

میری آواز پر جمشید نے کہا۔ ''آؤ ساتھیو!'' یہ کہہ کر وہ چلتا ہوا میرے پاس آ گیا۔

''آؤ!'' کئی لوگوں کی آوازیں آئیں۔ کئی افراد کا ایک گروہ تھانے کے احاطے میں داخل ہو گیا اور اس کے بعد گیٹ سے انسانی سیلاب احاطے میں پھیل گیا۔

تھانے کی عمارت اب مشتعل ہجوم کے نرغے میں تھی۔ میں اور جمشید اب ان لوگوں کے پیچھے تھے۔ لوگوں نے تھانے کو آگ لگا دی۔ آگ سے بچنے کے لیے پولیس والے دروازے کھول کر عمارت سے باہر آ گئے۔ جیسے ہی وہ باہر آئے، مشتعل ہجوم نے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور لاشوں کے یہ ٹکڑے جلتی ہوئی آگ میں جھونک دیے۔

ہجوم اب اپنی مرضی کا مالک تھا۔ اب اسے، کوئی بھی اقدام کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ میں اور جمشید کھسکتے ہوئے احاطے سے باہر آ گئے۔ اب ہمیں اپنی پناہ گاہ پر واپس پہنچنا تھا۔ ہمارے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد ہی مہندر اور صحرائی بھی وہاں آ گئے تھے۔

تھوڑی ہی دیر بعد ہم اس جلوس کے واقعات غزنوی کو سنا رہے تھے۔ پولیس افسر، اس کی بیوی اور بیٹی خوفزدہ انداز میں ہماری باتیں سن رہے تھے۔ شاید انہیں ڈر تھا کہ ہم انہیں بھی موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ اس کا اظہار اس پولیس افسر نے کیا بھی تھا مگر میں نے اسے یہ کہہ کر تسلی دی تھی کہ اس کی میزبانی کے عوض ہم اس کی جاں بخشی کر دیں گے۔

ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ مشتعل ہجوم نے سرکاری کارندوں سے ایسا سخت اور بھیانک انتقام لیا تھا۔ اس واقعے کا تذکرہ کم وبیش تاریخ کی ہر کتاب میں مل جائے گا مگر کسی کتاب میں اس ہنگامے کی اصل وجوہ شاید ہی ملیں۔ خود گاندھی جی نے اس واقعے پر غم کا اظہار کرتے ہوئے دوٹوک الفاظ میں کہا تھا کہ چوراچوری میں ہونے والے اس ہنگامے کا کوئی تعلق کانگریس سے نہیں ہے۔ کانگریس کا کوئی لیڈر یا کارکن اس ہنگامے کی قیادت نہیں کر رہا تھا۔ ساتھ ہی اس موقع پر گاندھی جی سے ایک غلطی بھی ہوئی۔ انہوں نے اس واقعے کو سول نافرمانی کی وہ تحریک ملتوی کرنے کا جواز بنا لیا جو بزدولی کے علاقے میں آٹھ دس روز قبل شروع کرنے کا اعلان کیا تھا۔ ان کی دلیل تھی کہ اس ہنگامے سے ثابت ہو گیا ہے کہ ہندوستان ابھی اہنسا کے سنہری عقیدے کو صدق دل سے قبول نہیں کر سکا ہے۔ ابھی تشدد اور بغاوت کے عنصر اس میں باقی ہیں۔ اس طرح گاندھی جی نے سول نافرمانی کے اعلان سے فیصلہ کن بغاوت کی سمت جو قدم اٹھایا تھا، واپس لے لیا۔ انہوں نے پیش قدمی کیے بغیر پسپائی اختیار کر لی۔ لوگوں کے دلوں میں دہکتے ہوئے لاوے کو انہوں نے سمندر کا جھاگ بنا ڈالا۔ ان کی اسی پالیسی کی بنا پر اسی سال کانگریس دو حصوں میں بٹ گئی۔ اس سے اگلے ماہ گاندھی جی بھی گرفتار کر لیے گئے حالانکہ انہوں نے سول نافرمانی کی تحریک ملتوی کر کے خود انگریز حکومت کے ہاتھ مضبوط کیے تھے۔ اندولال یاجنک نے جو ایک زمانے میں گاندھی جی کے سیکرٹری رہے ہیں، شاید ٹھیک ہی لکھا ہے کہ انگریز حکومت نے گاندھی جی کی گرتی ہوئی ساکھ بحال کرنے کے لیے ان کی گرفتاری کا ڈھونگ رچایا تھا۔

بہرحال ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکے تھے۔ ہم اسی رات چوراچوری سے نکل گئے تھے۔

☆======☆======☆

چوراچوری کی مہم سے فارغ ہو کر جمشید اور صحرائی کے سوا ہم چاروں، یعنی میں، مہندر، کوہستانی اور غزنوی کلکتے پہنچے۔ جمشید بمبئی چلا گیا اور صحرائی، سندھ۔ ہم چاروں کو کلکتے میں ایک خفیہ دہشت پسند تنظیم کے کارکنوں سے بعض آتشیں اسلحے اور بارودی دھماکوں کی تربیت لینا تھی۔ اس تنظیم کا سربراہ ایک انقلابی ہندو نوجوان ڈی کے بوس تھا۔ وہ اس شخص کی اولاد میں سے تھا جس کے ایما پر امریکہ میں مقیم ہندوستانیوں کی انجمن آزادیٔ ہند نے اسلحہ سے لدا ہوا جہاز ہندوستان بھیجنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا تمام خاندان ہی انقلابی

تھا۔ اس کے باپ کو پھانسی کی سزا ہوئی تھی اور چچا کو کالے پانی کی۔ اس کا بھائی فوج اور پولیس سے مقابلے کے دوران میں ہلاک ہوا تھا اور اس کی بہن اس کی دستِ راست تھی۔

ڈی کے بوس سے ہماری تنظیم کا تعارف گیا میں کانگریس کے اجلاس کے موقع پر ہوا تھا اور پھر اسی تعارف کی بنا پر ہماری تنظیم کے کارکنوں نے کلکتے میں پرنس آف ویلز کی آمد پر مظاہروں کی قیادت کی تھی۔ کلکتے کے ایک معمولی سے ہوٹل میں ہمارا قیام تھا۔ وہاں پہنچنے کے دو دن بعد ڈی کے بوس سے ہماری ملاقات ہوئی۔ وہ خود ہی ہم سے ملنے آیا تھا۔ ہماری یہ ملاقات بڑی پُر جوش رہی۔ وہ واقعی انقلابی تھا۔ بغاوت کا جذبہ اور آزادی حاصل کرنے کی امنگ اس کے روم روم میں سمائی ہوئی تھی۔ وہ ایک مضطرب اور چوکنا شخصیت کا مالک تھا۔ میرے ذہن میں اس کے لیے صرف ایک ہی تشبیہ ہے، بنگال ٹائیگر!

وہ ہم سے یوں ملا تھا جیسے ہم برسوں کے دیرینہ دوست ہوں۔ ابتدائی تعارف کے بعد وہ فوراً ہی ہم سے بے تکلف ہو گیا تھا۔ وہ ملی جلی اردو اور انگریزی میں ہم سے گفتگو کر رہا تھا۔ وہ ہم میں سے کسی کو بھی مخاطب کرتا تو پہلے ''یار'' کا لفظ استعمال کرتا۔ یہ لفظ اس کے منہ سے بڑا پیار لگتا۔

وہ ہم سے ہماری تنظیم کی سرگرمیوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ ہم نے مختصراً اسے تمام تفصیلات بتا دیں۔ وہ ان تفصیلات کو بڑی توجہ اور دلچسپی اور انہماک سے سنتا رہا۔

جب ہم اسے سب کچھ بتا چکے تو اس نے کہا۔ ''یار لوگو! مجھے خوشی ہے کہ اب ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی یہ انقلابی فکر پیدا ہو رہی ہے ورنہ ہم تو سوچتے تھے کہ اٹھارہ سو ستاون کے بعد ان علاقوں کی ماؤں نے شہید اور سرفروش بیٹوں کو جنم دینا ہی بند کر دیا ہے۔'' میں نے اس پر کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ بوس نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''نا، نا، نا! میں زوردار تقریریں کرنے والے سیاسی لیڈروں کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ نہ خواب دیکھنے والے ان لوگوں کی جنہیں تم مجاہدین کہتے ہو اور جو ہندوستان کی آزادی کے لیے ترکی اور افغانستان کی طرف دیکھتے ہیں اور ریشمی رومالوں پر خفیہ خط و کتابت کرتے ہیں۔ میں ان لوگوں کی بات کر رہا ہوں جو اپنے زورِ بازو پر بھروسا کرتے ہیں۔''

''یہ اندازِ فکر کا فرق ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ورنہ باقی ہندوستان میں بھی آزادی کے متوالے بستے ہیں۔''

''نہیں یار یہ اندازِ فکر کا نہیں، طریقۂ کار کا فرق ہے۔'' بوس نے کہا۔ ''تم لوگ

یاسی جنگ کے قائل ہو مگر یہ بھول جاتے ہو کہ سیاسی جنگ ایک آزاد ملک میں دو پارٹیوں کے درمیان تحریر، تقریر، اجتماع اور صحافت کی آزادیوں کے ساتھ لڑی جاتی یاست کی یہ جنگ کسی غلام ملک میں لڑی ہی نہیں جا سکتی۔ ایسے ممالک میں صرف دو ں ہوتی ہیں، ایک حاکموں کی دوسری غلاموں کی! ایک مرتبہ یہ کسی قوم پر مسلط اور نافذ ئیں تو پھر پیر تسمہ پا کی طرح کاندھوں پر سوار رہتے ہیں۔ یہ پیر تسمہ پا، غلاموں کے ھے سے، ان کی درخواست پر ان کے رونے دھونے پر نہیں اترتا۔ اسے تو کاندھے جھٹک کر گرانا پڑتا ہے اور بھاری پتھر سے اس کا سر کچلنا پڑتا ہے۔ خیر چھوڑو ان باتوں '' ڈی کے بوس نے کہا۔ ''یہ مباحثے عمر بھر جاری رہ سکتے ہیں۔ نہ میری دلیلیں ختم ہوں تمہاری، اصل بات تو عمل کی ہے۔''

اسی دن ہم اس ہوٹل سے ڈی کے بوس کے گھر منتقل ہو گئے۔ وہ کلکتے کے مضافات اپنے کسی دوست کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ یہاں ہماری ملاقات اس کی انقلابی بہن سشما بھی ہوئی۔ وہ سانولی سلونی، دبلی پتلی، نازک اندام بنگالی حسینہ تھی۔ اس کے نقوش ھے سادے مگر پُرکشش تھے۔ اس کے بال اتنے لانبے تھے کہ کمر سے بھی چار پانچ ت نیچے تک جاتے تھے۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک انقلابی لڑکی بھی ی تھی۔ ہماری تربیت تین ماہ جاری رہی۔ اس کے لیے پہلے ہمیں سندر بن اور کھلنا کے ت میں جانا پڑا اور پھر چٹا گانگ کے پہاڑی علاقوں میں۔ اس تربیت کے لیے سشما ی نگران تھی اور مزید دو افراد ہمارے ساتھ تھے۔ اس تربیت کے نتیجے میں ہم مشین گن رائفل چلانا نہ صرف سیکھ گئے تھے بلکہ ہمارا نشانہ بھی بہت صاف ہو گیا تھا۔ اس کے ہم نے مختلف قسم کے ڈائنا مائٹ اڑانے، فیوز بنانے اور بارود سے چھوٹے موٹے بم بنانے کی تربیت بھی حاصل کی تھی۔ مہندر اور سشما بہت تیزی کے ساتھ ایک رے کے قریب آ گئے تھے۔ وہ جب کبھی قریب ہوتے اور میں ان کی طرف آنکلتا تو ا اکثر متفکر انداز میں بس خلا کو گھورتا ہوا پاتا۔ شاید وہ بھی مستقبل کے بارے میں اسی ح سوچتے تھے جس طرح میں اور لالی سوچا کرتے تھے۔

ہم نے اپنی تمام صلاحیتیں اس تربیت پر صرف کر دیں۔ ہم جانتے تھے کہ ہماری یہ یت کسی اہم مہم کے سلسلے میں ہے، کسی بڑی مہم کے سلسلے میں! ہمیں اس تربیت کے لیے ب کرتے ہوئے سالارِ اعظم نے کہا تھا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم پوری دل جمعی سے یہ یت حاصل کرو کیونکہ یہ تربیت بعد میں ہماری تنظیم کی مہموں میں بہت کام آئے گی۔ اس

تربیت کے خاتمے کے فوری بعد تمہیں ایک نہایت اہم مہم درپیش ہوگی۔ وہ ایسی مہم ہ
انگریز حکومت ایک مرتبہ تو لرز کر ہی رہ جائے گی۔ یہ حکومت اس بات کی توقع ہی نہیں کر
کہ ہم ہندوستانی اس انداز میں بھی ان کے خلاف کارروائیاں کر سکتے ہیں۔''

ڈی کے بوس ہماری تربیت سے مطمئن تھا اور جتنی تیزی سے ہم مختلف آتشیں اس
کے استعمال میں مہارت حاصل کرتے جا رہے تھے، اس پر وہ خوش بھی تھا۔ وہ مہینے
ایک آدھ بار ہی ہم سے ملنے آتا یا پھر ہم ہی کسی جگہ اس سے مل لیا کرتے۔ یوں ب
ہمارے تربیتی کیمپ سے رابطہ ضرور قائم رکھتا تھا۔

جون کا مہینہ شروع ہو چکا تھا جب ہم اپنی تربیت مکمل کر کے کلکتے واپس پہنچے۔ بو
نے بڑی مسرت سے ہمارا استقبال کیا اور بتایا کہ ہمیں دو دن بعد ہی نینی تال روانہ ہو
ہے۔

''نینی تال!'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔ ''مگر کیوں؟''

''تمہارے چیف کی یہی ہدایت ہے۔ سشما بھی تمہارے ساتھ ہوگی۔''

میں نے پھر حیرانی کا اظہار کیا تو بوس نے کہا۔ ''اس کے لیے خود تمہارے چیف نے
مجھ سے کہا تھا۔ سشما بہت اچھی نرس ہے۔''

دو روز بعد بوس ہمیں ریلوے اسٹیشن پر الوداع کہہ رہا تھا۔

☆======☆======☆

ہدایات کے مطابق اور احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم ٹرینیں تبدیل
کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہے۔ اس سفر میں رہ رہ کر مجھے لکھنؤ سے بمبئی کا
وہ سفر بار بار یاد آتا رہا جس میں مہندر اور لالی بھی میرے ساتھ تھے۔ اس سفر سے کئی حسین
یادیں وابستہ تھیں اور ان میں حسین ترین یاد لالی کی تھی۔

سشما اس سفر کے ساتھ ہی مہندر کے لیے اپنے من مندر میں کئی دیپ جلا چکی تھی۔
میں نے محسوس کیا تھا کہ سشما کے یہ جذبات یک طرفہ نہیں تھے۔ مہندر بھی سشما کے لیے
وہی جذبات رکھتا تھا جو میرے دل میں لالی کے لیے تھے۔ سشما جب مہندر کی طرف دیکھتی
تو اس کی آنکھوں کی جوت کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی اور مہندر سے گفتگو کرتے ہوئے اس کے
لہجے میں گنگناہٹ کا ارتعاش سا پیدا ہو جاتا۔ اس کے گالوں پر جیسے انگارے سے دہکنے
لگتے۔ اس کی مٹیالی رنگت میں جیسے کسی بھیگی ہوئی شام میں پھوٹنے والی شفق گھل جاتی۔

یہ خواب بھی کتنے حسین ہوتے ہیں، یہ تصورات بھی کتنے شاداب ہوتے ہیں۔ غلامی
تپتی دوپہر میں سفر کرنے والوں کی زندگی میں ایسے خواب ناک، شاداب اور محبت سے
پور لمحات بہت ہی کم آتے ہیں اور پھر زندگی بھر کا عذاب بن جاتے ہیں۔ مجھے مہندر اور
شما پر بے حد پیار آنے لگا تھا۔ ساتھ ہی میرا دل غیر یقینی مستقبل کے اندیشوں سے دہل
رہ جاتا تھا، تب لالی کا چہرہ میرے تصور میں اتر آتا۔ ''میں انتظار کروں گی۔'' اس کے
الفاظ کی نغمگی مجھے بھی بوجھل اور شرابور کر ڈالتی۔

پیلی بھیت اسٹیشن پر کامریڈ صحرائی ہمارا منتظر تھا۔ وہ سالار اعظم کے پیغام کے ساتھ
ں پہنچا تھا۔ نینی تال میں جو مہم ہمیں سپرد کی جانے والی تھی، جزوی طور پر ملتوی کر دی گئی
لہٰذا ہم سب کا نینی تال جانا ضروری نہیں رہا تھا۔ اب صرف مجھے اور کوہستانی کو نینی تال
چنا تھا۔ مہندر، غزنوی اور سشما کو شملہ پہنچنے کی ہدایت تھی۔ لالی پہلے ہی شملے پہنچ چکی تھی۔
م سننے کے بعد میرے اور کوہستانی کے سوا باقی سب پیلی بھیت اسٹیشن پر ہی اتر گئے۔
یں ابھی کاٹھ گودام جانا تھا جو اس لائن پر آخری اسٹیشن تھا جہاں سے لاری کے ذریعے ہم
تال پہنچ سکتے تھے۔

نینی تال قدرت کی صناعی کا حسین شاہکار! پہاڑوں کے درمیان پُرسکون اور شفاف
ل، انگشتری میں نگینے کی مانند تھی۔ دکھوں اور آلام سے بھری ہوئی اس دنیا میں یہ خطہ
یرۂ عافیت معلوم ہوتا تھا۔ جھیل کے چاروں طرف پہاڑوں پر مکانات بنے ہوئے تھے۔
ل کنارے کے ساتھ ساتھ سڑک کا حلقہ تھا۔ رات کو جب آسمان کے ستارے اور
وں کی روشنیاں جھیل کی پُرسکون سطح پر اتر آتیں تو یوں لگتا کہ سیاہ چادر پر کسی نے مقیش
تاروں سے ستارے ٹانک دیے ہوں۔

ہمیں نینی تال پہنچے ہوئے تین دن ہو چکے تھے۔ ہم وہاں ایک چھوٹے سے مکان
یم تھے جو ہم نے کرائے پر لے لیا تھا۔ ان تین دنوں میں تنظیم کے کسی رکن نے ہم سے
ہ قائم نہیں کیا تھا۔ سو ہمارے لیے سوائے سیر و تفریح کے کوئی کام نہ تھا۔ ہم دن بھر
وں اور وادیوں کی سیر کرتے، خودرو، خوش رنگ پھولوں کی خوشبو سے بوجھل فضا میں
لیتے۔ کتنی عجیب بات تھی کہ قدرت نے انسان کے لیے تازگیاں اور خوشبوئیں
ری تھیں لیکن انسان ہی نے قدرت کے ان انعامات کو بعض کمزور انسانوں کے لیے شجرِ
ہ بنا دیا تھا۔ قدرت نے ہندوستان کے پہاڑوں، وادیوں، میدانوں، دریاؤں اور
ں میں تازگی اور فرحت گھول رکھی تھی لیکن غاصب غیر ملکیوں نے ہر جگہ ہندوستانیوں

کے لیے قبرستان اور شمشان گھاٹ سجا دیے تھے۔ نینی تال سے تازگی اور فرحت ابھرتی تھی اور ہندوستان ایک متعفن جوہڑ بنا ہوا تھا۔

نینی تال میں یہ ہمارا چوتھا دن تھا۔ میں اور کوہستانی جھیل کے ساتھ ساتھ سڑک پر چہل قدمی میں مصروف تھے۔ شام کے سرمئی سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ اچانک ایک شناسا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ ستا ہوا چہرہ، خمیدہ ناک، آپس میں ملی گھنی اور گہری بھنویں۔ شکرا! میں ایک لمحے کو اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی مجھے حیرانی اور تعجب کے سائے لہراتے نظر آئے۔ یہ وہی شخص تھا جس سے بمبئی میں میرا پالا پڑ چکا تھا، جس کے حکم پر مجھے اس فلیٹ سے اغوا کیا گیا تھا جہاں میں سالارِ اعظم کی ہدایت پر نظر بندی کے دن گزار رہا تھا۔

میرے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ میں نے تیزی سے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیرا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا پھر کوہستانی کے ساتھ ہو لیا۔ مجھے یقین تھا کہ شکرے نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں جلد از جلد اس کی نظروں سے اوجھل ہو جانا چاہتا تھا اور اس لیے میری رفتار از خود تیز ہو گئی تھی۔

''کیا بات ہے؟'' کوہستانی نے مجھ سے دریافت کیا۔

''کچھ نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''جلدی چلو۔''

''ہوا کیا؟'' کوہستانی نے سوال کیا۔

''خطرہ!'' میں نے کہا۔ ساتھ ہی میرے قدموں کی رفتار اور تیز ہو گئی۔

اب ہم تقریباً دوڑ رہے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ شکرا اپنی جگہ کھڑا ہماری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت ہم اس پتھریلی سڑک کے موڑ پر تھے جو دائیں جانب ایک مکان کے ساتھ تھا۔ وہ سڑک اوپر کی طرف چلی جاتی تھی۔ میں تیزی سے لپک کر اسی سڑک کی طرف مڑ گیا۔ موڑ پر میں نے پھر پلٹ کر دیکھا۔ شکرا اب بھی وہیں کھڑا تھا اور اس کا رخ ہماری طرف تھا۔ پھر مجھے یوں لگا تھا جیسے اس نے ہمارے تعاقب کے لیے دوڑنا شروع کر دیا ہو۔

''بھاگ لو کوہستانی!'' میں نے کہا تھا۔

رات نے نینی تال کو اپنی بانہوں نے میں سمیٹ لیا تھا۔ ہم وہاں سے فرار ہو کر اپنے مکان کی طرف ہو لیے تھے لیکن اس وقت نہ معلوم کیوں مجھے ہر طرف سے خطرات بڑھتے محسوس ہو رہے تھے۔ ہمارا یہ مکان آبادی سے ذرا الگ تھلگ تھا۔ اس وقت مجھے اس مکان

خوف سا محسوس ہوا۔ ایسا لگا جیسے وہاں خطرہ ہماری گھات میں چھپا ہوا ہو۔ شکرے کو نینی تال میں دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ اگر وہ خفیہ ہی کا کوئی کارندہ تھا تو پھر اب نینی تال ہمارے لیے محفوظ نہیں تھا۔

پھر میں نے ان خدشات کا اظہار کوہستانی سے کر ہی دیا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں یہاں جاتے ہوئے محتاط رہنا چاہیے۔'' شکرے سے متعلق تفصیلات میں اسے پہلے ہی بتا چکا تھا۔

''کیوں نہ آج رات کسی ہوٹل مین گزاری جائے۔'' کوہستانی نے تجویز پیش کی۔

''ہوٹل ہمارے لیے محفوظ نہیں ہے۔ نینی تال میں ہوٹل ہی کتنے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''پھر؟'' کوہستانی کے لہجے میں سوال بھی تھا اور تشویش بھی۔

''آؤ ایک تجویز ہے۔''

اس وقت اچانک میرے ذہن میں سروجنی نائیڈو کا خیال آیا تھا۔ میں نے ایک بنگلے پر ان کے نام کی تختی لگی دیکھی تھی اور دو ایک مرتبہ انہیں سیر کرتے ہوئے بھی دیکھا تھا لیکن ہر موقع پر ان سے کنی کترا گیا تھا۔ سروجنی نائیڈو، والد صاحب کی اچھی دوست تھیں۔ دو مرتبہ وہ لکھنؤ آئی تھیں اور اسی موقع پر والد صاحب کے ساتھ ان سے ملاقات کا موقع ملا تھا۔ وہ ایک پُرجوش خاتون تھیں۔ قدرت نے ان کی زبان میں جادو گھول دیا تھا اور ان کی شخصیت میں جاذبیت اور عظمت کے رنگ بھرے تھے۔ ان کا وجود آزادی کی چنگاریوں سے عبارت تھا۔ وہ ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتی تھیں۔ ہندوستان میں رہنے والے لوگوں کے لیے ان کے دل میں صرف محبت ہی محبت تھی۔ وہ ہندوستان میں آباد افراد کو صوبوں، قوموں، یا نسل، فرقوں اور زبان کے خانوں میں تقسیم نہیں کرتی تھیں۔ انہیں ہر ہندوستانی عزیز تھا، خواہ وہ کسی صوبے کا ہو، کسی مذہب کا ہو۔

پھر ہم دونوں وہاں سے واپس ہو لیے۔ میرا یہ فیصلہ غلط تھا یا نہیں، اس وقت مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی، نہ مجھے اس بات کا ہوش تھا کہ اس مکان کو چھوڑ کر میں تنظیم کے لیے رکاوٹیں پیدا کر سکتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ تنظیم کا کوئی نہ کوئی فرد یقیناً نینی تال میں ہماری نگرانی کر رہا ہو گا۔ اسے معلوم ہو گا کہ ہم لوگ کہاں مقیم ہیں اور وہ تنظیم کی طرف سے احکامات کا انتظار کر رہا ہو گا جو اس نے ہم تک پہنچانے تھے۔ اب اس مکان سے فرار ہونے کے بعد یقیناً تنظیم کو ہم سے رابطہ قائم کرنے میں مشکل در پیش آ سکتی تھی۔ سروجنی

نائیڈو کے گھر تک کے سفر میں یہ تمام باتیں میرے ذہن میں آئی تھیں اور میں نے سوچ
کہ اس کے لیے کوہستانی کو کام میں لاؤں گا۔ اب وہ اکیلا ہی نینی تال میں سیر کرے گا۔
تنظیم کے کارکن کو اس سے رابطہ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

سروجنی نائیڈو نے نہایت پُرجوش انداز میں ہمارا استقبال کیا۔ ''اوہ! مائی گرینڈ فری
ڈم فائٹر، مجاہدِ آزادی!'' یہ الفاظ ہی میرے لیے دھماکے سے کم نہیں تھے۔ ''کیسے آئے؟''
انہوں نے انگریزی میں سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''یہ میرے دوست ہیں، کوہستانی!''

''وہاٹ، کوہستانی؟'' سروجنی نائیڈو نے کہا۔ ''گلیڈ ٹو میٹ یو۔'' انہوں نے
کوہستانی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا، پھر انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''تو یہ بھی فری ڈم
فائٹر ہی ہوگا۔ فری ڈم فائٹر کا دوست بھی فری ڈم فائٹر ہی ہونا چاہیے۔''

''یہ آپ مجھے مستقل فری ڈم فائٹر کیوں کہہ رہی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں آفاق
شیرازی ہوں۔''

''کچھ غلط کہہ رہی ہوں؟'' سروجنی نائیڈو نے کہا۔ ان کے ہونٹوں پر معنی خیز
مسکراہٹ تھی۔

میں نے پریشان ہوکر کوہستانی کی طرف دیکھا۔

سروجنی نائیڈو کی آواز پھر ابھری۔ ''خان بہادر شیرازی کا بیٹا، آفاق شیرازی، انگریز
حکومت کی نظر میں دہشت پسند ہے ہم جیسے لوگ دہشت پسندوں کو فری ڈم فائٹر کہتے
ہیں۔'' سروجنی نائیڈو نے کہا۔ ''مجھے تم جیسے نوجوان سے محبت ہے۔''

''آپ نے تو مجھے حیران کر دیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''ابھی میں تمہیں اور حیران کروں گی۔'' سروجنی نائیڈو نے کہا۔ ''ویسے یہ بتاؤ نینی
تال کب آئے؟ کہاں ٹھہرے ہو؟''

اس کے بعد میں نے انہیں جھوٹ کی چاشنی کے ساتھ اپنا مسئلہ بتا ہی دیا۔ سروجنی
نائیڈو نے میری داستان سننے کے بعد گہرا سانس لے کر کہا۔ ''ہوں، گویا تم پناہ چاہتے
ہو۔'' وہ ایک لمحے کو سوچنے لگیں۔

''اگر آپ مناسب سمجھیں تو!'' میں نے کہا۔ ''ورنہ ہم کچھ اور انتظام کرلیں گے۔''

''اوہ نہیں!'' سروجنی نائیڈو نے کہا۔ ''میں کچھ اور سوچ رہی تھی میرے لیے اس
سے بڑا کوئی اعزاز ہو ہی نہیں سکتا کہ اس ملک کے فری ڈم فائٹرز مجھے اپنا دوست سمجھتے ہیں۔

تمہارے والد تمہاری طرف سے خاصے پریشان ہیں۔''

''نہیں میری روش پسند نہیں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں کیا پسند ہے کیا نہیں......'' سروجنی نائیڈو نے کہا۔ ''اس کا اندازہ تم شاید نہ کر
ان کی پریشانیاں اس لیے ہیں کہ وہ تمہارے باپ ہیں۔''

''ویسے آپ کا کیا خیال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اپنے بچے کو تمہارے نقشِ قدم پر چلتے دیکھنا چاہتی ہوں مگر نہیں جانتی کہ اگر اس
یسا فیصلہ کیا تو میرے جذبات کیا ہوں گے۔'' اس کے بعد ہم مختلف مسائل پر گفتگو
تے رہے۔ سروجنی نائیڈو بھی کئی دوسرے قوم پرست لیڈروں کی طرح ہندوستان کی
بنا پر تشویش میں مبتلا تھیں جو انگریز نے ہندوستان میں قائم کر دی تھی۔ کئی انتہا پسند ہندو
ان دنوں کھلم کھلا مسلمانوں کے خلاف زہر اگل رہے تھے اور انہیں مسلمانوں کے
بھڑکانے میں مصروف تھے۔ ان کے سرخیل پنڈت مدن موہن مالویہ تھے جنہوں نے
ہیں گاندھی جی کی اجازت سے وائسرائے لارڈ ریڈنگ سے ناکام مذاکرات کیے تھے
ساتھ ہی وہ اس یہودی وائسرائے سے یہ اجازت بھی لے آئے تھے کہ وہ مسلمانوں
خلاف اعلانِ جنگ کر دیں گے۔ وائسرائے سے ملاقات کے بعد ہی انہوں نے
ستان کی سیاست میں، جو بہ تدریج ہندو مسلم اتحاد کی بنیادوں پر آزادی کی راہ متعین
نے کی کوشش کر رہی تھی، وہ گند پھیلایا کہ یہ اتحاد جو پہلے ہی مصنوعی تھا اور جسے مصنوعی
ل سے مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی تھی، اسی برس اڑا دھڑام کر کے زمین پر آرہا۔

ہندوستان کی سیاست پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیں تین گھنٹے گزر گئے۔ اس دوران
نے تین مرتبہ چائے پی، ساتھ ہی ہمیں وہ کمرہ بھی دکھا دیا گیا جس میں ہمیں رات
تھی۔ اول تو یہ موضوع ہی ہماری دلچسپی کا تھا، پھر طرزِ کلام، ہندوستانی نائٹ انگیل،
نائیڈو کا، وقت کا کچھ پتا ہی نہ چلا کہ چپکے سے پر لگا کر اڑ گیا۔

رات خاصی بھیگ چکی تھی اور سروجنی نائیڈو کی باتیں جاری تھیں۔ پھر ایک مرتبہ
جماہی آئی تو شاید انہیں وقت کے گزرنے کا احساس ہوا، انہوں نے فوراً ہی کہا۔
بھوکے ہوگے میں بھی کتنی بداخلاق ہوں کہ تم سے کھانے کو نہیں پوچھا۔ دراصل میں
مہمان کا انتظار کر رہی ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ ایک گھنٹے میں آجائے گا مگر اب تو
ٹے ہوگئے ہیں۔ تم چاہو تو کھانا لگوا دوں۔''

''تو کیا آپ نہیں کھائیں گی؟'' میں نے سوال کیا۔

''میں اپنے مہمان کا انتظار کروں گی۔'' سروجنی نائیڈو نے کہا۔ ''وہ مہمان
بہت عزیز ہے۔ ویسے اے فری ڈم فائٹرز! یہ بتاؤ کہ اگر بھوک لگ رہی تھی تو تم
کیوں نہیں؟''

''میں آپ کی خوبصورت باتیں سن رہا تھا۔ ویسے آپ کے وہ مہمان ہیں کون؟''

''تم دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ میں نے کہا تھا نا تم سے کہ ابھی میں تمہیں
حیران کروں گی۔ میں چاہتی تھی کہ ہم سب ساتھ کھانا کھائیں۔ تم میرے مہمان سے
بہت خوش ہو گے اور اس سے زیادہ حیران ہو گے۔''

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ سروجنی نائیڈو کے مہمان کو دیکھ کر میں چونک ہی تو گیا۔
اور خوشی اپنی جگہ مگر اس سے زیادہ مجھے فکر اور پریشانیوں نے گھیر لیا۔

سروجنی نائیڈو کے وہ عزیز مہمان تھے۔ خان بہادر شیرازی، میرے والد!

مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں ایک چمک سی عود کر آئی۔ ایک مسکراہٹ ان
ہونٹوں پر مچل کر رہ گئی اور اس کے بعد ان کی پدرانہ شفقت پر ان کی خان بہادری غا
آ گئی۔ اب ان کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ ان کے ہونٹوں نے بھینچ کر
مسکراہٹ کو قتل کر دیا تھا۔

''آؤ شیرازی!'' سروجنی نائیڈو نے ان سے کہا تھا۔ ''بیٹھو!''

انہیں دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا تھا۔ یہ میرے والد تھے۔ انہی سے میری شنا
ہوتی تھی مگر عملی دنیا میں ہم ایک دوسرے کے حریف تھے۔ وہ انگریز بہادر کے خطاب
تھے۔ انگریزوں کی خدمات کے صلے میں انہیں خان بہادری ملی تھی۔ انگریزوں
وفاداری کے سلسلے میں انہوں نے مجھے اپنے سگے بیٹے کو عاق کر دیا تھا۔ اس کی خبر خود
اعظم نے مجھے دی تھی اور دوسری طرف میں تھا، ان کا بیٹا، سلطنت انگلشیہ کا دشمن،
حکومت کا دشمن، اس غاصب تاجر کا دشمن جو سات سمندر پار سے اس ملک میں تجارت
لیے آیا تھا۔ وہ جس نے اپنی تجارتی کوٹھیوں کو اسلحہ کے گوداموں اور فوجی قلعوں میں تبد
کر دیا تھا جس نے تجارت کے بہانے ہندوستان سے حاصل کی ہوئی دولت کے بل
پر سازشوں کے تار و پود پھیلائے تھے اور انہی سازشوں کے بل پر بنگال کے قاسم
صادق سے لے کر لکھنؤ کے شیرازی تک مختلف وطن فروشوں اور قوم کے فروشندوں
ان کے ضمیروں پر مہر لگا دی تھی۔

خان بہادر شیرازی قہر آلود انداز میں ہم دونوں کو گھورتے ہوئے آگے بڑھے

جنی نائیڈو کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئے۔ ''آفاق یہاں کس لیے آیا ہے؟'' انہوں نے
سوال سروجنی نائیڈو سے کیا تھا۔

''یہ تمہارا اعظیم بیٹا ہے، فری ڈم فائیٹر! یہ کسی کام سے یہاں آیا تھا کہ ......'' پھر
انہوں نے وہی جھوٹی سچی داستان مختصر الفاظ میں سنا دی جو میں نے بیان کی تھی۔ ''اسے
خطرہ ہے کہ خفیہ کے لوگ اس کے تعاقب میں ہیں۔ یہ پناہ لینے کے لیے یہاں آیا ہے۔''

''اور تم نے انہیں پناہ دے دی؟'' خان بہادر نے کہا۔

''ان جیسے لوگوں کو پناہ دینا بڑے فخر کی بات ہے خان بہادر!'' سروجنی نائیڈو نے
کہا۔

''اور بڑے خطرات بھی اس میں پوشیدہ ہیں۔'' خان بہادر شیرازی نے کہا۔ ''اگر
تمہارے مہمان نہ ہوتے تو انہیں گرفتار کرا کے خود مجھے خوشی ہوتی۔'' انہوں نے گویا فیصلہ
سنا دیا۔

''یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' سروجنی نائیڈو نے حیرت سے کہا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' خان بہادر نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''میں ابھی
مرکزی محکمۂ انٹیلی جنس کے چیف خان بہادر تصدق حسنی سے مل کر آ رہا ہوں۔ وہ یہیں نینی
تال میں موجود ہے، آج ہی یہاں پہنچا ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ......'' انہوں نے
میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اپنے ساتھیوں سمیت نینی تال آیا ہوا ہے۔ وہ
یہ معلوم کرنے آئے ہیں کہ یہ لوگ یہاں کس چکر میں پہنچے ہیں۔''

''ہم یہاں صرف سیر و تفریح کے لیے آئے ہوئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''خاموش رہو!'' خان بہادر نے مجھے ڈانٹ دیا۔

''تمہیں کیسے پتا چلا کہ تصدق یہاں آیا ہوا ہے۔''

''خود اس کے ایک پیغامبر کے ذریعے۔ نینی تال پہنچتے ہی اس نے مجھے پیغام بھجوایا
تھا اور آج رات ملنے کے لیے کہا تھا۔'' خان بہادر نے کہا۔ ''اس کی وجہ سے خود میری
حیثیت مشتبہ ہو کر رہ گئی ہے۔ میں حالانکہ اسے عاق کر چکا ہوں مگر حکومت کو میرے خلوص
پر یقین نہیں رہا۔ وہ میری نقل و حرکت کی نگرانی کر رہے ہیں۔ جب تصدق نے مجھے اطلاع
دی کہ یہ بھی یہاں موجود ہے تو میں حیران رہ گیا۔ معلوم ہے تصدق کیا سوچ رہا ہو گا؟''

''یہی کہ شاید تم آفاق سے ملنے کے لیے یہاں آئے ہو۔''

''ہاں۔'' خان بہادر شیرازی نے کہا۔ ''میں تصدق کو بڑی مشکل سے یقین دلا سکا

ہوں کہ یہ محض اتفاق ہے۔ بہر حال میں نے اس سے وعدہ کر لیا ہے کہ اس کی گرفتاری کے
لیے میں بھر پور تعاون کروں گا۔''

''تم ایسا نہیں کرو گے۔'' سروجنی نائیڈو نے کہا۔ ''آفاق میرا مہمان ہے، میری پناہ
میں ہے۔ تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ تم ایسا نہیں کرو گے۔''

''صرف اس حد تک وعدہ کر سکتا ہوں کہ جب تک یہ اس گھر میں مقیم ہے میں اس کی
مخبری نہیں کروں گا۔'' خان بہادر نے فیصلہ سنا دیا۔ ''لیکن اس گھر سے اگر اس نے قدم نکالا
تو میں خود......'' انہوں نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا۔ پھر انہوں نے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ اس
میں ابھی اتنی شرافت ہے کہ یہ پولیس کو نہیں بتائے گا کہ اس نے تمہارے گھر میں پناہ لی
تھی۔''

''مگر......'' سروجنی نائیڈو نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے ان کی بات کاٹ دی۔

''مجھے خوشی ہے خان بہادر صاحب کہ آپ نے میری شرافت کے بارے میں یہ
رائے قائم کی۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ ویسے اگر آپ چاہیں تو اپنا یہ شوق پورا کر سکتے ہیں کہ
اپنے ہی بیٹے کو گرفتار کرا دیں۔ میں ابھی باہر چلتا ہوں۔ آپ سے یہ وعدہ بھی کرتا ہوں کہ
میں باہر جا کر فرار ہونے کی کوشش نہیں کروں گا۔ آپ مجھ سے جہاں بھی ساتھ چلنے کو کہیں
گے، چلوں گا۔''

''بدتمیزی نہیں! خاموش بیٹھو اور یقین رکھو کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل بھی
کروں گا۔''

مجھے یقین تھا کہ خان بہادر جو کچھ کہہ رہے تھے وہ لفظ بہ لفظ سچ تھا۔ وہ مجھے گرفتار کرا
سکتے تھے کیوں کہ انہیں اپنی خان بہادری اتنی ہی عزیز تھی۔ بہر حال اس وقت سروجنی نائیڈو
ہی آڑے آئیں۔ انہوں نے خان بہادر صاحب کا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔ کھانے پر بھی فضا
بوجھل سی رہی۔

شب خوابی کے کمرے میں پہنچنے کے بعد کوہستانی نے جو اب تک خاموش رہا تھا، مجھ
سے کہا کہ ہمیں رات کو یہاں سے فرار ہو لینا چاہیے مگر میں نے اس کی یہ تجویز مسترد کر دی۔
میرا اب بھی وہی پروگرام تھا کہ تنظیم سے رابطے تک ہم یہیں مقیم رہیں۔ تنظیم سے رابطے کی
صورت اب یہی رہ گئی تھی کہ کوہستانی دن میں اس مکان کی طرف جائے جہاں ہمارا قیام تھا
اور یہ دیکھے کہ وہاں کیا حالات ہیں۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ میں محض وہم ہی کا شکار ہو گیا تھا۔
خان بہادر صاحب کی گفتگو سے تو یہی پتا چلتا تھا کہ ابھی انتظامیہ کو ہمارے ٹھکانے کا علم نہیں

خفیہ کے اعلیٰ افسر تصدق حسین کی نینی تال میں موجودگی میرے لیے حیرت انگیز تھی،
بلکہ اس سے خطرات کی سنگینی کا بھی احساس ہوتا تھا۔ ہم انہی تمام باتوں پر بہت دیر
تک دبے دبے لہجے میں گفتگو کرتے رہے۔

''ارے یار جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔'' کوہستانی نے کہا۔ ''فی الحال تو سو جاؤ۔''

ابھی میری آنکھ نہیں لگی تھی۔ میرے ذہن پر غنودگی سی طاری تھی کہ کھڑکی پر دستک کی
آواز سن کر میں چونک گیا۔ میں نے کمبل ایک طرف پھینک دیا اور تیزی کے ساتھ
بستر سے اتر گیا۔ میں نے دھیمی روشنی میں دیکھا، کوہستانی بھی اپنے پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا
تھا۔

''شیرازی!'' اس دفعہ دستک کی آواز کے فوری بعد وہ آواز سنائی دی جو میرے دل
سے تمام ڈر اور خوف زائل کر دیتی تھی اور مجھے نئے حوصلوں اور امنگوں سے سرشار کر جاتی
تھی۔ یہ آواز میرے سالار کی تھی۔ کوہستانی نے بھی اس آواز کو پہچان لیا تھا۔ ہم دونوں
تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھے تھے۔

''جی، سالار!'' میں نے کہا تھا۔ کھڑکی کی دائیں طرف، باہر کی سمت دیوار سے
ایک ہیولا چمٹا ہوا تھا۔

''فوراً اپنے ٹھکانے پر پہنچو۔''

''مگر سالار!'' میں نے کہا۔ ''وہاں خطرہ ہو سکتا ہے۔''

''میں وہیں سے آ رہا ہوں۔'' سالار نے کہا۔ ''کوئی خطرہ نہیں ہے۔ فوراً وہاں
پہنچو۔ ہمیں آج صبح تک نینی تال سے نکل جانا ہے۔''

''بہتر!'' میں نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی سالار کا ہیولا وہاں سے ہٹ گیا۔ میں نے
کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ سالار کا ہیولا دیوار کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

پھر ہم دونوں جلدی جلدی تیار ہوئے اور اسی کھڑکی کے راستے کمرے سے باہر
نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم اس بنگلے سے نکل کر اپنے مکان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تو گویا
یہ میرا وہم ہی تھا۔ میں نے خوش دلی سے سوچا تھا۔ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کیا تھا۔

پندرہ منٹ بعد ہم اپنے مکان میں تھے۔ دروازہ کھول کر ہم نشست گاہ میں داخل
ہوئے۔ اب ہمیں سالار کا انتظار کرنا تھا۔ ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھے ہی تھے کہ ہمیں ایک
حیرت سے دوچار ہونا پڑا۔ کوہستانی سے زیادہ میں حیرت زدہ تھا اور میرے ذہن

نے خطرے کی صدا لگائی تھی۔ دروازے میں شکرا کھڑا ہوا تھا۔ ''خوش آمدید دوستو۔'' شکرے
نے کھر کھراتے لہجے میں کہا۔ ''میں بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔'' اس کی آنکھیں
سکڑ گئی تھیں۔ بھویں آپس میں مل کر ماتھے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک لکیر
بنا گئی تھیں اور مجھے یوں لگا تھا کہ اس کی بھوں کی جگہ ایک لمبا سا سیاہ کمبل کیڑا بیٹھا ہو۔
اس کے پتلے پتلے سرخ ہونٹوں سے اس کے باریک باریک دانت جھانک رہے تھے۔
مسکراہٹ کی دو لکیریں ہونٹوں کے گوشوں سے پھیل کر نیچے تھوڑی تک چلی گئی تھیں۔
اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ میں اٹھنا ہی چاہتا تھا کہ شکرے نے کہا۔ ''بیٹھے رہو۔''
میں کرسی پر پہلو بدل کر رہ گیا۔
''تم کون ہو؟'' اس مرتبہ کوہستانی نے شکرے سے سوال کیا تھا۔
''وہی جس سے ڈر کر تم لوگ آج شام بھاگے تھے۔ تم لوگ بڑے بے مروت ہو،
اپنے دوستوں سے بھاگتے ہو۔'' شکرے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔
میں عجیب مخمصے میں گرفتار تھا۔ ذہن میں یہ خیال تھا کہ ابھی تھوڑی دیر بعد سالار پہنچنے
والا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور خوفناک خیال میرے ذہن میں آیا۔ ہم سالار کے ساتھ
سروجنی نائیڈو کے گھر سے چلے تھے۔ تو کیا وہ ہم سے پہلے یہاں پہنچ گیا ہے۔ کیا اسے
اس شکرے نے بے بس کر لیا ہے۔
''کیا سوچ رہے ہو؟'' شکرے کی مکروہ آواز ابھری۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ
اور گہری ہوگئی تھی۔
''تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے سوال کیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس صورت
حال سے کس طرح نمٹا جائے۔
''نہیں مسٹر کوہستانی! تم کوئی حماقت نہیں کرو گے۔''
مگر کوہستانی پر اس کی دھمکی کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بہت ہی تیزی سے شکرے پر جھپٹا
تھا۔ ''شیرازی! تم بھاگ لو۔'' میں نے اس کی آواز سنی تھی۔ اس کے باوجود کہ شکرے کے
ہاتھ میں پستول تھا، اس نے نہ معلوم کیوں گولی نہیں چلائی۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے
بایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ ساتھ ہی پستول اپنی جیب میں رکھ لیا۔ شکرے کے بائیں ہاتھ کی
ضرب بڑی زور سے کوہستانی کے سینے پر پڑی تھی اور وہ دہرا ہو گیا تھا۔ میں اسے پستول
جیب میں رکھتے ہوئے دیکھ چکا تھا۔ میں بھی اس پر جھپٹ پڑا۔
شاید یہ تین منٹ کا عرصہ رہا ہوگا۔ میں اور کوہستانی اس تین منٹ کے عرصے میں

کچھ نہیں کر سکے تھے۔ اس کے بدن میں جیسے بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔ وہ اتنی تیزی
سے حرکت میں آتا تھا کہ ہمیں اس پر ہاتھ ڈالنا مشکل ہی معلوم ہوتا تھا۔
''شیرازی! کوہستانی! خالد! یہ کیا ہو رہا ہے۔'' ایک سرد آواز ابھری، یہ آواز سالار
کی تھی۔
ہم تینوں ہی اپنی جگہ ساکت ہوگئے۔ اس وقت خالد ہماری پہنچ سے دور ایک کونے
میں کھڑا تھا۔ سالار نپے تلے قدم رکھتا ہوا اندر آ گیا۔ شکرے کے ردعمل پر میں حیران تھا۔
شکرے کا نام خالد تھا۔
''یہ کیا ہو رہا تھا؟'' سالار نے کہا۔
''یہ......'' میں نے وضاحت کرنا چاہی مگر کچھ نہ کہہ سکا، یہ سب کچھ میرے
لیے حیرت انگیز تھا، ناقابل یقین!
''اوہ!'' سالار نے کہا۔ ''اچھا! گویا تمہیں خالد نے کچھ نہیں بتایا۔''
ذرا دیر بعد ہمارا اجلاس شروع ہو چکا تھا۔ میں، کوہستانی اور خالد اسی کمرے میں
کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ سالار برابر کے کمرے میں جا چکا تھا۔ سالار نے بتایا تھا کہ خالد
ہماری تنظیم میں ایک اہم حیثیت کا حامل ہے۔ ایک طرح سے وہ سالار کا نائب تھا۔ وہ
ہماری تنظیم کے سرفروشوں کو جسمانی تربیت دیا کرتا تھا اور نئے اراکین کے علاوہ ان
سرفروشوں کی وفاداری کا امتحان بھی لیا کرتا تھا۔ جنہیں اہم اور خطرناک مہمیں سونپی جانے
والی ہوتی تھیں۔ بمبئی میں میرا اغوا اور مجھ سے سوال جواب بھی وفاداری کے اسی امتحان کا
ایک حصہ تھا۔
اس وضاحت کے بعد میں نے اور کوہستانی نے نہایت گرم جوشی سے ہاتھ ملائے۔
اس وقت مجھے خالد پر بے حد پیار آ رہا تھا اور میں دل ہی دل میں شرمندہ تھا کہ میں نے اس
کے بارے میں کیا کیا باتیں سوچی تھیں۔
پھر سالار نے مجھے اور کوہستانی کو اگلے آٹھ ماہ کا پروگرام دیا۔ یہ پروگرام ایک کاغذ
پر مختصر الفاظ میں تحریر تھا اور ہر نکتے کی وضاحت سالار زبانی کرتا جا رہا تھا۔ پروگرام کا پہلا
حصہ نینی تال کی اطراف کے علاقے کی سیاحت تھی۔ یہ سیاحت اس بڑے اور اہم منصوبے
کی تیاری کا پہلا مرحلہ تھی جو ہمیں ایک مناسب وقت پر سونپا جانا تھا۔ وضاحت کرتے
ہوئے سالار نے کہا تھا۔ ''تمہیں اس علاقے میں سفر کرتے ہوئے اس راستے کو بھی ذہن
نشین کرنا ہے جس سے تم گزرو گے۔'' اس کے ساتھ ہی سالار نے اس علاقے کا ایک نقشہ

ہمیں دیا تھا۔ یہ نقشہ ٹریسنگ پیپر پر بنا ہوا تھا۔ جس پر مختلف مقامات کے نشانات اور ان کے
نام لکھے ہوئے تھے۔ سالار نے بتایا تھا۔ ''یہ نقشہ سروے آف انڈیا کے ایک سروے ریز
کی سروے رپورٹ کا حصہ ہے۔ وہ اس راستے سے گزرا ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے
کس طرح اپنا راستہ تلاش کرتے ہو۔ تمہیں اپنا ذہن اور اپنی آنکھیں کھلی رکھنا ہیں۔ تم
یہ راستہ نہ صرف یاد رکھنا ہے بلکہ مختلف مقامات پر ایسی جگہیں بھی تلاش کرنا ہیں جہاں
عظیم مہم کے دوران میں پناہ لے سکو۔ جو مہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کے سپرد کی جا
گی۔ ہاں یہ بھی یاد رکھو کہ تم وہ مہم سردیوں میں سر کرو گے اس لیے تمہارے ساتھیوں کو
موسم سے آشنا کرنے کے لیے پہاڑی مقامات پر متعین کر دیا گیا ہے۔ سردیوں میں یہ
علاقہ برف سے ڈھکا ہوگا لہٰذا تمہاری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ اس علاقے میں کچھ نشانیاں
بھی ذہن نشین کرتے رہو۔ ایسی نشانیاں جو برف باری کے موسم میں بھی تمہیں نظر آتی
رہیں۔''

اس پروگرام کا دوسرا مرحلہ، برما کا سفر تھا۔ نینی تال کے علاقے میں ہمیں دو
تک سیاحت کرنا تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہمیں رانی کھیت اور پھر وہاں سے آسام کے
شہر گوہاٹی پہنچنا تھا جہاں ڈی کے بوس کو ہمارے ساتھ شامل ہونا تھا اور ہمیں اس کے ساتھ
ناگا ہلز کے پار برما پہنچنا تھا۔

''مگر جناب!'' میں نے دریافت کیا۔ ''برما کے سفر کا مقصد کیا ہے؟''

''ہمیں برما سے اسلحہ لانا ہے۔ ایسا اسلحہ جو اس مہم کے لیے ضروری ہوگا جو تمہیں
سردیوں میں درپیش ہوگی اور ایسا اسلحہ بھی جو ہمیں ہندوستان میں آسانی سے نہیں مل سکتا۔''
سالار نے کہا۔ ''ڈی کے بوس برما میں مقیم حریت پسند ہندوستانیوں کی ایک جماعت سے
رابطہ رکھتا ہے۔ وہ ایک ماہ بعد برما جانے والا ہے۔ تمہیں اس لیے بھیجا جا رہا ہے کہ تم اپنی
تنظیم کی ضروریات کا اسلحہ لے کر بہ حفاظت بریلی پہنچ جاؤ۔''

''بریلی میں ہمارا ٹھکانا کہاں ہوگا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''اسلحہ لے کر جب تم واپس ہندوستان کی سرحد میں داخل ہو گے تو تار کے ذریعے تم
مہندر کو اس کے بمبئی کے پتے پر اپنی آمد کی اطلاع دو گے۔'' سالار نے کہا۔ ''اس کے ٹھیک
ایک ماہ بعد تم بھاگلپور پہنچو گے وہاں تمہیں سب کچھ بتا دیا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے جناب!'' میں نے اطمینان کا اظہار کیا۔

''میں اور خالد بھی اسلحہ کے لیے یاغستان جا رہے ہیں اس لیے اب تم اپنے

ہدایات کے خود ذمے دار ہو گے۔ اتنا یاد رکھو کہ اس مہم پر ہماری بڑی اور اہم کامیابیوں کا
انحصار ہوگا۔ اس وقت تنظیم کے تمام اراکین غیر ملکی غاصبوں پر فیصلہ کن ضرب لگانے کی
تیاریاں کر رہے ہیں۔ تمام شمالی ہندوستان میں سرگرم عمل خفیہ حریت پسند تنظیموں میں ایک
اتحاد پیدا ہو چکا ہے۔ موجودہ مہم کے بعد تمام شمالی ہندوستان میں پے در پے دھماکے ہوں
گے۔ انگریز حکومت لرز کر رہ جائے گی۔''

''ہمیں کب روانہ ہونا ہے؟''

''آج ہی، سورج طلوع ہونے سے قبل تمہیں نینی تال سے نکل جانا ہے۔'' سالار
نے کہا۔ ''ہاں نقشے پر بعض مقامات کے گرد سرخ دائرے بنا دیے گئے ہیں۔ اس سفر میں
تمہیں خاص طور پر ان مقامات کا جائزہ لینا ہے اور یہ معلوم کرنا ہے کہ وہاں کچھ خاص قسم کی
سرگرمیاں تو نہیں ہیں۔ اگر تم وہاں کچھ خاص سرگرمیاں دیکھو تو یہ بھی معلوم کرنا کہ ان کی
نوعیت کیا ہے لیکن اس سلسلے میں زیادہ خطرات مول لینے کی ضرورت نہیں۔''

اس کے بعد گفتگو کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ میں اور کوہستانی روانگی کی تیاری کرنے لگے۔
سفر کے لیے ضروری سامان سے بھرے ہوئے دو بھاری تھیلے خالد نے ہمارے حوالے
کر دیے۔ ہم سفر کے لیے تیار ہو گئے تو خالد نے ہمیں سفر کے اخراجات کے لیے پانچ ہزار
روپے کی رقم دی۔ اس وقت مجھے اسلحہ کی خریداری کے لیے رقم کا خیال آیا اور میں نے ان
خیالات کا اظہار بھی کر دیا جس پر سالار نے مجھے بتایا کہ اسلحہ کی خریداری کے لیے رقم ڈی
کے بوس کی معرفت ان لوگوں تک پہنچ چکی ہے جو برما میں ہمارے لیے اسلحہ کا انتظام کریں
گے۔

پھر ہم جب سالار اور خالد سے رخصت ہونے لگے تو سالار نے کہا۔ ''اس سفر میں تم
دونوں ایک دوسرے کے محافظ اور رفیق ہو۔ اگرچہ مجھے توقع نہیں کہ اس سفر کے دوران
تمہارا مقابلہ کہیں کسی پولیس پارٹی یا سرکاری حکام سے ہوگا پھر بھی احتیاطاً......'' یہ کہہ کر
اس نے دو دو گولیاں ہم کو دیں۔ ''یہ زہر کی گولیاں ہیں۔'' سالار کی آواز کپکپا رہی تھی۔
''بفرض محال اگر تم پھنس ہی جاؤ اور تمہارے لیے کوئی راہ نہ ہو تو گرفتاری سے قبل ہی یہ
گولیاں حلق سے اتار لینا۔ پھر تم ان کی اذیت اور تشدد سے بچ جاؤ گے۔ وہ تم سے کچھ بھی
نہ اگلوا سکیں گے۔''

یہ کہہ کر سالار نے وہ گولیاں دو چھوٹی چھوٹی مومی تھیلیوں میں ڈال دیں۔ ''لو، خدا
حافظ۔'' یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے سالار کے لہجے میں لرزش محسوس کی تھی۔ وہ ہمیں کتنا

عزیز رکھتا تھا۔

☆======☆======☆

دوپہر بارہ بجے ہم کھیرنا پہنچ گئے تھے۔ یہاں ہم نے اپنے سفر کے لیے چار خچر لیے۔ دو پر ہم دونوں سوار ہوئے اور باقی دو پر ہم نے اپنا سامان لاد دیا۔ کھیرنا سے خاصی دور نکل کر ہم نے ایک درخت کے نیچے آرام کیا، کھانا کھایا، پانی پیا اور اس نقشے کو کھول لیا جو ہمیں سالار نے دیا تھا اور جس کے مطابق ہمیں اپنا سفر جاری رکھنا تھا۔ اس نقشے پر تین مقامات ایسے تھے جن پر سرخ دائرے کھنچے ہوئے تھے، یہ تھے نارن پریاگ، پیپل کوٹی اور سرائے طوطا!

ہم اس نقشے کے مطابق سفر کرتے رہے۔ چار دن میں ہم دوواراہٹ، گونائی، لوبھا، آب دوری اور سملی سے گزرتے ہوئے دریائے الکنندا پار کر کے کرم پریاگ پہنچے۔ دوواراہٹ میں ہم نے کوہستانی خانہ بدوشوں کی ایک پارٹی سے اپنے لیے ایک پرانا خیمہ خرید لیا تھا کیوں کہ اس علاقے میں راتیں بہت سرد ہوتی تھیں، پھر ہوا بھی بہت تیز ہوتی تھی۔ کرم پریاگ ہم دن کے ڈھائی بجے پہنچے تھے اور اس کی مختصر آبادی سے تھوڑے فاصلے پر پڑاؤ کیا تھا۔ یہاں کے بازار سے ہم نے اپنی ضرورت کا کچھ سامان خریدا اور دو قلیوں کی خدمات حاصل کیں۔

اگلے دن صبح پانچ بجے ہم وہاں سے روانہ ہوئے۔ ہماری اگلی منزل نارن پریاگ تھی۔ یہ ان تین مقامات میں سے پہلا تھا جس کے گرد سرخ دائرہ نقشے پر کھینچا ہوا تھا۔ نارن پریاگ کے علاقے میں ہمیں کوئی سرگرمی نظر نہیں آئی۔ ہم نے اس علاقے میں تین دن گزارے۔ اطراف و جوانب کا جائزہ لیا لیکن کوئی ایسی سرگرمی نظر نہ آئی جو ہماری توجہ کا مرکز بنتی۔ اس سے اگلا مقام پیپل کوٹی تھا مگر وہاں بھی ہمیں مایوسی ہی ہوئی البتہ وہاں قیام کے دوسرے دن ہمیں ایک قافلہ نظر پڑا۔ یہ قافلہ کوئی پچاس ساٹھ خچروں پر مشتمل تھا اور اس میں شامل تمام افراد انگریز تھے۔ ان میں سے صرف پانچ انگریز مسلح تھے اور باقی سب زنجیر سے بندھے ہوئے تھے۔ زنجیر کا ایک سلسلہ تھا جو ہر ایک کی کمر کے گرد بندھا ہوا تھا اور پھر اسی زنجیر کا حلقہ دوسرے شخص کی کمر کے گرد پڑا ہوا تھا۔ ان کے ہاتھ بھی بندھے ہوئے تے۔ وہ قافلہ ہمارے سامنے سے گزرتا ہوا گلاب کوٹی کی طرف بڑھ گیا۔

ڈھلیا نے جو ہمارے قلیوں میں سے ایک تھا، ہمیں بتایا کہ اس قسم کے قافلے گزشتہ تین چار ماہ سے اس علاقے میں گزرتے رہتے ہیں۔ ان قافلوں میں عموماً بیس پچیس افراد

ل ہوتے ہیں۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ قافلے باقاعدگی سے نہیں آتے، کبھی ن دن بعد آتے ہیں، کبھی بیس اور پچیس دن بعد۔ ڈھلیا ہمیں یہ نہ بتا سکا کہ یہ قافلے کہاں تے ہیں۔

گلاب کوٹی پر دونوں قلی اپنی اجرت لے کر واپس چلے گئے۔ اس علاقے کے قلیوں کا ہول تھا کہ وہ چند مخصوص مقامات کے درمیان ہی محنت مزدوری کرتے تھے۔ آگے نے کے لیے اگر ہمیں قلیوں کی ضرورت ہوتی تو یہاں سے ہمیں دوسرے قلی کرنے تھے ی الحال ہمیں قلیوں کی ضرورت نہیں تھی۔ ہم اسی علاقے میں گھومنا چاہتے تھے تاکہ یہ علوم ہو سکے کہ سفید فاموں کا وہ قافلہ اس علاقے میں کس جگہ جاتا ہے کیوں کہ یہاں پوچھ چھ کرنے پر ہمیں پتا چلا تھا کہ انگریز قیدیوں کے صرف دو بڑے قافلے گزشتہ تین ماہ میں ھر سے گزرے ہیں لیکن گزشتہ روز جو قافلہ ادھر سے گزرا تھا، اس میں صرف پانچ افراد امل تھے۔ ان میں سے ایک مسلح تھا اور چار زنجیر سے بندھے ہوئے۔

یہ بات ہمارے لیے حیرت انگیز تھی کیوں کہ پیپل کوٹی سے گزرنے والے قافلے میں س پچیس افراد شامل تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ پیپل کوٹی سے گلاب کوٹی کے درمیان ہیں نہ کہیں قافلے کا ایک حصہ کسی اور سمت چلا گیا تھا۔ ہم نے اپنا سامان، گلاب کوٹی کی بادی کے سربراہ کے ہاں رکھا اور خود اس علاقے میں گھومنے کے لیے نکل گئے۔ تیسرے روز رات کے وقت جب ہم ایک غار میں مقیم تھے تو ہمیں اپنی تگ و دو کا ثمر مل گیا۔ دور جب میں ہمیں ذرا سی دیر کے لیے ایک روشنی نظر آئی۔ اس کے بعد غار میں رکنا ہمارے یے دوبھر ہو گیا۔ ہم اپنی کمیں گاہ سے نکلے اور نشیب میں، اسی سمت بڑھتے چلے گئے جدھر یہ شنی نظر آئی تھی۔

بیس پچیس منٹ بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے۔ یہاں ایک پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹی ادی تھی۔ ان دونوں کے درمیان تنگ سی وادی بن گئی تھی۔ یہ دونوں پہاڑیاں تھوڑے اصلے پر جا کر مل جاتی تھیں۔ اسی سنگم پر کئی چھوٹی چھوٹی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ ہم سینے ے بل کھسکتے ہوئے ان روشنیوں کی طرف بڑھنے لگے۔

وہاں جو کچھ ہمیں نظر آیا اس سے یہی اندازہ ہو سکا کہ وہاں کچھ تعمیراتی کام ہو رہا تھا۔ اس کام کی نوعیت کیا تھی ہمیں معلوم نہ تھا۔ دونوں پہاڑیوں کے درمیان ایک سمت ے دوسری طرف تک ایک موٹی اور مضبوط دیوار زیر تکمیل تھی۔ دیوار کا ایک کونا ایک پہاڑ سے اور دوسرا سرا دوسرے پہاڑ میں پیوست تھا۔ اس زیر تعمیر دیوار کے باہر خاردار تاروں

سے ایک لمبا چوڑا احاطہ کھینچا گیا تھا۔ اس احاطے کے وسط میں ایک لمبی سی بیرک بنی ہوئی تھی۔ یہ بیرک تاریک تھی۔ احاطے کے چاروں کونوں پر نگرانی کے لیے مچان بنے ہوئے تھے۔ انہی میں سے ایک مچان کے ساتھ ایک اور لمبی سی بیرک تھی جس میں روشنی ہو رہی تھی۔

''یہ بندر آخر یہاں کیا رہے ہیں؟'' کوہستانی نے سرگوشی کی۔

''اس کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ یہ سب کام نہایت رازداری سے کیا جا رہا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آؤ اب واپس چلیں۔''

ہم اس رات گلاب کوٹی واپس پہنچ گئے۔ ہمیں جو کچھ معلوم کرنا تھا، وہ ہمیں معلوم ہو گیا تھا۔ اب وہاں رہنا ہمارے کسی کام کا نہ تھا۔ اگلے دن تر و تازہ ہو کر ہم دوپہر کے وقت جوشی مٹھ روانہ ہوئے۔ جوشی مٹھ میں ہماری ملاقات طارق بیگ سے ہوئی۔ وہ ایک مضبوط کاٹھی کا شخص تھا۔ اس سے دوستی کا سبب یہ تھا کہ وہ بہت صاف اور شستہ اردو بولتا تھا۔ طارق بھی بہت جلدی ہم سے گھل مل گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ مراد آباد کے صادق بیگ کا پوتا ہے۔

''صادق بیگ کون؟'' میں نے پوچھا۔

میرا یہ سوال سن کر اس نے میری لاعلمی پر حیرت کا اظہار کیا۔ پھر اس نے بتایا کہ صادق بیگ، ہندوستان کے شہنشاہ، بہادر شاہ ظفر کے سپہ سالار، جنرل بخت خان کا ایک ساتھی تھا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد جنرل بخت خان جن ساتھیوں کے ہمراہ نیپال کی طرف نکل گیا تھا، ان میں صادق بیگ بھی شامل تھا جو اس وقت نوجوان اور غیر شادی شدہ تھا۔ پھر صادق بیگ نیپال سے گزرتا ہوا تبت پہنچ گیا تھا اور وہیں کی ایک بستی دابا کو اپنا مسکن بنا لیا، پھر ایک تبتی عورت سے شادی کر لی۔ اس کی دادی اور ماں باپ اب بھی داباہی میں رہتے تھے۔ وہ خود ان علاقوں میں قلی کے کام کے لیے سرائے طوطا میں رہتا تھا اور کبھی کبھار خاص طور پر سردیوں میں داباچلا جاتا تھا۔

اس نے ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت، دہلی، قلعۂ دہلی، جامع مسجد اور دہلی کے مختلف علاقوں کے بارے میں کئی معصومانہ سوال کیے۔ اس نے دہلی، مغل بادشاہ اور انگریزوں کے بارے میں اپنے باپ دادا سے مختلف کہانیاں سنی تھیں اور انہی کو دہرا رہا تھا۔ ان کہانیوں میں پرستان کی سی داستان کا لطف آ رہا تھا۔ دہلی اب بھی اس کے لیے خوابوں کا شہر تھا۔ طارق بیگ نے بتایا کہ اس کے باپ نے اسے سختی سے منع کیا ہوا ہے کہ وہ جوشی مٹھ

سے آگے نہ جائے۔ اسی لیے وہ صرف جوشی مٹھ سے لال پہاڑ تک کے علاقے میں قلی کا کام کرتا ہے۔

اس نے بتایا کہ وہ مسلمان ہے، وہ کلمہ بھی پڑھتا تھا لیکن اس سے آگے اسے کچھ نہیں معلوم تھا۔ اس کے دادا کا انتقال اس وقت ہو گیا تھا جب اس کے باپ کی عمر صرف بارہ برس ہی تھی اور اتنے عرصے میں طارق کا دادا اپنے بیٹے شارق کو مذہب کی بنیادی تفصیلات نہیں بتا سکا تھا۔ وہ پانچوں وقت نماز بھی پڑھتا تھا لیکن نہ تو وضو ہی ٹھیک کر پاتا تھا نہ اسے یہ معلوم تھا کہ کس نماز میں کتنی رکعت پڑھنا ہوتی ہیں۔ کلمۂ طیبہ کے بعد اسے صرف الحمد ہی یاد تھی۔ نماز میں وہ یہی پڑھا کرتا تھا اور ایک ہی رکعت میں سلام بھی پھیر لیتا تھا۔ اس کے باوجود اس کا ایمان بڑا پختہ تھا۔ وہ اللہ کو واحد اور لاشریک جانتا تھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا آخری پیغمبر سمجھتا تھا۔ وہ عقیدے کے اعتبار سے پکا مسلمان تھا۔ جھوٹ کو گناہ سمجھتا تھا۔ دھوکے اور خیانت کو بہت بڑا پاپ سمجھتا تھا۔ باقی نیکیوں کا تصور اس کے ذہن میں وہی تھا جو مہاتما گوتم بودھ کی تعلیمات میں ہے۔ وہ خود کو مسلمان کہتا تھا اور مسلمان ہونے پر فخر کرتا تھا۔

طارق بیگ نے ہی ہمیں بتایا کہ اس علاقے میں فرنگی ایک مقام پر کوئی قلعہ بنا رہے ہیں۔ پھر ہم نے طارق کو ہی قلی کے طور پر اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اسی نے ہماری راہنمائی اس مقام تک کی جہاں انگریز خفیہ تعمیر میں مصروف تھے۔ اسے جب یہ معلوم ہوا تھا کہ ہم انگریزوں کے خلاف ہی مصروفِ عمل ہیں تو اس کا جوش قابلِ دید تھا۔ انگریز سے نفرت اسے ورثے میں ملی تھی۔ وہ اب بھی خود کو مراد آباد کا کہتا تھا اور صرف اتنا جانتا تھا کہ اگر اس کے دادا کو انگریزوں کی وجہ سے ہندوستان نہ چھوڑنا پڑتا تو وہ مراد آباد ہی میں پلا بڑھا ہوتا۔ وہ نہایت جذباتی ہو گیا تھا اور ہم سے اصرار کر رہا تھا کہ اسے بھی اپنے ساتھ شامل کر لیں۔ اس کے اصرار کو دیکھتے ہوئے میں نے کہا کہ اگلی سردیوں میں ہم پھر یہاں آئیں گے اور اسی وقت ہم اسے اپنے ساتھ شامل کر لیں گے۔ تب اس نے ہمیں بتایا کہ وہ جوشی مٹھ کے سردار مکھن کا گہرا دوست ہے۔ اگر اس وقت جب ہم یہاں آئیں اور وہ نہ ہو تو مکھن سے کہہ کر اسے بلا لیں۔

پھر ہم نے اسی کی معیت میں نینی تال کے باقی علاقے کی سیر کی۔ ہم ان تمام مقامات پر گئے جن کی نشان دہی نقشے میں کی گئی تھی اور ٹھیک دو ہفتے بعد رانی کھیت واپس پہنچ گئے۔ اگلے دن پہلی ٹرین سے ہم بریلی پہنچے جہاں ہم نے ٹرین تبدیل کرنے کے لیے

بھاگلپور کا ٹکٹ لیا۔ جہاں سے پھر چھوٹی لائن کی ٹرین سے ہمیں گوہاٹی پہنچنا تھا۔

☆======☆======☆

گوہاٹی میں صرف ڈی کے بوس ہی ہمارا منتظر نہ تھا، علی احمد صدیقی اور مولانا قاسم بھی ہمارے منتظر تھے۔ علی احمد صدیقی کا تعلق الہ آباد سے تھا اور مولانا قاسم علی، مراد آبادکی کسی مسجد کے امام تھے وہ بھی ایک انقلابی اور چھاپا مار تحریک سے تعلق رکھتے تھے۔ ہم پانچوں اگلے ہی دن گوہاٹی سے دیبروگڑھ روانہ ہوئے جو ناگا پہاڑیوں کے دامن میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔

اگلے ہی دن ہم پانچوں، وہاں سے برما کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس سفر میں ایک برمی نوجوان کہٹن ہمارا رہبر تھا۔ اس کا تعلق کاچین قبیلے سے تھا جو کاچین پہاڑیوں سے گھرا ہوا تھا۔ کہٹن ان راستوں سے خوب واقف تھا۔ وہ اس سے پہلے بھی ڈی کے بوس کے لیے اسلحہ اسمگل کرنے کی خاطر ان پہاڑوں کو عبور کر چکا تھا۔

ڈی کے بوس نے بتایا تھا کہ وہ خود بھی ہمارے لیے اسلحہ اسمگل کر کے لا سکتا تھا مگر اس نے یہی بہتر سمجھا تھا کہ شمالی ہندوستان میں مصروف چھاپا مار جماعتوں کا براہِ راست ان لوگوں سے تعارف کرا دیا جائے جو برما میں ہندوستان کے حریت پسندوں کے لیے اسلحہ کی خریداری کا اہتمام کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہندوستان سے ہی نقل وطن کر کے برما گئے تھے۔ وہاں ان لوگوں نے کاروبار جما لیے تھے لیکن ہندوستان بہرحال ان کا آبائی وطن تھا اور وہ اسے آزاد دیکھنا چاہتے تھے۔ رنگون اور منڈالے ان لوگوں کے مرکز تھے۔ جہاں سے وہ اسلحہ حاصل کر کے میکٹیانا میں جمع کرتے تھے اور وہاں سے ہاتھیوں اور خچروں کے ذریعے یہ اسلحہ ہندوستان پہنچا دیا کرتے تھے۔ اس مقصد کے لیے کاچین قبیلے کے بعض نوجوانوں کی خدمات انہوں نے حاصل کر لی تھیں۔

ناہموار پگڈنڈیوں اور اونچے نیچے ٹیلوں سے گزرتے ہوئے ہم نے اپنا سفر جاری رکھا۔ احتیاطاً ہم رات کے وقت سفر کرتے تھے اور دن کے وقت آرام۔ یہ تمام سفر ہمیں پیدل ہی کرنا تھا۔

کہٹن مجھ سے کچھ زیادہ ہی مانوس ہو گیا تھا۔ وہ مجھے اپنے قبیلے کی روایات بتاتا اور کہانیاں سناتا۔

ناگا پہاڑیوں میں، ہمالیہ کی طرف سے آنے والی ہوائیں کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر لیتی ہیں اور رات کے وقت سردی بے انتہا بڑھ جاتی ہے۔ سردی کی وجہ سے ہمیں خاصی

تکلیف ہوتی لیکن اس تکلیف کو برداشت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

ناگا پہاڑیاں عبور کر کے اب ہم کاچین کے پہاڑی سلسلے میں داخل ہو گئے تھے۔ ان پہاڑوں پر ہر وقت ایک سبز سی دھند پھیلی ہوتی ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے پہاڑوں پر کسی اپسرا نے اپنی سبز چنریا پھیلا رکھی ہو۔ اس سبز دھند کے پیچھے نیلگوں مائل سرسبز پہاڑ دور سے سرمئی نظر آتے ہیں۔ ''یہ پہاڑ دیکھو دادا!'' کہٹن نے مجھ سے کہا تھا۔ وہ مجھے دادا ہی کہتا تھا۔ یہ اس کے قبیلے کی بولی کا ایک لفظ تھا جس کے معنی سردار سربراہ کے ہوتے ہیں۔

''ہاں!'' میں نے جواب دیا۔

''کیسے لگتے ہیں؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''اچھے لگتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔

''یہ پہاڑ دیوتاؤں کو جنم دیتے ہیں۔ دیوتا ان پہاڑوں پر بسیرا کرتے ہیں۔ ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ انہیں تو بس دیکھا جا سکتا ہے، انہیں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ کارانگ کسائی کی قسم، یہ پہاڑ بڑے مہربان ہیں۔''

''میاں صاحبزادے! یہ کارانگ کسائی کون ہیں؟'' علی احمد صدیقی نے سوال کیا۔

''کارانگ کسائی دیوتاؤں کا دیوتا ہے۔ اسی کے حکم پر ہمارا قبیلہ کاچین کی پہاڑیوں میں آباد ہوا ہے۔ مقدس بھجنوں میں لکھا ہے کہ کارانگ کسائی کی مٹھی سے ہمارے قبیلے نے جنم لیا جن کا استھان ہمالیہ ہے۔ یہ قبیلہ پہلے تبت میں آباد ہوا، پھر کارانگ کسائی کے حکم پر اس قبیلے کی ایک شاخ شمالی برما میں آبسی۔ پتا ہے یہ کب ہوا، ایک ہزار سال پہلے!''

علی احمد صدیقی ہنس کر خاموش ہو گئے۔

پھر اچانک ہی بارش شروع ہو گئی۔ موسلا دھار اور مسلسل بارش کی وجہ سے ہمارا سفر اور بھی دشوار ہو گیا۔ ایک مرحلہ تو ایسا آیا کہ ہم تین دن تک ایک غار میں دبکے بیٹھے رہے۔ پھر خدا خدا کر کے بارش کا سلسلہ اچانک ہی ختم ہو گیا اور ہم پھر اپنی منزل کی طرف رواں ہو گئے۔

دو ماہ سفر کے بعد ہم ایک بلند مسطح میدان میں پہنچے۔ اس میدان کے نیچے وادی پھیلی ہوئی تھی۔ یہ میدان کیا تھا۔ پہاڑ کی چوٹی تھی جسے قدرت نے بالکل ہموار کاٹ دیا تھا۔ یہ سرسبز و شاداب میدان تھا۔ نیچے وادی کے بعد دوسری سمت پھر ایک پہاڑ بلند ہوتا چلا گیا اور وادی میں چھوٹی چھوٹی پٹریاں بنی ہوئی تھیں۔

"وہ رہا سپرابوم، میرا گاؤں!" کہٹن نے پُرجوش انداز میں کہا۔

کاچین، قبیلے کا سردار، کہٹن کا باپ تھا۔ اس نے ہمارا انتہائی خلوص سے استقبال کیا۔ اپنا نمبر آنے پر میں نے اس سے کہا۔ "کا جاای، دادا!" یعنی اے سردار تجھ پر سلامتی ہو کہٹن نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے قبیلے والے ایک دوسرے سے کس طرح ملتے ہیں۔

"کا جاای!" کاچین سردار نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

اس وقت کہٹن ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگیا۔ اس نے اپنے باپ کو بتایا کہ یہ الفاظ اس نے ہی مجھے سکھائے ہیں، پھر اس نے اپنے باپ سے میرا مزید تعارف کرایا۔ "یہ میرا بہترین دوست ہے۔ میرا بھائی!"

"آؤ آؤ! ہمارے دل اور ہمارے گھر سب تمہارے لیے کشادہ ہیں۔" سردار نے کہا۔ پھر اس نے نہایت تیزی سے چوڑے پھل والی تلوار نکالی اور اس کی دھار کو اپنی کلائی پر اس طرح چلایا کہ کھال پر خراش آگئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے خون کی دو تین بوندیں اس خراش سے پھوٹ آئیں، پھر اس نے خون کی ان بوندوں کو انگشت شہادت سے صاف کر کے وہ خون میری اور کہٹن کی پیشانی پر لگا دیا۔ "تم دونوں میرے بیٹے ہو۔ میری دو آنکھیں ہو۔ میرے دو ہاتھ ہو۔" بعد میں کہٹن نے مجھے بتایا کہ کاچین قبیلے کی روایات کے مطابق اب ہم دونوں بھائیوں میں وہی رشتہ پیدا ہوگیا ہے جو سگے بھائیوں جیسا ہے اور اس کا احترام کرنا ہر کاچین کا مقدس مذہبی فریضہ ہے۔

یہاں سے ہم ہاتھیوں کے ذریعے میٹکیانا روانہ ہوئے۔ اس سفر میں کاچین سردار بھی ہمارے ساتھ تھا۔ ایراوتی دریا پار کرنے تک سفر خاصا دشوار رہا۔ اس کے بعد ہم میٹکیانا پہنچے۔ اس سفر میں ہمیں پندرہ دن کا عرصہ لگا۔ ہم نے خاص میٹکیانا میں قیام نہیں کیا بلکہ اس سے دس میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی بستی راڈی کیانا میں قیام کیا۔ یہاں ہم کاچین قبیلے ہی کے ایک گھرانے میں مہمان ٹھہرے۔ یہ گھرانا کہٹن کے پھوپا کا تھا۔ جب ان لوگوں کو یہ معلوم ہوا کہ میں کہٹن کا منہ بولا بھائی ہوں تو ان لوگوں نے میری بڑی آؤ بھگت کی۔

ایک ہفتے کے اندر اندر ہمارے ان دوستوں نے جو برما میں ہندوستان کی آزادی کے لیے خاموش جنگ لڑ رہے تھے، وہ تمام مطلوبہ اسلحہ ہمیں فراہم کر دیا جس کی رقم ہم ادا کر چکے تھے۔ یہ تمام سامان اتنا تھا کہ ان کے لیے دس ہاتھی درکار تھے۔ گویا ہمیں مزید پانچ ہاتھیوں کی ضرورت تھی کیوں کہ ہم سپرابوم سے پانچ ہاتھیوں پر آئے تھے۔ جس دن تمام اسلحہ ہمیں ملا، اسی رات ہم نے راڈی کیانا سے واپسی کا سفر اختیار کیا۔

اس سے قبل ڈی کے بوس نے برما میں مقیم ان ہندوستانی دوستوں سے ہمارا تعارف تفصیل کے ساتھ کرایا جو ہمارے لیے مستقبل میں بھی اسلحہ کی مستقل فراہمی کا وسیلہ بن سکتے تھے اور اب ہم ڈی کے بوس کے توسط کی بجائے ان سے براہِ راست بھی رابطہ قائم کر سکتے تھے۔

ہم پانچویں دن دریائے ایراوتی کے کنارے شانوں، یعنی ماہی گیروں کی بستی ہوچانگ پہنچے۔ اس مقام سے دریا پار کر کے ہمیں پھر دشوار گزار کوہستانی علاقے سے گزر کر سپرابوم اور وہاں سے شمال مغربی برما میں ہندوستان کی سرحد پر پہنچنا تھا۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ہوچانگ میں شب گزارنے کے بعد آگے بڑھیں گے لیکن ابھی ہم ہاتھیوں سے اپنا قیمتی سامان اتارنے بھی نہ پائے تھے کہ کہٹن کا پھوپا نہایت برق رفتاری کے ساتھ گاچانگ پہنچا۔ اپنے ساتھ ایک ہولناک خبر لے کر آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ گاچانگ سے ہماری روانگی کے بعد کسی طرح انگریز حکام کو اسلحہ کی اسمگلنگ کا علم ہوگیا۔ انہوں نے میٹکیانا میں ہمارے ہندوستانی ساتھیوں کو گرفتار کر لیا اور پھر برمی افسروں کے ساتھ راڈی کیانا میں اس کے گھر چھاپا مارا۔ اس وقت وہ اپنے گھر پر نہیں تھا۔ چھاپے کی اطلاع اسے اپنے ایک دوست نے دی اور پھر اس نے سرسری معلومات حاصل کر کے سیدھا ہمارے پیچھے آنے کا فیصلہ

یہ اطلاع انتہائی تشویش ناک تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ انگریز، برمی افسروں کے ساتھ ہم کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ انہوں نے جس شخص کو اس سفر کے لیے رہبر بنایا تھا وہ بہترین معتمد تھا اور اسے اس نے یہ پیغام پہنچا دیا ہے کہ وہ ان لوگوں کو طویل راستے سپرابوم لے کر جائے۔

یہ خبر سنتے ہی ہم نے فوراً ہی دریائے ایراوتی پار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت سورج ڈوب رہا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ اگر انگریزوں اور برمی افسروں کی پارٹی نے مختصر راستے سے آنے کا فیصلہ کر لیا تب بھی وہ رات کو یہ دریا پار کرنا پسند نہیں کریں گے۔ ہم نے یہ [illegible] پر کہٹن کے پھوپا کا شکریہ ادا کیا اور اسے الوداع کہہ کر اپنے فیصلے پر عمل کر کے دریا پار کرنے کے بعد ہم دو تین میل بڑھتے ہی چلے گئے، پھر پہاڑوں کے دامن میں ہاتھیوں کو روک لیا۔

اس مرحلے پر ایک دشواری یہ تھی کہ ہمارا کچھ اسلحہ سپرابوم میں تھا۔ یہ وہ اسلحہ تھا جو ہمارے ساتھیوں نے ہماری آمد سے پہلے ہی سپرابوم پہنچا دیا تھا۔ دشواری اس لیے پیدا

ہوئی تھی کہ ان لوگوں نے میری یہ تجویز مان لی تھی کہ تمام اسلحہ چھ ہاتھیوں پر منتقل کر
اور یہ چھ ہاتھی دوسرے راستے سے آسام اور برما کی سرحد کی طرف بڑھ جائیں
چار ہاتھی سپرابوم کی طرف بڑھ جائیں اور اور اپنا سفر جاری رکھیں۔ اسلحہ سے لدے
ہاتھوں کے قافلے کی رہنمائی کی خاطر کاچین دادا، یعنی کاچین سردار نے ایک ایسے
کوان کے ساتھ کرنے پر آمادگی کا اظہار کر دیا تھا جو اس قافلے کو ایک طویل اور دشوار
سے منزل کی طرف لے جاسکتا تھا۔

اس موقع پر میں نے اپنی خدمات پیش کیں۔ ''ایسا کرو کہ میں، دادا اور کہٹن
ساتھ سپرابوم کی طرف چلتا ہوں۔ وہاں سے بقیہ اسلحہ لے کر میں سرحد پہنچوں گا اور
لوگوں سے آملوں گا۔''

''پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' پُرجوش اور سراپا آگ علی احمد صدیقی
کہا۔

''مگر اس کی ضرورت کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''ضرورت ہے۔'' علی احمد صدیقی نے بلند آواز میں کہا۔ ''ہم جن خطرات
دوچار ہو گئے ہیں۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس انداز میں ہمارا استقبال کریں۔ موت
قدم پر گھات لگائے بیٹھی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ہم میں سے کسی ایک کے مقدر میں موت لکھی
تو ایسی صورت میں دوسرا تو وہ اسلحہ لے جائے گا۔ اس وقت ہمارے ساتھیوں کو
زندگی اور ہماری قربانیوں سے زیادہ، اسلحہ کی ضرورت ہے۔''

علی احمد صدیقی سچ کہہ رہا تھا اس لیے اس کی بات مان لی گئی۔

☆======☆======☆

ہمارا اندازہ غلط نکلا۔ انگریز اور برمی افسروں کی پارٹی اسی مختصر راستے سے
کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ اطلاع اس کاچین نوجوان نے ہمیں دی تھی جسے دادا نے
گاچانگ سے دریا پار کرنے کے بعد وہیں چھوڑ دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ماہی گیروں
سردار نے اس اینگلو برمیز پارٹی کو یہ اطلاع دی تھی کہ ہاتھیوں پر مشتمل کاچینی قافلہ
کر کے سپرابوم کی طرف گیا ہے۔ یہ اطلاع فراہم کرنے پر انگریزوں نے اس
بھی دیا تھا۔

گویا وہی ہوا جس کا ہمیں خطرہ تھا۔ اس وقت ہم دو پہاڑوں کے درمیان ایک
سے درے سے گزر رہے تھے۔ پہلے سے طے شدہ حکمت عملی کے مطابق میں اور

ہاتھیوں سے اتر گئے اور دونوں طرف پہاڑوں پر چڑھ گئے۔ میں دائیں جانب
پہاڑ پر تھا اور علی احمد صدیقی بائیں طرف کے پہاڑ پر! ہم بہت تیزی سے آگے بڑھتے
رہے تھے۔ ہاتھیوں کی رفتار سست کر دی گئی تھی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ہم دشمن سے
میں نمٹنا چاہتے تھے دادا نے اس کاچین نوجوان کو واپس بھیج دیا اور اسے ہدایت
کی اگر راستے میں وہ اینگلو برمیز پارٹی ملے اور وہ اس قافلے کے بارے میں پوچھے تو
سچ سچ بتا دے کہ اس قافلے میں صرف چار ہاتھی ہیں۔ دادا کا خیال تھا کہ شاید اس
وہ پارٹی یہ سمجھے گی کہ ان کی مطلوبہ پارٹی کسی اور طرف نکل گئی ہے اور یہ سوچ کر شاید
تعاقب چھوڑ دیں۔

مگر یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہوا۔ نصف گھنٹے بعد اینگلو برمیز پارٹی اس درے میں پہنچ
گئی۔ سیٹیوں کے مخصوص اشاروں سے میں نے دادا، کہٹن اور چاروں مہاوتوں کو خطرہ
آنے کی اطلاع دے دی تھی۔ ہاتھیوں کی رفتار اور سست کر دی گئی۔ اینگلو برمیز
خچروں پر سوار تھی۔ ہاتھیوں کو دیکھتے ہی انہوں نے زور زور سے آوازیں دیں۔ ہاتھی
لیے گئے۔ میں اور علی احمد صدیقی اپنی اپنی جگہ دبک گئے۔ ہم نے بڑے بڑے
کی آڑ لے رکھی تھی۔

اس پارٹی نے دادا اور کہٹن کو ہاتھی سے نیچے اترنے کا حکم دیا۔ گفتگو کیوں کہ برمی
میں ہو رہی تھی اس لیے میں یہ اندازہ صرف حرکات و سکنات کی بنا پر لگا سکا۔ دونوں
بیٹھے ہاتھیوں سے اتر گئے۔ ان میں زور زور سے گفتگو ہوتی رہی۔

''ان سے پوچھو باقی چھ ہاتھ کہاں ہیں؟'' ایک انگریز نے برمی سے کہا۔

دادا نے سر اور ہاتھوں کے اشارے سے بتایا کہ اسے علم نہیں وہ کہاں گئے۔ اس نے
سے کچھ رقم نکال کر بھی اس پارٹی کے انگریز سربراہ کو دکھائی۔ میرا اندازہ یہی ہے کہ
نے پارٹی کو یہی بتایا ہوگا کہ ان لوگوں کو رقم کے عوض ہاتھی دیے گئے ہیں یا اسی قسم کی کوئی
ہی ہوگی۔

''ان سے پوچھو کہ وہ لوگ کیا سامان لے کر گئے ہیں؟'' انگریز نے برمی افسر سے کہا۔
برمی افسر نے اس سوال کو برمی زبان میں دہرایا۔ اس کے ساتھ ہی دادا نے زور
سے سر ہلایا اور دونوں کانوں کو ہاتھ لگایا۔

اس حرکت پر ایک انگریز نے بڑھ کر دادا کے چہرے پر زناٹے کا تھپڑ مارا۔
دادا کی یہ تذلیل دیکھ کر کہٹن سے نہ رہا گیا۔ اس نے اپنی جگہ سے چھلانگ دی اور

اس انگریز افسر پر جا پڑا۔ اسی وقت ایک برمی افسر کے پستول نے گولی اگل دی۔ گولی بڑے کے دائیں بازو میں لگی۔ اس کے ساتھ ہی فائرنگ کی آواز سے ایک ہاتھی بڑبڑا گیا۔ چنگھاڑا، دو تین قدم گھبرا کر پیچھے ہٹا اور پھر اپنا بھاری بھرکم پیر کہٹن کی ایک ران پر رکھ دیا۔ کہٹن کے منہ سے ایک ہولناک چیخ ابھری۔

اسی لمحے علی احمد صدیقی کے پستول سے گولی نکلی اور ایک انگریز کو ختم کر گئی۔ اب میرے لیے بھی گولی چلانا لازمی ہو گیا تھا۔ میں نے جتنے عرصے میں دو گولیاں چلائیں، علی احمد صدیقی اپنا پستول خالی کر چکا تھا۔ اس کی کوئی گولی بھی ضائع نہیں گئی تھی۔ ذرا سی دیر میں اینگلو برمیز پارٹی کے ساتوں اراکین زمین بوس ہو چکے تھے۔ پھر میں نے علی احمد کو چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ نیچے اترتے ہوئے دیکھا۔ میں ابھی اوپر ہی تھا کہ وہ نیچے پہنچ گیا۔ اس نے ایک انگریز کے ہاتھ سے رائفل کھینچی اور پھر اس پارٹی کے تین زخمیوں کے سر رائفل کے بٹ سے پاش پاش کر دیے۔ اس نے رائفل کو لاٹھی کی طرح استعمال کیا تھا۔

''خس کم جہاں پاک!'' اس نے رائفل ایک طرف پھینک کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''کم بخت بہت ہی سخت جان تھے۔''

کاچین سردار، اس کا بیٹا کہٹن اور کاچین مہاوت اس منظر کو پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ میں اترتے ہی کہٹن کی طرف لپکا تھا۔ اس کا چہرہ تکلیف کی شدت سے پسینے میں ڈوبا ہوا تھا مگر اس نے بھی ضبط کی انتہا کر دی تھی۔ ہاتھی کا پیر ران پر پڑتے وقت اس کے منہ سے چیخ نکلی تھی مگر اس کے بعد اس نے اپنے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا لیا تھا۔

پھر علی احمد صدیقی اور کاچین سردار نے ان انگریز اور برمی افسروں کی لاشیں وہاں سے اٹھا کر پتھروں اور چٹانوں کے پیچھے چھپا دیں اور ان کے خچروں کو وہاں سے بھگا دیا۔ میں اس دوران میں کہٹن کے پاس بیٹھا رہا۔

''آفاق! میرے بھائی۔'' کہٹن نے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لرز کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن ان کے گوشوں پر تبسم لرزاں تھا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ میں اپنے دینی بھائی کے کام آیا۔''

''تم ٹھیک ہو جاؤ گے کہٹن۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

''معذور کاچین نوجوان اپنی قوم کی ضرورت نہیں ہوتا میرے بھائی! معذور کاچین بے مصرف ہوتا ہے۔ صرف صحت مند کاچین ہی کو زندہ رہنے کا حق ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے کہا۔

''جلد ہی یہ بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔''

کہٹن نے اس طرح کہا جیسے وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، اس کے معنی میں نہیں سمجھ سکتا تھا۔

پھر ہم نے بمشکل تمام کہٹن کو ایک ہاتھی پر سوار کیا اور ہمارا سفر پھر شروع ہو گیا۔ اب ہماری رفتار بہت تیز تھی۔ ہم جلد از جلد اس مقام سے دور نکل جانا چاہتے تھے۔ درے سے نکلنے کے بعد دادا کی ہدایت کے مطابق راستہ تبدیل کر دیا گیا۔ سرسبز پہاڑوں اور اونچے نیچے میدانوں سے گزرتے ہوئے، ہم ایک جوہڑ کے کنارے ٹھہرے جس پر کنول کے سفید سفید پھول تیر رہے تھے۔ دادا، ہاتھی سے اترا اور اس نے جوہڑ سے کنول کے پھول توڑ لیے۔ میں اس وقت جوہڑ کے کنارے میں کھڑا تھا۔ میں نے دادا سے پوچھا تو اس نے بتایا۔ ''میرے بیٹے! یہ پھول دیوتاؤں کو بہت پسند ہیں۔ دیوتا ان پھولوں کے ساتھ جانے والی آتما کو اپنے پہلو میں جگہ دیتے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا مطلب دیوتا جانتے ہیں بیٹا!''

''میں کہٹن کے ساتھ بیٹھوں گا۔'' میں نے کہا۔

''ضرور بیٹھو۔'' دادا نے کہا۔ ''تمہیں روکا کس نے ہے۔ وہ تمہارا بھائی ہے۔ تم دونوں پر ایک دوسرے کا بہت حق ہے۔'' دادا کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ اس کے لہجے میں غم تھا۔

سبز ڈنڈیوں والے سفید سفید کنول، بے شمار کنول، ہاتھی پر لاد دیے گئے۔ سفر پھر شروع ہو گیا۔ دادا اب اس ہاتھی پر سوار ہو چکا تھا۔ جس پر میں پہلے بیٹھا تھا اور اب میں کہٹن کے ساتھ تھا۔

کہٹن کے چہرے پر اب بھی ایک معصوم سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے اس سے پوچھا تو۔ ''کہٹن، میرے بھائی! کیا ہونے والا ہے؟''

''جو کچھ ہونے والا ہے بہت خوبصورت ہے۔ ان پہاڑوں پر آتماؤں کا مسکن ہے میرے بھائی! یہ جو تم ان پہاڑوں پر دھندسی پھیلی دیکھتے ہو یہ آتماؤں ہی کے سبب ہے۔ یہ وہ آتمائیں ہیں جنہیں دیوتا اپنے پہلو میں جگہ دیتے ہیں۔''

''میں تمہیں اپنے ساتھ ملے جاؤں گا۔ وہاں بہترین ڈاکٹروں سے تمہارا علاج کراؤں گا۔ مصنوعی ٹانگ لگوا دوں گا تمہارے۔''

''آفاق، میرے بھائی!'' اس نے میرے ہاتھ کو زور سے بھینچتے ہوئے کہا۔ ''ہم

کا چین ہیں۔ ہم دیوتا کی مٹھی سے پیدا ہوئے ہیں۔ کرانگ کسائی ہم پر بہت مہربان ہے کوئی کا چین اس کی ناراضگی مول نہیں لینا چاہتا۔ اس نے ہمیں اپنے اعضا کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ مصنوعی اعضا ہمارے لیے بے کار ہیں۔''

میں بہت پریشان ہو رہا تھا۔ مجھے احساس تھا کہ کچھ ہونے والا ہے مگر کیا ہونے والا ہے، میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں نے دو ایک مرتبہ کہٹن سے پوچھا بھی مگر اس نے صرف یہ جواب دیا۔ ''دادا بہتر جانتا ہے۔ دادا سب کچھ جانتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا دینی بھائی میرے ساتھ ہے۔''

سورج ڈھلنے لگا تھا اور سائے ترچھے ہونے لگے تھے۔ آسمان پر قوس قزح کھنچ گئی تھی۔ کہٹن نے اسے دیکھا اور مسرت سے اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''یہ دیکھ رہے ہو میرے بھائی! یہ دیوتاؤں کا راستہ ہے۔ میں بڑا خوش قسمت ہوں۔''

اسی وقت ہاتھی روک لیے گئے۔ دادا اپنے ہاتھی سے اتر کر میری طرف آیا، میں بھی ہاتھی سے اتر چکا تھا۔ دائیں جانب بلند پہاڑ تھا جس پر چیڑ کے درخت آسمان کی طرف سر اٹھائے کھڑے تھے۔ پتھروں اور سبز گھاس کے درمیان دور دور تک سفید اور زرد پھولوں کا بستر بچھا ہوا تھا۔ ہوا دھیرے دھیرے سسک رہی تھی۔

پھر دادا نے کہٹن کو ہاتھی سے اتار لیا۔ ''کیا کر رہے ہو دادا؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے بیٹے!'' دادا نے کہا۔ ''تم سیرابوم جاؤ، میں نے مہاوت کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ وہاں سے اپنے ہتھیار لے کر فوراً ہندوستان روانہ ہو جاؤ۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ دیوتا تمہاری حفاظت کریں گے۔''

''مگر تم...... کیا تم نہیں جاؤ گے۔'' میں نے اس سے سوال کیا تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔

''میں دیوتاؤں کے احکام پورے کروں گا۔'' دادا کے لہجے میں عزم تھا۔ آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

پھر میں مجبور ہی ہو گیا۔ میں ان کے اعتقادات میں مزاحمت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اور دادا نے مل کر کہٹن کو اٹھایا۔ علی احمد نے مدد کرنا چاہی تو دادا نے منع کر دیا۔ ''تم لوگ یہیں رہو۔ یہ دھرم کا معاملہ ہے۔ صرف میں جو کہٹن کا باپ ہوں اور آفاق جو اس کا دینی بھائی ہے، یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔''

اگرچہ دادا کا اصرار تھا کہ میں فوراً وہاں سے چلا جاؤں مگر اس کے لیے آمادہ نہ تھا۔

دادا نے بتایا تھا کہ وہ اس پہاڑ پر چیڑ کے درخت کے نیچے بنے ہوئے ایک غار تک کہٹن کو لے جانا چاہتا تھا۔

چیڑ کا درخت غار کے اوپر کھڑا تھا۔ ہوا اس کے پتوں کے درمیان سسکیاں بھرتی گزر رہی تھی۔ ہم نے کہٹن کو غار کے دہانے کے پاس لٹا دیا اور دادا اس غار میں گھس گیا۔

''میں بڑا خوش قسمت ہوں میرے بھائی!'' کہٹن نے کہا۔ ''کنول کے مقدس پھولوں کی چادر، آسمان پر تنی ہوئی دھنک کی کمان کا راستہ اور چیڑ کا درخت، یہ سب کچھ ہے۔ بتاؤ مجھے یاد رکھو گے نا!''

''میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتا کہٹن میرے بھائی!'' میں نے کہا تھا۔ ''میں تم سے ملنے آؤں گا۔''

''تمہیں معلوم ہے اب میں آرام کروں گا۔'' کہٹن نے کہا۔ ''یہاں میرے تمام دکھوں کا علاج ہو جائے گا۔'' اس نے اپنی زخمی ٹانگ کی طرف دیکھا۔ ''اپنے گھر والوں کو بتانا کہ تم نے مجھے اپنا بھائی بنایا تھا۔''

تھوڑی دیر میں دادا غار سے باہر آ گیا۔ ''میرے بیٹے!'' دادا نے مجھ سے کہا۔ ''جاؤ نیچے سے کنول کے پھول لے آؤ۔''

میں تھوڑی ہی دیر میں کنول کے پھولوں کا گٹھر لے آیا۔ دادا، پھولوں کو لے کر پھر غار میں گھس گیا۔ ''آخر دادا کیا کر رہا ہے۔ کیا ہونے والا ہے؟'' میں نے کہٹن سے پوچھا۔

کہٹن نے کہا۔ ''دادا سب کچھ جانتا ہے۔ وہ وہی کر رہا ہے جو کرنا چاہیے، وہی ہو گا جو ہونا چاہیے۔'' وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔ ''ہم کا چین ہیں۔ وہ کرانگ کسائی کی مرضی پوری کر رہا ہے۔''

پھر دادا باہر آ گیا۔ ہم نے کہٹن کو غار میں منتقل کر دیا۔ دادا نے غار میں کنول کے پھولوں کا بستر بچھا دیا تھا اور تکیے کی جگہ ایک چوڑا سا پتھر رکھ دیا تھا۔ ''یہ دیوتاؤں کا بستر ہے۔'' دادا نے آہستگی سے کہٹن کے کان میں کہا۔

''میں جانتا ہوں دادا۔'' کہٹن کا جواب تھا۔

''اب تم اپنے بھائی سے باتیں کر لو۔'' یہ کہہ کر دادا غار سے نکل گیا۔

میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ غار میں خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ پھر اس خاموشی کو کہٹن نے ہی توڑا۔ ''آفاق، میرے بھائی! تم جانتے ہونا، میں تمہارا فرماں بردار چھوٹا بھائی

ہوں۔ میں نے تمہاری ہر طرح مدد کرنا چاہی ہے۔''

''ہاں!'' میں نے جواب دیا۔

''اپنی امی اور اپنی بہن کو اور اپنے باپ کو میرا اسلام کہنا، ان سے کہنا کہ تمہارا ایک وفادار بھائی۔ برما میں، کاچین کے پہاڑی سلسلے میں ایک غار کے اندر سو رہا ہے۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''تم حیران کیوں ہو میرے بھائی! یہ ہمارے دھرم کی بات ہے اور ہاں، یہ تمہارے لیے ہے، میری ایک نشانی!'' اس نے میری ہتھیلی پر اپنی انگوٹھی رکھ دی۔ یہ انگوٹھی ہاتھی کے بالوں سے بنائی گئی تھی اور کہٹن ہر وقت اسے پہنے رکھتا تھا۔ ''اچھا اب تم جاؤ۔''

میں کھڑا ہو گیا۔

باہر آ کر میں نے دادا سے رخصت کی اجازت لی۔ اس نے مجھے ڈھیروں دعاؤں کی چھاؤں میں الوداع کہا اور ہدایت کی کہ میں جلد از جلد اپنے ہتھیار لے کر سپرا بوم سے نکل جاؤں۔ پھر میں تیزی سے نیچے اتر آیا۔

ابھی میں ہاتھی پر سوار ہی ہوا تھا کہ مجھے اوپر غار سے ایک زوردار چیخ سنائی دی۔ اس چیخ کو میں پہچانتا تھا۔ میں نے پھر ہاتھی سے چھلانگ لگائی، علی احمد صدیقی بھی اترنا چاہتا تھا مگر میں نے اسے روک دیا اور واپس اسی تیزی سے پہاڑ پر چڑھتا چلا گیا۔

دادا غار کے دہانے پر پتھر رکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اس کا جسم اس طرح کانپ رہا تھا جیسے ہوا کے جھونکوں سے چیڑ کے پتے کانپتے ہیں۔

''دادا!'' میں چیخا۔ ''تم نے کیا کیا؟ کہٹن کو کیا ہوا؟''

اس نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ ''جاؤ میرے بیٹے، جاؤ۔ جو کچھ ہوا، ٹھیک ہوا۔ میں آج رات عبادت کروں گا۔ کل صبح تمہارے بھائی کے جسم کو مقدس آگ کے سپرد کر دیا جائے گا۔''

''دادا! میرا بھائی، کہاں ہے وہ۔'' میں نے بڑھ کر غار میں جھانکا۔

کہٹن کے سر پر ایک بھاری پتھر پڑا ہوا تھا اور گاڑھا گاڑھا خون ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میں نے مڑ کر دادا کو دیکھا۔

''وہ دیکھو دھنک کی کمان فضا میں تحلیل ہو رہی ہے، ادھر دیکھو! کہٹن کی روح جا رہی ہے۔ تم اس کے دینی بھائی ہو۔ تمہیں اس کی روح مجھ سے زیادہ صاف نظر آئے گی۔''

میں مٹتی ہوئی دھنک کو گھورتا رہا۔ میرا دل بوجھل ہو گیا تھا۔ دادا مسلسل دھنک کو دیکھے جا رہا تھا۔ پھر جب دھنک بالکل ہی ختم ہو گئی تو دادا نے پوچھا۔ ''کیوں بیٹا! نظر آئی تھی اس کی آتما؟''

میں نے بوجھل دل سے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

آج جب میں یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ کہٹن کی چیخ میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ یہ کئی مرتبہ میرے کانوں میں گونجی ہے اور ہر مرتبہ میں نے کہٹن کی دی ہوئی ہاتھی کے بالوں والی انگوٹھی کو چوما ہے۔ اس وقت بھی وہ انگوٹھی میرے پاس ہے اور میں نے ابھی ابھی اسے چوم کر رکھا ہے۔

سرحد پار اسلحہ منتقل کرنا کچھ زیادہ مشکل ثابت نہ ہوا۔ ہم یہ تمام اسلحہ خچروں پر لاد کر قبائل کی بستیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے گوہاٹی پہنچے تھے۔ اس علاقے میں ڈی کے بوس کے کئی جاننے والے تھے اور وہ سب بوس سے عقیدت رکھتے تھے۔ بوس نے ان لوگوں سے ہمارا تعارف کرایا اور ان سے وعدہ لیا کہ آئندہ اگر ہم میں سے کوئی بھی اس طرح اسلحہ لے کر گزرے گا تو وہ اس کی اسی طرح مدد کریں گے جس طرح ڈی کے بوس کی کرتے تھے۔

گوہاٹی پہنچ کر بوس نے ہم سب کو بیل گاڑیاں دلوائیں۔ ہم نے یہ اسلحہ ان بیل گاڑیوں میں لادا اور دو دو تین تین دن کے وقفے سے روانہ ہوئے۔ پہلے دن علی احمد صدیقی اور مولانا قاسم علی وہاں سے چلے، اس کے تین دن بعد میں اور کوہستانی! ڈی کے بوس نے بتایا تھا کہ وہ تین دن بعد وہاں سے روانہ ہو گا۔ بھاگلپور تک ہمیں پہنچانے کے لیے اس نے ہمارے ساتھ بھی ایک رہبر کر دیا تھا۔ ایسا ہی ایک رہبر علی احمد صدیقی اور مولانا قاسم علی کے ساتھ بھی تھا۔ ہم گوہاٹی سے مہندر ناتھ کو تار کے ذریعے ہندوستان میں اپنی آمد کی اطلاع پہلے ہی دے چکے تھے۔

پروگرام کے مطابق ہمیں گوہاٹی سے تار دینے کے ٹھیک ایک ماہ بعد بھاگلپور پہنچنا تھا۔ ڈی کے بوس نے ہمارے رہبر کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی تھی اور وہ بیلوں کو ایک مخصوص رفتار سے چلا رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ بیل گاڑی میں سوار تھا اور کوہستانی کی بیل گاڑی پیچھے تھی۔

مہندر ہمیں گوہاٹی سے باہر ہی سڑک پر منتظر ملا۔ اس کے بعد کیا کرنا تھا، اس کی ذمے داری [illegible]۔ پہلے جو پروگرام سالار نے مجھے دیا تھا، اس کے مطابق مجھے تمام اسلحے کے ساتھ

بریلی پہنچنا تھا لیکن اب مہندر نے مجھے بتایا تھا، اسلحہ وہ طے کر جائے گا۔ اب مجھے لکھنؤ
تھا اور کوہستانی کو مہندر کے ساتھ جانا تھا۔

جس وقت ہم برما روانہ ہوئے تھے، گرمیوں کا موسم تھا اور اب گزرتے جا ر
تھے۔ خزاں ختم ہو رہی تھی۔ سوکھے پتوں کی جگہ درختوں پر نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔

اس سفر سے برما میں وہ رابطے پیدا ہوئے جو بعد میں سبھاش چندر بوس اور جنرل
شاہنواز کے کام آئے۔

☆======☆======☆

لکھنؤ میں ایک اعتبار سے میں نظر بند ہو کر رہ گیا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ والدہ سخت
علیل تھیں، والد صاحب ان دنوں کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ پھر تنظیم کی طرف سے بھی مجھے
کوئی پیغام نہیں ملا تھا۔ لکھنؤ میں آزادانہ طور پر میں نقل و حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ خصوصاً ان
میں تو کہیں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اپنی شخصیت کو تبدیل کرنے کے لیے میں
نے داڑھی رکھ لی تھی اور بال بڑھا لیے تھے۔ میں ایک آنکھ پر مستقل ہرا کپڑا باندھے رکھتا
تھا۔ لباس میں تبدیلی کرنے کے لیے میں نے لانبا کرتا اور شلوار پہننی شروع کر دی تھی اور
ایک چادر ہر وقت میرے شانے پر پڑی رہتی تھی۔ ننھی زیب میری اس ہیئت کذائی پر بہت
ہنسا کرتی تھی۔

گھر میں صرف امی، ننھی زیب اور بابا تھے۔ گھر کے دروازے ہر وقت بند رہتے
تھے تاکہ کوئی عزیز رشتے دار اچانک نہ آ جائے۔ ننھی زیب کو سمجھا دیا گیا تھا کہ وہ کسی سے بھی
یہ تذکرہ نہ کرے کہ میں گھر میں ہوں یا لکھنؤ آ گیا ہوں۔ ننھی زیب بہت ہوشیار اور عقل مند
بچی تھی وہ حالات کی سنگینی کو سمجھتی ہو یا نہ سمجھتی ہو۔ یہ بات بہر حال جانتی تھی کہ اس کا بھائی
خطرے میں ہے۔

گرمیاں اپنے عروج پر تھیں۔ آم، خربوزوں اور تربوز کا موسم خاتمے پر تھا۔ اپنے
گھر میں محصور ہوئے یہ مجھے تیسرا مہینہ تھا۔ میں کبھی کبھار رات گئے گھر سے نکلتا، ادھر ادھر
سیر کرتا اور واپس آ جاتا۔ میں نے اس دوران میں کسی سے بھی ملاقات نہیں کی تھی۔ میں
نہیں چاہتا تھا کہ کسی بھی فرد کو یہ پتا چلے، میں لکھنؤ میں موجود ہوں۔

اس دن بڑا حبس تھا۔ لگتا تھا کہ اس حبس کے بعد خوب کھل کر بارش ہوگی۔

مگر اس دن موسم کا یہ حبس ٹوٹنے سے پہلے میری روح اور میرے وجود کا حبس ٹو
میرے وجود پر ابرِ مسرت اتنا جھوم جھوم کے برسا کہ میری روح شار ہوگئی۔

ہاں اس دن ایسا ہی ہوا تھا، میں نے یہی کچھ محسوس کیا تھا۔ دوپہر کے وقت ایسا ہی
مہندر اور لالی وہاں پہنچے تھے۔ مہندر نے مجھے بتایا تھا کہ سالار نے اس کے والد سیٹھ
تھ سے کہہ کر لالی کو یہاں امی کی تیمارداری کے لیے بھیجا ہے۔ سالار نے انہیں بتایا تھا
مہارے والد کو حکومت نے کسی اہم مشن پر کہیں بھیج رکھا ہے اور ان کے جلد آنے کی توقع
ہے۔ میں نے اس وقت نامعلوم کیوں مہندر کے لہجے میں تلخی سی محسوس کی تھی۔

''اس مہم کی نوعیت کیا ہے؟'' میں نے مہندر سے پوچھا۔

''اس مہم کی نوعیت وہی ہے۔ جو سوامی شردھانند اور مالویہ جی کے مشن کی ہے۔''
در نے جواب دیا۔ ''وہ مختلف جیلوں میں نظر بند لیڈروں کے علاوہ ان لیڈروں سے بھی
قاتیں کرتے پھر رہے ہیں جو آزاد ہیں۔ ان کا مشن صرف اتنا ہے کہ ہندو مسلم اختلافات
خلیج اور وسیع کر دیں۔ وہ مسلمانوں سے مسلمانوں کا ہمدرد بن کر ملتے ہیں اور ہندوؤں
کانگریسی مسلمان بن کر۔''

مجھے یہ سب کچھ سن کر افسوس ہوا مگر پھر میں نے اس تکدر کو اپنے ذہن سے جھٹک
''وہ تو ہمیشہ سے ایسے ہی ہیں۔'' میں نے کہا تھا۔ ''انہیں خان بہادری سے زیادہ کچھ
ز نہیں۔''

''بہر حال!'' مہندر نے کہا۔ ''لالی اب یہاں امی کی تیمارداری کرے گی کیوں کہ
اب ایک مہم درپیش ہے۔ اس مہم میں جو مختلف چھاپا مار تنظیموں کی مشترکہ مہم ہے، اپنی
یم کی طرف سے میں، تم اور جمشید شریک ہوں گے۔''

''ہمیں کہاں جانا ہوگا؟''

''دو دن بعد ہمیں کانپور جانا ہے۔'' مہندر نے کہا۔ ''وہاں ہمیں اس مہم کی تفصیلات
م ہوگا اور ان تمام لوگوں سے ملاقات بھی جو اس مہم میں مختلف تنظیموں کی طرف سے
ت کریں گے۔''

لالی سے مل کر امی بے حد خوش ہوئی تھیں۔ خود لالی نے امی سے مل کر اتنی عقیدت کا
ہار کیا تھا جیسے امی کی خدمت کرنا ہی اس کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہے۔ ننھی زیب
اور میں اس سے گھل مل گئی تھی اور بیٹھی پٹر پٹر باتیں بنا رہی تھی۔

''معلوم ہے باجی!'' ننھی زیب اس وقت بولی جب میں مہندر کے ساتھ اپنے
میں جانے لگا۔ ''ہمارے بھیا ایسے نہیں ہیں۔''

''کیسے نہیں ہیں؟'' لالی نے پوچھا۔

''ایسے داڑھی والے، جھولے سے کپڑے پہنے ہوئے۔''

''پھر کیسے ہیں؟'' لالی اس کی معصوم باتوں میں دلچسپی لے رہی تھی۔

''بہت اچھے سے، پتلون قمیص پہنے ہوئے۔''

''نہیں بھئی۔'' لالی نے کہا۔ ''تمہارے بھیا تو اب بھی اچھے ہیں۔ وہ ہر روپ میں اچھے لگتے ہیں۔'' لالی نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''سچ!'' ننھی زیب خوشی سے چیخی۔ اسے شاید ڈر تھا کہ لالی نے مجھے اس ہیئت میں پسند نہیں کیا ہے۔

''سچ بھئی۔'' لالی نے کہا۔ ''میں کوئی تم سے جھوٹ بولوں گی۔''

ننھی زیب اچھل کر اس کی گود میں سوار ہوگئی۔ ''میری اچھی باجی! مگر ہمیں تو بھیا ایسے ذرا بھی اچھے نہیں لگتے۔''

مہندر اور لالی کو لکھنؤ آئے ہوئے یہ دوسرا دن تھا ہمیں اسی رات لکھنؤ سے نکل جانا تھا۔ مہندر اپنے کسی دوست سے ملنے کے لیے امین آباد گیا ہوا تھا۔ اس دن امی کو نہ معلوم کیا ہوا تھا کہ بس مجھے اپنے سامنے بٹھائے تکے جا رہی تھیں۔ پھر اچانک انہیں میری شادی یاد آگئی اور انہوں نے لالی سے کہا۔ ''لالی، میری بیٹی! اسے سمجھاؤ، شادی کر لے۔ میں مرنے سے پہلے اس کے ماتھے پر سہرا دیکھنا چاہتی ہوں، اپنی بہو کو گھر میں لانا چاہتی ہوں۔''

لالی کے چہرے پر جیسے رنگ آ کر گزر گیا۔ ''کوئی لڑکی دیکھی ہے امی آپ نے؟''

''کئی۔'' امی نے جواب دیا۔ ''مگر اسے کوئی پسند ہی نہیں آئی۔ کہتا ہے اپنی پسند سے کرے گا۔ کوئی لڑکی پسند بھی کر لی ہے۔''

''یہ کب کی بات ہے؟'' لالی نے پوچھا۔

''ڈیڑھ دو برس پہلے جب یہ امروہے گیا تھا۔'' امی نے لالی کو بتایا۔ شاید وہ لالی سے میرے بارے میں ہی گفتگو کرتی رہتی تھیں اور انہوں نے لالی کو میری زندگی کے بارے میں ان دنوں میں سب کچھ بتا دیا تھا۔ ایک ماں کو اگر ایک اچھا سامع مل جائے تو پھر وہ اس سے بس اپنی اولاد ہی کی گفتگو کرتی رہتی ہے۔

''نام کیا ہے اس کا؟'' لالی نے پوچھا۔

''نام کہاں بتایا اس نے۔'' امی نے جیسے بڑے دکھ سے کہا۔ ''بس وعدہ کیا تھا کہ اسے دکھا دے گا۔''

''کیوں شیرازی جی!'' لالی نے کہا۔ ''نام کیوں نہیں بتایا آپ نے؟ امی کو تنگ

...تی ہیں!''

''تم چاہتی ہو کہ میں نام بتا دوں!'' میں نے کہا۔

''ہاں، کیوں نہیں، بتا دو۔'' لالی نے تڑ سے جواب دیا۔

''امی!'' میں نے کہا۔ ''میری پسند اور آپ کی دلہن، آپ کے سامنے بیٹھی ہے،

''

لالی جیسے بیر بہوٹی ہوگئی۔ امی کی سمجھ میں جیسے کچھ نہیں آیا۔ ''کیا بک رہا ہے لڑکے! باتیں کر رہا ہے۔ لالی بیٹی! برا نہ ماننا، یہ تو ہے ہی ایسا، اول فول بکتا رہتا ہے۔''

''امی میں سچ کہہ رہا ہوں یہی لالی میری پسند ہے۔ یہی ہم دونوں کا فیصلہ ہے۔ شادی اگر ہوگی تو لالی سے ہوگی۔'' میں نے کہا۔ ''مگر ہماری شادی اس وقت ہوگی ہندوستان آزاد ہو جائے گا۔ میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ آپ کو ہونے والی دکھاؤں گا۔ وہ وعدہ میں نے پورا کر دیا۔''

امی کو اب بھی جیسے یقین نہیں آیا۔ وہ حیرانی سے کبھی مجھے کبھی لالی کو دیکھے جا رہی ''تم...... مگر آفاق! یہ کیسے ہوگا؟ یہ کیسے ممکن ہے؟''

''سب کچھ ممکن ہے امی جان!'' میں نے کہا۔ ''یہ میرا اور لالی کا فیصلہ ہے۔''

امی نے لالی کو اپنے سینے سے لگا لیا۔ ''میری بیٹی، میری بہو!'' ان کی آنکھوں میں تیر گیا تھا۔

''پسند آئی آپ کو اپنی ہونے والی بہو؟''

''تجھ سے زیادہ میں اپنی بیٹی کو پسند کرتی ہوں۔'' انہوں نے کہا۔ ''جب سے آئی ہے میرے دل نے یہی کہا تھا کہ اگر یہ میری بہو بن جائے تو کتنا اچھا ہو۔ اللہ نے دل کی لگی سن لی! اور کس کو معلوم ہے یہ بات؟''

''کسی کو نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ہم تینوں کے سوا اور کسی کو اس بات کا علم

''

اس وقت امی کو نہ جانے کیا سوجھی تھی کہ انہوں نے لالی کو سامنے بٹھا کر وہ تمام جو انہوں نے اپنی بہو کے لیے تیار کیے تھے، لالی کو پہنائے، اس کی مانگ میں اور اسے سب سے قیمتی جوڑا پہنا کر دلہن کی طرح سجا دیا۔ نہ جانے کیوں امی کو یہ چلا تھا کہ ان کی زندگی کے دن بہت تھوڑے رہ گئے ہیں۔ نہ معلوم انہیں یہ ہول تھا کہ یہ ہم تینوں کی آخری ملاقات ہے۔ وہ بار بار اپنے اس خوف کا اظہار کر

رہی تھیں اور میں ہر مرتبہ انہیں حوصلہ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

دلہن سج گئی تو امی نے مجھے لالی کو دکھایا تھا اور لالی کی بے شمار بلائیں لی تھیں۔ زیب اس وقت مہندر کے ساتھ گئی ہوئی تھی ورنہ تو وہ شور مچا مچا کر سارے محلے کو اٹھا لیتی۔

امی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''چلو میں نے اپنی آنکھوں سے اپنی بہو کو دیکھ تو لیا۔ یہ نگوڑا ہمارا ہندوستان تو جانے کب آزاد ہوگا۔''

رات آ گئی ہم تیار ہو گئے۔ چلتے وقت مجھے اچانک زہر کی وہ گولیاں یاد آ گئیں جو سالار نے نینی تال میں مجھے دی تھیں۔ ''ذرا ایک چیز اور لے لوں۔'' میں نے مہندر سے کہا اور اپنی الماری کی طرف بڑھ گیا۔

الماری سے میں نے وہ مومی لفافہ نکالا جس میں زہر کی دونوں گولیاں رکھی ہوئی تھیں۔ انہیں میں نے لفافے سے نکال کر ایک نظر دیکھا، پھر ان گولیوں کو لفافے میں واپس ڈال لیا۔

''یہ کیسی گولیاں ہیں؟'' لالی نے مجھ سے پوچھا۔

''زہر کی گولیاں ہیں۔ سالار نے مجھے دی تھیں۔'' میں نے اسے بتایا تھا۔ ''جب میں برما جا رہا تھا۔''

''یہ گولیاں اسی مہم کے لیے دی تھیں نا؟'' لالی نے پوچھا۔ ''اس مہم کے لیے نہیں۔''

''شاید!'' میں نے جواب دیا۔

''تو پھر یہ گولیاں مجھے دے دو۔'' اس نے مومی لفافہ میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔

''آؤ یار، چلو دیر ہو رہی ہے۔'' مہندر نے کہا تھا۔

ہم دونوں امی کی دعاؤں کے سائے میں مکان سے باہر آئے ہی تھے کہ ننھی زیب دوڑتی ہوئی آتی۔ ''بھیا! بھیا'' اس نے سرگوشی میں کہا۔ ''امی ایک منٹ کے لیے بلا رہی ہیں۔''

''تم تانگے میں بیٹھو۔'' میں نے مہندر سے کہا۔ ''میں ابھی آیا۔''

اندر پہنچا تو امی نے مجھ سے کمزور آواز میں کہا۔ ''لالی تجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔'' انہوں نے پچھلے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔

میں کمرے میں گیا۔ لالی دروازے کی ایک طرف کھڑی تھی۔ ''شیرازی جی!''

تے ہوئے کہا اور میرے سینے سے سر ٹکا دیا۔ ''آج سے میں خود کو سہاگن سمجھوں گی۔ تم میرا سہاگ ہو۔ اس کی حفاظت کرنا۔''

پھر ہم چند لمحے کے لیے ایک دوسرے میں گم ہو گئے۔

☆======☆======☆

کانپور پہنچ کر بنگالی محال کے محلے میں، فخرالدین صاحب کے گھر ہمارا قیام ہوا۔ یہ دو منزلہ مکان تھا۔ فخرالدین صاحب نے مہمانوں کے لیے اپنے گھر کا بالا خانہ خالی کر ہمیں پتا چلا تھا کہ ہمارے باقی ساتھی بھی بنگالی محال میں ہی پنڈت گنیش شنکر کے ہاں ہیں۔ یہ محلہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی ملی جلی آبادی پر مشتمل تھا البتہ یہاں مسلمانوں کی بہت قلیل تھی۔ صورت یہ تھی کہ ہماری مہم میں جن لوگوں کو شریک ہونا تھا ان میں جو مان تھے انہیں ٹھہرانے کا بندوبست تو فخرالدین صاحب کے ہاں تھا، ہندو اور سکھ رضا کے قیام کا بندوبست پنڈت گنیش شنکر کے ہاں تھا۔

اس مہم کا اہتمام اس دور میں کیا گیا تھا جب ہندو اور مسلم اتحاد کی باتیں، زور وشور جاتی تھیں۔ شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں ابھی کمزور تھیں، ان کا زہر ابھی پوری طرح پھیلا تھا۔ اس وقت ہم میں سے کوئی بھی یہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ انگریز کی حمایت سے جانے والی شدھی اور سنگٹھن کی تحریکیں تین چار برس میں ہی اتنی توانا ہو جائیں گی کہ سلم بھائی بھائی کا نعرہ یکسر ختم ہو جائے گا۔ ہاں بنگالی محال کانپور کا وہی محلہ تھا جہاں چار سال بعد ہی ہولناک ہندو مسلم فساد پھوٹا تھا۔ اس محلے میں مسلمانوں کے تمام ت جلا دیے گئے تھے۔ ہر مسلمان کو جس میں مرد عورت اور بچے سبھی شامل تھے چن چن کر دیا گیا تھا۔ فخرالدین صاحب کا یہی مکان جس میں اس وقت ہم مقیم تھے، ان ت میں سب سے پہلا نشانہ بنا تھا اور تمام گھر والے قتل کر دیے گئے تھے۔ پنڈت گنیش تھے جو انہی ہنگاموں کے اگلے دن قتل کر دیے گئے تھے۔

فخرالدین صاحب کے گھر، میں، جمشید، اشفاق اللہ اور علی احمد صدیقی تھے۔ اشفاق جانتا تھا، ان کا تعلق لکھنؤ سے تھا۔ مہندر بھی ہمارے ساتھ ہی ٹھہرا تھا۔ پنڈت گنیش ہاں رام پرشاد بسمل، سچندر ناتھ سانیال، ڈی کے بوس اور کئی افراد مقیم تھے جن میں گھوش، جگت سنگھ اور بی سی جوشی بھی شامل تھے۔ آجوئے گھوش کانپور میں ہی رہتا جگت سنگھ کا زبردست حامی اور ساتھی تھی۔ جگت سنگھ نے کانپور میں رضا کاروں کی لیے جسمانی تربیت کا ایک مرکز فزیکل سینٹر کے نام سے قائم رکھا تھا۔ ہمیں اسی

فزیکل سینٹر میں عملی تربیت بھی حاصل کرتا تھی۔ رام پرشاد بسمل سے بھی میں واقف تھ
خلیق الزماں نئے واقف کاروں میں سے تھا اور اکثر جلسے جلوسوں میں ان سے ملاقات ہو
کرتی تھی۔

علی احمد اور مولانا قاسم علی کے ذمے یہ کام تھا کہ وہ ہمیں اس مہم کے لیے جو ہم
پیش تھی، اسلحہ فراہم کریں گے۔ ان دونوں حضرات سے میری واقفیت برما کے سفر
دوران میں ہوئی تھی۔ علی احمد کے بارے میں ایک بات بتا تا چلوں کہ یہ شخص آزادی
زبردست رسیا تھا۔ والدین نے زبردستی شادی کردی تھی لیکن یہ حضرت اپنی بیوی کو چھوڑ
گھر سے نکل لیے تھے اور یہ عہد کیا تھا کہ جب تک ہندوستان آزاد نہیں ہوگا، نہ تو اپنی بیوی
کے پاس جائیں گے نہ اس کی شکل دیکھیں گے اور یہ شخص اپنے عہد پر سختی سے قائم رہا تھا۔

ایک ہفتے کی تربیت کے بعد پندرہ افراد کی ایک جماعت کانپور سے کاکوری روانہ
ہوئی۔ کانپور میں ہم نے ٹرین الٹنے کی تربیت لی تھی اور اس مہم میں کام آنے والے اسلحہ
استعمال کرنے کے گر سیکھے تھے۔

☆======☆======☆

غلام ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والے مجاہدین غلامی کی تاریکیوں میں
سینندھ لگانے کے لیے عموماً رات کو حرکت میں آتے ہیں اور دشمن پر شب خون مارتے ہیں۔
وہ رات بھی ایسی ہی رات تھی جب ہم کاکوری کے ایک مکان میں بیٹھے ایک شب خون
مارنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ اس مہم کے لیے ہمارا سربراہ ڈی کے بوس تھا۔ ہم سب
کمرے کی دیواروں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور ڈی کے بوس آخری مرحلے پر ہمیں ایک
مرتبہ پھر اس مہم کی ایک ایک تفصیل بتا رہا تھا۔ اس مہم میں بنیادی کام میرا، مہندر اور جمشید
تھا۔ اس وقت تو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ آخر اس مہم میں ہماری شرکت اتنی محدود کیوں
تھی لیکن بعد میں مجھے احساس ہوا تھا کہ یہ ایک اور بڑے کام کے لیے ہماری عملی تربیت کا
حصہ تھا۔ اگرچہ ہم بارودی سرنگوں اور ڈائنا مائٹ کے استعمال سے متعلق کانپور کے دوران
قیام میں کافی لیکچر لے چکے تھے۔ ڈی کے بوس اور سانیال نے ہمیں ایک بات سمجھ
دی تھی لیکن ظاہر ہے عملی تجربہ کچھ اور ہی بات ہوتی ہے۔

علی احمد صدیقی اور مولانا قاسم علی الہ آباد اور لکھنؤ سے اسلحہ لے آئے تھے۔ مختلف
سمتوں سے اسلحہ احتیاطاً منگایا گیا تھا تاکہ اگر کسی ایک پر چھاپا پڑ جائے تو دوسرا ذخیرہ وقت
پر پہنچ جائے۔ یہ تمام اسلحہ بیل گاڑیوں میں لدا ہوا تھا۔ ڈی کے بوس نے علی احمد کو اسلحہ

گاڑی سمیت واپس الہ آباد بھیج دیا تھا۔ مولانا قاسم علی اس جگہ کے قریب جہاں، ہمیں یہ
کارروائی انجام دینا تھی، جھاڑیوں میں اسلحہ اتار کر واپس جا چکے تھے۔ ان جھاڑیوں میں
رضاکار اس کی حفاظت کے لیے موجود تھے۔

بارودی سرنگوں اور ڈائنا مائٹ کے استعمال سے متعلق ایک مرتبہ پھر ایک ایک بات
سمجھانے کے بعد ڈی کے بوس نے مجھے، مہندر، جمشید، جوشی، اشفاق اللہ اور سانیال کو مہم
کے ابتدائی اور سب سے اہم مرحلے کی تکمیل کے لیے روانہ کر دیا۔ ہم چھ افراد تین تین کی
ٹولیوں میں وہاں سے تھوڑے تھوڑے وقفے سے کارراز کی سمت روانہ ہوئے۔

رات اندھیری تھی۔ اس کی تاریکی، مہربان اور شفیق تاریکی نے ہمیں تحفظ فراہم کیا
تھا۔ کاکوری اسٹیشن سے تین میل آگے جا کر ہم اس جگہ رکے جہاں ریلوے لائن کے قریب
جھاڑیوں میں اسلحہ رکھا ہوا تھا۔ ٹارچ کی روشنی سے اشاروں کا تبادلہ ہونے کے کچھ ہی دیر
بعد جھاڑیوں میں متعین دو افراد لکڑی کی دو پیٹیاں اٹھا لائے جس میں وہ سامان موجود تھا
جسے استعمال کرنے کے لیے ہم یہاں آئے تھے۔

پہلے گروپ میں ہم تینوں یعنی میں، مہندر اور جمشید تھے۔ ہم نے ریلوے لائن کی
پٹڑیوں سے بارودی سرنگیں اور ڈائنا مائٹ باندھ دیے۔ ڈائنا مائٹ کی چھڑیوں کو ہم نے
بارودی سرنگوں سے منسلک کیا تھا تاکہ وہ بغیر فلیتے کے اپنا کام کر سکیں۔ ہم سے کوئی بیس
گز آگے دوسری پارٹی بھی اسی نوعیت کے کام میں مصروف تھی تاکہ اگر دھماکا خیز سلسلے کا پہلا
مرحلہ کسی نادیدہ اور غیر متوقع خرابی کی بنا پر کام نہ کر سکے تو اگلا مرحلہ اپنا کام دکھا دے۔

بیس منٹ کے اندر ہم اپنا یہ کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے چکے تھے۔ اسی
وقت اگلی پارٹی کا سربراہ سانیال ہماری طرف آیا۔ ''کہو، سب ٹھیک ہے؟''

''میرا خیال ہے سب ٹھیک ہے۔''

پھر وہ ہماری کارروائی کا معائنہ کرنے لگا۔ ان دونوں گروپوں میں سانیال ہی واحد
شخص تھا جو اس نوعیت کا اسلحہ استعمال کرنے سے بخوبی واقف تھا۔ اس نے ہمارے نصب
کیے ہوئے بارودی مادے کا معائنہ کرنے کے بعد ہمارے کام کو سراہا۔

''مجھے حیرت ہے کہ تم نے تمام کام اتنی خوبصورتی اور مہارت سے کیا ہے۔'' سانیال
نے کہا۔

''جب ایک مقصد سامنے ہو اور انسان کو کچھ سیکھنے کا شوق ہو تو پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔''
میں نے جواب دیا تھا۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد ہم نے اگلے مرحلے کی تیاری شروع کر
دوسری سمت کی جھاڑیوں سے چھ بندوقیں اور پستول لے کر ہم لائن کی دوسری سمت
سانیال نے گھڑی دیکھی۔ ''پانچ منٹ بعد پہلی پارٹی کو آ جانا چاہیے۔''
ایسا ہی ہوا۔ اس پارٹی میں تین افراد تھے۔ انہیں ہم نے لائن کی دوسری طرف بھیج
دیا جہاں اسلحہ چھپایا گیا تھا۔ اس کے پندرہ منٹ بعد تین اور افراد کی پارٹی موقع پر پہنچ
ان کے پانچ منٹ بعد ڈی کے بوس وہاں پہنچ گیا۔

''ہو گیا کام؟'' اس نے سانیال سے دریافت کیا۔

''ہاں!'' سانیال نے جواب دیا۔

''شیرازی اینڈ کمپنی کا کام کیسا رہا؟'' بوس نے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک، بہت عمدہ!'' سانیال نے جواب دیا۔

''واقعی!'' بوس نے کہا۔ ''ذرا میں بھی تو دیکھوں۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا۔ سانیال اس سے دو قدم آگے تھا۔ بوس نے ان تمام بارودی سرنگوں کو جو میں نے اور میرے ساتھیوں نے ریل کی پٹری کے ساتھ لگائی تھیں، ٹارچ کی روشنی ڈال کر دیکھا اور مطمئن ہو گیا۔

''ٹھیک ہے، شاباش!'' اس نے اپنی مسرت کا اظہار کیا۔

پھر ہم سب گھات میں بیٹھ گئے۔ اب فیصلہ کن مرحلے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔

پندرہ منٹ بعد مشرق سے اس ایکسپریس ٹرین کی تیز روشنی نظر آنے لگی جو ذرا ہی دیر بعد تباہی سے دوچار ہونے والی تھی۔ اسی ٹرین کی تباہی کے لیے ہم نے اتنے پاپڑ بیلے تھے۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مہندر نے جو میرے برابر ہی بیٹھا تھا میرا ہاتھ دبایا۔ یقیناً وہ بھی اسی کیفیت سے دوچار تھا جو میری تھی۔

پھر اس ٹرین اور تباہی کے درمیان فاصلے مٹ گئے۔ پے در پے کئی دھماکے ہوئے۔ انجن اور اس کے ساتھ ہی کئی ڈبے پٹری سے اتر گئے۔ لوہے اور فولاد سے بنے ہوئے ڈبوں کے آپس میں ٹکرانے سے ایسا شور ہوا جیسے قیامت آ گئی ہو۔ اس شور کے درمیان ٹرین میں سوار مسافروں کی چیخ و پکار، یہ سب کچھ چند سیکنڈ میں ہو گیا۔ اب وہاں موت کا سناٹا تھا۔ گاڑی کے صرف تین ڈبے ایسے تھے جو الٹنے سے بچ گئے تھے۔ جو ڈبے الٹ گئے تھے، ان میں مسافر پھنسے ہوئے تھے۔ زندہ اور زخمی تمام مسافر بے ہولناک صدمے سے بے ہوش ہو چکے تھے۔

میں خوش تھا۔ اس تباہی پر نہیں بلکہ صرف اس بات پر کہ ٹرین بارودی سرنگوں کے ہی مرحلے پر تباہ ہو گئی تھی۔ اس مرحلے پر ہم تین ساتھیوں نے کام کیا تھا۔

''مبارک ہو کامریڈ! تمہاری کوشش کامیاب رہی۔'' جمشید نے کہا۔

مہندر اس پر الٹ پڑا۔ ''مبارک باد مت دو جمشید! نہ معلوم اس ٹرین میں کتنے بے مرے ہوں گے۔ کتنے افراد ہمیشہ کے لیے معذور ہو گئے ہوں گے۔''

میں اپنی جگہ جیسے دہشت زدہ ہو کر رہ گیا۔ ہم نے جو کامیابی حاصل کی تھی، مسرت کا وہ اس ٹرین کی تباہی سے ہمیں میسر آیا تھا، اس کے لیے کتنے لوگوں نے جانیں دی تھیں۔ ہمارا کام ختم ہو چکا تھا۔ اس کے بعد تمام مرحلے صرف دوسرے لوگوں کے تھے۔ ہم یوں وہیں بیٹھے رہے۔

چند منٹ سکوت کے بعد ٹرین کے ڈبوں سے چیخ و پکار بلند ہوئی۔ اس مہم میں شامل اپنی جگہ حرکت میں آ گئے۔ ٹرین کے پچھلے ڈبوں پر تڑاتڑ گولیاں چلیں اور اس کے بعد ایک زوردار آواز ابھری۔ ''کوئی باہر نہ آئے ورنہ گولی مار دی جائے گی۔''

سیاہ انجن کسی لب دم عفریت کی مانند آخری اور گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ بھاپ، آگ اور پانی مل کر سنسنا رہے تھے۔ جنہیں اس مہم کے لیے ہمارے ساتھ کانپور میں تربیت دی گئی تھی، ان لوگوں کی توجہ کا مرکز وہ ڈبا تھا جو انجن کے ساتھ لگا ہوا تھا یا پھر وہ ڈبا جو اس کے پیچھے تھا اور جس میں خزانے کی حفاظت کے لیے گارڈ موجود تھے۔ یہ دونوں ڈبے بری طرح ٹوٹ پھوٹ گئے تھے۔

ہم تینوں اٹھ گئے۔ ہم ان کی کارروائیاں دیکھتے رہے۔ وہ سب شکستہ ڈبے کے ملبے سے نوٹوں کے تھیلے نکال رہے تھے۔ یہی وہ خزانہ تھا جس کی وجہ سے اس ٹرین کو یہ انجام دیکھنا پڑا تھا۔ یہ تمام کارروائی دس منٹ کے قلیل عرصے میں مکمل ہو گئی تھی۔ اس کام کے لیے صرف دس منٹ ہی مقرر کیے گئے تھے۔

فضا میں ایک تیز سیٹی گونجی۔ یہ سیٹی، ڈی کے بوس نے بجائی تھی اور یہ موقع واردات سے واپسی کا اشارہ تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہم سب انہی جھاڑیوں میں تھے جہاں اس مہم کے لیے ہونے والا اسلحہ چھپایا گیا تھا۔ ہم سب نے اپنی رائفلیں جو پہلے ہمیں دی گئی تھیں، وہیں دیں۔ رائفلوں کو جلدی جلدی ایک چادر میں لپیٹ کر گٹھری کی صورت میں باندھ دیا اب موقع واردات سے ہماری واپسی کا مرحلہ تھا۔

جھاڑیوں اور ناہموار میدان سے گزرتے ہوئے، ہم سڑک پر آ گئے جہاں ایک

درخت کے نیچے بیل گاڑی موجود تھی جس پر بھوسا لدا ہوا تھا۔ اوپر سے چند بوریاں بھی
نوٹوں کے تھیلوں اور بندوقوں کی گٹھری کو رکھ دیا گیا اور وہ بوریاں پھر ان پر رکھ دی گئیں۔

اس بیل گاڑی کی منزل شاہ جہاں پور تھی۔

یہاں سے ہماری منزلیں جدا جدا تھیں۔

مہندر اور جمشید کو سیدھے کانپور جانا تھا۔ ان کے ساتھ ڈی کے بوس بھی کانپور جا
تھا جہاں سے اسے کلکتے کا رخ کرنا تھا۔ میرے لیے ہدایت تھی کہ میں پھر لکھنؤ جاؤں اور
تنظیم کی طرف سے نئے احکامات کا انتظار کروں۔ باقی چھاپا ماروں کی منزل شاہ جہاں پور
تھی۔ یہ ان پر موقوف تھا کہ وہ شاہ جہاں پور جانے کے لیے کیا طریقے اختیار کرتے ہیں۔

اس طرح ہماری وہ مہم اپنے انجام کو پہنچی جو ہندوستان کی تاریخ میں کاکوری ڈکیتی
کیس کہلایا۔

اس کے بعد اس خزانے کا کیا ہونا تھا جو ٹرین سے لوٹا گیا تھا، ہمیں اس سے کوئی
غرض نہ تھی۔

ڈی کے بوس، یوپی سے تعلق رکھنے والے مجاہدین آزادی کو چھاپا مار جنگ کی تربیت
دینے آیا تھا۔ اسی دوران میں اس خزانے کی روانگی سے متعلق پروگرام کا پتا چلا لیا گیا تھا اور
ڈی کے بوس نے اس ٹرین پر چھاپا مارنے اور ان رضا کاروں کو عملی تربیت دینے کا
پروگرام بنالیا تھا۔ دوسری طرف اس نے سالارِ اعظم کو بھی مطلع کر دیا تھا۔ وہ اپنی تنظیم کے
کسی رضا کار یا رضا کاروں کو عملی تربیت دینا چاہتے ہیں تو انہیں کانپور بھیج دیں۔

ہم چاروں، صبح اذانِ فجر کے وقت لکھنؤ پہنچے تھے۔ مہندر، بوس اور جمشید نے اونٹ
گاڑیوں کے ذریعے کانپور جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے انہیں الوداع کہہ کر سیدھا گھر کا
رخ کیا۔

☆======☆======☆

گھر ایک پریشان کن اطلاع میری منتظر تھی۔

امی کا رو رو کر بُرا حال تھا۔ ننھی زیب سو رہی تھی لیکن اس کے چہرے پر آنسوؤں کی
لکیریں نظر آ رہی تھیں۔ بابا اپنی جگہ اداس اور مغموم تھے۔ میری دنیا جیسے تاریک ہو کر رہ گئی
تھی۔

رات اس وقت جب میں رضا کاروں کے ساتھ ٹرین پر چھاپا مارنے کی کارروائیوں
میں مصروف تھا، پولیس نے ہمارے گھر پر چھاپا مارا تھا اور لالی کو گرفتار کر کے لے گئی تھی۔

نہیں مجھے بابا نے بتائی تھیں۔ امی تو جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھیں۔ ان کی صرف آنکھیں
ہی تھیں، ساون بھادوں برسا رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر ان کی ہچکیاں ہی تو بندھ گئی تھیں۔
میں نے امی کا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ ”مگر بابا! یہ سب کچھ ہوا کیسے؟ اسے کیوں
ر کیا گیا ہے؟“

”کیا بتائیں چھوٹے صاحب!“ بابا نے کہا۔ ”ہمیں کچھ پتا نہیں۔ بس پولیس آئی
اور لالی بٹیا کو گرفتار کر کے لے گئی۔ وہ جی، وہ خان بہادر ہیں نا خفیہ والے، وہ بھی
تھے۔ لالی بٹیا نے گرفتاری کا وارنٹ دیکھا تھا۔“

تو یہ کم بخت تصدق حسین ہاتھ دھو کر ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے۔ میں نے سوچا تھا۔ میرا
اس وقت جیسے چکرا کر رہ گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ وہ کون
جس نے لالی کے بارے میں مخبری کی تھی؟ میں اس وقت بے حد مجبور تھا۔ کچھ کر بھی تو
سکتا تھا۔ آزادی سے کہیں آ جا بھی نہیں سکتا تھا کہ دن نکل آیا تھا۔ ادھر یہ خطرہ بھی تھا
جاننے والے دوست احباب اور عزیز و اقارب کو اس واقعے کا علم ہوگا، وہ اظہارِ
ی کے لیے اور اپنا تجسس مٹانے کے لیے ہمارے گھر آنا شروع کر دیں گے۔

گویا اب میرا گھر بھی میرے لیے خطرناک ہو گیا تھا۔ اس مرحلے پر میں کسی بھی
والے کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا لیکن اب تو کسی نہ کسی کو اعتماد میں لینا ہی تھا۔ سو
نے ایک مرتبہ پھر منصور کے ہاں پناہ لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ منصور میرا وہی دوست جس
ھر سے فرار ہو کر میں نے لالی اور مہندر کے ساتھ بمبئی کا سفر کیا تھا۔ میں نے بابا کو منصور
ھر بھیجا تاکہ وہ میرے لیے اپنے گھر میں انتظام کر سکے۔

امی کو بڑے دم دلاسے دے کر میں گھر سے نکلا۔ میری ہیئت اب بھی تبدیل تھی۔
لمبے بال، شلوار کرتہ اور کاندھے پر چادر! اپنی شخصیت کو مزید چھپانے کے لیے
نے چال میں لنگڑاہٹ بھی پیدا کر لی تھی۔

منصور مجھے دیکھ کر لپٹ ہی تو گیا۔

”میں ابھی تمہارے گھر ہی آنے والا تھا۔ رات تمہارے گھر سے جو لڑکی، کیا نام ہے
؟“

”لالی۔“ میں نے کہا۔

”ہاں، لالی! وہ گرفتار ہوئی تھی تو میں فوراً خلیق الزماں کے پاس گیا تھا۔ تمہیں معلوم
نے پھر وکالت شروع کر دی ہے۔ میں نے خلیق کو تمہارے گھر سے لالی کی گرفتاری

کی خبر سنائی اور اس سے کہا کہ وہ معلوم کر کے یہ بتائے، لالی کو کس الزام میں اور کن احکامات کے تحت گرفتار کیا گیا ہے۔ پھر میں نے اس سے یہ بھی کہا کہ اس سلسلے میں جو کچھ ہو سکتا ہے، وہ کرے کیوں کہ تمہارے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے نواب خلیق الزماں یہاں آیا تھا۔ بے چارہ تمام رات اس سلسلے میں پریشان رہا۔'' منصور خاموش ہو گیا۔

''کیا بتایا اس نے؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''خلیق الزماں کی اطلاعات بہت مایوس کن ہیں۔ لالی کو غداروں اور دہشت پسندوں سے متعلق خصوصی قوانین کے تحت گرفتار کیا گیا ہے۔ اس کے تحت گرفتار ہونے والوں کی ضمانت بھی نہیں ہو سکتی۔ بہر حال وہ آج عدالت کھلتے ہی اغوا اور حبس بے جا کی درخواست دائر کرے گا اور کوشش کرے گا کہ عدالت سے یہ احکام حاصل کر لے کہ حکومت یہ بتائے، لالی کو کہاں رکھا گیا ہے اور اس سے ملاقات کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔''

''سنو منصور!'' میں نے کہا۔ ''تم خلیق کے پاس جاؤ۔ اس سے کہو کہ وہ کسی طرح بھی معلوم کرے کہ لالی کے بارے میں کس نے مخبری کی ہے۔ ہاں، سنو! میں یہ نہیں چاہتا کہ تمہارے سوا کسی اور کو یہ معلوم ہو کہ میں لکھنؤ میں ہوں۔ خلیق سے کہنا کہ یہ پتا چلانا ضروری ہے کہ مخبری کس نے کی ہے۔ میرا نام ہرگز، بیچ میں نہ آنے پائے۔ ہاں، تم سیٹھ وشوا ناتھ کو بھی تار دے دو لالی کی گرفتاری کا۔'' یہ کہہ کر میں نے اسے سیٹھ وشوا ناتھ کا پتا دیا۔

''تمہارے والد صاحب کو میں رات ہی تار دے چکا ہوں۔'' منصور نے بتایا۔ ''تمہاری والدہ سے پتا لے لیا تھا۔''

''وہ ان دنوں کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے انہیں شملے کے پتے پر تار دیا ہے۔'' منصور نے بتایا۔

منصور چلا گیا اور میں اس کمرے میں پڑا ہوا جو منصور نے میرے لیے مخصوص کیا تھا، حالات کی اس نئی کروٹ پر غور کرتا رہا۔ وہ کمرہ مکان کا حصہ ہو کر بھی الگ تھلگ تھا اور مہمان خانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہ تمام لمحے جو میں نے لالی کے ساتھ گزارے تھے ایک ایک کر کے میرے تصور میں ابھرتے، وہ تمام باتیں، حسین اور دل فریب باتیں جو اس نے مجھ سے کی تھیں، میرے کانوں میں گونجتی رہیں۔ اس کے ہونٹوں کے پھول میرے ہونٹوں پر مچلتے رہے۔ وہ زندگی میں جتنی حسین تھی، اپنے وجود میں جتنی چاہنے والی تھی،

خیال بھی، اتنا ہی دل ربا تھا مگر جو بات مختلف تھی وہ یہ کہ اس کا سراپا ایک سکون سا بخشتا تھا، ایک لذت سی بخشتا تھا اور اس کا خیال بے چین سا کر دیتا تھا، ذہن میں چنگاریاں اور بگولے اڑا دیتا تھا۔

میں مضطرب اور بے چین تھا مگر میرا اضطراب بے سود تھا۔ مجھے شام تک اسی کمرے میں محصور رہنا تھا۔ میں جو کچھ کر سکتا تھا، رات کی تاریکیوں میں کر سکتا تھا۔ لکھنؤ میں دن کے وقت میرا گھر سے نکلنا محض حماقت ہی تھی۔

منصور صبح کا گیا سہ پہر کو آیا۔ وہ کوئی بھی تو اچھی خبر نہیں لایا تھا۔ ہر اطلاع تشویش ناک تھی۔

اس نے بتایا تھا کہ عدالت نے خلیق الزماں کی جانب سے دی جانے والی درخواست کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کیوں کہ لالی کی گرفتاری کے احکام مرکزی حکومت نے خصوصی قوانین کے تحت جاری کیے تھے اور لکھنؤ کی انتظامیہ اور عدلیہ کو اس سے مطلع کر دیا تھا۔

''مگر مخبری کس نے کی تھی؟'' میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

''یہی معلوم کرنے میں تو دیر ہوئی۔'' منصور نے جواب دیا۔

''عدالت سے فارغ ہو کر خلیق الزماں پہلے نواب چھتاری کے پاس گئے، پھر راجا صاحب محمود آباد کے پاس! راجا صاحب محمود آباد نے بتایا کہ انہوں نے گورنر بٹلر کے ہاں لالی کی فائل پڑھی تھی۔ خود بٹلر نے انہیں یہ کہتے ہوئے فائل دی تھی کہ اب ہندوستان کو شاید آزادی سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ہندوستان میں جتنی حریت پسند خواتین ہیں، ان میں لالی سب سے کم عمر اور سب سے نڈر اور خطرناک ہے۔''

''وہ ایک محب وطن لڑکی ہے اور محبت انسان کو نڈر بنا دیتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم یہ بتاؤ مخبری کس نے کی تھی؟''

''بتاتا ہوں یار!'' منصور نے کہا۔ ''میں تمہیں ساری باتیں تفصیل سے بتانا چاہتا ہوں۔ لالی کی نشان دہی براہِ راست نہیں ہوئی بلکہ تمہاری تصویر اس کی گرفتاری کا سبب بنی ہے۔ وہ تمہارے حوالے سے پہچانی گئی ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔ یہ اطلاع میرے لیے چونکا دینے والی تھی۔

''ہاں۔'' منصور نے کہا۔ ''امروہے میں سیٹھ بدری ناتھ ہیں۔ وہ لالی کے چچا

ہیں۔ ان کی لڑکیاں شکنتلا اور کامنی نے تمہاری تصویر شناخت کی تھی اور پکڑی گئی بے چاری لالی۔''

''مگر...... مگر، انہیں تصویر کہاں سے ملی؟''

''وہ اپنے تایا سیٹھ وشوا ناتھ کے گھر گئی تھیں۔ وہاں ایک البم ان کے ہاتھ لگ گیا۔ اس البم میں تمہاری تصویر تھی۔''

''ہاں وہ میری تصویر ہی تھی۔''

''بس پھر انہوں نے پولیس کو اطلاع دے دی، انہوں نے کیا بدری ناتھ نے! انہوں نے تو وہ تصویر اپنے پتا کو دے دی تھی۔ پھر کیا تھا، سلسلے ملتے چلے گئے۔ پولیس پہنچی، سیٹھ وشوا ناتھ کو گرفتار کر لیا گیا۔''

''کیا کیا، سیٹھ وشوا ناتھ کو گرفتار کر لیا؟ مگر کیوں؟ کب؟''

''سیٹھ وشوا ناتھ کے ایک ملازم نے پولیس سے تعاون کیا تھا۔ اس نے نہ صرف تمہاری تصویر کو شناخت کر لیا بلکہ اور بھی بہت کچھ بتا دیا۔ اس نے کسی سیاہ پوش کا بھی ذکر کیا ہے جسے تم لوگ، سالار کہتے ہو۔ اس نے یہ سب باتیں چھپ کر سنی تھیں۔ اس نے پولیس کو یہ بتایا کہ تم، لالی اور مہندر سب سیاہ پوش کے ساتھی ہو۔''

میں سر پکڑ کر بیٹھ رہا۔ یہ اچانک کیا ہو گیا؟ کیا ہو رہا ہے؟

''ہاں ایک بات تو بتانا بھول ہی گیا۔ امروہے میں تمہاری تصویر کی شناخت کے بعد ہی یہ معاملہ مرکزی محکمۂ خفیہ کو سونپ دیا گیا تھا اور اس کیس کی تفتیش خان بہادر تصدق حسین کے سپرد کر دی گئی تھی۔ اس نے تمہاری تنظیم کے جال کا پتا چلایا ہے۔ امروہے سے ترونگری اور بمبئی سے شملے تک اس نے ہر جگہ جہاں بھی تم لوگوں کا سراغ ملا تعاقب کیا۔ ہر جگہ تمہارا، لالی کا اور مہندر کا سراغ ضرور ملا۔ یہ تمام کارروائی نہایت راز داری سے کی گئی مگر یہاں آ کر یہ معاملہ کھل ہی گیا ورنہ تصدق حسین کی کوشش تو یہی تھی کہ تمہاری اور مہندر کی گرفتاری تک بلکہ تمہارے سرغنہ سیاہ پوش کی گرفتاری تک اسے راز ہی رکھا جائے۔ اس راز داری کی خاطر اس نے اتنی برق رفتاری سے کام کیا تھا۔'' وہ کہتا رہا، میں سنتا رہا۔ میرا ذہن اس وقت کچھ نہ سوچ سکتا تھا۔ ''اور ہاں سنو! کاکوری کے قریب آج ایک......''

''مجھے یہ بتاؤ کہ لالی کہاں ہے؟'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ مجھے ڈکیتی کی واردات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''لالی کے بارے میں تصدق حسین کو علم ہے۔ کسی کو پتا نہیں کہ رات اسے گرفتار کر

کہاں لے جایا گیا ہے۔'' منصور نے بتایا۔

''اور تصدق حسین کہاں ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''کاکوری میں......'' اس نے پھر کچھ کہنا چاہا تھا۔

''مجھے مت بتاؤ کاکوری میں ٹرین الٹ دی گئی۔ خزانہ لوٹ لیا گیا۔'' میں نے جھلا کر کہا۔ ''مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تصدق حسین کہاں ہے؟''

''وہی تو بتا رہا ہوں یار!'' منصور نے کہا۔ ''وہ کاکوری کی اسی واردات کی تحقیقات میں مصروف ہو گیا ہے۔'' منصور نے کہا۔ ''ویسے ایک بات تمہیں بتاؤں، راجا صاحب محمود آباد کا خیال ہے کہ تصدق حسین، لالی کو شملے لے جائے گا۔ وہیں اس سے پوچھ گچھ ہو گی۔ شملے میں انگریز افسر کا اغوا کوئی معمولی بات نہیں۔'' وہ واقعی تفصیلی معلومات کر کے لوٹا تھا۔

میں گہرا سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ قدرت نے مجھے ایسے حالات سے دوچار کیا تھا کہ میں کچھ بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔ میرے پاس کچھ بھی تو نہیں تھا، سوائے ایک پستول اور گولیوں کے چند راؤنڈ کے! پھر میرا یہاں کوئی بھی ساتھی نہیں تھا۔

''اب کیا سوچا ہے تم نے؟'' منصور نے مجھ سے سوال کیا۔

''ابھی تک میں کچھ بھی نہیں سوچ سکا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بس اتنا جانتا ہوں کہ میں لالی کے لیے تصدق کا جہنم تک پیچھا کروں گا۔'' میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا تھا۔

''تم جو کہو، میں تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں آفاق!'' منصور نے کہا۔ ''آج راجا صاحب محمود آباد تمہاری اور تمہارے ساتھیوں کی سرگرمیوں کے بارے میں بتا رہے تھے اور میں دل ہی دل میں خود کو شرمندہ سا محسوس کر رہا تھا۔ تم لوگوں کی یہ جدوجہد، یہ کوششیں صرف اس لیے ہیں کہ ہم آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں۔ تم نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ وہ راہ منتخب کی ہے جو آزمائشوں کی راہ ہے، مصائب اور آلام کی راہ ہے، جو صرف جیل اور پھانسی کے پھندے پر جا کر ختم ہوتی ہے۔ اس کے باوجود تم اس راہ پر گامزن ہو، یہ تمہاری جرأت اور استقامت کا ثبوت ہے۔ ایسے مایوس کن انجام کو سامنے دیکھنے کے باوجود تم اپنی راہ پر بڑھتے جا رہے ہو۔'' منصور خاموش ہو گیا۔ چند لمحے بعد پھر کہا۔ ''مجھے بتاؤ آفاق! میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟''

''تم میرے ساتھ صرف اتنا تعاون کرو کہ کسی طرح، کسی نہ کسی طرح یہ پتا لگاؤ کہ وہ کہاں رکھا گیا ہے؟''

"میں کوشش کروں گا۔" منصور نے مجھے یقین دلایا۔ "پولیس میں میرے دو ایک اچھے جاننے والے ہیں۔" وہ مجھے اس طرح بتا رہا تھا جیسے لکھنؤ اور وہ خود میرے لیے اجنبی ہوں۔

ہاں اس دن، بلکہ ان دنوں میں، لکھنؤ کے لیے اجنبی ہو گیا تھا۔ وہ شہر جہاں میں نے جنم لیا، جہاں میں پلا بڑھا، میرے لیے دیارِ غیر بن گیا تھا۔ اب وہاں میرا اپنا گھر بھی نہیں تھا۔ گھر جہاں لوگوں کو سکون ملتا ہے، پناہ ملتی ہے۔ میں اس شہر میں ایک قانون شکن کی حیثیت سے چھپتا پھر رہا تھا۔ میں اپنی بیمار ماں کی تیمار داری بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں ان کے لیے بھی بھاگ دوڑ نہیں کر سکتا تھا۔ غیر ملکیوں کے قانون نے اجنبیوں کے آئین نے مجھے اپنے وطن سے محبت کی یہ سزا دی تھی۔

سورج ڈھلے منصور واپس آیا۔ اس کے پاس صرف اتنی اطلاع تھی کہ لالی کو ابھی باہر نہیں لے جایا گیا ہے۔ وہ اسی شہر میں تھی کیوں کہ تصدق حسین اس شہر میں تھا اور اس نے کاکوری ڈکیتی کیس کا معاملہ حل کرنے تک اس شہر میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ دوسری اطلاع وہ یہ لایا تھا کہ میرے والد، خان بہادر شیرازی اگلے دن لکھنؤ پہنچنے والے تھے۔ انہوں نے تار کے ذریعے اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ منصور کے پاس ایک پیغام بھی تھا، میری امی کا پیغام! وہ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔ کیسے دن تھے وہ بھی! میں اپنی امی سے صرف پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر تھا لیکن ان سے بہت دور تھا۔ میرے اور ان کے درمیان اجنبیوں کے قوانین کی دیوار حائل تھی۔

عشاء کی نماز کے بعد میں چوروں کی طرح منصور کے گھر سے نکلا اور اپنے گھر پہنچا۔ اس سے قبل منصور نے اس بات کا اطمینان کر لیا تھا کہ آس پاس کوئی شخص میرے گھر کی نگرانی پر تو متعین نہیں ہے۔

امی کی آنکھیں رو رو کر خشک ہو چکی تھیں۔ اب ان آنکھوں میں صرف اداسی، وحشت اور انتظار تھا۔ لالی نے اتنے مختصر عرصے میں واقعی ان کے دل میں اپنا گھر کر لیا تھا، انہیں اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔

"آفاق!" انہوں نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔ "لالی سے مجھے بس ایک مرتبہ ملوا دے۔ میں اسے ایک مرتبہ، صرف ایک مرتبہ اور دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"حوصلہ رکھیں امی۔" میں نے کہا۔ "لالی آپ سے ضرور ملے گی۔"

"یہ سب کچھ تیرا کیا دھرا ہے۔" امی نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں تجھے

...گی اپنی لالی کو، وہ تیری وجہ سے پکڑی گئی ہے۔"

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" میں نے پوچھا۔ "یہ آپ کو کس نے بتایا؟"

تب مجھے کچھ امی نے اور کچھ بابا نے بتایا کچھ دیر قبل رام پرشاد بسمل آیا تھا۔ اسی نے ...ی کو لالی کے بارے میں بتایا ہے۔ رام پرشاد بسمل کا نام سنتے ہی جیسے میرے ذہن سے ...یوں کی تاریکی چھٹ گئی۔ وہ کاکوری ڈکیتی کیس میں ہمارے ساتھ تھا۔ وہ یقیناً اس معاملے میں میری مدد کر سکتا تھا۔ وہ لکھنؤ میں تھا، یہ بات میرے لیے اور بھی خوش کن تھی۔ ...اس سلسلے میں اس سے مدد لے سکتا تھا۔

ہماری باتیں سن کر ننھی زیب کی آنکھ بھی کھل گئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ میرے سینے سے چمٹ گئی۔ "بھیا! بھیا!" وہ سسک پڑی۔ "لالی باجی! پولیس انہیں پکڑ کر لے گئی ہے۔ کیوں لے گئی؟ آپ لالی باجی کو چھڑا لائیے نا!"

"ہاں بیٹا، چھڑا لائیں گے۔" میں نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

"سچ بھیا!" اس نے میرے چہرے کو اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں لے کر پوچھا۔ وہ بڑی آنکھوں میں اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے میرے الفاظ کی صداقت میری آنکھوں میں تلاش کرنا چاہتی ہو۔

"ہاں زیب!" میں نے کہا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں۔"

اسے گویا میری صداقت پر یقین آ گیا۔ "جانتے ہیں بھیا! امی، لالی باجی کو اپنی بہو کہتی ہیں۔ وہ انہیں آپ کی دلہن بنائیں گی۔ پھر وہ میری بھابی ہو جائیں گی نا!"

"ہاں!" میں نے کہا۔ میرا دل رونے لگا۔

پھر میں اپنی امی، اپنی بہن اور بابا سے رخصت لے کر باہر بیٹھک میں آ گیا جہاں منصور میرا منتظر تھا۔ اگرچہ امی منصور سے پردہ نہیں کرتی تھیں لیکن اس وقت خود منصور نے اندر آنا مناسب نہیں سمجھا تھا ورنہ میں نے اسے اندر بلایا تھا۔

پھر ہم دونوں آگے پیچھے، تھوڑے تھوڑے فاصلے سے رام پرشاد بسمل کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے منصور کو احتیاطاً ساتھ لیا تھا۔ بسمل کے گھر پہنچ کر پہلے ہم نے آس پاس کا جائزہ لیا، پھر میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔

"کون ہے؟" فوراً ہی پوچھا گیا۔ آواز بسمل کی تھی۔ میں نے منصور کو واپس چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اب اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ یہ بات ہم میں پہلے ہی طے ہوئی تھی اور منصور نے وعدہ کیا تھا کہ وہ واپس گھر جا کر میرا انتظار کرے گا اور میرے انتظار میں

اپنا دروازہ کھلا رکھے گا۔

''بسمل!'' میں نے جواب دیا۔ ''میں ہوں آفاق شیرازی۔''

دروازہ بلا تاخیر کھل گیا۔ ''آؤ اندر آؤ۔'' بسمل نے مجھے اندر بلا لیا، پھر دروازہ بند کر دیا۔ ''میرا خیال تھا تم لکھنؤ میں نہیں ہو۔ میں آج شام تمہارے گھر گیا تھا۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اسی لیے تو میں یہاں آیا ہوں۔''

پھر میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ بعض کاغذات تلف کرنے اور بعض کاغذات لینے کے لیے لکھنؤ آیا تھا اور اب اس وقت وہ لکھنؤ چھوڑنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ تصدق حسین کی لکھنؤ میں موجودگی ہی بہت خطرناک تھی۔ یہ وہ شخص تھا کہ جس معاملے کو ہاتھ میں لیتا، اس کی تہہ تک پہنچ کر دم لیتا۔ کھوج لگانے میں، اس وقت پورے ہندوستان میں اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ اپنی انہی خصوصیات کی بنا پر وہ انگریز حکومت کی ناک کا بال بنا ہوا تھا۔ تصدق وہ شخص تھا جس کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ دن کے چوبیس گھنٹوں اور سال کے تین سو پینسٹھ دنوں میں جب اور جس وقت چاہے، وائسرائے سے مل سکتا تھا۔ چھوٹے موٹے انگریز افسروں کو تو وہ خاطر میں بھی نہ لاتا تھا۔ اس کے اختیارات بھی خاصے تھے۔ وہ اس وقت انگریز حکومت کے استحکام میں ایک زبردست فعال قوت کی مانند متحرک تھا۔ رام پرشاد بسمل کا خیال تھا کہ وہ کاکوری ڈکیتی کیس کا بھی جلد سراغ لگا لے گا اور وہ اس سے پہلے ہی لکھنؤ سے چلا جانا چاہتا تھا، تصدق حسین کی پہنچ سے بہت دور!

''کیا اشفاق اللہ لکھنؤ میں ہے؟'' یہ سوال میں نے اس لیے کیا تھا کہ گزشتہ رات کارروائی کے بعد پروگرام کے مطابق میرے، مہندر، جمشید اور بوس کے سوا باقی کو شاہ جہاں پور چلا جانا تھا مگر بسمل یہیں لکھنؤ میں موجود تھا، سو میں نے سوچا کہ شاید اشفاق اللہ بھی لکھنؤ ہی میں ہو۔

''نہیں۔'' بسمل نے جواب دیا۔ ''وہ رات ہی شاہ جہاں پور چلا گیا تھا اور شاید آج وہاں سے پنجاب کی طرف نکل گیا ہو۔ اسے بھگت سنگھ کے پاس جانا تھا۔ یہ بتاؤ کیسے آنا ہوا؟ ہاں وہ لڑکی لالی کون ہے؟''

''میں اسی کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔ وہ ہماری تنظیم کی رکن ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ایک محب وطن انقلابی ہے۔ میں تمہاری مدد چاہتا ہوں۔''

''بولو، کیا معاملہ ہے؟'' بسمل نے کہا۔

''میں پہلے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ لالی کو کہاں رکھا گیا ہے، پھر اسے ان کے قبضے

سے نکالنا چاہتا ہوں۔''

بسمل سوچ میں پڑ گیا۔ ظاہر ہے اسے سوچ میں پڑنا ہی چاہیے تھا۔ وہ تو اسی رات لکھنؤ چھوڑنے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ وہ ایک انقلابی تھا، ایک چھاپا مار تھا، اور چھاپا ماروں کا اصول ہوتا ہے کہ ایک زندہ صحیح سالم اور آزاد چھاپا مار، دس مقید چھاپا ماروں اور ایک ہزار معذور رضا کاروں سے بہتر ہوتا ہے۔ ان کی تربیت ہی یہ ہوتی ہے کہ جس وقت دشمن مقابلے پر ہوں تو اسے زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچائیں اور جب دشمن پر حملہ نہ کر رہے ہوں تو اپنی جان کی حفاظت کریں۔ جب دشمن پر ٹوٹیں تو دشمن کو مار دیں یا خود مر جائیں اور لوٹیں تو خود کو بلاوجہ ہلاکت میں نہ ڈالیں۔ کوئی ساتھی گرفتار ہو جائے تو اس سے یہ توقع رکھیں کہ وہ جان پر کھیل جائے گا لیکن اپنے مقصد سے غداری نہیں کرے گا۔

''کیا سوچنے لگے؟'' میں نے بسمل سے کہا۔ ''دوٹوک جواب دو۔ اگر تم نے مدد سے انکار کر دیا تو مجھے کوئی افسوس نہ ہوگا۔''

''میں...... میں میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں کیا کروں! میری تربیت اور میرے اصول مجھ سے تقاضا کر رہے ہیں کہ میں اپنی حفاظت کروں اور لکھنؤ چھوڑ دوں لیکن لالی کے بارے میں مجھے جو کچھ معلوم ہوا ہے اس کے پیش نظر سوچتا ہوں کہ اس لڑکی کو ان درندوں سے نجات دلانے میں تمہاری مدد کروں۔''

''میں نے تمہارے سامنے ایک تجویز رکھی ہے۔ اسے منظور کرنے یا نہ کرنے کا تمہیں پورا اختیار ہے۔ میں تم پر کوئی دباؤ نہیں ڈال رہا ہوں۔ فیصلہ تمہیں کرنا ہے اور اپنے ضمیر کے مطابق کرنا ہے۔ ویسے کبھی کبھی ہمیں پتا چلتا ہے کہ ہم نے اپنے لیے جو اصول وضع کیے تھے وہ ناقص ہیں اور ناکافی ہیں۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ اصول انسانوں کی بہتری اور کاز کو آگے بڑھانے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ زندگی اتنی گوناگوں ہے کہ اصول بناتے وقت اس کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔''

''ٹھیک ہے یار!'' رام پرشاد بسمل نے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ ہوں۔ بتاؤ تمہارے ذہن میں کیا خاکہ ہے؟''

''کوئی خاکہ بنانے سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ لالی کو کہاں رکھا گیا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اتنا میں جانتا ہوں کہ لالی یہیں لکھنؤ میں ہے۔ وہ اس وقت تک لکھنؤ میں رہے گی جب تک تصدق حسین یہاں ہے۔ اس نے کاکوری کیس بھی اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے۔''

"یہ سب باتیں تمہیں کس ذریعے سے معلوم ہوئیں؟"

"خلیق الزماں کے ذریعے سے! انہوں نے میری درخواست پر اس سلسلے میں خاصی دوڑ دھوپ کی ہے۔ وہ نواب چھتاری اور راجا صاحب محمود آباد سے ملے ہیں۔ راجا صاحب نے ہی یہ سب باتیں بتائی ہیں۔"

"مجھے لالی کے بارے میں ہرکرن ناتھ مصرا سے معلوم ہوا ہے۔" بسمل نے بتایا۔

"ظاہر ہے انہیں خلیق الزماں ہی نے بتایا ہوگا۔"

پھر ہم نے یہ طے کیا کہ اگلے دن ہم اپنے اپنے ذرائع سے یہ معلوم کریں گے کہ لالی کو کہاں رکھا گیا ہے۔ اس کے بعد ہی ہم اس کی رہائی کا کوئی منصوبہ بنا سکتے تھے۔ پھر میں اگلی رات اس سے ملنے کا پروگرام بنا کر منصور کے گھر واپس آ گیا۔

☆======☆======☆

اس کے بعد یہ تیسری رات تھی۔

اسی دن منصور یہ خبر لایا تھا کہ تصدق حسین نے لالی پر تشدد کی انتہا کر دی ہے۔ اس وقت وہ لالی سے کاکوری ڈکیتی کیس کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ لکھنؤ میں لالی کی موجودگی اور کاکوری ڈکیتی کیس میں کوئی نہ کوئی تعلق ضرور تھا کیوں کہ لالی اس واردات سے چند دن قبل ہی لکھنؤ آئی تھی۔ تصدق حسین اس سے یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس واردات کا سرغنہ کون ہے۔ لکھنؤ اور کاکوری میں اس کے ساتھی کون کون تھے۔ ساتھ ہی وہ سیاہ پوش، یعنی ہماری تنظیم کے سالارِ اعلیٰ کے بارے میں بھی چھان بین کر رہا تھا۔ اس نے لالی سے میرے اور مہندر کے بارے میں بھی پوچھ گچھ کی تھی کہ اس وقت دونوں کہاں ہیں۔ منصور نے بتایا تھا کہ لالی تمام صعوبتیں اور تمام اذیتیں برداشت کر رہی ہے لیکن اس نے کسی کے بارے میں کوئی لفظ نہیں کہا۔ اس کا بس یہی جواب تھا۔ "میں نہیں جانتی۔ مجھے نہیں معلوم۔ یہ جھوٹ ہے۔ یہ غلط ہے۔"

منصور نے بتایا تھا کہ اس کے دوست کا کہنا ہے کہ اس نے لالی جیسی پُرعزم لڑکی نہیں دیکھی۔ اس کے ناخنوں میں سوئیاں پیوست کی گئیں، اس کے پیر کے تلووں پر ڈنڈے برسائے گئے، اس کے ماتھے پر رسی باندھ کر ڈنڈے سے بل دیے گئے مگر اس کے پائے استقامت میں لرزش نہیں آئی۔

یہ تفصیلات سن کر میں کانپ گیا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میری لالی، میری نازک سی کومل لالی سے وہ درندے کتنا سفاکانہ سلوک کر رہے تھے۔ میرا دل ان کے خلاف

نفرت سے بھر گیا۔

اس کے علاوہ منصور نے جو کچھ بتایا تھا، یہ تھا کہ لالی کو بٹلر ہاؤس کے ایک حصے میں رکھا گیا ہے۔ بٹلر یوپی کا گورنر تھا اور راجا صاحب محمود آباد کا دوست۔ بٹلر ہاؤس لکھنؤ میں غلامی کی بدترین یادگاروں میں سے ایک تھا۔ منصور کا کہنا تھا کہ ان دنوں بٹلر ہاؤس کا یہ حصہ مکمل طور پر خان بہادر تصدق حسین کے تصرف میں تھا۔ گورنر بٹلر نے اس مکان میں سجنے والی شراب اور شباب کی محفلوں کو چند روز کے لیے ملتوی کر دیا تھا۔ لالی، بٹلر ہاؤس کے اسی حصے میں تھی جو تصدق حسین کے تصرف میں تھا۔ اس کا حکم تھا کہ لالی کو اذیتیں دی جائیں لیکن اس حد تک کہ وہ مرنے نہ پائے۔ اس کے حکم مطابق لالی کو اس وقت تک زندہ رہنا تھا جب تک کہ وہ تمام باتیں نہ اگل دے جو اس سے پوچھی جا رہی تھیں۔

اور آخری خبر یہ تھی کہ تصدق ان انگریز اہل کاروں پر سخت برہم تھا جو ابھی تک لالی کی زبان نہیں کھلوا سکے تھے اور اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اس رات وہ خود لالی سے نمٹے گا۔

یہ وہی رات تھی۔ میں اور بسمل، بٹلر ہاؤس کے اسی حصے میں چھت پر موجود تھے۔

نیچے قبرستان کا سا سناٹا تھا اور اس سناٹے میں عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ سب انگریز تھے اور تیزی سے اِدھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ ان کے انداز سے گھبراہٹ اور تشویش عیاں تھی۔ اس عمارت کے اس حصے میں بڑا سخت پہرا تھا۔ پہرے پر صرف انگریز فوجی متعین تھے۔ ان میں کوئی بھی ہندوستانی نہ تھا۔ واقعی میری لالی بہت عظیم تھی، بہت نڈر تھی۔

چند منٹ ہم چھت پر لیٹے اپنے سانس درست کرتے رہے۔ یہاں تک ہم کس طرح پہنچے تھے، بس ہم ہی جانتے تھے۔

ہم نے چھت سے جھانک کر نیچے پھیلے ہوئے ماحول کا جائزہ لیا۔ تب ہمیں پتا چلا کہ ان غیر معمولی سرگرمیوں کا سبب کیا تھا۔ ایک طرف سے گورنر بٹلر اور تصدق حسین بڑی تیزی سے اسی حصے کی طرف آ رہے تھے۔ ان کی رفتار سے عجلت کے ساتھ ساتھ گھبراہٹ بھی عیاں تھی، گویا انہیں کوئی بہت ہی بُری خبر ملی ہو۔

ہم اس وقت طویل چھت کے ایک کونے پر تھے۔ صرف چار روشن دان اس حصے کے ایسے تھے جن سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ برآمدے کی چھت سے چپکے ہوئے ہم انہی روشن دانوں کی طرف بڑھ گئے۔

پہلے دو روشن دان جس کمرے میں کھلتے تھے وہ خالی تھا۔ ہم وہاں سے آگے رینگ گئے۔ دوسرے کمرے میں گورنر بٹلر، تصدق حسین اور دو انگریز افسر موجود تھے۔ ایک طرف

دیوار کے ساتھ لوہے کا، اسپرنگ والا پلنگ تھا۔ اس پر کوئی بستر نہ تھا۔ اس پلنگ پر لالی پڑی
تھی۔ اس کا چہرہ دیوار کی طرف تھا۔ اس کی ساڑھی بے ترتیب تھی۔ بدن کے ننگے حصوں
پر اذیت اور تشدد کے نشان تھے۔

''یہ سب کیسے ہوا؟'' خان بہادر تصدق حسین نے ایک انگریز افسر سے سوال کیا
تھا۔ ''اسے زہر کس نے فراہم کیا تھا؟''

''کچھ پتا نہیں سر!'' انگریز افسر نے جواب دیا۔ ''آپ چلے گئے تو آپ ہی کی
ہدایت کے مطابق میں آدھے گھنٹے بعد اس سے پوچھ گچھ کے لیے آیا تھا۔ اس وقت اس کی
حالت بہت خراب تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی بتایا تھا کہ اس نے زہر کھالیا ہے۔''

لالی مر چکی تھی! لالی مر چکی تھی! میرے ذہن میں جیسے گرم گرم ریت کے بگولے
اڑنے لگے۔ میں تنہا رہ گیا تھا۔ میرا سب سے حسین خواب بکھر کر رہ گیا تھا۔

''اس کی لاش کو چھیڑا گیا ہے؟'' تصدق حسین نے پوچھا۔

''جی نہیں۔''

پھر تصدق حسین پلنگ پر جھکا اور اس نے لالی کی لاش کو سیدھا کیا۔ لالی کی گردن
اس طرح مڑ گئی تھی کہ اس کا چہرہ روشن دان سے صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے گالوں پر
خراشوں کے نشان تھے۔ ماتھے پر سیاہی مائل لکیریں ابھری ہوئی تھیں۔ اس کے بازوؤں پر
جگہ جگہ سے خون رس رس کر جم چکا تھا۔ اس کی انگلیاں خون میں لتھڑی ہوئی تھیں۔ اس کے
ہونٹوں کی باچھوں سے لعاب سا بہہ گیا تھا۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔

تصدق حسین نے جھک کر ایک مٹھی کو کھولا۔ اس میں سے سفید رنگ کا زردی مائل
چھوٹا سا مڑا ہوا لفافہ نکل کر فرش پر گر گیا۔ تصدق نے وہ لفافہ اٹھا لیا جسے میں خوب پہچانتا
تھا۔ یہ وہی لفافہ تھا جو برما کے سفر میں میرے ساتھ تھا۔ اسی لفافے میں سالار نے مجھے زہر
کی گولیاں دی تھیں اور یہی لفافہ لالی نے مجھ سے اس وقت لے لیا تھا جب میں مہندر کے
ساتھ کانپور روانہ ہو رہا تھا۔

میرے کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں میں چیخنا چاہتا تھا، رونا چاہتا تھا، لالی کی
لاش سے لپٹنا چاہتا تھا۔ بسمل شاید میری کیفیت کو بھانپ چکا تھا۔ وہ میرے شانے کو تھپتھپا کر
مجھے گویا تسلیاں دے رہا تھا۔

گورنر بٹلر، تصدق حسین کی یہ کارروائی دیکھتا رہا۔

''پھر کیا ہوا تھا؟''

''میں نے فوراً ایک آدمی آپ کی طرف دوڑایا تھا جناب!'' اسی انگریز افسر نے
کہا۔ ''پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے یہ مرگئی۔''

''کچھ بتایا۔'' تصدق حسین نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' انگریز افسر نے کہا۔ ''اس نے صرف یہ درخواست کی تھی کہ اس کی لاش
خان بہادر شیرازی کے گھر بھیج دی جائے۔ وہ ان کے بیٹے کی دلہن ہے۔ اس نے درخواست
کی تھی کہ اس کے رشتے داروں سے کہا جائے کہ اس کی ارتھی، خان بہادری شیرازی کے گھر
سے اٹھائیں کیوں کہ یہی مرتے وقت اس کی خواہش تھی۔'' انگریز افسر کا لہجہ بھی کچھ متاسفانہ
تھا۔ ''پھر یہ بس آفاق میرے دیوتا، آفاق میرے دیوتا، کہتے کہتے خاموش ہوگئی تھی۔''

بسمل شاید سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ اس نے میرے شانے کو زور سے دبایا۔

''یہ واقعی ایک عظیم اور بہادر لڑکی تھی۔'' گورنر بٹلر نے کہا۔ ''جس قوم میں ایسی
لڑکیاں ہوں، تصدق حسین! اسے زیادہ دنوں غلام نہیں رکھا جا سکتا۔ تم جیسے وفادار کب تک
انہیں سہارا دیں گے۔ میں اسے سلام کرتا ہوں۔'' اور واقعی بٹلر نے فوجی انداز میں لالی کی
لاش کو سلامی دی۔

یہ منظر دیکھ کر کمرے میں موجود دوسرے انگریز افسروں نے بھی لالی کی لاش کو سلامی
دی تھی۔ اگر ہاتھ نہیں اٹھے تھے تو انگریزی حکومت کے نمک خوار تصدق حسین کے!

''اس مجاہدہ کی آخری خواہش ضرور پوری کی جائے۔ اس کی لاش خان بہادر
شیرازی کے گھر بھیج دی جائے۔'' گورنر بٹلر نے حکم دیا۔ پھر لالی کی لاش کے احترام میں دو
قدم پیچھے ہٹا اور باہر جانے کے لیے مڑ گیا۔

اسی وقت ایک فائر کی آواز گونجی تھی۔ یہ فائر میں نے کیا تھا مگر اس سے ذرا پہلے ہی
بسمل نے میرے شانے پر ہاتھ مار کر مجھے فائر کرنے کے ارادے سے باز رکھنا چاہا تھا۔ میرا
ہاتھ ہل گیا، نشانہ خطا ہو گیا اور تصدق حسین بچ گیا۔

اس کے بعد ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ''یہ کیا حماقت کی تم نے! بھاگو...... بھاگو!''

☆======☆======☆

میں شکستہ اور نڈھال منصور کے گھر پہنچا۔ میرا سینہ انتقام کی آگ سے دہک رہا تھا۔
اگر بسمل نے اس وقت میرا ہاتھ نہ پکڑا ہوتا تو لالی کا قاتل اس وقت زندہ نہ ہوتا۔ بہر حال
اس کے بعد وہاں سے بچ کر نکل آنا بھی ایک معجزہ ہی تھا۔

میں پھر منصور کے گھر میں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ اب میرے پاس تھا ہی کیا کرنے کو!

اس شام ادھر خان بہادر شیرازی گھر پہنچے، ادھر لالی کی لاش پہنچی۔ میں نے منصور کی بیٹھک سے دیکھا تھا، ایک دلہن اس گھر میں اتری تھی جہاں ایک ساس اس کی منتظر تھی۔ اس کے ساتھ ہی منصور، لالی کی ہلاکت کی خبر کے ساتھ اس کا آخری زبانی پیغام میرے نام لایا تھا۔ لالی سے متعلق اس کی معلومات کا ذریعہ بٹلر ہاؤس کا ایک ہندو باورچی تھا جو لالی کو کھانا وغیرہ پہنچاتا تھا۔ اس نے اپنی موت کے روز، دوپہر کے وقت جب باورچی اس کے لیے کھانا لایا تھا تو اسے یہ پیغام دیا تھا کہ اب اذیتیں اس کے لیے ناقابل برداشت ہیں۔ وہ مرنے کے بعد دوسری دنیا میں میرا انتظار کرے گی۔

اور میں کتنا ظالم ہوں کہ آج تک اسے انتظار کرا رہا ہوں۔

پھر اس کے تھوڑی دیر بعد ایک اور دل دوز خبر مجھے ملی۔ لالی کی لاش کا استقبال کرنے کے بعد میری ماں بھی اپنی بہو کے ساتھ دوسری دنیا کا سفر اختیار کر چکی تھیں۔ انہیں اپنی بہو سے کچھ اتنی ہی زیادہ محبت تھی کہ وہ اس کی دائمی جدائی کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی تھیں۔

اور میں اپنی دو عزیز ہستیوں سے تھوڑے فاصلے پر ہونے کے باوجود ان کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔

پھر ہمارے گھر لوگوں کی آمد کا تانتا بندھ گیا۔ منصور خبر لایا کہ لالی کی ماں بھی ہمارے گھر پہنچ چکی ہے۔ معلوم نہیں مہندر کو بھی اس قیامت کا علم ہے یا نہیں جو اس کے گھر پر گزر گئی ہے؟ میں نے بڑے ہی دکھی دل سے سوچا تھا۔

دن ڈھلا، سورج غروب ہو گیا۔ رات آ گئی۔ ہمارے گھر سے بین کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک ماتم تھا، ایک کہرام تھا جو مچا ہوا تھا۔ میرا دل اپنے عزیزوں کی موت کا عزا خانہ بنا ہوا تھا۔ میں اپنا غم کسے سناتا۔ کون تھا جو میرا غم بانٹتا۔

رات گئے منصور خبر لایا کہ کاکوری ڈکیتی کیس کے سلسلے میں بسمل کو اس وقت گرفتار کر لیا گیا جب وہ لکھنؤ چھوڑنے والا تھا۔ اس طرح اس کیس میں ملوث گیارہ آدمی گرفتار ہو چکے تھے۔ بسمل نے اس کیس کے سرغنہ ہونے کا اعتراف کر کے ان لوگوں کو بچانا چاہا تھا جو اس کی پارٹی کے روحِ رواں تھے۔

اگلے دن ہمارے گھر سے امی کا جنازہ اور ان کی بہو کی ارتھی آگے پیچھے نکلے۔ ایک کا سفر قبرستان کی طرف تھا اور ایک کا شمشان گھاٹ کی طرف!

وہ دونوں ہی مجھے عزیز رکھتی تھیں۔ وہ دونوں ہی مجھے عزیز تھیں اور میں، میں بس ان کا ماتم کرنے کے لیے زندہ تھا۔

وقت چپ چاپ، آنسوؤں کی طرح ٹپ ٹپ روتا گزرتا رہا۔ اب نہ وہ دل دار تھا وہ طرح دار جو میرے دل میں غنچے چٹکاتا تھا۔ اب محبت کی وہ آغوش بھی نہ تھی جس کی گرمی میں، میں نے پرورش پائی تھی۔

تیسرے دن، جب رات بہت گزر گئی اور اس کی سیاہی بہت بڑھ گئی تو میں منصور کے گھر سے نکلا۔ منصور بھی میرے ساتھ تھا۔ میں لالی کی چتا سے پھول چننے جا رہا تھا۔

شمشان گھاٹ پہنچ کر منصور نے اس جگہ کی نشاندہی کی جہاں لالی کی لاش پھونکی گئی تھی۔ لالی، میری لالی، اب راکھ کا ڈھیر تھی۔

''منصور، میرے دوست!'' میں نے کہا۔ ''تم جاؤ، میں اپنی لالی سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری اور اس کی باتیں کوئی اور سنے۔ جانتے ہو لالی لاش کی صورت میں دلہن بن کر ہمارے گھر آئی تھی۔ آج ہماری سہاگ رات ہے۔ جاؤ!''

''مگر......'' منصور نے کچھ کہنا چاہا۔

''یقین رکھو، میں صبح تک آ جاؤں گا۔ میں جا بھی کہاں سکتا ہوں۔''

منصور چلا گیا۔

اور پھر واقعی میں نے اپنی لالی سے ڈھیروں باتیں کیں اس نے بھی مجھ سے باتیں کی تھیں مگر اسے کون سمجھ سکتا ہے۔ کون میرے ان الفاظ پر یقین کر سکتا ہے مگر میں بتاؤں، لالی سے میں نے دل کی زبان میں گفتگو کی تھی اور میں نے اسی دل کی قوتِ سماعت سے لالی کے جواب سنے تھے۔

میں راکھ سے پھول چنتا رہا، لالی سے باتیں کرتا رہا اور پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی۔

پھر میں نے اپنے شانوں پر ایک مانوس دباؤ محسوس کیا، محبت کا دباؤ، پیار کا دباؤ، ایسا دباؤ جو غم میں شرکت کا احساس دلاتا ہے۔

میں نے مڑ کر دیکھا۔

☆======☆======☆

وہ میرا دوست تھا، لالی کا بھائی مہندر!

اس نے مجھے سینے سے چمٹا لیا۔ مہندر کو قریب پا کر میرا غم پھر تازہ ہو گیا۔ ''مہندر! مہندر!'' میں نے سسکیوں کے درمیان کہا۔

''آفاق! میرے دوست! میری جان!'' اس کا گلا بھی رندھ گیا۔ آواز بُری طرح کپکپا رہی تھی۔ ہم دونوں کا غم مشترک تھا۔ لالی اس کی بہن ہی نہیں تھی اس کی رازداں بھی تھی، دوست بھی! آزادی کی پُرپیچ اور پُرخطر راہوں پر اس کی ہم سفر بھی تھی۔

''لالی ہمیں چھوڑ کر چلی گئی مہندر، ایسا کیوں ہوا؟ یہ سب کیا ہو گیا'' میرے پاس وہ الفاظ ہی نہ تھے میں جن میں اپنے غم کا اظہار کر سکتا۔

لالی مر چکی تھی! وہ جانتا تھا اس لیے وہاں موجود تھا۔ مجھے تسلی دینے کے انداز میں وہ میری کمر تھپکتا رہا۔ وہ لالی کا بھائی تھا۔ غم اس کا شدید تھا یا میرا؟ کون جانے، میں تو بس یہ جانتا تھا کہ وہ بے حد زخمی سا ہو گیا ہے۔ اس کے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ ایک چیخ تھی، سسکی تھی، ایک آنسو تھا۔ ''میں تمہارے غم کو سمجھتا ہوں آفاق!''

''میں شرمندہ ہوں مہندر! مجھے معاف کر دو'' میں بلکتا رہا اور پوری شدت سے اسے چمٹا لیا۔ ''مہندر مجھے معاف کر دو۔''

''اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔'' مہندر نے کہا۔ ''ہم سب مجبور تھے۔ سب بے بس تھے، کوئی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔''

''مگر مہندر! وہ میرے گھر سے گرفتار ہوئی تھی۔'' میں نے تڑپ کر کہا۔ ''میں شرمندہ ہوں کہ اس کی حفاظت نہ کر سکا۔ تم ایک جیتی جاگتی مورت میرے گھر چھوڑ گئے تھے، بتاؤ مہندر، اب میں تمہیں کیا لوٹاؤں؟''

وہ میری پیٹھ تھپکتا رہا۔ اس کی انگلیاں کپکپا رہی تھیں۔ ''صبر سے کام لو آفاق!'' اس کے لہجے میں رقت تھی۔ ''میں نے تمہاری محبت اور اپنی بہن کے قاتل سے بھرپور انتقام لے

لیا ہے۔ بدری ناتھ اور اس کی بیٹیاں، اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میں نے ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔'' اس کے لہجے میں عجیب سا درد تھا۔

گویا وہ میری اور لالی کی محبت سے بھی آگاہ تھا۔ غم کی اس شدت کے باوجود میں دل میں اور بھی شرمندہ ہو کر رہ گیا مگر میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ ہم دونوں وہاں خاموش کھڑے گومتی کی لہروں کو کناروں سے سر پٹکتے، سسکیاں لیتے سنتے رہے۔ آس پاس پھیلی جھاڑیوں میں ہوا دھیرے دھیرے غم سے بوجھل بہہ رہی تھی۔ آسمان بھی چپکے چپکے رو رہا تھا۔ پورا ماحول سوگوار اور غمگین تھا۔

ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ پھر ہمیں یوں محسوس ہوا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے تاریکی کا ایک حصہ متحرک ہو گیا۔ یہ دھبا حرکت کرتا ہوا قریب آ گیا۔ ایک سیاہ ہیولا ہم سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا۔ پھر اس دھبے سے آواز ابھری۔ ''آفاق! مہندر!'' یہ آواز سالار اعظم کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہیولا اور آگے بڑھ آیا۔

''ہندوستان ایک عظیم اور بہادر بیٹی سے محروم ہو گیا ہے۔ یہ صرف ہمارا تمہارا غم نہیں، پورے ہندوستان کا غم ہے۔''

ہم دونوں اپنی جگہ ساکت کھڑے رہے، ہمارے پاس کہنے کے لیے تھا ہی کیا مگر میں نے سالار کے ان الفاظ کو حقیقت کے بہت قریب جانا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں ہندوستان تھا، ہاں میں ہندوستان تھا۔ میں اور میرے ساتھی اپنے اپنے وجود میں مکمل ہندوستان تھے۔ سالار ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، یہ سارے ہندوستان کا غم تھا۔

''میں تمہارے غم کو خوب سمجھتا ہوں۔'' سالار نے کہا۔ ''تم سب میرے بچے ہو۔ میں تمہارے ہر ساتھی کی موت پر خون کے آنسو رویا ہوں۔ میرا یہ دل ایک قبرستان ہے جس میں نہ معلوم تمہارے کتنے ساتھیوں کی لاشیں دفن ہیں مگر میرے ہر غم نے، ہر تازہ غم نے میرے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کو اور بھڑکا دیا ہے۔ یہ غم مجھے بے عمل نہیں بنا سکے۔ اگر ہم اپنے ایک ایک ساتھی کی موت پر اسی طرح ماتم کناں رہے تو ہم کچھ نہ کر سکیں گے۔ ہر ساتھی کی موت ہمارے عزائم اور ہمارے مقاصد کی لگن کے لیے مہمیز ہونا چاہیے۔ میرے بیٹو! تمہیں کیا معلوم، لالی میرے لیے کیا تھی، وہ مجھے اپنی بیٹی سے بڑھ کر تھی، وہ مجھے میرے بیٹے سے بڑھ کر عزیز تھی۔ میں نے اس کے بارے میں کچھ خواب دیکھے تھے، کچھ فیصلے کیے تھے مگر وہ خواب شکست ہو گئے، وہ فیصلے شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکے۔ خواب چکنا چور ہو گئے آفاق! تم ایک باپ کا غم نہیں سمجھ سکتے۔ وہ میری بیٹی تھی، سگی بیٹی سے

بڑھ کر تھی وہ میرے لیے!'' سالار کا لہجہ غم سے چور تھا۔ ''وہ اتنی فرماں بردار تھی کہ میرے
کہنے پر تمہاری والدہ کی تیمارداری کے لیے لکھنؤ سے آ گئی۔ میں مہندر اور وشوا ناتھ سے
شرمندہ ہوں۔ نہ میں اسے یہاں بھیجتا، نہ شاید اس کی گرفتاری عمل میں آتی۔''

''یہ ہونا ہی تھا جناب!'' مہندر نے کہا۔ ''پتا جی یہاں نہیں تھے تو کیا وہ بچ گئے!''

سالار نے مہندر کے اس تبصرے پر کچھ نہیں کہا۔ سالار ایک چٹان تھا جس میں ایک
بے حد نرم دل دھڑک رہا تھا۔ اس کے اعصاب آہنی تھے لیکن وہ، دل میں گداز رکھتا تھا۔ وہ
ایک حریت پسند تنظیم کا سربراہ تھا، وہ سرفروشوں کی فوج کا بے جگر سردار تھا اسی لیے کبھی وہ
جذبات اور احساسات کی رو کو اپنے مقصد پر غالب نہیں آنے دیتا تھا۔ اس نے صرف اتنا ہی
کہا۔ ''آفاق! میرا خیال ہے کہ تم اپنی والدہ کی قبر پر بھی جاؤ گے۔ مہندر بھی شاید تمہارے
ساتھ جانا پسند کرے گا حالانکہ وہ ابھی وہیں سے آ رہا ہے۔''

''جی ہاں!'' میں نے کہا۔ ''میں ادھر ہی جاؤں گا۔'' میری آواز پھر بھرا گئی۔ ''ان
کا جنازہ اور لالی کی ارتھی میرے سامنے ہی اٹھی تھی اور میں چند قدم کے فاصلے پر منصور کے
گھر سے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن......''

''ہاں یہی ہماری قسمت ہے۔'' سالار نے کہا۔ ''ہندوستان بھی آزادی سے اتنا ہی
دور ہے۔ جتنے دور تم اپنے گھر سے تھے۔ یہ فاصلہ بہت کم ہے لیکن قدم قدم پر رکاوٹیں ہیں،
مزاحمتیں ہیں، قانون کی دیواریں حائل ہیں اور اس وجہ سے یہ مختصر سا فاصلہ بے حد طویل ہو
گیا ہے۔ ہمیں ہر قدم پر ان کانٹوں کو اپنے ساتھیوں کی لاشوں پر سے پھلانگتے ہوئے
بڑھتے رہنا ہے۔ فوجیں جب پیش قدمی کرتی ہیں ایسا ہی ہوتا ہے۔ آگے بڑھنے والا مجاہد
شہید ہو جانے والے ساتھی کے سرہانے نہیں بیٹھتا بلکہ زیادہ شدت سے یلغار کرتا ہے۔''

ہم خاموش ہو گئے۔ میں نے یوں محسوس کیا جیسے میرا تمام وجود دہکتا ہوا انگارا بن
گیا ہے۔ اسی وقت میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں ہندوستان کے دشمنوں، لالی کے قاتلوں،
انگریزوں اور ان کے پٹھوؤں پر قہر بن کر نازل ہوں گا۔ یہ سب کچھ سالار کے ان چند
جملوں کا اثر تھا جو اس نے کہے تھے۔ واقعی وہ ایسا ہی شخص تھا جو جذبوں کو حوصلہ اور حوصلوں
کو توانائی بخشتا تھا۔ اس کی موجودگی میں ہر مشکل ہیچ ہو جاتی تھی، ہر غم ہلکا ہو جاتا تھا۔

''قبرستان سے تم سیدھے ہر کرن ناتھ مصرا کے گھر جاؤ گے مہندر!'' سالار اعظم نے
کہا۔ ''تم اس کے گھر سے واقف ہو۔ اس کے مہمان خانے کا دروازہ تمہیں کھلا ملے گا۔
وہاں سسشما تمہاری منتظر ہے۔ وہ میرے ساتھ یہاں پہنچی ہے۔''

''مگر......''

''اچھا میں چلا۔'' سالار نے مہندر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''آفاق تم تو منصور
کے گھر ہی پہنچو گے؟''

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے جو آپ کا حکم ہو۔''

''نہیں تم وہیں جانا۔ خان بہادر صاحب نے تمہاری چھوٹی بہن کو وہیں بھیج دیا
ہے۔ شاید انہیں یہ سن گن لگ گئی ہے کہ تم اسی کے گھر مقیم ہو۔ تمہاری چھوٹی بہن تمہیں بہت
یاد کرتی ہے۔ اپنی امی اور لالی کو تو یاد کرتی ہی ہے لیکن ان سے زیادہ تمہیں! اپنے ابا سے
ڈرتی ہے۔ ذہین ہے نا، اس کے ذہن میں یہ خوف پیدا ہو گیا ہے کہ اپنے والد ہی کی
وجہ سے تم اپنے گھر سے بھاگتے رہتے ہو۔'' سالار نے دکھ سے کہا۔ ''مجھے تم سے ہمدردی
ہے آفاق!''

''مگر جناب! کہیں یہ کوئی چال نہ ہو؟ وہ کہہ چکے ہیں کہ اگر انہیں موقع ملا تو وہ مجھے
گرفتار کرا دیں گے۔ شاید انھوں نے زیب کو وہاں بھیج کر مجھے شکار کرنے کا پروگرام بنایا
ہے۔'' میں کہتا ہی چلا گیا۔

''میرا خیال ہے ایسا نہیں ہے۔'' سالار اعظم نے کہا۔ ''تم بے فکر ہو کر وہاں جاؤ۔
کوئی خطرہ ہوا تو تمہارے ساتھی تمہیں خبردار کرنے اور تمہاری مدد کرنے کے لیے تمہارے
آس پاس ہی ہوں گے۔ میں شاید تمہیں اس کی اجازت نہیں دیتا مگر زیب کی حالت بہت
خراب ہے۔ وہ سوتے میں بھی تمہیں ہی پکارتی رہتی ہے۔'' سالار خاموش ہو گیا، پھر جیسے
اسے کچھ یاد آ گیا۔ ''ہاں مہندر! تمہارے نام لالی کا ایک خط ہے۔ لالی نے یہ خط اس دن
لکھا تھا جب تم یہاں سے تربیت کے لیے کانپور گئے تھے۔ یہ خط اس نے ایک لفافے میں
میرے نام بمبئی بھیجا تھا جہاں سے یہ میرے پاس آ گیا۔ اس نے مجھے لکھا تھا کہ میں یہ خط
تمہیں بھجوا دوں۔ ظاہر ہے اسے یہ تو علم تھا نہیں کہ تم کہاں ہو۔ میں نے اسے اپنے بمبئی
کے ایک دوست کا پتا دے دیا تھا جہاں سے یہ مجھ تک پہنچ گیا۔'' یہ کہہ کر سالار نے ایک
لفافہ مہندر کی طرف بڑھا دیا۔

پھر سالار اسی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ میرے دل کا بوجھ ذرا سا ہٹ گیا تھا لیکن
میں زیب کے لیے پریشان تھا۔ وہ بے چاری اپنے پیارے بھائی کے انتظار میں تھی۔
اس کی امی چھن گئی تھیں اور لالی جو خواب کی طرح ہمارے گھر میں آئی تھی وہ بھی!

''آؤ چلیں۔'' مہندر نے کہا۔ ''پہلے قبرستان چلتے ہیں۔''

"میرا خیال ہے کہ تم سیدھے ہر کرن ناتھ مصرا کے ہاں چلے جاؤ۔" میں نے کہا۔ "سشما تمہاری منتظر ہوگی۔"

"ہم سب انتظار کر رہے ہیں۔" مہندر نے کہا۔ "انتظار تو ہمارا سب سے بڑا انعام ہے۔ انتظار کی طوالت یا زحمت ہمارے لیے بے معنی ہے۔ وہ کچھ دیر اور انتظار کرے گی۔ اس کے بعد بھی تو اسے انتظار ہی کرنا ہے۔"

قبرستان تک کا راستہ خاموشی سے طے ہوگیا۔ پھر ہم جدا جدا راستوں پر چل کھڑے ہوئے

☆======☆======☆

منصور کے گھر کا دروازہ میرے ہی انتظار میں کھلا ہوا تھا۔ وہاں سب منتظر تھے۔ آہٹ پاتے ہی منصور دروازے پر آیا تھا تو میں دہلیز پار کر چکا تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھک میں آ گیا جہاں منصور کی والدہ اور بہن بھی شاید میرے ہی انتظار میں بیٹھی تھیں۔ شاید وہ سب یہ چاہتے تھے کہ میں آؤں تو ننھی زیب کو میری نگرانی میں دے کر چلے جائیں۔

ننھی زیب پلنگ پر پڑی سو رہی تھی۔ خواب میں بھی اس کی سسکیاں جاری تھیں۔ سسکیوں سے اس کا تمام جسم مرتعش تھا۔ اس کے ہونٹوں پر بس میرا ہی نام تھا۔ "بھیا کہاں ہو۔ بھیا کہاں ہو۔ بھیا آ جاؤ۔ بھیا! امی...... لالی بھابی کہاں ہیں؟"

میں نے بڑھ کر اس کی معصوم پیشانی پر ہونٹ رکھ دیے۔ میری ننھی سی بہن! اس چھوٹی سی عمر میں وہ کیسے صدمے سے دوچار ہوئی تھی۔ پیشانی پر ہونٹوں کا لمس محسوس کرتے ہی ننھی زیب جاگ اٹھی تھی۔

اس نے غور سے میری طرف دیکھا۔ "بھیا!" اس نے زور سے چیخ کر کہا اور میری گود میں آ گئی اور پھر جو اس نے رونا شروع کیا ہے تو بیٹھک میں موجود ہر شخص کو رلا دیا اور میں، میں تو مسلسل رو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی گڑیا رکھی تھی جسے اس نے بڑی محبت کے ساتھ اپنے سینے سے لگا رکھا تھا۔ یہ گڑیا لالی اس کے لیے لائی تھی۔

پھر منصور اور اس کے گھر والے اٹھ گئے۔ میں ننھی زیب کے ساتھ پلنگ پر لیٹ رہا۔ وہ بس امی اور لالی کی باتیں کر رہی تھی۔ لالی نے مختصر سے قیام کی مدت میں اسے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا۔ وہ اپنے معصوم ذہن سے اس کی باتیں سوچ رہی تھی اور مسلسل اسی کا تذکرہ کر رہی تھی۔

"ارتھی تو جلا دیتے ہیں نا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"تو لالی بھابی بھی راکھ بن گئی ہوں گی، ویسے ہی جیسے لکڑی جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔" اس کے سوالوں کا سلسلہ جاری رہا

"ہاں۔" میرے حلق میں تھوک کا گولا سا اٹک گیا۔ وہ راکھ بن گئی تھی۔ اس راکھ سے میں نے چتا کے پھول چنے تھے۔ یہ پھول میرے پاس تھے۔ یہ پھول آج بھی میرے پاس ہیں۔

"اور امی، بھیا! وہ تو نہیں جلی ہوں گی۔"

"نہیں!"

"تو ان کا کیا بنے گا؟"

"وہ بھی مٹی بن جائیں گی، خاک ہو جائیں گی۔" میں نے بڑبڑا کر کہا۔ "زمین کا دوزخ کبھی نہیں بھرتا۔"

"ارے ہاں بھیا!" ننھی زیب نے کہا۔ "پتا ہے، لالی بھابی نے آپ کے لیے ایک چیز دی تھی۔"

"کیا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔ "کہاں ہے؟"

"ایک خط اس میں رکھا تھا لالی بھابی نے!" ننھی زیب نے گڑیا مجھے دکھائی۔

میں نے زیب سے پلاسٹک کی وہ سوتی جاگتی گڑیا لے لی۔ پلاسٹک کی اس گڑیا کی آنکھیں ایسی تھیں کہ جب اسے لٹا دیا جاتا تھا تو اس کی آنکھیں بند ہو جاتی تھیں اور جب اسے کھڑا کر لیا جاتا تو اس کی آنکھیں کھل جاتی تھیں۔ اس کے ہاتھ پیر الگ ہو جاتے تھے۔ میں اس گڑیا کو دیکھ رہا تھا تو ننھی زیب نے گڑیا میرے ہاتھ سے جھپٹ لی۔ وہ جیسے مجھ پر کوئی انکشاف کرنے والی تھی۔ پھر اس نے زور لگا کر گڑیا کی ایک ٹانگ الگ کر دی۔ کھانچے کے سوراخ میں جو گڑیا کے پیٹ میں کھلتا تھا، اس نے جھانک کر دیکھا۔ "یہ رہا خط!"

خط کیا تھا، صرف ایک جملہ تھا۔ "وہ الفاظ جو زبان سے تمہارے سامنے ادا نہیں ہوئے آج لکھ رہی ہوں، مجھے تم سے محبت ہے۔"

وہ جو ہمیشہ مجھے دیوتا کہتی تھی، اس نے پہلی مرتبہ مجھے تم سے مخاطب کیا تھا۔ وہ جذبہ ہمارے دلوں میں پروان چڑھا تھا اور جس کی حقیقت ہم دونوں پر واضح تھی پہلی مرتبہ

شرمندۂ الفاظ ہوا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ’’کیا لکھا ہے بھیا، بھابی نے خط
میں؟‘‘

میں اسے کیا بتاتا، لالی نے کیا لکھا تھا۔ یہ پیغام تو صرف میرے لیے تھا۔ ’’کیا کہا تھ
لالی نے تم سے یہ خط رکھتے ہوئے؟‘‘

’’کہا تھا بھیا، کہ میں کسی کو نہ بتاؤں کہ اس میں کیا ہے اور کہا تھا تمہارے بھیا تو نہ
جانے کب آئیں اور میں نہ جانے کب چلی جاؤں۔ ان سے ایک ضروری بات تھی، وہ لکھ
کر میں نے اس میں ڈال دی ہے۔ تم صرف اپنے بھیا شیرازی کو بتانا اور کسی کو بھی نہیں۔‘‘

’’تم نے بتایا تو نہیں کسی کو؟‘‘

’’نہیں بھیا۔‘‘ زیب نے کہا تھا۔ ’’میں نے وعدہ کیا تھا۔‘‘

اگلے دن پولیس کی بھاری جمعیت نے ہمارے گھر چھاپا مارا تھا۔ میں نے پولیس کو
اپنے گھر کا محاصرہ کرتے دیکھا تھا۔ میں ننھی زیب کے ساتھ بیٹھک میں کھڑکی کو ذرا سا
کھولے یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ننھی زیب، پولیس کو دیکھ کر گھبرا گئی تھی اور سہم کر مجھ سے چمٹی
ہوئی تھی۔ پھر منصور گھبرایا ہوا آیا تھا، اس نے بتایا۔ ’’پولیس نے خانہ تلاشی کے لیے یہ چھاپا
مارا ہے۔ پولیس کا خیال ہے کہ کاکوری ڈکیتی کیس کے لیے اسلحہ کا ذخیرہ تمہارے گھر کیا
گیا ہوگا کیونکہ لالی وہیں مقیم تھی۔ تمہارے والد بہت چراغ پا ہو رہے ہیں۔ تمام خان
بہادری جلال ان کے چہرے اور زبان میں سمٹ آیا ہے۔ پولیس انسپکٹر ان کے رعب اور
دبدبے میں آ گیا ہے۔ خان بہادر اور انسپکٹر دونوں اس بات پر رضامند ہو گئے ہیں کہ خان
بہادر تصدق حسین کی آمد کے بعد ہی خانہ تلاشی لی جائے گی۔‘‘

میں نے خطرے کو بہت قریب محسوس کیا۔ میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ پولیس کی یہ
کارروائی صرف مجھے گرفتار کرنے کی غرض سے ہے۔ مجھے اپنے والد خان بہادر شیرازی
سے یہی توقع تھی۔ میں نے اسی وقت مکان کے پچھلے دروازے سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔
میں نے ننھی زیب کو اس خطرے کے متعلق سمجھایا جو محسوس کیا تھا۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ’’بھیا اب کب آؤ گے؟‘‘ اس نے بلکتے ہوئے کہا
تھا۔

’’بہت جلد آؤں گا زیب!‘‘ میں نے اس کی پیشانی کو چوما۔ وہ جو ماں کی آغوش
سے محروم تھی ایک مرتبہ پھر خود کو تنہا محسوس کر رہی تھی اور سسکیوں سے اس کا جسم لرز رہا تھا۔
’’بہادر بھائی کی بہادر بہن! اس طرح نہیں روتے۔‘‘ میں نے اسے دلاسا دیا اور

...ے سے باہر آ گیا۔ اس وقت مجھے پتا نہیں تھا کہ میں اس سے بائیس برس کے لیے
...ہا ہوں۔

گلی سے نکل کر میں سڑک پر آ گیا۔ اس وقت بھی میرا حلیہ سرحدی پٹھان جیسا تھا،
...ھیر کی شلوار، لمبا کرتہ، سر پر پگڑی اور گردن پر چادر! میں اس گلی کے سامنے سے گزرا
...ے آخری سرے پر ہماری حویلی تھی۔ پولیس کی جمعیت گلی کے نکڑ پر اور ہماری حویلی
...منے تھی۔ لوگوں کا جم غفیر سڑک پر جمع تھا۔ سپاہیوں نے اس طرف سے سڑک کھلی رکھی
...دھر سے خان بہادر تصدق حسین کی سواری آنے والی تھی۔

...ہاں خان بہادر تصدق حسین آنے ولا تھا، وہ شخص آنے والا تھا جو لالی کا قاتل تھا۔
...حکومت کا وفادار تھا۔ پھر میرا ذہن جیسے جلتا ہوا الاؤ بن گیا۔ میں نے آس پاس کا
...لیا۔ میرا روم روم اس وقت انتقام انتقام کی صدا لگا رہا تھا۔ حالات میرے لیے ساز
...تھے۔ فرار کی ایک راہ تھی۔

تھوڑی دیر بعد سڑک کی مخالف سمت سے تین گھوڑ سوار اسی سمت بڑھتے نظر آئے۔
...ن کے گھوڑے پر خان بہادر تصدق حسین تھا۔ اس نے برجیس پہنی ہوئی تھی۔ اس کے
...میں ایک ہنٹر نما چھڑی تھی۔ اس کے دونوں پہلوؤں کے ساتھ دو سپاہی چل رہے

میں پیچھے ہٹا۔ چادر کے نیچے بغل میں چھپا ہوا پستول میرے ہاتھ میں آ گیا۔ پھر
...ادہ گھوڑے قریب آئے، میں نے پے در پے تین فائر کیے۔ ایک بھگدڑ مچ گئی۔ میں
...خان بہادر تصدق حسین کو گھوڑے سے زمین پر گرتے دیکھا تھا، پھر اسی افراتفری میں،
...ہاں سے بھاگا تھا۔ اسی وقت کئی افراد آپس میں گتھم گتھا ہو گئے تھا۔ میں وہاں سے
...تا بھاگا اور شکیل کے گھر کے کھلے ہوئے دروازے میں گھس گیا۔ دروازے میں
...ہوئی عورتیں چیخ کر اِدھر اُدھر ہٹ گئیں۔ میں اس گھر سے خوب واقف تھا۔ میں
...ے گزرتا ہوا صحن میں آیا۔ عورتیں شور مچا رہی تھیں۔ وہاں سے میں سیدھا سہ دری
...میں جانتا تھا کہ کدھر سے، اس مکان سے نکل سکتا ہوں۔ سہ دری میں باہر جانے
...دروازہ تھا، میں اس سے نکلا اور باہر سے کنڈی چڑھا دی۔

...میری خوش قسمتی تھی کہ دوسری طرف گلی سے نکلتے ہی مجھے ایک خالی تانگا مل گیا۔
...شاید کسی دکان سے بیڑی سگریٹ وغیرہ لینے گیا ہوا تھا۔ میں نے تانگے میں بیٹھ
...ے کو ہوا کر دیا۔ اب میری منزل امین آباد پارک تھا۔ میں جلدی ہی وہاں پہنچ گیا،

پھر ایک تنہا گوشہ دیکھ کر میں نے اپنا بھیس بدلا۔ لمبے کرتے اور چوڑے گھیر والی شلوار کے نیچے، میں عرصے سے پتلون اور قمیص پہنے رکھتا تھا۔ میں نے تھوڑی ہی دیر میں لباس تبدیل کرلیا تھا۔ کرتے اور شلوار کو تہہ کرکے میں نے چادر میں رکھ لیا۔ میں نے انہی میں اپنا پستول بھی چھپادیا تھا۔

میں خاصی مشکل میں پھنس چکا تھا۔ مجھے اس وقت ایک ایسی چھت کی ضرورت تھی جس کے نیچے پناہ لے سکوں۔ اس وقت میں کسی دوست کے گھر بھی نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ اس طرح لکھنؤ میں میری موجودگی کی خبر پھیل سکتی تھی۔ پھر میرے ذہن میں ایک ترکیب آہی گئی۔ میں اسٹیشن کی طرف چل دیا۔

ذرا سی اداکاری سے کام لے کر میں ریلوے ہسپتال کے اسپیشل وارڈ کے ایک کمرے میں مریض کی حیثیت سے داخل ہوچکا تھا۔ میں نے پیٹ میں شدید درد کی شکایت کرتے ہوئے ڈاکٹر کو یہی بتایا تھا کہ میں پٹنہ سے علی گڑھ جارہا تھا کہ راستے میں قے اور اسہال شروع ہوگیا اور مجھے لکھنؤ اترنا پڑا۔ میں نے یہی درخواست کی تھی کہ مجھے تین چار دن کے لیے ہسپتال میں داخل کرلیا جائے تاکہ میں ٹھیک ہوکر علی گڑھ جاسکوں۔ کمرہ مخصوص کرانے کے لئے اور دیگر اخراجات میں نے پیشگی ہی ادا کردیے۔ اپنی بیماری کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے مجھے دن میں کڑوی کڑوی دوائیں بھی پینا پڑیں اور پڑیاں بھی پھانکنا پڑیں۔ رات آٹھ بجے ایک ڈاکٹر، نرس کے ہمراہ میرا حال دریافت کرنے آیا۔ اس وقت میں نے ایسی اداکاری کی گویا میری حالت صبح کے مقابلے میں زیادہ بہتر تھی۔ ڈاکٹر چلا گیا تو میں نے لائٹ آف کی اور وہاں سے نکلنے کے موقع کی تاک میں لگ گیا۔

یہ موقع مجھے رات بارہ بجے کے بعد ملا تھا۔ ایک بجے تک میں ہرکرن ناتھ مصرا کے مہمان خانے میں مہندر اور سشما کے سامنے بیٹھا تھا۔ مہندر مجھے اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ مجھے نہیں میرے بھوت کو دیکھ رہا ہو۔ "تم کہاں تھے؟" اس نے میرے بیٹھتے ہی مجھ سے پوچھا تھا۔ میں نے اسے تمام حالات بتادیے تو اس نے گہرا سانس لیا۔ "میں تو پریشان ہو گیا تھا!"

"تو تمہیں اطلاع مل چکی تھی۔" میں نے پوچھا۔

"ہاں! منصور آیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ تم خان بہادر تصدق حسین پر قاتلانہ حملے کے بعد کسی شکیل کے گھر کے راستے فرار ہوچکے ہو۔ وہ بے چارہ تمہاری تلاش میں ہی ادھر آیا تھا اور بہت مایوس و پریشان یہاں سے گیا تھا۔ اس وقت میں پریشان تھا۔ مجھے ڈر

کہ کہیں تم کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ۔"

"میں نے دن کو ادھر آنا مناسب نہ سمجھا۔ بس یہی ترکیب سمجھ میں آئی کہ س ہسپتال میں بیمار بن کر داخل ہوجاؤں...... خان بہادر تصدق حسین کا کیا بنا؟"

"بڑا سخت جان ہے کم بخت!" مہندر نے کہا۔ "بس اس کا بازو زخمی ہوا ہے۔"

"میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا مہندر!" میں نے کہا۔ "میں زندگی کی آخری سرحد تک اس کا تعاقب کروں گا۔"

میرے اس جملے کے بعد کمرے پر ایک سکوت سا طاری ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ اس جملے کا تعلق لالی کی موت ہی سے تھا۔

سشما غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے پہلی مرتبہ مجھ سے کہا۔ "تمہیں لالی سے بہت محبت تھی؟"

میں چونک گیا، پھر خجالت سے مہندر کی طرف دیکھا۔ میری حالت اس وقت چوروں کی سی تھی۔ یہ بڑا نازک اور جذباتی لمحہ تھا۔ مہندر بہرحال لالی کا بھائی تھا اور سشما نے بلاجھجک اس کے سامنے یہ سوال کردیا تھا۔ میں نے سر جھکا لیا۔

"ہاں سشما! یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے بنے تھے۔" مہندر نے کہا۔

میری آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ "یہ سب کچھ بے اختیارانہ ہوا تھا، ارادے کو کوئی دخل نہ تھا مگر ہمارے درمیان ایک مقدس عہد بھی تھا۔" میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہوں کیا نہ کہوں۔ "وہ بہت عظیم تھی، بہت ہی عظیم!"

"میں جانتا ہوں آفاق!" مہندر نے کہا۔ "ان دونوں میں عہد تھا کہ یہ ہندوستان کی آزادی کے بعد شادی کریں گے۔" اس مرتبہ اس نے سشما کو سمجھایا تھا۔ "تم حیران نہ ہو آفاق! لالی میری بہن ہی نہیں میری دوست بھی تھی۔" پھر اس نے جیب سے ایک لفافہ نکالا اور میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ میرے لئے تو کم، تمہارے لیے زیادہ ہے۔ اسے اپنے پاس رکھو۔"

میں نے کپکپاتے ہاتھوں سے لفافہ لیا، اس میں سے نکلنے والے خط کی تہیں کھولتے ہوئے میری عجیب کیفیت تھی۔ میرے چاروں طرح جیسے گرم گرم بھوبل اڑ رہی ہو۔

مہندر بھیا! میرے اچھے دوست!

ایک بات سنو، بڑی عجیب بات ہے۔ شیرازی جی ہیں نا، ان کی امی نے مجھے اپنی بہو کے طور پر پسند کرلیا ہے۔ وہ ایک دن مجھ

سے شکایت کر رہی تھیں کہ شیرازی جی شادی پر تیار ہی نہیں
ہوتے۔ پتا نہیں بھیا کیا بات ہے اولاد جوان ہوتی ہے تو ماں
باپ کو اپنی زندگی پر سے اعتماد اٹھ جاتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ
جلد از جلد اپنی اولاد کی شادی کر دیں۔ یہاں بھی یہی معاملہ
ہے۔ بس بھیا، اس وقت میں نے پوچھ لیا کہ انہوں نے کوئی
لڑکی پسند کی ہے؟ اس پر وہ کہنے لگیں......

اس کے بعد لالی نے کم و بیش وہ تمام گفتگو لکھ دی تھی جو اس وقت ہم تینوں، یعنی
میرے، لالی اور امی کے درمیان ہوئی تھی۔ میرا دل بھر آیا تھا، میری آنکھوں میں آنسو آ گئے
تھے۔

......جانتے ہو بھیا اس کے بعد کیا ہوا، تم سوچ بھی نہیں سکتے۔
امی نے مجھے وہ تمام زیور اور عروسی جوڑا پہنایا جو انہوں نے
شیرازی جی کی دلہن کے لیے بڑی محبت سے تیار کیا تھا۔ وہ اتنی
خوش ہوئیں، اتنی خوش ہوئیں کہ بھیا میں کچھ بیان نہیں کر سکتی۔
لگتا تھا جیسے وہ سچ مچ، دلہن بیاہ کر لے آئی ہوں۔ کہنے لگیں۔
''اب میں سکون سے مر سکوں گی۔ پتا نہیں یہ مٹی کب اٹھ
جائے۔ میں نے اپنی دلہن کو اپنی آنکھوں سے دیکھ تو لیا ورنہ اس
آفاق کی رٹ تو بس یہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد
شادی کرے گا۔'' ان دنوں امی بہت بیمار ہیں۔ انہیں اپنے
بچنے کی کوئی امید تھی۔ بھیا، ایسا کیوں ہے؟ ہر مذہب اور
عقیدے کے مطابق مایوسی گناہ ہے۔ پھر بھی میں نے لوگوں کو
مایوس دیکھا ہے۔ کیوں، کیا عقیدے اتنے ہی کچے ہوتے ہیں؟
اسی خدا کی عبادت کرتے ہیں جس نے مایوسی کو گناہ کہا ہے اور
پھر مایوسی کو گلے لگا کر اسی خدا کے حکم کی نفی کرتے ہیں...... خیر تو
امی پر ان دنوں مایوسی کا غلبہ ہے۔ کہتی ہیں، چند سانسیں باقی رہ
گئی ہیں۔ کہتی ہیں، بھیا! میں نہ آتی تو اب تک مر گئی ہوتیں۔
مجھ سے بڑی محبت سے پیش آتی ہیں۔ بس ہر وقت مجھے اپنے
پاس بٹھائے ٹکر ٹکر گھورتی رہتی ہیں۔ اب انہیں یہی غم کھائے

جا رہا ہے کہ یہ شادی کیسے ہوگی۔ وہ مذہب کے فرق سے بہت
پریشان ہیں۔ میں نے انہیں تسلی دینے کے لیے کہا تھا۔ ''امی
سب سے بڑا مذہب تو خود انسانیت ہے۔'' تو کہنے لگیں۔ ''یہ
سب کتابوں کی باتیں ہیں، حکمت کی باتیں ہیں، فلسفے کی باتیں
ہیں۔ کتابی، حکیمانہ اور فلسفیانہ باتیں زندگی کے حقائق پر پوری
نہیں اترتیں۔ یہ سب تو وہ خواب ہیں جو مفکروں نے بہترین
زندگی کے لیے اور اس دنیا کو خوبصورت بنانے کے لیے دیکھے
ہیں۔ یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوں گے۔'' کیوں بھیا! بتاؤ،
امی ٹھیک کہتی ہیں یا حکیم، فلسفی اور مفکر؟

ہاں سنو! ننھی زیب بھی بہت خوش ہے۔ ہر وقت مینا کی طرح
چہکتی رہتی ہے۔ مجھے تو بس بھابی، بھابی کہہ کر اس کا حلق سوکھتا
ہے۔ امی نے دو ایک مرتبہ اسے ڈانٹا بھی مگر میں نے منع کر دیا۔
ویسے زیب ہے بہت ذہین، کبھی کسی آنے جانے والے کے
سامنے مجھے بھابی نہیں کہتی، ایسے موقعوں پر وہ اپیا کہا کرتی
ہے۔

اچھا بھیا اجازت، تمہاری بہن یہاں بہت خوش ہے۔

تمہاری دوست، لالی

سب کچھ وہی تھا، گفتگو کا وہی سیدھا سادا انداز! ایک ایک سطر میں لالی اپنے دل کی
گہرائیوں سے بول رہی تھی۔ اس خط میں اس نے میرے متعلق، ایک سطر میں بھی اپنے کسی
جذبے کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن پھر بھی یہ خط اس امر کا غماز تھا کہ اس نے کس جذبے اور کس
کیفیت کے ساتھ وہ خط تحریر کیا تھا۔ میری آنکھوں میں جمع ہونے والے آنسوؤں سے لالی
کی تحریر کے تمام الفاظ گڈمڈ ہو کر بے شمار ذروں میں بکھر گئے۔ سب کچھ سراب ہو گیا تھا،
میرے ہاتھ کچھ نہ لگا تھا۔ صرف چمکیلی ریت کے ذرے میری مٹھی میں تھے اور کچھ نہیں، کچھ
بھی نہیں۔ میں نے اس خط کو بڑی احتیاط سے تہہ کر کے لفافہ مہندر کی طرف بڑھا دیا۔
''نہیں دوست!'' مہندر نے کہا۔ ''یہ تمہارے لیے ہے۔'' مہندر کا لہجہ دکھی تھا۔ سو
لالی کی ذات سے وابستہ، اس کی چتا کا آخری پھول تھا جو میں نے چنا۔ یہ پھول آج بھی
میرے پاس ہیں اور مجھے بہت عزیز ہیں۔

بڑی دیر تک کمرے میں سکوت طاری رہا، پھر مہندر نے اس خاموشی کو توڑا۔ ''میں نے تمہاری محبت اور اپنی بہن کے قاتلوں سے انتقام لے لیا ہے۔''

ایسا ہی جملہ اس نے لالی کی چتا کی راکھ کے قریب کھڑے ہوئے مجھ سے کہا تھا۔

اسی رات کے آخری پہر میں، اسی مہمان خانے میں سالار اعظم بھی پہنچ گیا۔ سیاہ نقاب سے چمکتی آنکھوں نے کمرے اور ماحول کا جائزہ لیا اور پھر اس نے کہا۔ ''میرے بیٹو! میں تمہارے دکھ سے واقف ہوں اس لیے کہ اس غم کا داغ میرے دل پر بھی ہے مگر یاد رکھو ہم ایک حقیقی جنگ میں مصروف ہیں۔ یہ جنگ کوئی ڈراما نہیں ہے، ہماری زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور تم جانتے ہو کہ جنگ میں بہت سے دوست کام آتے ہیں۔ لالی کا غم اپنی جگہ مگر ہمیں اس مقصد کو عزیز رکھنا ہے جس کے لیے لالی نے اپنی جان دے دی لیکن مقصد کو قربان نہیں کیا۔ اس کے لیے زندگی کا سودا کرنا کچھ مشکل نہ تھا۔ اذیتیں جب اس کے لیے ناقابل برداشت ہوگئیں تو اس نے اپنی جان دے دینے کا فیصلہ کیا اور ہندوستان کی عظیم حریت پسند خواتین میں اپنا نام درج کرا لیا۔''

''ہمیں اپنا مقصد اسی طرح عزیز ہے جیسے لالی کو تھا۔'' مہندر نے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔'' سالار اعظم نے کہا۔ ''آفاق نے آج جو حرکت کی ہے، وہ تنظیم کے مفاد میں نہیں۔ آفاق نے یہ حرکت اپنے ذاتی عناد کی بنا پر کی ہے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ہم اپنی ذات کو اجتماعیت میں گم کر چکے ہیں۔ ہمارے اپنے انفرادی مسائل بے حقیقت ہو چکے ہیں۔ ہم ایک بڑی مشین میں چھوٹے چھوٹے کل پرزوں کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔''

میں خاموشی سے اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔

''آفاق بیٹا!'' سالار اعظم نے اتنی محبت سے کہا کہ مجھے اپنا وجود پگھلتا محسوس ہوا۔ ''میں تمہیں سرزنش نہیں کر رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ جس دکھ سے تم گزرے ہو اس کے بعد انسان اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے۔ یہ سب کچھ ہو کر بھی تم انسان ہو۔ تمام انسانی کمزوریاں تمہارے ساتھ ہیں مگر سوچو، اگر اس موقع پر تمہارے ساتھی موجود نہ ہوتے تو کیا تم اتنی آسانی کے ساتھ وہاں سے نکل سکتے؟''

''جی، میں نے......'' میں نے کچھ کہنا چاہا۔

''یقیناً تم نے وہاں کے ماحول کا جائزہ لیا ہوگا اور شکیل کے مکان کو فرار کی راہ کے طور پر اختیار کرنے کا فیصلہ بھی کیا ہوگا۔ پھر بھی تمہارے ساتھیوں نے جو وہاں موجود تھے،

فرار ہونے کی مہلت دینے کے لیے ہنگامہ کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے تم آسانی کے ساتھ ے فرار ہوگئے۔''

''مگر جناب، میں تصدق کو نہیں چھوڑوں گا۔'' میں نے کہا۔

''ہوں!'' سالار نے گہرا سانس لیا۔ ''میں تمہیں اس سے نہیں روکوں گا لیکن تمہیں کرنا ہوگا کہ تم اپنا یہ انتقام اس طرح لو گے کہ غیر ضروری طور پر خطرے مول لے کر لاکت میں نہ ڈالو، نہ تنظیم کے عظیم تر مقاصد پر اس انتقام کو فوقیت حاصل ہو سکے۔''

اعظم خاموش ہو گیا، گویا وہ مجھ سے اپنے اس جملے کا جواب چاہتا تھا۔

''جی ہاں، میں وعدہ کرتا ہوں، ایسا ہی ہوگا۔''

ٹھیک ہے۔'' سالار نے کہا۔ ''اب میں تمہیں اس مہم کے بارے میں بتاتا ہوں جس لیے ہم کئی ماہ سے تیاریاں کر رہے ہیں اور جس کی خاطر تمہیں نینی تال کے علاقے کی ت اور بربا کے سفر پر بھیجا گیا تھا۔ ہماری یہ مہم اس سال سردیوں میں شروع ہوگی۔ ے ساتھی اس مہم کے لیے تیاریوں میں مصروف ہیں اور کل اس سلسلے میں سشما بھی ہاں جا رہی ہے۔''

میں نے سشما کی طرف دیکھا تھا۔ اس کے سانولے چہرے پر عزم تھا۔

''سشما ایک بہت دلیر اور جری لڑکی ہے۔ پچھلے ہفتے اس کا بھائی کلکتے میں انگریز ے مقابلہ کرتے ہوئے گولی کا نشانہ بن کر موت کی وادی میں پہنچ گیا ہے مگر اس کے ا میں کوئی لغزش نہیں آئی۔''

میں نے دیکھا تھا، سشما کی آنکھوں سے ستارے ٹپ ٹپ کر گر رہے تھے۔

''اس علاقے میں جہاں تم نے تعمیراتی کام ہوتے دیکھا تھا آفاق، وہاں انگریز یائی اسلحہ کا کارخانہ قائم کر رہے ہیں۔'' سالار اعظم چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ رخانے کی تعمیر کے لیے وہ مقام اس لیے چنا گیا ہے کہ کیمیائی اسلحہ کی تیاری میں ہونے والا خام مواد وہاں دستیاب ہے۔ انگریز، اس کی تعمیر، جرمن اور ترک جنگی ے کرا رہے ہیں۔''

''مگر جناب، انہوں نے یہ فیکٹری برطانیہ میں کسی جگہ کیوں نہ لگوائی؟'' مہندر نے

س کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ برطانیہ میں ایسا اسلحہ تیار کرنے کے لیے، وافر مقدار میں تا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جنگ کے سبب برطانیہ میں جاسوسوں کا جال پھیلا

ہوا ہے۔ پھر برطانیہ کے سیاستدانوں اور جنگی ماہرین کا خیال ہے کہ اگرچہ جنگ ختم ہو گئی
ہے، جرمنی کو شکست ہوئی ہے لیکن جرمنی اس شکست کو ایک دائمی حقیقت کے طور پر تسلیم نہیں
کرے گا بلکہ وہ بہت جلدی اس شکست کا انتقام لینے کی کوشش کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ
انگریزوں نے یہ اسلحہ ساز کارخانہ، ہندوستان کے ایک دور افتادہ علاقے میں لگایا ہے۔ تاکہ
اس وقت برطانیہ میں سرگرم عمل جرمنی کے جاسوسوں کو اس کی سن گن نہ لگ سکے۔ اور
اس لیے بھی کہ مستقبل میں ہونے والی جنگ میں جرمن، اس تک آسانی سے نہ پہنچ سکیں۔
ان کا اندازہ ہے کہ آئندہ جنگ بیس بائیس سال بعد متوقع ہے۔''

''مگر اس کے لیے موسم سرما کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے جب کہ وہ موسم اس مہم کو
زیادہ دشوار بنا دے گا؟'' میں نے دریافت کیا۔

''اس لیے کہ اگلے دو تین ماہ میں یہ فیکٹری مکمل ہو جائے گی۔ ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ
اس فیکٹری کو اس وقت تباہ کیا جائے جب یہ مکمل ہو کر اپنا کام شروع کر دے تاکہ ان کی
کوشش قطعی طور پر ناکام ہو جائے۔ اس کے علاوہ ایسا فیصلہ کرنے کا ایک اور سبب بھی ہے۔
ہمیں پتا چلا ہے کہ کیمیائی اسلحہ کا یہ فارمولا ایک جرمن سائنسداں کے ذہن کی اختراع ہے۔
انگریزوں نے اس سائنسداں کو عین اس وقت اغوا کیا، جب وہ اس فارمولے کا کامیاب
تجربہ کر چکا تھا۔ اس کا معاون دراصل ایک انگریز سائنس داں تھا اور اسی نے اس کے اغوا
کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ اس سائنس داں کو جرمنی سے اغوا کر کے سیدھا ہندوستان پہنچایا گیا۔
اسے ہندوستان میں کہاں رکھا گیا ہے، اس کا علم صرف وائسرائے کو ہے۔ کہا جاتا ہے کہ
نینی تال کے علاقے میں تعمیر ہونے والی اسلحہ ساز فیکٹری کا نقشہ اس سائنس داں ہی کی مدد
سے تیار کیا گیا ہے۔ کیمیائی اسلحہ کی تیاری کا فارمولا اس کے ذہن میں ہے۔ لاکھ تشدد کے
باوجود اس نے یہ فارمولا انگریزوں کو نہیں بتایا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ کسی بھی صورت میں
فارمولا کسی کو نہیں بتائے گا لیکن تشدد کے سبب وہ اس بات پر راضی ہو گیا ہے کہ جب تک
زندہ ہے، اس فارمولے پر عمل درآمد کرتے ہوئے مطلوبہ مہلک بم تیار کرتا رہے گا۔ ان کا
خیال ہے اس طرح وہ اس ہتھیار کی ہلاکت آفرینی کو محدود کر سکے گا۔''

ہم سب کے دل یقیناً تیزی سے دھڑک رہے تھے۔

''یہ ہماری سب سے اہم مہم ہوگی۔'' سالار نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ ''اس فیکٹری کو
مکمل طور پر تباہ کرنے کے لیے ضروری اسلحہ، اس مہم کے آغاز سے بہت پہلے اس علاقے
میں تمہارے مستقر پہنچ جائے گا۔ نینی تال کے مضافات میں سیاحت سے متعلق کوہستانی نے

جو رپورٹ پیش کی ہے، اس کے مطابق ہم نے اس علاقے میں بعض غاروں کو اپنے
اور مستقر بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس وقت تک کوہستانی ان غاروں میں یہ گولہ بارود
جمع کر چکا ہوگا۔ ان دنوں وہ اسی کام میں مصروف ہے۔ اس کام میں تمہارا دوست
طارق بیگ بھی اس کے ساتھ شامل ہے۔''

''طارق بیگ؟'' میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔ یہ نام میرا جانا پہچانا تھا مگر فوری
طور پر اس نام کے ساتھ کوئی شخصیت وابستہ نہ کر سکا۔ میری یادداشت میں یہ نام محفوظ تھا۔

''وہی نوجوان جو نینی تال کے مضافات کی سیاحت میں تمہیں ملا تھا۔ جس کا دادا
اقبال بخت کے ساتھ......''

''جی ہاں، یاد آ گیا۔'' میں نے کہا۔ ''تو کوہستانی نے اس سے رابطہ قائم کر ہی لیا!''

''ہاں، وہ بڑے پُرجوش انداز میں ہمارا ساتھ دے رہا ہے۔ اس کی وجہ سے
کوہستانی کو اس علاقے میں بہت آسانی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے وہ علاقہ اس کا دیکھا بھالا بھی
ہے۔ پھر وہ اس علاقے کی بولی سے بھی واقف ہے۔ وہ خوش ہے کہ اپنے دادا کے نقش قدم
پر چلتے ہوئے وہ انگریزوں کے خلاف مصروف جہاد ہے۔ میں نے مراد آباد میں، اس کے
بچھڑے عزیزوں کے بارے میں معلومات کی ہیں۔ اس کے دادا کا سگا بھائی اب بھی وہاں
ٹھاکر کے علاقے میں ہے۔ کوہستانی کے ذریعے میں نے اسے اس کے بچھڑے ہوئے
خاندان والوں کی تصاویر بھیجی ہیں اور وہ خوش ہے کہ ایک مرتبہ پھر اپنے لوگوں سے آ ملے

''میں ایک بات اور پوچھنا چاہتا ہوں جناب!'' میں نے کہا۔ ''حالانکہ مجھے یہ
نہیں پوچھنا چاہیے۔''

''پوچھو!'' سالار نے بڑی محبت سے کہا۔

''اس فیکٹری سے متعلق ہماری معلومات کا ذریعہ کیا کیمبر لے بنا ہے؟'' میں معلوم
کرنا چاہتا تھا کہ ہماری وہ مہم کتنی کامیاب رہی۔

''کسی حد تک!'' سالار نے کہا۔ ''وہ دبلا پتلا منحنی شخص، بڑے مضبوط اعصاب کا
ثابت ہوا۔ وہ واقعی اپنے تنگ سینے کے چھوٹے سے پنجرے میں شیر کا دل رکھتا تھا۔
اس نے ہمیں جھوٹی سچی باتیں بتائی تھیں لیکن ان سے بہر حال ہمیں ایسے اشارے مل گئے
جو ہمارے لیے بنیادی اہمیت کے حامل تھے۔ اسی کے بعد تمہیں نینی تال کے علاقے کی
سیاحت پر بھیجا گیا تھا۔ پھر باقی معلومات ہم نے اپنے ذرائع سے حاصل کی تھیں۔

انگریزوں میں بھی غدار ہو سکتے ہیں۔ آج بھی ہندوستان میں موجود بہت سے انگریز افسر، وارن ہیسٹنگز کی طرح دولت کی ہوس رکھتے ہیں۔''

''تو کیا بعض انگریزوں نے بھی اس بارے میں کچھ اطلاعات دی ہیں؟'' سشما نے پوچھا۔

''صرف ایک انگریز نے!'' سالار نے کہا۔ ''بہرحال کوہستانی نے اس علاقے میں اپنے اب تک کے کام کے بارے میں جو رپورٹ دی ہے، یہ اس کی نقل ہے۔'' سالار اعظم نے ایک لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم اس رپورٹ کا مطالعہ کرو۔ اس میں اس فیکٹری کا نقشہ بھی ہے جو کوہستانی نے کسی طرح حاصل کیا ہے۔ تم اس رپورٹ اور نقشے کا بغور مطالعہ کرو اور سوچو کہ اس فیکٹری کی تباہی کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے! ایسا ایک منصوبہ کوہستانی بھی تیار کر رہا ہے۔ میں بھی اپنے طور پر سوچ رہا ہوں۔ تم دونوں بھی اپنے طور پر اسکیم تیار کرو۔ ہم سردیوں میں نینی تال کے مضافات میں، اپنی مہم کے مستقر پر پہنچ کر ان تینوں منصوبوں پر غور کریں گے اور یہ فیصلہ کریں گے کہ کون سا منصوبہ قابل عمل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس فیکٹری کی تباہی کے لیے ہمارے پاس تین متبادل منصوبے ہوں جن میں موقع پر معمولی ردوبدل کی جا سکے۔''

''اس عرصے میں ہم کیا کریں گے؟'' مہندر نے سوال کیا۔

''اب سے دو ماہ بعد تم دونوں شملے پہنچو گے اور وہاں کے پہاڑی علاقے میں زندگی گزارنے کی مشقیں کرو گے۔''

''اور یہ دو ماہ؟'' مہندر نے دریافت کیا۔

''تمہارے والد، سیٹھ وشواناتھ ان دنوں پراودہ جیل میں ہیں۔ انگریز حکام ان پر اتنا تشدد کر رہے ہیں کہ ان کا بچنا محال ہے۔ ان کا پیغام مجھے ملا ہے۔ وہ ایک مرتبہ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اور آفاق دونوں ہی ان سے ملاقات کرو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ان سے ملاقات تمہارے لیے خطرے کا سبب بن سکتی ہے۔ تم گرفتار ہو سکتے ہو، پھر بھی میں نے تمہاری اور سیٹھ وشواناتھ کی ملاقات کی ایک صورت نکالی ہے۔ تم دونوں آج سے ٹھیک دس دن بعد احمد آباد پہنچ کر گاندھی جی کے سابق سیکرٹری اندولال یاجنک سے ملاقات کرو گے۔ وہ تمہیں بتائے گا کہ تم سیٹھ وشواناتھ سے کیسے مل سکتے ہو۔'' یہ کہہ کر سالار نے مہندر کا شانہ تھپتھپایا۔

پھر سالار اٹھ گیا۔ چلنے سے قبل اس نے سشما سے کہا تھا۔ ''کل تمہیں نینی تال

روانہ ہونا ہے۔ میں نے مصرا جی کو بتا دیا ہے، صبح کو ہسانی تمہیں لینے آئے گا۔''

''اچھا جی!'' سشما نے کہا۔

''تم بہادر بھائی کی بہن اور بہادر باپ کی بیٹی ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ اس مہم میں تم نے ہمارا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔''

''یہ میرے بھائی کی خواہش بھی تھی اور میری بھی۔'' سشما نے کہا۔

اس کے بعد وہ رات آنکھوں ہی آنکھوں میں کٹ گئی۔ سشما واقعی بہت جری لڑکی تھی۔ بھائی کی موت کا غم تازہ تھا لیکن اس کے عزم میں کوئی کمی نہیں تھی۔ ایک مرتبہ جب میں نے کچھ کہنا چاہا تھا تو سشما نے کہا تھا۔ ''مسٹر آفاق! ہم فریڈم فائٹر ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ ہمیں اس جنگ میں مر کھپ جانا ہے۔ موت ہمارے لیے ایک ایسی معلوم حقیقت ہے جس کا علم ہم سے زیادہ کسی کو نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ موت کسی نہ کسی دن آنا ہے، کسی بھی لمحے آ سکتی ہے، اس کے باوجود وہ طویل عمری چاہتا ہے اور موت کو خود سے دور سمجھتا ہے اور ہم، ہم جانتے ہیں کہ اگلے لمحے کوئی ایسی بات ہو سکتی ہے جو ہماری زندگی کا سلسلہ منقطع کر سکتی ہے۔ موت کو اتنے قریب دیکھ کر ہی تو ہم میں دلیری پیدا ہوتی ہے۔''

میں اس وقت ان دونوں کے درمیان اپنے وجود کو فاضل سمجھ رہا تھا۔ مہندر اور سشما ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے، بس ایک دوسرے کو دیکھے جا رہے تھے۔ میں اٹھ گیا۔

میں ذرا باہر ٹہلنے جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

مہندر مسکرایا۔ ''میں جانتا ہوں آفاق، تم اس وقت کیا سوچ رہے ہو؟'' اس نے کہا۔ ''ہماری محبت بھی تمہاری اور لالی کی محبت کی طرح ہے، صاف، بے داغ اور بے ریا۔ تم فکر نہ کرو۔ باہر جانے میں خطرہ ہے۔''

''نہیں میں جا رہا ہوں۔'' میں نے دلگیر لہجے میں کہا۔

''تم نہ جاؤ گے آفاق! اس وقت ہم ذرا سی بے احتیاطی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔''

''نہیں مہندر!'' میں دروازے کی طرف بڑھا۔

''تم نہیں جاؤ گے!'' مہندر نے بڑھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''میں تم دونوں کو تنہائی میں ملنے کے موقع فراہم کرتا تھا اس لیے کہ لالی میری بہن تھی۔ پھر مجھے لالی پر بھی اعتماد تھا اور تم پر بھی۔ میں جانتا تھا کہ تم دونوں جذبات کو بے لگام نہیں ہونے دو گے۔''

''مہندر! پرماتما کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔'' میں نے کہا۔

''تم نہیں جاؤ گے آفاق!'' مہندر نے کہا۔ یہ کہہ کر اس نے میرے سامنے جھک کر سشما کے ہونٹوں کی لالی چرالی۔ میری نظریں جھک گئیں۔ ''تم اسی وجہ سے جا رہے تھے۔'' اس نے کہا۔ ''چلو بیٹھ جاؤ۔''

میں پلنگ پر کروٹ بدل کر لیٹ گیا اور سسکیاں لینے لگا۔

وہ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے اور میں لالی کے تصور میں کھویا رہا۔ مجھے معلوم نہیں ان دونوں نے کیا باتیں کیں، کیا کہا۔ وہ دونوں کئی ماہ کے لیے بچھڑنے والے تھے اور انہیں نہیں معلوم تھا کہ اس کے بعد وہ پھر مل بھی سکیں گے یا نہیں۔ ان کی بے تابی اور بے قراری ظاہر تھی۔ میں ایسے جذباتی ہیجان سے گزر چکا تھا۔ غیر یقینی مستقبل کے ساتھ بچھڑنے والے بہت ہی زیادہ مضطرب ہوتے ہیں۔ جدائی کے ایسے کرب ناک لمحوں میں دو چاہنے والے ایک دوسرے میں کھو جاتے ہیں۔

صبح جب سشما نے مجھے جھنجھوڑا تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''بھیا!'' وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

''بھابی، میری پیاری بھابی!'' میں بھی زیادہ کچھ نہ کہہ سکا۔

کوہستانی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ وہ اس وقت دروازے میں کھڑا تھا۔

''مجھے افسوس ہے کامریڈ!'' اس کی آواز ابھری۔ ''لالی......''

''اسے چھوڑو میرے دوست! یہ سشما میری بھابی ہے۔ میں اپنی بھابی تم سے لوں گا۔ میں نہیں چاہتا کہ لالی کی طرح اپنی بھابی کو بھی کھو دوں۔''

مہندر اور کوہستانی نے میرے شانے پر اپنے پیار بھرے ہاتھ رکھے، پھر کوہستانی نے کہا۔ ''میں اپنی بھابی کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کروں گا۔''

''اور میں تمہارے بھائی پر قربان ہونے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔'' سشما نے کہا۔

مہندر اور سشما نے ایک دوسرے کو الوداعی بوسہ دیا، پھر سشما، کوہستانی کے ساتھ تاریک گلی میں اتر گئی۔

☆======☆======☆

تصدق حسین پر قاتلانہ حملہ معمولی بات نہ تھی۔ پولیس اور انتظامیہ نے پورا لکھنؤ پٹ رکھا تھا۔ منصور بھی گرفتار کر لیا گیا تھا اور پولیس اس سے پوچھ گچھ کر رہی تھی۔ کچھ افراد نے مخبری کی تھی کہ خان بہادر تصدق حسین پر جس شخص نے حملہ کیا تھا اسی حلیے کے آدمی کو دو تین مرتبہ منصوبہ کے گھر میں داخل ہوتے دیکھا گیا تھا۔ ظاہر ہے، وہ حلیہ ہی ایسا تھا کہ لکھنؤ جیسے

روایات اور معاشرت کے پابند شہر میں نمایاں ہو کر نظر آتا تھا۔

یہ اطلاعات ہمیں سہ پہر کو خود ہر کرن ناتھ مصرا نے دی تھیں اور مشورہ دیا تھا کہ ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ کسی نہ کسی طرح جلد از جلد لکھنؤ سے نکل جائیں۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ پولیس ایک ایسے نوجوان کی تلاش میں بھی ہے جو گزشتہ روز ریلوے ہسپتال میں مریض بن کر داخل ہوا تھا اور رات کو غائب ہو گیا تھا۔ یہ خبریں اس لیے پریشان کن تھیں کہ بے چارہ منصور صرف میری ہمدردی کی وجہ سے پولیس کے ظلم وستم کا نشانہ بن گیا تھا۔

پھر وہ مہربان رات آ گئی جو اس وقت ہمارے لیے ماں کی آغوش کی مانند تھی۔ ہرکرن ناتھ مصرا سے رخصت ہو کر ہم رات کی تاریکی میں باہر آ گئے۔ ہم نے اسی رات لکھنؤ چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا لیکن لکھنؤ چھوڑنے سے قبل ہم نے لکھنؤ میں ایک اور کام کرنے کا تہیہ بھی کر رکھا تھا اور یہ کام تھا، خان بہادر تصدق حسین سے لالی کا انتقام لینا!

ہم اس وقت اسلحہ سے خاصے لیس تھے۔ ہمارے پاس چار پستول تھے، چاروں میں گولیاں بھری ہوئی تھیں، اسی کے ساتھ ہمارے پاس فالتو راؤنڈ بھی تھے۔ مہندر کے پاس ایک تھیلے میں چھ دستی بم بھی تھے۔ یہ تمام اسلحہ مہندر کو سشما نے دیا تھا۔ ہم دونوں عمارتوں کی دیواروں کے ساتھ لگے لگے محتاط انداز میں بٹلر ہاؤس کی طرف بڑھتے رہے۔ ابھی ہم ایک موڑ پر گھومے ہی تھے کہ دو سپاہی ہمارے سامنے آ گئے۔ وہ دونوں اپنی بندوقیں کاندھوں پر لٹکائے آپس میں گفتگو کرتے جا رہے تھے۔ وہ ہمارے پاس گزر گئے۔ ہم نے ماحول کا جائزہ لیا۔ ہر طرف سناٹا اور تاریکی تھی۔ دور پاس، کہیں کسی شخص کا نشان نہ تھا، پھر ہم ان کے پیچھے ہو لیے اور انہیں پستول سے دھکا کر ایک سمت لے چلے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک مسجد تھی جس کے پہلو میں ایک کنواں بنا ہوا تھا۔ کنویں کے پیچھے املی کا گھنا پیڑ تھا۔

جان کس کو پیاری نہیں ہوتی۔ وہ خاموشی سے وہی کرتے رہے جو ہم ان سے کہہ رہے تھے۔ سب سے پہلے ان سے ایک دوسرے کے منہ بندھوائے گئے، پھر ان کی وردیاں اتروالی گئیں۔ اس کے بعد ان کے ہاتھ پیر باندھ دیے گئے تب ہم نے اپنے کپڑے اتار کر ان کی وردیاں پہن لیں اور پورے طور پر سپاہی بن گئے۔ دونوں کو کنویں کی منڈیر کے ساتھ لگی ہوئی چرخی میں لپٹی ہوئی رسی سے بستر کی طرح باندھ کر کنویں میں لٹکا دیا گیا اور ہم آرام سے بٹلر ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب فوری طور پر ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ رات کی تاریکی میں چہرے سے زیادہ ہمیں اپنی وردی سے پولیس کا مسلح

سپاہی سمجھا جاتا۔

بٹلر ہاؤس کے جس حصے میں خان بہادر تصدق حسین مقیم تھا، اب ہمارے سامنے تھا۔ اس طرف حفاظتی انتظامات غیر معمولی ہی نظر آئے۔ گیٹ پر مسلح سپاہی موجود تھے۔ ہم ادھر سے گزرتے ہوئے مشرق کی سمت میدان کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ کونے پر بنے ہوئے مچان پر ایک مسلح فوجی پہرا دے رہا تھا۔

میں نے گزرتے ہوئے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ اس نے نیچے دیکھ کر ہماری طرف جواب میں ہاتھ ہلایا اور پھر اپنی جگہ مستعد کھڑا ہوگیا۔ اب ہم نسبتاً تاریکی میں تھے۔

''آج تو بہت زیادہ چوکسی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''پچھلی مرتبہ جب ہم داخل ہوئے تھے تو ایسا نہیں تھا۔''

اس وقت ہم ایک درخت کے نیچے سے گزر رہے تھے کہ درخت پر سے ٹارچ کی روشنی پھینکی گئی۔

''کون ہے؟'' میں نے سوال کیا، ساتھ ہی ٹارچ کی روشنی اوپر ڈالی۔ درخت میں بنے ہوئے مچان پر ایک سپاہی موجود تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' اوپر سے کہا گیا۔

''کوئی خاص بات؟'' مہندر نے پوچھا۔

''ہر طرف سناٹا ہے۔'' اوپر سے کہا گیا اور ہم آگے بڑھ گئے۔

ہم نے بٹلر ہاؤس کا پورا چکر لگالیا۔ واقعی بہت سخت پہرا تھا، چڑیا پر نہیں مار سکتی تھی۔

''یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔'' مہندر نے کہا۔

''وہ کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلے تم نے بسمل کے ساتھ بٹلر ہاؤس پر چھاپا مارا تھا، پھر کل صبح تم نے تصدق حسین پر حملہ کیا۔'' مہندر نے جواب دیا۔

''سوال یہ ہے، اب کیا ہوگا؟'' میں نے کہا، ''میرے لیے یہی خیال سوہانِ روح ہے کہ لالی کا قاتل اس دیوار کے پار ہے اور میں کچھ نہیں کرسکتا۔'' میں واقعی اس وقت سخت الجھن میں تھا۔ گیٹ سے اندر پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جس درخت کو میں بسمل کے ساتھ چند دن پہلے بٹلر ہاؤس میں داخل ہونے کا ذریعہ بنا چکا تھا، اس پر بھی اس وقت پہرا تھا۔

''بس ایک ترکیب ہے۔'' مہندر نے کہا۔ اس وقت ہم پھر مشرقی میدان کے ساتھ

[illegible] جانے والی دیوار کے ساتھ ساتھ اسی درخت کی طرف بڑھ رہے تھے جس پر ایک سپاہی موجود تھا۔ ''تمہارے پاس غلیل ہے؟'' مہندر نے پوچھا تھا۔

''ہے، اور اس کے اسپیشل کارتوس بھی!'' میں نے کہا۔

''لاؤ مجھے دو۔'' مہندر نے کہا۔ ''درخت کے نیچے پہنچ کر تم ٹارچ کی روشنی اس پر ڈال کر باتیں کرنا۔ اس دوران میں میری کوشش یہی ہوگی کہ تاک کر ایسا نشانہ لگاؤں کہ وہ بغیر آواز نکالے ڈھیر ہوجائے۔''

''اگر اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہوا؟'' میں نے ایک امکانی خطرے کی طرف نشاندہی کی۔

''وہ تو جب تم اس سے باتیں کروگے تو پتا چل جائے گا۔'' مہندر نے جواب دیا۔ ''اس وقت صرف یہی ایک ترکیب میری سمجھ میں آئی ہے۔ اگر کوئی اور بھی ہوا تو ہمیں کچھ اور ترکیب کرنا پڑے گی۔''

پھر میں چند قدم آگے نکل گیا۔ اب میں اس درخت کے نیچے تھا۔ ''سب کچھ ٹھیک ہے۔'' میں نے روشنی اوپر ڈال کر پوچھا۔

''ہاں سب ٹھیک ہے۔'' اوپر سے کہا گیا۔ ''تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟''

''وہ ذرا پیشاب کرنے بیٹھ گیا ہے۔'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ڈر کے مارے سالے کا پیشاب ہی اترا چلا آرہا ہے۔''

اوپر سے پہلے ہنسی کی آواز ابھری تھی جس کا اختتام ہلکی سی کراہ پر ہوا۔ مہندر کا نشانہ ٹھیک بیٹھا تھا۔ سپاہی درخت پر سے بغیر آواز نکالے نیچے آرہا تھا اور بعد کی آواز کے ساتھ زمین پر گرچکا تھا۔ اس کے بعد اسے اچھی طرح باندھ کر جھاڑیوں میں ڈالنا اور رسی کے سہارے درخت پر بنے ہوئے مچان پر پہنچنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ اس تمام کارروائی میں ہمیں [illegible] منٹ لگے تھے مگر محسوس ایسا ہو رہا تھا جیسے ایک زمانہ بیت گیا ہو۔ اس مچان سے ہم ایک رسی کے سہارے بٹلر ہاؤس کے احاطے میں اتر گئے۔

وسیع و عریض اور خوب صورت لان میں کراٹے کی باڑھ سے روشیں بنائی گئی تھیں۔ [illegible] کے ساتھ ساتھ قطعات کے اندرونی حصوں میں پھولوں کے تختے تھے۔ ہم دونوں [illegible] والوں کے مخصوص انداز میں اندر روشوں پر بڑھتے رہے۔ صرف ساٹھ ستر گز کے فاصلے پر بٹلر ہاؤس کا مہمان خانہ تھا جس میں خان بہادر تصدق حسین مقیم تھا۔

ہم نے چاروں طرف سے گھوم کر گیسٹ ہاؤس کا جائزہ لیا۔ ہم اس عمارت سے دور

ہی دور تھے تاکہ کوئی شخص ہمیں قریب سے نہ دیکھ پائے۔ ہم دراصل یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ اس وقت تصدق حسین اس گیسٹ ہاؤس کے کس حصے میں موجود ہے۔ اس وقت ہم چکر لگاتے ہوئے گیسٹ ہاؤس کے سامنے والے حصے کی طرف آ نکلے تھے کہ تصدق حسین نظر آ گیا۔ وہ ڈرائنگ روم میں چند افراد کے ساتھ بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا۔ اس کے گلے پر ایک پٹی پڑی ہوئی تھی اور اس کا بایاں ہاتھ اس پٹی کے سہارے لٹکا ہوا تھا۔

اسے دیکھ کر میرے جسم میں جھرجھری ہی تو آ گئی۔ مہندر شاید میرے اس جذباتی ہیجان سے آگاہ تھا اسی لئے اس نے میرا شانہ دبا کر مجھے ذرا دیر انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔ ہم ٹہلتے ہوئے ادھر سے گزر کر پھر اسی جگہ آ گئے جہاں سے بٹلر ہاؤس کے احاطے میں داخل ہوئے تھے۔

''واپسی کے بارے میں کچھ سوچا؟'' مہندر نے پوچھا۔

''واپسی کے بارے میں؟'' میں نے سوالیہ انداز میں کہا۔ ''کیا یہ راہ مناسب نہیں۔'' میں نے اسی سیڑھی کی طرف اشارہ کیا جو درخت پر بنے ہوئے مچان تک جاتی تھی۔

''ہاں یہ بھی ہے، لیکن ہمیں یہاں سے بہت تیزی کے ساتھ نکلنا ہوگا۔'' مہندر نے کہا۔

''اس احاطے سے نکلنے کے بعد دیکھا جائے گا۔'' میں نے مہندر سے کہا۔ اس وقت مجھے اس کی یہ احتیاط پسندی بالکل نہیں بھائی تھی۔

''دوسری طرف کاریں کھڑی ہیں۔'' مہندر نے کہا۔ ''کیا خیال ہے اگر ہم یہاں سے کسی کار میں فرار ہو جائیں۔''

''ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن دھماکے کے بعد کیا ایک دم گیٹ بند نہیں کر دیا جائے گا؟''

''اول تو اس افراتفری میں کوئی بھی فوری طور پر کوئی فیصلہ ہی نہ کر پائے گا، پھر بھی اگر ایسا ہوا تو ہماری یہ وردیاں ہماری محافظ بن سکتی ہیں۔'' مہندر نے جواب دیا تھا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں یہی کرنا چاہیے۔''

اس وقت پیڑ پر پیچھے سے ٹارچ کی روشنی پھینکی گئی جس کے ذریعے ہم بٹلر ہاؤس کے احاطے میں داخل ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ ایک آواز بھی ابھری۔ ''خان محمد! کہاں ہو تم؟''

آواز دینے والے نے شاید اس خان محمد کو آواز دی تھی جو اس مچان پر پہرا دے رہا تھا۔ اس کے بعد ہی ایک اور ٹارچ کی روشنی مچان پر پڑی۔ پھر سیٹیاں گونج اٹھیں۔ گویا ہمارے فرار کی یہ راہ مسدود ہو چکی تھی۔ میں نے مہندر کا بازو پکڑا اور ہم دونوں تیزی کے ساتھ اس مقام سے ہٹ گئے۔ سیٹیوں کی آواز کے ساتھ ہی ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ ...دوڑ کر اسی سمت آ رہے تھے اور ہم گیسٹ ہاؤس کے مغربی پہلو میں پہنچ گئے تھے۔

''تم اپنا کام کرو۔'' مہندر نے کہا۔ ''میں کار اسٹارٹ کرتا ہوں۔''

میں نے اپنے تھیلے سے ایک دستی بم نکالا، اس کی سیفٹی پن کھینچی اور گیسٹ ہاؤس کی طرف پھینک دیا۔ ایک دھماکا ہوا۔ میں اسی دوران میں دوسرے دستی بم کی سیفٹی پن کھینچ چکا تھا۔ اس وقت میری نظر ڈرائنگ روم کے سامنے والے برآمدے پر پڑی، خان بہادر تصدق حسین اور اس کے مہمان وہیں دہشت زدگی کے عالم میں موجود تھے۔ دوسرا دستی بم میں نے برآمدے کی طرف پھینکا تھا اور لپک کر کار میں بیٹھ گیا تھا جسے دھماکوں کے شور اور لوگوں کی چیخ پکار کے درمیان مہندر اسٹارٹ کر چکا تھا۔

گیسٹ ہاؤس میں ایک قیامت آ گئی تھی۔ دھماکوں سے تباہ ہونے والی عمارت، اب لوگوں کی توجہ کا مرکز تھی۔ کار، گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہی خطرہ سامنے آ چکا تھا جس کا تذکرہ میں نے مہندر سے کیا تھا۔ گیٹ پر دو فوجی موجود تھے اور دونوں، گیٹ کے ایک ایک دروازے کے دھکا دے کر بند کر رہے تھے۔ مہندر نے کار کی رفتار بڑھا دی۔

''گیٹ کھولو، گیٹ کھولو!'' مہندر نے کہا۔ ''میجر نے ڈاکٹر بلانے کو کہا ہے۔ خان بہادر زخمی ہیں۔''

دونوں فوجی متذبذب کھڑے تھے۔

''جلدی کرو، گیٹ کھولو!''

''تم کون ہو؟'' ایک فوجی نے پوچھا۔ اسی وقت دوسرے فوجی نے پہلو میں لگا ہوا پستول نکالنے کی کوشش کی تھی مگر اس سے قبل میں اپنے پستول سے گولی چلا چکا تھا۔ مہندر نے دوسرے فوجی کو نشانہ بنایا تھا۔ پھر میں نے کار سے اتر کر گیٹ کا ایک دروازہ جو بند ہو چکا تھا، کھول دیا۔ مہندر نے کار کو گیٹ سے نکالا، میں لپک کر کھلے دروازے سے کار میں بیٹھ گیا۔ اسی وقت عقب سے دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ وہ کئی افراد تھے۔

''ہالٹ!'' ادھر سے کہا گیا، پھر گولیاں سنسناتی ہوئی آئیں مگر اس وقت تک کار گیٹ سے مڑ کر ہوا ہو چکی تھی۔

رات کے دو بج رہے تھے جب ہم پولیس کی وردی پہنے ہوئے پلیٹ فارم پر آئے۔ہم نے کار کو اسٹیشن سے خاصی دور ایک تاریک گلی میں چھوڑ دیا تھا اور اسٹیشن پہنچ کر انٹر کلاس کا، بمبئی کا ٹکٹ لیا تھا۔ہم نے یہی سوچا تھا کہ چند دن بمبئی میں گزار کر مقررہ دن ہم احمد آباد پہنچ جائیں گے۔

بمبئی جانے والی ٹرین کے آنے میں ابھی دو گھنٹے باقی تھے۔ہم ٹہلتے ہوئے، پلیٹ فارم کے ایک تاریک گوشے میں آ گئے۔اس وقت ہم دونوں ہی خاموش تھے اور چوکنا انداز میں چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔ہمیں یقین تھا کہ بٹلر ہاؤس میں دھماکوں کے بعد ایک مرتبہ پھر پولیس اور انتظامیہ حرکت میں آ جائے گی اور ہمیں یہ بھی احساس تھا کہ پولیس ہماری تلاش میں اسٹیشن بھی آ سکتی ہے۔

''میرا خیال ہے کہ مہندر، ہمیں فوراً یہاں سے چل دینا چاہیے۔'' میں نے کہا۔''یہ دو گھنٹے تک انتظار خطرناک ہو سکتا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''وہ دیکھو، ایک مال گاڑی آ کر لگی ہے۔اگر یہ آگے جا رہی ہے تو ہمیں اسی سے نکل جانا چاہیے۔'' میں نے کہا۔اسی وقت ایک ریلوے ملازم سگنل لیمپ لیے ہمارے پاس سے گزرا۔''اے میاں سنو!''

''جی!'' وہ پولیس کی وردی دیکھ کر ہی رعب میں آ گیا۔

''یہ مال گاڑی کب جائے گی؟''

''یہ مال گاڑی، صرف پانچ منٹ کے لیے رکے گی۔یہ اسپیشل مال گاڑی ہے، انبالہ جا رہی ہے۔''

''بس پانچ منٹ رکے گی؟ کیوں؟''

''یہ تھرو گاڑی ہے۔یہاں صرف انجن بدلنے کے لیے رکی ہے۔'' ریلوے ملازم نے کہا۔

''کیا بات ہے جی، اس گاڑی میں بڑی احتیاط کی جا رہی ہے۔اس کے ساتھ فوج کا ایک ڈبا بھی ہے۔کیا آپ بھی اسی سلسلے میں آئے ہیں؟'' ملازم نے پوچھا۔''آج تو صبح سے بہت ہلچل ہے۔''

''ہاں ہم اسی سلسلے میں آئے ہیں۔اس مال گاڑی کو بہ حفاظت لکھنؤ سے نکالنے کی ذمے داری پولیس پر بھی ہے۔ہم بھی اسی ڈیوٹی پر ہیں۔'' مہندر بولتا چلا گیا۔''ویسے تم نے

مشتبہ آدمی تو نہیں دیکھا؟ کوئی اجنبی آدمی؟''

''نہیں جی!'' اس نے کہا۔''ایسا تو کوئی آدمی نظر نہیں پڑا۔''

''ٹھیک ہے، تم جاؤ اپنا کام کرو! اور دیکھو کسی سے اس کا تذکرہ نہ کرنا کہ پولیس کسی آدمی کی تلاش میں ہے۔اگر نظر پڑے بھی تو فوراً کسی ایم پی کو یا پھر اسٹیشن ماسٹر کو اطلاع دے دینا۔''

''کیوں جی، آپ کہیں جا رہے ہیں؟''

''نہیں، ہم گشت پر ہیں نا!''

''اچھا جی!'' یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔اس کے بعد ہمیں ایک دوسرے سے کچھ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔مہندر بھی میرا ہم خیال تھا۔ہمیں فوراً یہاں سے نکل جانا تھا اور اس کے لیے یہی مال گاڑی بہترین وسیلہ بن سکتی تھی۔ہم پلیٹ فارم سے اتر کر لائن پار کرتے ہوئے اس مال گاڑی کی طرف بڑھنے لگے جو بس اب روانہ ہی ہونے والی تھی۔

یہ واقعی کوئی اہم مال گاڑی تھی۔جس وقت ہم اس مال گاڑی کے پاس پہنچے، انجن لگ چکا تھا۔فوجی تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ٹرین کے ساتھ کھڑے ہوئے تھے۔یہ ٹرین دس ڈبوں پر مشتمل تھی۔گیارھواں ڈبا فوجیوں کا تھا اور اس کے پیچھے گارڈ کا ڈبا تھا۔ہم اطمینان سے چلتے رہے۔پولیس کی وردی ہماری سب سے بڑی محافظ ثابت ہوئی تھی۔شاید وہاں موجود فوجی بھی ہمیں اس ٹرین کے حفاظتی انتظام کا ایک پرزہ سمجھ رہے تھے۔پھر ایک سیٹی بجی اور تمام فوجی لپک کر اپنے ڈبے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ہم اسی طرح اطمینان سے چلتے ہوئے گارڈ کے ڈبے کے پاس پہنچ گئے۔

''ایوری تھنگ آل رائٹ؟'' میں نے گارڈ سے پوچھا تھا۔

''ایوری تھنگ!'' گارڈ نے کہا جو ہندوستانی ہی تھا۔''آل کلیئر!''

ہم ادھر سے گھوم کر دوسری طرف پہنچ گئے۔گارڈ نے سیٹی بجائی۔

''وش یو گڈ لک!'' میں نے گارڈ سے کہا۔

''تھینک یو۔'' اس نے کہا۔ایک مرتبہ اور سیٹی بجائی اور مال گاڑی آہستہ آہستہ کھسکنے لگی۔گارڈ ہینڈل پکڑ کر باہر لٹک گیا اور سگنل لیمپ ہلانے لگا۔اس سے پہلے کہ ٹرین رفتار پکڑتی، ہم دونوں پائیدان سے چڑھ کر ڈبے میں آ گئے، گارڈ نے پلٹ کر دیکھا اور ہاتھ میں پستول دیکھ کر اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

پھر ہم اس کے ساتھ ڈبے کے اندر آ گئے۔''تم کون ہو؟ کیا چاہتے ہو؟'' اس نے

کہا۔

''ہم یہاں تمہارے سوالوں کا جواب دینے نہیں آئے، سمجھے!'' میں نے دھمکی دینے والے انداز میں کہا۔ ''یہ بتاؤ، اب یہ ٹرین کہاں رکے گی؟''

''اگلے اسٹیشن پر!'' گارڈ نے کہا۔

''جھوٹ!'' میں نے کہا اور زوردار تھپڑ مارا۔

گارڈ کو توقع نہیں تھی کہ اچانک ہی میرا ردِعمل یہ ہوگا۔ وہ بوکھلا گیا۔ ''جی شاہ جہاں پور پر۔''

''شاباش!'' مہندر نے کہا۔ ''اچھے بچوں کی طرح سچ بولتے رہو۔ اس مال گاڑی میں کیا ہے؟''

''فوجی اسلحہ، گولہ بارود۔'' گارڈ نے کہا۔ ''یہ اسلحہ انبالہ چھاؤنی جا رہا ہے۔''

ہمارا اندازہ درست ہی تھا۔ ''کتنے فوجی ہیں، اس گاڑی کے ساتھ؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''بیس۔'' گارڈ نے کہا۔ ''اور ایک میجر مگر تم کون ہو، کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''ہم وہ ہیں جنہوں نے کاکوری میں ٹرین کو لوٹا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''فری ڈم فائٹرز۔''

گارڈ کا چہرہ زرد پڑ گیا جیسے اس نے موت کو سامنے دیکھ لیا ہو۔ ''تو...... تو کیا تم اس گاڑی کو تباہ کرنا چاہتے ہو؟''

اس وقت تک ہمارے ذہن میں ایسا کوئی خیال نہ تھا۔ گارڈ کے اس جملے سے جیسے ہمیں ایک راہ سوجھ گئی۔ میں نے اور مہندر نے ایک ساتھ ہی ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ ''ابھی تک ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اب ایسا ضرور ہوگا۔''

''گاڑی شاہ جہاں پور کب پہنچے گی؟''

''چار گھنٹے بعد، صبح ساڑھے چھ بجے!'' گارڈ نے جواب دیا۔

پھر ہم نے اسے بے بس کر کے باندھ لیا۔ ہمارے پاس چار گھنٹے تھے۔ اس دوران میں ہم اس مال گاڑی کو تباہ کر سکتے تھے جس میں اسلحہ لدا ہوا تھا۔ ہمارے پاس صرف چار دستی بم تھے۔ ہمیں یقین نہیں تھا کہ یہ دستی بم مال گاڑی کے ڈبوں کی لوہے کی چادریں توڑ کر اس حد تک اثر انداز ہو سکیں گے یا نہیں کہ ڈبوں میں لدا ہوا گولہ بارود بھک سے اڑ جائے تاہم اتنا اندازہ ضرور تھا کہ دھماکے سے ٹرین الٹ جائے گی اور لوہے کے بنے

ہوئے ڈبے اتنی قوت سے آپس میں ٹکرائیں گے کہ گولہ بارود اس شدید ٹکراؤ سے پھٹ جائے گا۔ اس میں ایک خطرہ یہ تھا کہ خود ہم بھی اس گاڑی میں سوار تھے جسے ہم تباہ کرنے والے تھے۔ ہم گاڑی کو تباہ کرنے کے مختلف طریقوں پر غور کرتے رہے، پھر ہمیں ایک راہ سوجھ ہی گئی۔

اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔ ہمارے پاس ابھی ساڑھے تین گھنٹے تھے۔ ان دوران میں ہم آسانی سے اپنا یہ مقصد حاصل کر سکتے تھے۔ ہم نے گارڈ کو کمرے کی چھت سے باندھا اور باہر آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم گارڈ کے ڈبے کی چھت پر تھے۔ پھر ہم نے اگلے ڈبے کی چھت بہت احتیاط سے پار کی۔ ہماری کوشش یہی تھی کہ اس ڈبے کی چھت سے گزرتے ہوئے کسی قسم کی دھمک نیچے نہ پہنچے اور فوجی ہوشیار نہ ہو جائیں۔ فوجیوں کا ڈبا پار کرنے کے بعد ہم نے اطمینان کا سانس لیا۔

مال گاڑی اپنی پوری رفتار سے منزل کی طرف اڑی چلی جا رہی تھی۔ اس کی منزل اب انبالہ کی چھاؤنی نہیں، تباہی کی چھاؤنی تھی۔ پھر ہم مال گاڑی کے تمام ڈبے عبور کر کے انجن کے پہلو میں بنے ہوئے پلیٹ فارم پر اتر گئے۔ ایک طرف میں اترا تھا، دوسری طرف مہندر، پھر ہم دونوں ایک ساتھ پلیٹ فارم پر چلتے ہوئے انجن روم میں داخل ہو گئے۔ ہمارے ہاتھ میں پستول تھے اور جسم پر پولیس کی وردیاں۔ انجن ڈرائیور اور کوئلہ جھونکنے والے دونوں فائر مین ہمیں دیکھ کر چونک گئے۔ ''خاموش رہو! ورنہ گولی مار دی جائے گی۔'' میں نے چیخ کر کہا۔

''کیا...... کیا چاہتے ہو؟'' انجن ڈرائیور نے کہا۔

''خاموش رہو!'' میں نے نہایت سفاکانہ لہجے میں کہا اور پستول اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔ ''اگر تم لوگ ہمارے کہنے پر عمل کرتے رہے تو تم زندہ رہو گے ورنہ......'' اسی وقت ایک فائر مین نے مجھے زیادہ پھرتیلا ہونے کا ثبوت دینا چاہا تھا۔ اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارنا چاہا تھا مگر اسی وقت مہندر کے پستول کی گولی نے اس کا کام تمام کر دیا تھا۔ ''تم دونوں کا بھی یہی حشر ہوگا۔'' میں نے کہا۔ وہ دونوں اپنے ساتھی کا یہ حشر دیکھ کر سہم گئے اور ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ ''اس لاش کو باہر پھینکو!'' میں نے دوسرے فائر مین سے

پھر مُردہ فائر مین کی لاش باہر پھینک دی گئی۔ ''کیا چاہتے ہو؟'' انجن ڈرائیور نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''ہم اس ٹرین کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''سمجھے! تم بس اپنا کام کرتے رہو۔ ذرا بھی کوتاہی کی تو میں بے دریغ گولی مار دوں گا۔''

''مم...... مم...... مگر ہم......'' انجن ڈرائیور نے کہا۔ وہ اپنے سامنے موت کو رقص کرتے دیکھ رہا تھا۔

''اگر تم دونوں نے ہمارے کہنے پر عمل کیا تو تم دونوں زندہ رہو گے۔'' میں نے کہا۔

''ہم بھی مرنا نہیں چاہتے۔''

''اے!'' مہندر نے فائر مین سے کہا۔ ''کیا نام ہے تمہارا؟''

''پردیپ، جی!'' فائر مین نے کہا۔

مہندر نے تھیلے سے رسی نکالتے ہوئے کہا۔ ''لو، انجن ڈرائیور کو اس کی نشست سے باندھ دو، اچھی طرح کہ ہل بھی نہ سکے اپنی جگہ سے!'' غالباً پردیپ کی سمجھ میں نہ آسکا کہ وہ اس حکم پر عمل کرے یا نہ کرے!

''جیسا یہ کہہ رہے ہیں ویسا ہی کرو۔'' انجن ڈرائیور نے کہا، جو ذرا معقول آدمی معلوم ہوتا تھا۔ پھر پردیپ نے انجن ڈرائیور کو اس طرح سیٹ سے کس کر باندھ دیا جس طرح مہندر نے کہا تھا۔ انجن ڈرائیور اب اس طرح اپنی سیٹ سے بندھا ہوا تھا کہ وہ اپنا کام اپنے ہاتھوں سے بہ خوبی کر سکتا تھا لیکن سیٹ سے نہ تو ہل سکتا تھا نہ ہی بندشوں کو کھول سکتا تھا۔

''اب باقی رسی کاٹ لو۔'' مہندر نے یہ کہہ کر چاقو، پردیپ کی طرف بڑھا دیا۔ ''چالاک بننے کی کوشش نہ کرنا۔'' اس نے پردیپ کر چاقو دیتے ہوئے دھمکی دی۔

پردیپ نے رسی کاٹ کر چاقو مہندر کو دے دیا۔ ''اب رسی کا یہ سرا اپنی کمر کے گرد باندھو!'' مہندر نے کہا۔

''مم...... مگر کیوں؟'' پردیپ نے کہا۔

''تمہاری اپنی حفاظت کے لیے۔'' مہندر نے اسے بتایا۔ ''تمہیں اب بقیہ گاڑی کو انجن سے کاٹنا ہے۔ اس کام کے دوران میں تم اسی رسی کے سہارے بندھے رہو گے تو تمہارے نیچے گرنے کا کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔''

''تو کیا واقعی تم ٹرین کو تباہ کرنا چاہتے ہو؟'' انجن ڈرائیور گویا ہمارا مقصد سمجھ گیا تھا۔

''ہاں، ہم محض مذاق مذاق میں اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر یہاں نہیں پہنچے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''مگر تم یہاں تک کیسے آئے؟'' انجن ڈرائیور نے سوال کیا۔

''صبح تمہیں گارڈ سب کچھ بتا دے گا، اگر وہ اس تباہی میں زندہ بچ رہا تو!'' میں نے کہا۔

پھر مہندر، فائر مین کو انجن کے پچھلے حصے کی طرف لے گیا تھا۔ ''تو کیا تم اسے بھی......'' انجن ڈرائیور ہکلایا۔

''ہاں وہ بھی اپنے ڈبے میں بندھا پڑا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم ڈبوں کی چھت سے ہو کر یہاں تک پہنچے ہیں۔''

''تمہارا ان لوگوں سے کوئی تعلق ہے جو شملے سے ایک انجن میں بیٹھ کر فرار ہوئے تھے؟'' انجن ڈرائیور نے پوچھا۔

''ہاں ہم وہی لوگ ہیں۔'' میں نے کہا۔

''بڑے جیالے لوگ ہو تم!'' انجن ڈرائیور نے کہا۔ ''تم جیسے لوگ ہی ہندوستان کو آزاد کرا سکتے ہیں۔ میرا ایک بھتیجا بھی تم جیسے لوگوں کے ساتھ ہے۔ وہ کلکتے میں، ڈی کے بوس کے ساتھیوں میں شامل ہے۔''

''ڈی کے بوس شہید ہو گیا ہے۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''اب اس کی بہن ہمارے گروپ میں شامل ہے۔ میرا ساتھی اس سے شادی کرے گا۔''

''تمہارا ساتھی؟'' انجن ڈرائیور نے کہا۔

''وہی جو فائر مین کو لے کر گاڑی علیحدہ کرانے گیا ہے مگر یہ شادی ہندوستان کی آزادی کے بعد ہو گی۔''

''واقعی، تم لوگ جان ہتھیلیوں پر لیے پھرتے ہو۔ تمہارے ماں باپ تو تمہارے لیے ہر وقت پریشان رہتے ہوں گے۔''

''پتا نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میری ماں ابھی تین چار دن پہلے انتقال کر گئی ہیں۔ میں ان کے جنازے میں بھی شریک نہیں ہو سکا۔''

پھر مہندر اس فائر مین کے ساتھ آ گیا۔ اس نے فائر مین کے ہاتھوں کو آہنی جنگلے سے باندھ دیا۔

''گاڑی انجن سے علیحدہ ہو گئی؟'' انجن ڈرائیور نے فائر مین سے پوچھا۔

''ہاں۔'' فائر مین نے جواب دیا۔

پھر ہم دونوں اپنے اپنے پہلو سے آہنی جنگلے کے سہارے انجن کے پچھلے حصے کی

طرف آ گئے۔ مال گاڑی اگرچہ انجن سے کٹ گئی تھی، پھر بھی وہ ابھی تک اسی رفتار سے انجن کے ساتھ ساتھ لگی چلی آرہی تھی۔ اس وقت انجن اور مال گاڑی کے درمیان فاصلہ ایک فٹ تھا۔ پھر یہ فاصلہ بڑھنے لگا۔ مہندر واپس گیا۔ اس نے چیخ کر انجن ڈرائیور سے کہا کہ وہ انجن کی رفتار تیز کر دے۔ پھر مہندر اپنی جگہ واپس آ گیا۔

اس وقت انجن اور گاڑی کا درمیانی فاصلہ چھ سات گز ہو گیا تھا۔

''شروع!'' مہندر نے کہا۔

میں نے دستی بم کی پن کھینچی۔ میں نے دستی بم مال گاڑی کے اگلے ڈبے کے سامنے پٹریوں کے درمیان پھینکا تھا اور مہندر نے اسی لمحے دوسرا دستی بم گاڑی کی چھت پر پھینکا تھا۔ دھماکے ہوئے تھے اور اگلے ہی لمحے ہم اپنے باقی دو دستی بم بھی تباہی سے دوچار ہونے والی گاڑی پر پھینک چکے تھے۔ نتیجہ ہماری توقع کے مطابق تھا۔ مال گاڑی میں پے درپے کئی دھماکے ہوئے تھے۔ دور ہوتے انجن سے ہم رات کی تاریکی میں اس آتش بازی کے جھماکے دیکھتے رہے۔

پھر وہ منظر ہماری آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ ہم واپس انجن روم میں آ گئے۔ پردیپ ہمیں اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے ہم اس دنیا کی مخلوق نہ ہوں۔ مال گاڑی کی تباہی کا تمام منظر اس نے بھی یقیناً دیکھا ہوگا۔

''کیا ہوا؟'' انجن ڈرائیور نے پوچھا۔

''کام پورا ہو گیا۔'' میں نے کہا تھا۔

''مبارک ہو۔'' اس نے اتنی آہستگی سے کہا کہ اس کے الفاظ پردیپ کے کانوں میں نہ پڑ سکیں۔

''اب کیا ارادہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

سامنے کسی بستی کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ ''بس یہیں انجن روک دو!'' میں نے کہا۔ ''ہم یہیں اتر جائیں گے، پھر تمہاری مرضی، جو جی میں آئے کرنا۔''

انجن رک گیا اور میں مہندر کے ساتھ کھیتوں میں اتر گیا۔ تھوڑی دیر بعد انجن وہاں سے آگے کی سمت روانہ ہو گیا۔

یوں ہندوستان کی تاریخ میں اسلحہ سے لدی ہوئی ایک گاڑی اس طرح تباہ کی گئی۔ کسی نے اس کا منصوبہ پہلے سے نہیں بنایا تھا۔ یہ بس وقت اور حالات تھے جنہوں نے ہمیں اس مال گاڑی تک پہنچا دیا تھا۔ اس واردات میں اس مال گاڑی کے ساتھ اکیس فوجیوں

میں سے انیس فوجی ہلاک ہو گئے تھے۔

☆======☆======☆

مقررہ دن ہم احمد آباد میں اندو لال یاجنک سے ملے تھے۔

اس کے ٹھیک پندرہ دن بعد ہم یراودہ جیل میں قیدیوں کی حیثیت سے موجود تھے۔ اس سفر کی تفصیل مختصر لفظوں میں یوں ہے کہ اندو لال یاجنک ہی کے دفتر میں ہمارا رفیق خالد شکرا بھی موجود تھا۔ خالد پہلے ہی اندو لال یاجنک سے مل کر تمام معاملات طے کر چکا تھا۔ سو ہم اسی شام احمد آباد سے سابرمتی منتقل ہو گئے۔ ہم وہاں دیال جی وسائی کے مہمان کی حیثیت سے مقیم تھے۔ ہمارا تعارف سی پی کے انقلاب پسند طلبہ کی حیثیت سے کرایا گیا تھا۔ ہم دونوں کی وضع قطع ہندوؤں جیسی تھی۔ پھر ایک روز سابرمتی میں طلبہ کا ہنگامہ اسٹیج کرایا گیا۔ یہ ہنگامے مسلسل تین دن جاری رہے۔ تیسرے دن میں اور مہندر انہی ہنگاموں کے دوران میں گرفتار کر لیے گئے۔ گرفتار ہو کر ہم سابرمتی جیل پہنچے اور وہاں سے ہمیں یراودہ جیل منتقل کر دیا گیا۔ سابرمتی سے سابرمتی جیل اور وہاں سے یراودہ جیل پہنچانے میں دیال جی وسائی کے وہ تعلقات کام میں آئے جو بعض سرکاری حکام سے تھے۔ یہ لوگ ان کے کالج اور اسکول کے ساتھیوں میں تھے۔

سابرمتی جیل میں اگرچہ ہم دونوں کو یورپین احاطے میں رکھا گیا تھا اور اسے اسپیشل ڈویژن کہا جاتا تھا مگر ہمارے ساتھ معمولی قیدیوں کا سا سلوک کیا جاتا تھا کیوں کہ مجسٹریٹ کے حکم کی توثیق ابھی حکومت کی طرف سے نہیں ہوئی تھی۔ دوپہر کو ہمیں کنکر اور ریت ملے آٹے کی روٹی اور دال ملتی۔ شام کو روٹی کے ساتھ کسی ترکاری کا شوربا ملتا تھا جسے حلق سے اتارنا بڑے دل گردے کی بات تھی مگر پھر دو دن بعد ہی جیل سپرنٹنڈنٹ کی مہربانی سے ہمیں پاؤ روٹی اور دودھ بھی ملنے لگا۔ سب سے تکلیف وہ بات یہ تھی کہ شام چھ بجے ہمیں سردیوں کے اس شدید موسم میں، چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں میں بند کر دیا جاتا تھا۔

چودھویں دن ہمیں اطلاع ملی کہ ہمیں اسپیشل ڈویژن میں رکھنے سے متعلق حکومت نے قطعی احکام جاری کر دیے ہیں۔ ہمیں سیاسی قیدیوں کا درجہ حاصل ہو گیا تھا اور اسی کے ساتھ ہمیں سابرمتی جیل سے یراودہ جیل منتقل کرنے کے احکام بھی جاری ہو گئے تھے کیوں کہ تمام سیاسی قیدی یراودہ جیل ہی میں رکھے جاتے تھے۔

ہم سابرمتی جیل کے اسپیشل ڈویژن میں بھی رہے تھے جو دراصل یورپین قیدیوں کا احاطہ تھا اور اب ہم یراودہ جیل کے اسپیشل ڈویژن میں تھے لیکن یہ یورپین قیدیوں کا احاطہ

نہ تھا اسی لیے جیل کا یہ احاطہ بہت ہی ذلیل تھا کیوں کہ یہاں ہندوستانی قیدی رکھے جاتے تھے۔ سابرمتی جیل کی کوٹھریاں صاف لیکن یہاں کی سنگی کوٹھریوں کے فرش کو گوبر سے لیپا گیا تھا اور ہم ان کوٹھریوں میں مویشیوں کی طرح رہتے تھے۔ یہ کوٹھریاں سیاہ پتھر کی اونچی اونچی دیواروں کے دامن میں بنی ہوئی تھیں۔ ہمارا یہ احاطہ تکون شکل کا تھا۔ اس مثلث کی دوسری طرف خاردار تاروں کا جنگلا تھا جس کے پار یورپین قیدیوں کا صاف ستھرا احاطہ تھا اور تیسری طرف کشادہ سڑک تھی جو جیل کے پھاٹک سے ہو کر جیل کے دوسرے احاطوں کی طرف جاتی تھی۔ ہمارا یہ احاطہ بہت مختصر تھا اور قیدی بہت تھے اس وجہ سے ہم سب ایک دوسرے کے لیے پریشانی کا سبب ہی بنتے تھے۔

یہاں ہماری ملاقات منظر علی سے بھی ہوئی۔ منظر علی سے میری پہلی ملاقات برما میں ہوئی تھی۔ یہ ان ہندوستانی وطن پرستوں میں سے تھے جو برما سے ہندوستان میں مصروف عمل حریت پسندوں کو اسلحہ فراہم کرتے تھے۔ منظر نے مجھے بتایا کہ انہیں اسی چھاپے کے دوران میں پکڑا گیا تھا جس کی اطلاع کہنٹن کے پھو پھانے ہمیں دی تھی۔ پھر انہیں گرفتار کر کے رنگون جیل بھیج دیا گیا تھا جہاں سے بعد میں انہیں یراودہ جیل منتقل کر دیا گیا تھا کیوں کہ بنیادی طور پر ان کا تعلق احمد آباد سے تھا۔ منظر علی کی موجودگی سے ہمیں بڑی تقویت پہنچی۔

یہاں منظر علی کے بعد ایک شخص تھا جس سے رفاقت کے روزانہ چند لمحے ہمارے لیے بڑے قیمتی ہوتے تھے۔ وہ شخص تھا جیل کا ہندوستانی ڈاکٹر! وہ ہمیں روزانہ مہندر کے والد سیٹھ وشوا ناتھ کی حالت کے بارے میں بتایا کرتا تھا۔ سیٹھ وشوا ناتھ کو یورپین قیدیوں کے احاطے میں ایک خطرناک قیدی کی حیثیت سے قید تنہائی میں رکھا گیا تھا اور انگریز افسران نے ان پر تشدد کی انتہا کر دی تھی۔

''میری ڈیوٹی صرف اتنی ہے......'' ڈاکٹر نے ایک دن کہا تھا۔ ''کہ سیٹھ وشوا ناتھ کو مرنے نہ دوں اور اذیت برداشت کرنے کے لیے ان کی توانائی بحال رکھوں لیکن کب تک؟''

ڈاکٹر لیش پال کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وشوا ناتھ، مہندر ناتھ کا باپ تھا اس لیے کہ مہندر ناتھ کا نام وہاں نردوش گوکھل تھا۔ اس جیل میں منظر علی کے سوا کسی کو بھی ہماری اصلیت کا علم نہیں تھا۔ ڈاکٹر لیش پال سے ہم یونہی ایک دن دوسرے قیدیوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے تو سیٹھ وشوا ناتھ کا ذکر بھی نکل آیا تھا اور اس کے بعد تو شام کے وقت جب میں ڈاکٹر گشت پر آتا، ہم اس سے سیٹھ وشوا ناتھ کے بارے میں ضروری سوالات کیا کرتے۔

پھر ایک دن جیل سپرنٹنڈنٹ کے حکم سے مہندر کو اور مجھے یورپین قیدیوں کے طے میں سیٹھ وشوا ناتھ کی خدمت کے لیے منتقل کر دیا گیا۔ میں نے اس کا سبب معلوم کیا نظر علی نے مجھے بتایا کہ یراودہ جیل میں کم وبیش تمام قیدیوں کا تعلق گجرات یا بمبئی سے اس لیے ہمیں سیٹھ وشوا ناتھ کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے۔ حکام کا خیال ہے کہ کسی اہم طرناک قیدی کے پاس اسی کے علاقے کا قیدی نہیں ہونا چاہیے۔

سو اس طرح ہم یراودہ جیل میں سیٹھ وشوا ناتھ کے پاس پہنچے۔

سیٹھ وشوا ناتھ کی حالت بے حد خستہ تھی۔ ان کے چہرے پر نیل پڑے ہوئے تھے۔ منے کے دو دانت زنبور سے کھینچ لیے گئے تھے۔ ہونٹ سوجے ہوئے تھے۔ انگلیوں کے گے پورے زخمی تھے۔ پیر کے کئی ناخنوں کی جگہ لال لال گوشت نظر آ رہا تھا۔ میں اور ہندر، سیٹھ وشوا ناتھ کی حالت دیکھ کر سکتے میں آ گئے۔ جیل کا محافظ ہمیں اس کوٹھری میں ھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ہم سب پر ایک عجیب بے بسی طاری تھی۔ ہم اس وقت سیٹھ وشوا ناتھ ے واقفیت کا اظہار بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت مہندر کیسے جذباتی ب سے گزر رہا ہوگا۔ اس کا باپ، مہربان اور شفیق باپ، زخمی اور بیمار باپ، اس کے امنے تھا اور وہ اپنے لہولہو جذبات کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

اور سیٹھ وشوا ناتھ، وہ تو اپنے حواس ہی میں نہ تھے۔ ان کی آنکھیں اپنے بیٹے کو بھی یں پہچان سکی تھیں۔ وہ پانی بھری آنکھوں سے ہمیں اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے خالی وار کو دیکھ رہے ہوں۔ پھر ان کے زخمی ہونٹوں سے آواز ابھری۔ ''کون ہو تم؟ کیوں ے ہو؟''

''جناب!'' میں نے کہا۔ ''ہم آپ کے خادم ہیں۔'' میں نے مہندر کی طرف کھا۔ اس کا تمام جسم جیسے شدید غصے سے کپکپا رہا تھا۔ اس نے ایک انگلی سے اپنی آنکھوں جمع ہونے والے آنسوؤں کو پونچھا۔

''چلے جاؤ یہاں سے!'' سیٹھ وشوا ناتھ نے پھر زخمی آواز میں کہا۔ لگتا تھا وہ گفتگو ں کر رہے بلکہ ہر لفظ ایک احتجاج بن کر ان کے ہونٹوں سے ٹپک رہا ہے۔ ''مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔ ان سے کہہ دو جلدی سے میرا قصہ تمام کر دیں۔ ان سے کہہ دو مجھے کچھ نہیں معلوم، اگر معلوم ہوتا بھی تو میں انہیں کچھ نہ بتاتا۔''

''ہمیں آپ کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم بھی آپ کی طرح دی ہیں۔''

''ہاں مسٹر وشواناتھ!'' جیل سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ ''یہ دونوں جوان آپ کی خدمت پر مامور کیے گئے ہیں کیوں کہ اب آپ کے لیے اپنے آپ چلنا مشکل ہو گیا ہے۔''

''میں اپنی لاش خود کھینچ سکتا ہوں۔ میں اپنی ارتھی کو خود چتا پر رکھ کر پھونک سکتا ہوں، ابھی مجھ میں بہت طاقت ہے۔'' سیٹھ وشواناتھ نے کہا اور پلنگ سے اٹھنا چاہا لیکن اٹھ نہیں سکے۔ انہیں پٹیوں کے ذریعے پلنگ سے باندھ دیا گیا تھا۔ ''میں کہتا ہوں لے جاؤ انہیں، مجھے کسی ملازم کی ضرورت نہیں۔ مجھ میں ابھی تم جیسے لوگوں سے مقابلہ کرنے کی جرأت ہے۔''

''آپ بلاوجہ خود کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں سیٹھ وشواناتھ!'' سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ ''آپ سے جو کچھ پوچھا جا رہا ہے، وہ بتا دیں تو آپ کی یہ مشکلات ختم ہو جائیں گی۔ یقین جانیے مجھے آپ سے بے حد ہمدردی ہے۔''

''مجھے تمہاری ہمدردی کی ضرورت نہیں۔ مجھے تمہاری دشمنی ہی عزیز ہے۔'' سیٹھ وشواناتھ نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ ''تم دونوں ادھر آؤ، میرے ساتھ!''

ہم دونوں اس کے پیچھے پیچھے سیٹھ وشواناتھ کی کوٹھری سے نکل آئے۔ یہ کوٹھری اب ہماری بھی تھی کیوں کہ ہمارے کمبل بھی وہیں لا کر ایک طرف ڈال دیے گئے تھے۔

''سنو نوجوان!'' سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ اس کا انداز دوستانہ، سرپرستانہ اور ہمدردانہ تھا۔ ''یہ شخص وشواناتھ ہے۔ بمبئی کا ایک بہت بڑا تاجر! بہت مخیّر اور ہمدرد انسان ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کی لڑکی کو اغوا کر لیا ہے اور اس کے بیٹے کو مار ڈالا ہے۔ وہ اسے بلیک میل کر رہے ہیں۔ وہ اس سے بڑی بڑی رقمیں اینٹھتے ہیں۔ تم اس کی عیادت کرو، اس سے معلوم کرو، ان لوگوں کے نام پتے! اگر تم نے ایسا کیا تو تمہیں نہ صرف رہائی مل جائے گی بلکہ بڑا انعام بھی ملے گا۔''

''سنو سپرنٹنڈنٹ!'' مہندر نے کہا۔ ''اگر یہ سیٹھ وشواناتھ ہی ہے تو میں نے اس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔ تم مجھ سے یہ توقع نہ رکھنا کہ میں تمہارے لیے اس کی مخبری کروں گا۔''

''میری یہ پیشکش منظور کرنا نہ کرنا تمہارا کام ہے۔'' سپرنٹنڈنٹ جیل نے کہا۔ ''سوچ لو کہ تمہیں رہائی یا انعام پسند ہے یا نہیں۔ میں تمہیں صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں کہ غربت اور افلاس سے تنگ آئے ہوئے لوگوں نے اپنی محرومیوں کو حریت پسندی اور وطن

رتی کے خوبصورت نام دیے ہیں۔ حریت پسندی کا جذبہ صرف غربت سے پروان چڑھتا ہے۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' مہندر نے چیخ کر کہا۔

''جذباتی نہ بنو، غیر جانبدار بن کر سوچو! دیکھو کہ کوئی بھی راجا نواب، جاگیردار، خطاب یافتہ شخص یا صنعت کار، حکومت کے خلاف نہیں ہے۔ ایسا اس لیے ہے کہ انہیں آسائشیں میسر ہیں۔ وہ دولت میں کھیل رہے ہیں۔ بغاوت صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو ان چیزوں سے محروم ہوتے ہیں اور اپنی مجرمانہ زندگی کو حریت پسندی کا نام دیتے ہیں۔''

اس مرتبہ مہندر خاموش رہا۔

سپرنٹنڈنٹ نے واپس جانے کے لیے قدم بڑھاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر کہا۔ ''میری پیشکش پر پھر غور کرنا، مسترد کرنے سے پہلے دو تین مرتبہ سوچ لینا۔ میں تمہیں ایک بالکل نئی زندگی کی پیشکش کر رہا ہوں۔'' پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

ہم پھر واپس آ کر سیٹھ وشواناتھ کے ساتھ بیٹھ گئے۔ سیٹھ وشواناتھ اس وقت گہری غنودگی میں تھے۔ ان کے ہونٹوں سے ''مہندر! مہندر!'' ابھر رہا تھا۔

شام چھ بجے سے قبل ہمیں رات کا کھانا دیا گیا۔ ڈاکٹر آیا اس نے سیٹھ وشواناتھ کا جائزہ لیا، انہیں دوا کھلائی اور اپنے سامنے گرم گرم دودھ پلایا۔ ٹھیک چھ بجے کوٹھری کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ صرف ایک چھوٹا سا روزن جس میں آہنی سلاخیں جڑی ہوئی تھیں کسی آنکھ کی طرح روشن تھا۔

وہ مانوس سا شور جو شام چھ بجے قیدیوں کو ان کی کوٹھریوں میں بند کرتے وقت ہوا کرتا تھا، چند منٹ بعد خاموشی میں دفن ہو گیا۔ تمام احاطے میں سناٹا پھیل گیا۔ سیٹھ وشواناتھ پھر گہری غنودگی میں ڈوب گئے تھے۔ ڈاکٹر نے شاید انہیں کوئی خواب آور دوا دی تھی تاکہ وہ ذہنی اور جسمانی طور پر کوئی تکلیف محسوس نہ کر سکیں۔ مہندر اور میں سیٹھ وشواناتھ کے پلنگ کے ساتھ دونوں پٹیوں سے لگے، اِدھر اُدھر بیٹھے تھے۔

روزنِ دیوارِ زنداں کب کا بجھ چکا تھا۔ اب وہاں صرف تاریکی تھی۔ ایسی تاریکی کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ ہم دونوں اب بھی اسی حالت میں بیٹھے تھے۔ سیٹھ وشواناتھ نے کراہ کر کروٹ لینا چاہی مگر پٹیوں سے کسے ہونے کے سبب کروٹ نہ لے سکے۔ پھر ان کے منہ سے وہی الفاظ نکلے۔ ''مہندر! بیٹا مہندر!''

"پتاجی!" مہندر نے کہا اور اپنے باپ کے سینے پر سر رکھ دیا۔

"بیٹا مہندر!" یہ کہہ کر سیٹھ وشوا ناتھ نے مہندر کے سر پر ہاتھ پھیرا، اس کے ساتھ ہی دونوں کی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اب کوٹھری میں صرف چند الفاظ سسکیوں کے درمیان سرگوشیوں کے انداز میں ابھر رہے تھے۔ "پتاجی! بیٹا مہندر! پتاجی بیٹا مہندر!"

کتنی رقت انگیز تھی یہ ملاقات! اس کا اندازہ میرے سوا شاید کوئی نہ کر سکے۔ دو باپ بیٹے ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے تھے لیکن اتنے مجبور تھے کہ نہ بیٹا، باپ کے زخموں پر مرہم رکھ سکتا تھا، نہ ایک باپ اپنے دکھی بیٹے کو تسلی دے سکتا تھا۔

"بیٹا آفاق!" سیٹھ وشوا ناتھ کی زخمی آواز نے پکارا۔

"پتاجی!" میں اور کچھ نہ کہہ سکا۔ پھر سیٹھ وشوا ناتھ نے اپنے کمزور ہاتھ سے میرا سر بھی اپنے سینے پر ٹکا لیا۔

"میرے بیٹے!" سیٹھ وشوا ناتھ نے کہا تھا۔ "میرے بہادر بیٹے!"

"آپ...... آپ ہمیں پہچان گئے تھے؟" سیٹھ وشوا ناتھ سے مہندر نے پوچھا۔

"اپنی آنکھوں کے نور، اپنے دل کی دھڑکن کو کون نہیں پہچان لیتا بیٹا!" سیٹھ وشوا ناتھ نے کہا۔

اور پھر وہ جذبات جو زنداں میں دن کی روشنی، صیاد کے ڈر اور قانون کے خوف سے پابند تھے بہہ نکلے۔ "پتاجی! لالی......" مہندر نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"مرگئی بیٹا!" سیٹھ وشوا ناتھ نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے، میری لالی مرگئی۔ میری بیٹی بڑی بہادر تھی۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا؟" میں نے پوچھا۔ "سالار نے بتایا تھا کہ آپ کو ابھی تک لالی کی موت کا علم نہیں ہے۔"

"یہ ایک ہفتے پہلے کی بات ہے۔ جس دن مجھے ڈاکٹر لیش پال نے اطلاع دی کہ تم اور مہندر جیل میں آچکے ہو، اسی دن مجھے اس نے لالی کی موت کے بارے میں بھی بتا دیا تھا۔" سیٹھ وشوا ناتھ نے کہا۔ "میں خوش تھا کہ مہندر آگیا، میں رو رہا تھا کہ لالی ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئی۔" سیٹھ وشوا ناتھ نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ "لالی! میری بیٹی! اس کے لیے میں نے سالار اعظم سے ایک وعدہ کیا تھا۔"

پھر کافی دیر تک کوئی کچھ نہ بولا۔ بس سیٹھ وشوا ناتھ کی سسکیاں ابھرتی رہیں۔ سسکیوں سے ان کا جسم پھڑکتا رہا۔ ان کی زخمی انگلیاں میرے بالوں میں سرسراتی رہیں۔

"آفاق! میرے بیٹے میں نے سالار سے ایک وعدہ کیا تھا۔ تمہیں اس کا علم نہیں، کسی کو علم نہیں! سالار نے بتایا تھا کہ تم اور لالی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو۔ اس نے وعدہ لیا تھا کہ نینی تال کی مہم کے بعد میں لالی کو تم سے منسوب کر دوں گا، منگنی کر دوں گا اور شادی...... ہندوستان کی آزادی کے بعد ہوگی مگر بیٹا! لالی مرگئی...... لالی تو مرگئی بیٹا...... مجھے بتاؤ اب میں اپنا وعدہ کیسے پورا کروں گا!" سیٹھ وشوا ناتھ بُری طرح بلک پڑا۔

☆======☆======☆

رات کے پچھلے پہر اچانک میری کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ اس مرتبہ سپرنٹنڈنٹ جیل دو انگریز افسروں اور دو ہندوستانی اہل کاروں کے ساتھ آیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل اور انگریز افسروں کے ہاتھوں میں ٹارچیں تھیں اور وہ کوٹھری کے اندھیرے میں روشنی پھینک کر جائزہ لے رہے تھے۔ پھر انگریز افسروں کے اشارے پر ہندوستانی اہل کاروں نے سیٹھ وشوا ناتھ کو پلنگ سے کھولا اور اسٹریچر پر ڈال کر لے گئے۔ ان کے جاتے ہی سپرنٹنڈنٹ جیل نے مجھ سے کہا کہ میں اس کے ساتھ آفس چلوں۔ مہندر نے میرا ہاتھ دبایا۔ میں نے بھی جواباً اس کے ہاتھ پر دباؤ ڈالا اور سپرنٹنڈنٹ جیل کے پیچھے کوٹھری سے نکل گیا۔ ایک محافظ نے کوٹھری کا دروازہ بند کیا۔ کیا ہونے والا ہے؟ کیا سلوک کریں گے یہ لوگ میرے ساتھ؟ میں یہی کچھ سوچتا ہوا سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اس کے دفتر میں پہنچ گیا۔

"بیٹھو!" سپرنٹنڈنٹ جیل نے مجھ سے کہا۔

میں اس کی میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "فرمائیے کیا کام ہے مجھ سے؟"

"بتاتا ہوں۔" سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ "بات یہ ہے کہ مجھے نہ معلوم تم پر کیوں رحم آرہا ہے۔"

"میرے لیے یہ نئی اطلاع ہے۔" میں نے کہا۔ "سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پر مجھے خوش ہونا چاہیے یا رونا چاہیے!"

"سنو نوجوان!" سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ "تمہارا ساتھی تو جذباتی اور احمق ہے۔ مجھے تم میں معقولیت کے آثار نظر آرہے ہیں۔ تم معاملات پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے والے معلوم ہوتے ہو۔"

"آپ کا اندازہ درست ہے۔" میں نے کہا۔

"تو سنو!" سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ "میں نے آج سہ پہر جو پیشکش کی تھی، بہت

سنجیدگی سے کی تھی۔ حکومت یہ جاننا چاہتی ہے کہ سیٹھ وشوانا تھ کن لوگوں کے لیے کام کر رہا ہے اور سالارِ اعظم کون ہے؟'' اس کے بعد اس نے وہ تمام باتیں دہرا دیں جو پولیس کو سیٹھ وشوانا تھ کے ملازم سے معلوم ہوئی تھیں۔ ''تم یوں کرو کہ سیٹھ وشوانا تھ کا اعتماد حاصل کرلو۔ اس کے سامنے خود کو زبردست انقلابی ظاہر کرو اور کسی طرح یہ معلوم کرو کہ سالارِ اعظم کون ہے اور اس کے ساتھی کون کون ہیں؟ ان کی تنظیم کے مالی وسائل کیا کیا ہیں؟ یقین جانو اگر تم اپنی اس کوشش میں کامیاب ہو گئے تو نہ صرف تم رہا ہو جاؤ گے بلکہ ایک بڑے انعام کے بھی مستحق قرار پاؤ گے۔'' وہ خاموش ہو گیا۔

''مگر آپ نے اس کام کے لیے مجھے ہی کیوں منتخب کیا ہے؟''

''محض تمہاری خوش قسمتی۔'' سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ ''ہم کسی اور پر اعتماد نہیں کر سکتے۔''

''اس اعتماد کا شکریہ!'' میں نے کہا۔ ''میں اپنی سی پوری کوشش کروں گا۔''

''تو پھر خوش قسمتی تمہاری منتظر ہے۔'' سپرنٹنڈنٹ جیل نے کہا۔

جب میں سپرنٹنڈنٹ کے ساتھ واپس اپنی کوٹھری کی طرف آ رہا تھا تو اسی بیرک کے آخری سرے پر بنے ہوئے کمروں سے کسی شخص کے انتہائی کرب کے عالم میں چیخنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ آوازیں سیٹھ وشوانا تھ ہی کی ہو سکتی تھیں۔

''یہ کیسی آواز ہے، کس کی آواز ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اسی بدقسمت سیٹھ وشوانا تھ کی آواز!'' سپرنٹنڈنٹ جیل نے کہا۔ ''اگر زبان کھول دے تو اس عذاب سے اس کی جان چھوٹ جائے۔''

''میں دیکھ سکتا ہوں اسے ایک نظر؟'' میں نے کہا۔

''آؤ'' وہ مجھے لے کر بیرک کے دوسرے کنارے کی طرف بڑھ گیا۔ جوں جوں ہم اس طرف بڑھتے جا رہے تھے، چیخیں زیادہ بلند ہوتی جا رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ کوئی بکرا چھری کے نیچے ڈکرا رہا ہو۔

میں اس کمرے کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازے سے میں نے وہ منظر دیکھا کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سیٹھ وشوانا تھ ٹکٹکی سے بندھے ہوئے تھے۔ ان کا منہ دیوار کی طرف تھا اور ان کی کمر پر بیک وقت کئی بچھو رینگ رہے تھے جنہیں ڈنک مارنے پر مجبور کرنے کے لیے ایک شخص لوہے کی سلاخ سے چھیڑ رہا تھا۔

''میری گردن کاٹ ڈالو، مجھے سانپ سے ڈسوا دو، میں نہیں بتاؤں گا، کچھ نہیں

بتاؤں گا!''

''مسٹر وشوانا تھ!'' ایک انگریز افسر نے کہا۔ ''یہ آخری رات ہے، آخری موقع ہے آج تم زندہ حالت میں واپس جاؤ گے۔ کل تم زندہ واپس نہیں جا سکو گے۔''

''مجھے تم آج ہی مار ڈالو۔'' وشوانا تھ نے کہا تھا۔

''تمہاری موت اتنی آسان نہیں ہو گی۔'' انگریز افسر نے کہا۔ انگریز افسر کے اشارے پر تمام بچھو چمٹی سے پکڑ کر ایک چوڑے منہ کی شیشی میں ڈال دیے گئے۔ میں نے اس وقت نہ معلوم کس طرح خود کو قابو میں رکھا تھا لیکن ابھی مجھے اس سے زیادہ بھیانک منظر دیکھنا تھا۔

ایک پولیس والا، کمرے کے اس حصے سے جو میری نظروں سے اوجھل تھا، آگے آیا۔ اس کی کلائی پر چمڑے کا خول چڑھا ہوا تھا۔ اس کلائی پر ایک شکرا بیٹھا ہوا تھا جس کی آنکھوں اور چونچ پر چمڑے کے خول چڑھے ہوئے تھے۔ انگریز افسر کے اشارے پر اس نے اس شکرے کی آنکھوں اور چونچ سے خول ہٹائے اور سیٹھ وشوانا تھ کی پیٹھ پر شکرے کو چھوڑ دیا۔ اس کے ایک پنجے میں پڑی ہوئی زنجیر اسی سپاہی کے ہاتھ میں تھی۔

سپاہی نے انگلی سے سیٹھ وشوانا تھ کی کمر کو ٹھوکا اور پھر مجھے آنکھیں بند کر لینا پڑیں۔ شکرے نے اپنے پنجے سیٹھ وشوانا تھ کے کھوے پر جما کر اپنی تیز نوکیلی مڑی ہوئی چونچ ان کے شانے میں گاڑ دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سیٹھ وشوانا تھ کے منہ سے ایک بھیانک چیخ ابھری تھی۔

''کل یہ شکرا تمہارے چہرے سے اپنی بھوک مٹائے گا۔'' اسی انگریز افسر کی آواز ابھری۔ ''پہلے یہ تمہاری آنکھیں نوچ کر کھائے گا، پھر تمہارے سینے کو نوچے گا۔''

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ شکرا پھر اسی سپاہی کی کلائی پر بیٹھا تھا اور مرغی کی اس ٹانگ کو ادھیڑ رہا تھا جو سپاہی کے ہاتھ میں تھی۔ سیٹھ وشوانا تھ کے شانے سے خون بہہ رہا تھا اور سرخ سرخ گوشت زخم سے لٹک رہا تھا۔

سیٹھ وشوانا تھ کراہتا رہا۔

''آؤ چلو۔'' سپرنٹنڈنٹ نے مجھ سے کہا۔

میری ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ میرے جبڑوں میں درد ہونے لگا تھا، میرے دانت اتنی ہی شدت سے ایک دوسرے پر جمے ہوئے تھے۔ ''یہ سراسر درندگی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس کا ذمے دار خود سیٹھ وشوا ناتھ ہے۔'' سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔

''یہ انگریز افسر کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ڈائریکٹر جنرل جیلز، کرنل مرے۔'' سپرنٹنڈنٹ نے کہا۔ ''بڑا سخت آفیسر ہے۔ انڈیمان میں اس نے بنگال کے بڑے بڑے شیروں کو بھیڑ بنا دیا ہے۔ تم سیٹھ وشوا ناتھ کو سمجھانا۔ مجھے یقین ہے تم سیٹھ وشوا ناتھ کو بھی بچا سکتے ہو اور اپنی زندگی بھی سنوار سکتے ہو۔''

اس رات سیٹھ وشوا ناتھ کو کوٹھری میں واپس نہیں لایا گیا۔ ہم تمام رات انتظار کرتے رہے۔ میں نے مہندر کو سپرنٹنڈنٹ جیل سے اپنی گفتگو اور پھر سیٹھ وشوا ناتھ پر کیے جانے والے ظلم کی تمام تفصیل بتا دی۔ ''یہاں سے نکلنے کے بعد میں......''

''میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ اس کرنل مرے کو......''

صبح سورج نکلنے کے بعد سیٹھ وشوا ناتھ کو اسٹریچر پر کوٹھری میں لایا گیا۔ ان کے شانے کے زخم کی ڈریسنگ کر دی گئی تھی۔ سیٹھ وشوا ناتھ اس وقت بے ہوش تھا۔ ڈاکٹر ساتھ آیا تھا۔ اس نے مہندر کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''انہیں سمجھاؤ۔'' اس نے چپکے سے کہا تھا۔ ''آج تمہاری ضمانت ہو رہی ہے۔ گیارہ بجے تک رہائی عمل میں آجائے گی۔''

''مگر......''

ڈاکٹر نے جواب میں کچھ نہیں کہا اور کوٹھری سے نکل گیا۔

ہم سیٹھ وشوا ناتھ کے پلنگ کے ساتھ بیٹھے رہے۔ کوئی نصف گھنٹے بعد انہیں ہوش آگیا۔ انہوں نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے ہمیں دیکھا۔

''پتا جی!'' مہندر نے کہا۔ ''میں آپ سے التجا کرتا ہوں مان جائیے!''

سیٹھ وشوا ناتھ نے مسکرا کر کہا۔ ''میں جانتا ہوں بیٹا! تمہیں ڈاکٹر نے سب کچھ بتا دیا ہوگا۔''

''ڈاکٹر نے نہیں بتایا پتا جی!'' مہندر نے سیٹھ وشوا ناتھ کی پیشانی پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ''خود آفاق نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ وہ آپ کو کیسی بھیانک سزائیں دے رہے ہیں۔ مان جائیے پتا جی!''

''میں انہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ......'' سیٹھ وشوا ناتھ نے اتنے زور سے کہا تھا کہ کھانسی آگئی۔ دم میں دم آنے پر وشوا ناتھ نے اپنا جملہ مکمل کیا۔ ''ہم...... ہندوستانیوں میں وفاداری اور حب الوطنی خون کی مانند دوڑتی ہے۔ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ کرنل مرے کی تمام تر اذیتوں کو شکست دینے کا حوصلہ بھی ہم ہندوستانیوں میں موجود ہے۔'' وہ ذرا دیر...

...لے رکھا۔ ''سالار سے میرا شکریہ ادا کر دینا کہ اس نے مجھے تم سے ملنے کی سبیل نکال ہی لی۔ آج ہی تمہاری رہائی بھی ہو جائے گی۔''

''آپ کو یہ سب کیسے پتا چلا؟'' میں نے پوچھا۔

''ڈاکٹر ریش پال بہت اچھا آدمی ہے۔'' سیٹھ وشوا ناتھ نے جواب دیا۔ ''اسی نے ...تھا۔ وہ نیک دل ہندوستانی ہے۔''

جس وقت مجھے اور مہندر کو سپرنٹنڈنٹ جیل کے دفتر میں طلب کیا گیا، سیٹھ وشوا ناتھ کی حالت قابل رحم تھی۔ اس نے بھیگی آنکھوں سے ہمیں الوداع کہا۔ اس کے کپکپاتے ہونٹوں سے ہمارے لیے صرف ایک دعا نکلی۔ ''اللہ پرماتما تمہاری حفاظت کرے۔'' لیکن ...جانتا تھا کہ اس ایک دعا کے پیچھے نہ معلوم کتنی دعائیں اس کے دل سے ابھری تھیں اور ...الفاظ نہ پا کر دل ہی میں دم توڑ گئی تھیں۔ سیٹھ وشوا ناتھ کا پورا وجود ہی ہمارے لیے دعا بن ...گیا تھا۔

نصف گھنٹے کے اندر رہائی پا کر ہم یراودہ جیل سے باہر آئے تو وسائی کو اپنا منتظر پایا۔

جیل سے باہر آنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ یراودہ جیل میں یہ دن گزارنے کا مقصد کیا ...۔ انسانیت سوز اذیتوں کی خبر پانے کے بعد سالار اعظم نے سیٹھ وشوا ناتھ کو بھی زہر کی ...گولیاں بھیجی تھیں مگر سیٹھ وشوا ناتھ نے پیغام بھیجا تھا کہ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ اگر سیٹھ چاہتا ...ہے کہ وہ سم قاتل سے اپنی جان کا خاتمہ کر لے تو پھر ایک شرط ہے اور وہ شرط یہی تھی کہ مجھ ...اور مہندر سے ملاقات کرا دے۔

''تو تمہیں شروع ہی سے معلوم تھا؟'' میں نے مہندر سے پوچھا۔

''ہاں میں شروع ہی سے جانتا تھا۔ سشما مجھے پتا جی کا یہ پیغام سنا چکی تھی۔'' مہندر نے ...غم سے چور لہجے میں کہا۔ ''آج میں نے خود زہر کی گولیاں پتا جی کو دی ہیں اور ان سے ...وعدہ لیا ہے کہ وہ یہ گولیاں رات سے پہلے کھا لیں گے۔''

''یہ گولیاں تمہیں کہاں سے ملی تھیں؟''

''ڈاکٹر ریش پال نے مجھے فراہم کی تھیں۔ آج صبح میں نے پتا جی سے وعدہ لے لیا ...کہ وہ یہ گولیاں کھا لیں گے۔''

☆======☆======☆

اسی شام ہم اندولال یاجنک کے دفتر میں موجود تھے کیوں کہ ہم نے رقم وغیرہ اور اپنا ...سا لیکن اہم سامان یاجنک ہی کے پاس رکھوا دیا تھا۔ اس سامان میں ہمارے پستول

اور لباس وغیرہ شامل تھے۔ وہاں خالد شکرا بھی موجود تھا۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی خالد شکرا اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اچھا یا جنک! تمہارے تعاون کا بہت بہت شکریہ۔'' اس نے اپنا مضبوط اور لانبا ہاتھ بڑھا دیا اور یا جنک سے بڑی گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا۔

پھر میں نے اور مہندر نے بھی شکریہ ادا کرتے ہوئے یا جنک سے ہاتھ ملائے اور یا جنک کے دفتر کے عقبی حصے سے نکل کر ایک کار میں بیٹھ گئے۔ خالد کار ڈرائیو کر رہا تھا۔

''کیا کوئی خطرہ ہے؟'' مہندر نے دریافت کیا۔

''خطرہ نہیں، صرف احتیاط کے طور پر!'' خالد نے کہا۔ ''حالات اس قدر غیر یقینی ہیں کہ ہم کسی پر بھی اعتبار نہیں کر سکتے۔ ہم کسی کی نیت پر شبہ نہیں کر رہے لیکن اپنی حفاظت کی طرف سے غافل بھی نہیں رہ سکتے۔ ہم اپنی جنگ خود ہی لڑ سکتے ہیں خطرہ محسوس کرنے ہی کی وجہ تھی کہ تمہیں جیل سے فوری طور پر رہا کرانے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ ہاں مہندر کیا رہا؟'' خالد شکرا خاموش ہو گیا۔

''پتا جی راضی ہو گئے ہیں۔'' مہندر نے کہا۔

''وہ واقعی بہت عظیم اور بہت جرأت مند انسان ہے۔'' خالد نے خراجِ تحسین پیش کیا۔

دس منٹ بعد ہم خالد کی قیام گاہ پر تھے۔ نہا دھو کر جب ہم فارغ ہوئے تو ایسا لگا کہ نہ معلوم کتنا بوجھ جسم سے ہٹ گیا ہے مگر وہ بوجھ جو ہمارے دل پر تھا کیسے ہٹ سکتا تھا۔ یہ خیال ہی تکلیف دہ تھا کہ اس دن کسی وقت بھی سیٹھ وشوا ناتھ زہر کی گولیاں حلق سے اتار کر اس دنیا سے سدھار چکے ہوں گے۔

بڑے دنوں بعد ہمیں اچھی چائے میسر آئی تھی۔ چائے پر ہی خالد نے ہم سے کہا تھا۔ ''تمہیں آج رات ہی احمد آباد سے نکل جانا ہوگا۔ یہاں سے تم سیدھے لاہور پہنچو گے اور مولانا ظفر علی خاں کے پاس قیام کرو گے۔ انہیں اطلاع دے دی گئی ہے کہ ہمارے دو مہمان ان کے پاس آ رہے ہیں۔ تم ان سے صرف خالد بمبئی والے کے حوالے سے ملو گے۔ آئندہ تم سے ہمارا رابطہ مولانا ظفر علی خاں کی معرفت ہی ہوگیا۔''

''کیا ہم کل رات تک نہیں ٹھہر سکتے؟'' مہندر نے سوال کیا۔

''کیوں، کوئی خاص بات ہے؟'' خالد نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم جلد احمد آباد سے نکل جاؤ۔''

''خاص بات ہی ہے۔'' مہندر نے کہا۔ ''مجھے ایک قرض اتارنا ہے۔''

''اگر بہت ہی ضروری ہے تو ٹھہر جاؤ۔'' خالد نے کہا۔ ''اور مناسب سمجھو تو یہ بتا دو کہ تمہیں کس شخص سے ملنا ہے؟''

''یہ میرا ذاتی راز ہے۔'' مہندر نے جواباً کہا۔ ''نہ پوچھیں تو بہتر ہے۔''

پھر ہمارے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں لیکن گھوم پھر کر موضوعِ گفتگو پھر زیادہ جیل میں سیٹھ وشوا ناتھ کو دی جانے والی اذیتوں پر آ گیا۔ میں نے گزشتہ رات کے بھیانک منظر کا تذکرہ چھیڑا ہی تھا کہ خالد نے میری بات کاٹ دی۔ ''مجھے صبح ہی اس کی اطلاع مل گئی تھی۔ میں اس پولیس والے سے بھی واقف ہوں جس کے پاس وہ شکاری شکرا ہے۔ کرنل مرے نے اسے خاص طور پر بمبئی سے بلایا ہے اور اپنے ساتھ ہی ٹھہرایا ہے۔ یہ کرنل مرے بہت ہی خبیث آدمی ہے۔ اس نے انڈیمان جیل میں حریت پسندوں پر ایسے ایسے ظلم توڑے ہیں کہ سن کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس نے کئی آدمیوں کے گلے ان کی پچھیوں سے کٹوائے ہیں۔ اس کے مظالم ناقابلِ بیان ہیں۔''

خالد یہ باتیں کرتے ہوئے جیسے غصے میں آ گیا تھا۔ اس کے جبڑے کی ہڈیاں تنے ہوئے چہرے پر ابھر آئی تھیں۔ ماتھے کی شکنیں اور گہری ہو گئی تھیں اور گھنی بھنویں آپس میں مل گئی تھیں۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی شاہین، آسمان کی بلندیوں پر پرواز کرتے ہوئے نیچے اپنے کسی شکار کو دیکھ رہا ہو۔

پھر خالد، کرنل مرے ہی کی باتیں کرتا رہا، احمد آباد میں، کرنل مرے کی سرگرمیوں کے بارے میں بتاتا رہا۔ جب کرنل مرے، احمد آباد کے ریسٹ ہاؤس میں مقیم تھا، روزانہ رات کو شراب کے نشے میں دھت ہو کر دادِ عیش دیا کرتا تھا۔

اسی رات ہم دونوں ریسٹ ہاؤس میں موجود تھے۔ چوکیدار باورچی اور شکرے والے سپاہی کو ہم آسانی سے بے بس کر کے اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گئے جس کے اندر کرنل مرے ایک ہندوستانی عورت کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا رہا تھا۔ دروازے پر ہلکے سے دباؤ سے پتا چلا کہ کھلا ہوا ہے۔ اگلے لمحے ہم زور سے دروازہ کھول کر اندر پہنچ گئے۔ ہمارے ہاتھوں میں پستول تھے۔ کرنل مرے گھبرا کر مڑا۔ عورت نے چیخ مار کر چادر اپنے اوپر کھینچ لی۔ کرنل مرے ننگ دھڑنگ بستر پر موجود تھا۔

''اٹھو!'' میں نے پستول اس کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

اس دوران میں مہندر نے بیڈ کے ساتھ رکھی ہوئی میز پر سے کرنل مرے کا پستول اٹھا لیا تھا۔

"اپنے سلیپنگ سوٹ سے اپنی ٹانگیں باندھو!" میں نے کہا۔ اس وقت مہندر اس کے دوسرے پہلو پر کھڑا تھا۔

"کون ہو تم؟"

"اپنے پیر باندھو!" مہندر نے میز پر پڑی ہوئی بید کی چھڑی اٹھا کر پوری قوت سے مرے کے جسم پر ماری۔

مرے نے سسکاری لے کر اپنے جسم کے اس حصے کو دبا لیا تھا جہاں چھڑی پڑی تھی۔ اس جگہ ایک بدھی اچھل آئی تھی۔ پھر اسے اپنے دونوں پیر سلیپنگ سوٹ کے ایک پائنچے سے باندھنے ہی پڑے، اب وہ آسانی سے حرکت نہیں کر سکتا تھا۔

"تم چاہتے کیا ہو؟" کرنل مرے نے پھر پوچھا۔ خوف سے اس کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

"اب اس لڑکی کے پیر بھی باندھ دو۔" میں نے کہا۔

پھر ہم نے کرنل مرے ہی سے اس لڑکی کے ہاتھ اور منہ بھی بندھوا دیا اور اسے پلنگ سے اٹھا کر فرش پر ڈال دیا گیا۔ ذرا ہی دیر میں کرنل کے ہاتھ بھی باندھ دیے گئے اور اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا گیا۔

"میں مہندر ہوں کرنل مرے!" مہندر نے کہا تھا۔ "وشواناتھ کا بیٹا جس کی تم لوگوں کو تلاش تھی۔ کل تم نے وشواناتھ کے جسم کو شکرے کی خوراک بنانے کا وعدہ کیا تھا اور شکرے کو اس کے جسم ذائقہ چکھایا بھی تھا۔"

کرنل مرے کی آنکھیں خوف سے ابل پڑیں۔ مہندر نے بڑھ کر اس کے منہ سے کپڑا کھول لیا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس نہ تو ٹکٹکی ہے نہ بچھو!"

"تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔" کرنل مرے نے کہا۔ "میں نے جو کچھ کیا میرے فرائض میں داخل تھا۔"

"میں جو کچھ کر رہا ہوں، وہ بھی میرے فرائض میں داخل ہے۔" مہندر نے کہا۔ "میں آج تمہارے جسم سے اس شکرے کی دعوت کروں گا، سمجھے!"

"نہیں، تم ایسا نہیں کر سکتے۔" کرنل مرے نے کہا تھا۔

"ایسا ہی کیا جائے گا۔" مہندر نے کہا تھا۔ "تم ظالم ہو، بے رحم ہو، بزدل ہو، آج تک تم نے لوگوں کو ایذائیں دی ہیں، آج تم خود اس کا لطف اٹھاؤ گے۔ میں دیکھوں گا کہ تم اپنی چیخوں پر کس طرح قہقہے لگاؤ گے! کس طرح تکلیف سے لطف اٹھاؤ گے!"

"نہیں، خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔" کرنل مرے نے کہا۔ "میں نے تمہارے والد کو نہیں مارا۔ انہوں نے خودکشی کی ہے۔"

میں اسی وقت کمرے سے نکل گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں اس سپاہی کو جس نے شکرا پال رکھا تھا، شکرے کے ساتھ اسی کمرے میں لے آیا۔ اس وقت بھی شکرے کی آنکھوں اور چونچ پر چمڑے کا خول چڑھا ہوا تھا۔ خود سپاہی کی آنکھوں پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مہندر نے آہٹ پاتے ہی پھر کرنل کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا تھا۔

میں سپاہی کو کرنل مرے کی مسہری کے پاس لے آیا۔ پھر اس کی کلائی میں پڑی ہوئی زنجیر کھولی۔ اس زنجیر کا دوسرا سرا شکرے کی ایک ٹانگ میں پڑا ہوا تھا۔ میں نے زنجیر اس کے بازو سے کھول کر کرنل مرے کے بازو سے باندھ دی۔ اس وقت کرنل مرے کے چہرے پر خوف اور دہشت کے آثار اپنی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ وہ تاثرات آج بھی میرے ذہن میں پوری طرح موجود ہیں۔ موت سے چند لمحے قبل انسان پر کیا دہشت طاری ہوتی ہے، اس کا چہرہ کس حد تک بگڑ جاتا ہے، یہ اسی دن مجھے معلوم ہوا تھا۔

سپاہی کے چہرے سے پٹی کھولتے ہوئے میں نے اس سے کہا کہ وہ شکرے کی آنکھوں اور چونچ سے چمڑے کا خول اتار دے۔ اسی وقت مہندر نے پستول کا دستہ مار کر کھڑکی کا ایک شیشہ توڑ دیا اور شیشے کا ایک تیز دھار ٹکڑا لے آیا۔ مہندر نے مرے کے سینے سے لے کر پیٹ تک ایک ہی لکیر کھینچی اور گوشت کٹ کر اس گھاؤ میں سے سرخ سرخ خون بہنے لگا۔

سپاہی دہشت کے مارے کبھی ہمیں اور کبھی کرنل مرے کو دیکھ رہا تھا۔ "نہیں!" وہ چیخا۔

"تم مرنا چاہتے ہو!" میں نے سفاکی سے کہا۔

اسے وہی کرنا پڑا جو ہم چاہتے تھے۔ شکرے کی آنکھیں کھلیں، اس نے سامنے سرخ سرخ خون اور گوشت دیکھا اور بے قابو ہو گیا۔ پھر شکرے کی چونچ کھلی اور اس نے کرنل مرے کے جسم میں پنجوں کے نوکیلے ناخن پوری طرح گاڑ کر اپنی بیٹھک درست کی اور مڑی چونچ کرنل مرے کے جسم میں اتار دی۔

میں نے پستول کا دستہ، سپاہی کے سر کے پچھلے حصے پر زور سے مارا اور وہ بغیر آواز نکالے ڈھیر ہو گیا۔ سپاہی کو چادروں سے باندھ کر کرنل مرے کے پلنگ کے نیچے دھکیل دیا گیا۔

کرنل مرے جسم کو بار بار تکلیف سے جنبش دے رہا تھا۔ پھر مہندر نے اس کے منہ سے کپڑ نکال لیا اور مرے کی چیخیں، کمرے کی فضا میں گونجنے لگیں۔

''ہاہاہا!'' مہندر چیخا۔ ''کرنل ہنسو! ہنستے کیوں نہیں ان چیخوں پر!''

شکرا کمرے کے اس ماحول سے جو نفرت، عداوت اور انتقام سے مسموم تھا، بے نیاز ہو کر انسانی جسم کے زندہ گوشت سے اپنی بھوک مٹا رہا تھا اور کرنل مرے کی بھیانک چیخیں ابھر رہی تھیں۔ یہ چیخیں سیٹھ وشواناتھ کی اس چیخ سے زیادہ بھیانک تھیں جو پچھلی رات میں نے یراودہ جیل میں سنی تھیں۔

''آؤ مہندر!'' میں نے کہا۔ ''بس اب نکل چلو۔''

''مجھے افسوس ہے مرے، میں تمہاری چیخوں سے زیادہ لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔'' مہندر نے کہا اور میرے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔

ہم برآمدے سے اترے ہی تھے کہ سامنے شیڈ میں کھڑی ہوئی کار تیزی سے آ کر ہمارے پاس رکی۔ میں نے اور مہندر نے پستول سیدھے کر لیے اسی وقت آواز آئی۔

''جلدی سے بیٹھ جاؤ، بہت دیر کر دی تم نے!'' یہ خالد شکرے کی آواز تھی۔ ہم دونوں کار میں بیٹھ گئے اور کار تیزی کے ساتھ ریسٹ ہاؤس کے احاطے سے نکل گئی۔ اس وقت بھی کرنل مرے کی خوفناک چیخیں ابھر رہی تھیں۔

یہ چیخیں دیر تک ہمارے کانوں میں گونجتی رہیں۔

''آپ اچانک......'' مہندر نے کافی دیر بعد زبان کھولی۔

''تم لوگ تنظیم کا بہترین سرمایہ ہو۔'' خالد نے کہا۔ ''اور اپنے سرمائے کی ہر شخص حفاظت کرتا ہے۔'' پھر وہ ہمیں بتاتا رہا کہ اس نے صبح ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ ہماری نقل و حرکت پر نظر رکھے گا۔ ''ویسے مجھے یقین تھا کہ تم کرنل مرے ہی سے بدلہ لینا چاہتے ہو اسی لیے میں نے صبح تم سے کرنل مرے کے بارے میں کافی گفتگو کی تھی اور تمہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ کرنل مرے کہاں مقیم ہے اور وہاں تک کیسے پہنچا جا سکتا ہے۔ یہ سب کچھ میں نے اسی لیے بتایا تھا تاکہ تمہیں کسی انجانے شخص سے ریسٹ ہاؤس کا پتا نہ پوچھنا پڑے اور میرا اندازہ درست ہی نکلا۔''

ہم دونوں خاموش رہے۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم نے ایک ظالم آدمی کو اس کے انجام تک پہنچایا۔'' خالد نے کہا۔ ''لیکن یہ بات ہمیشہ یاد رکھو، ہمیں ذاتی رنجشوں اور دشمنیوں سے بلند ہو کر کام کرنا ہے۔

کرنل مرے ہمارے ملک کی حریت پسند تنظیموں کا اجتماعی دشمن تھا اس لیے تنظیم کو تمہارے اس فعل پر شاید کوئی اعتراض نہ ہو۔''

''ہمیں معلوم ہے جناب!'' میں نے کہا تھا۔

''یہ میں بھی جانتا ہوں۔'' خالد نے کہا۔ ''لیکن تمہیں بار بار اس لیے یہ بات جتائی جاتی ہے کہ کسی بھی لمحے تمہارے ذہن سے اجتماعی مفادات اور کوششوں کی اہمیت اوجھل نہ ہو۔ ہاں تمہارے لیے ایک اطلاع ہے۔'' خالد نے کہا۔

''وہ کیا؟''

''خان بہادر تصدق حسین کو ختم کرنے کی تمہاری دوسری کوشش بھی کامیاب نہ ہو سکی۔'' خالد نے کہا۔

''کیا؟'' میں نے تقریباً چیخ کر کہا۔

''ہاں۔'' خالد نے کہا۔ ''وہ بالکل محفوظ رہا البتہ اس کے دو مہمان ہلاک ہو گئے۔''

میرا دشمن اب بھی زندہ تھا، لالی کا قاتل اب بھی زندہ تھا، یہ خیال میرے لیے سوہان روح تھا۔

''ویسے ایک بات بتاؤ......'' خالد کہہ رہا تھا۔ ''کیا اسی رات تصدق پر حملہ کرنے کے بعد تم نے اسلحہ سے لدی ہوئی ٹرین بھی تباہ کی تھی؟ مجھے یقین ہے کہ یہ کارروائی تمہاری ہی تھی۔''

''اس یقین کا سبب؟'' مہندر نے پوچھا۔

''مال گاڑی کے انجن ڈرائیور، فائر مین اور گارڈ اس سلسلے میں دو نوجوانوں کی داستان سنا رہے ہیں۔'' خالد نے کہا۔ ''انہوں نے پولیس کو جو حلیہ بتایا ہے، وہ حلیہ وہی ہے جو اس موقع پر تمہارا تھا۔''

پھر مہندر نے اس رات کے تمام واقعات خالد کو مختصراً بتا دیے۔

''اب تم پکے چھاپا مار بن گئے ہو۔'' خالد نے کہا۔ ''ہر وقت حملہ کرنے کے لیے چوکس اور تیار رہنا بھی چھاپا مار کی خصوصیت ہوتی ہے۔'' خالد کے لہجے میں تحسین و آفریں کے جذبات تھے۔ ''مجھے یقین ہے کہ تم نینی تال کی مہم سے بھی کامیاب اور سرخرو لوٹو گے۔''

اب ہم بڑودہ پہنچ گئے تھے۔ ریلوے اسٹیشن پر خالد نے ہمیں اتارا اور ہدایت کی کہ ہم ٹرین پکڑ کر لاہور پہنچیں۔ ''میری کوشش ہوگی کہ پولیس کو یہ اندازہ نہ ہونے دوں کہ تم ریسٹ ہاؤس سے کدھر گئے ہو۔ میں یہی کار لے کر سورت جا رہا ہوں۔ وہاں کسی تھانے کے

پاس یہ موٹر گاڑی کھڑی کر کے میں بمبئی پہنچ جاؤں گا۔ خدا حافظ!''

''خدا حافظ!'' ہم دونوں نے ایک ساتھ کہا اور خالد نے کار بڑھا دی۔

☆======☆======☆

پروگرام کے مطابق اب ہم شملے میں تھے۔ لاہور میں مولانا ظفر علی خان نے ہمارا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا تھا اور ہمیں پولیس، قانون اور خفیہ کی دسترس سے دور رکھا تھا۔ اس دوران میں محبانِ وطن کے کارکن جنوبی ہندوستان اور مشرقی ہندوستان میں سرگرم عمل رہے۔ کرنل مرے کی لاش کے پاس بھی محبانِ وطن ہی کا کارڈ پایا گیا تھا۔ پولیس نے شبے میں بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کی تھیں لیکن محبانِ وطن کے سربراہوں تک نہیں پہنچ پائی تھی۔ جنوبی ہندوستان کے کارخانوں میں ہڑتالوں اور توڑ پھوڑ کا زور تھا۔ سبوتاژ کی وارداتیں مسلسل ہو رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ حریت پسندوں کی تمام توجہ جنوبی ہندوستان کی طرف مرکوز ہے۔ اس دوران میں شمالی ہندوستان میں صرف ایک اہم واقعہ ہوا۔ اسمبلی ہال میں بم کے دھماکے ہوئے تھے لیکن کوئی خاص نقصان نہیں ہوا تھا۔ یہ اطلاعات ہمیں مولانا ظفر علی خان سے باقاعدہ ملا کرتی تھیں۔ لاہور میں، ہمارے قیام کے دوران میں صرف ایک واقعہ ایسا ہوا تھا جس کا تذکرہ میں ضروری سمجھتا ہوں۔

ایک دن حسب معمول ملاقات کے دوران میں مولانا ظفر علی نے ہمیں بتایا تھا کہ خان بہادر تصدق حسین اپنے اہل خاندان کے ہمراہ لاہور آیا ہے۔ بس پھر ہم نے مولانا ظفر علی خان سے یہ بھی معلوم کر لیا کہ وہ کہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ مال روڈ پر ایک کوٹھی میں اپنے خاندان کے ساتھ مقیم تھا۔ پھر ایک رات ہم دونوں وہاں پہنچ گئے تھے۔ ہماری بدقسمتی تھی یا تصدق حسین کی خوش قسمتی کہ وہ کسی اہم کام کے سلسلے میں گورنر پنجاب کے پاس گیا ہوا تھا۔ کوٹھی میں صرف اس کی بیوی اور بیٹی موجود تھیں۔

میں نے سوچا تھا کہ اس کی بیٹی کو گولی مار دوں اور اسی خیال سے مہندر کو تصدق حسین کی بیوی کے پاس چھوڑ کر اس کی بیٹی کی خواب گاہ میں داخل ہوا تھا۔

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی اور بڑی بڑی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ پستول میرے ہاتھ میں کپکپا کر رہ گیا۔ میں گولی نہ چلا سکا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں اس پر گولی چلا ہی نہیں سکتا تھا۔ میں بھلا لالی کی تصویر پر گولی کیسے چلا سکتا تھا۔ شاہدہ تصدق بالکل لالی کی ہم شکل تھی۔

میں الٹے قدموں دروازے سے واپس آ گیا۔ ''کیا ہوا آفاق! گولی کیوں نہیں

چلائی؟''

''میں...... میں اسے نہیں مار سکتا۔'' میں نے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''تم اس پر نظر رکھو!'' مہندر نے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں۔''

اور پھر مہندر بھی اسی جذباتی صدمے سے دوچار ہوا تھا جس نے میرے حواس پراگندہ کر دیے تھے۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' اس نے کہا۔

پھر ہم دونوں ان ماں بیٹیوں کو ایک کمرے میں لے آئے تھے اور میں نے کہا تھا۔

''مسز تصدق! اپنے شوہر سے کہہ دینا کہ آج اس کی بیٹی محض اس لیے بچ گئی ہے کہ یہ لالی کی ہم شکل ہے، اس لڑکی کی ہم شکل جسے اس نے لکھنؤ میں موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اس سے کہہ دینا کہ میں دنیا کے آخری سرے تک اس کا تعاقب کروں گا۔''

پھر ہم دونوں وہاں سے ناکام، محروم اور افسردہ و ملول واپس آ گئے تھے۔ شاہدہ آج بھی زندہ ہے۔ کراچی ہی میں مقیم ہے۔ وہ آج اس لیے زندہ ہے کہ لالی کی ہم شکل ہے ورنہ وہ رات، اس کی آخری رات ثابت ہوتی۔ کون ہے جو میرے اس دکھ کو محسوس کر سکتا ہے۔ آج بھی جب کبھی میں لالی کو دیکھنا چاہتا ہوں تو شاہدہ کے گھر چلا جاتا ہوں۔

☆======☆======☆

دو ماہ ہم چھ آدمیوں نے شملہ اور اس کے آگے پہاڑی سلسلے کی کوہ پیمائی کی۔ میں، مہندر اور جمشید ایک پارٹی میں تھے۔ ہم شملے سے چل کر درہ شپکی پہنچے تھے، پھر درہ مانا اور کامٹ سے گزرتے ہوئے واپس شملہ آ گئے تھے۔ دہقانی، صحرائی اور غزنوی کامٹ سے گزرتے ہوئے درہ شپکی اور درہ مانا تک پہنچے تھے اور وہاں سے واپس شملے آئے تھے۔ دونوں جماعتوں کی ملاقات درہ شپکی کے قریب ہوئی تھی۔

یہ سفر بہت سخت، پُرمصائب اور آزمائشی تھا۔ کہیں تیز اور سرد ہوائیں ہمارے جسم کو چھید ڈالتی تھیں، کہیں رات کو ہمیں کھلے میں سونا پڑتا تھا کہ خیمہ کھڑا کرنا ناممکن ہوتا تھا یا پھر ہوا اتنی تیز ہوتی تھی کہ خیمے کا ٹھہرنا ہی محال ہو جاتا تھا۔

ہم نے اس کوہ پیمائی کی صعوبتوں کو خوشی سے برداشت کیا کیوں کہ ہم جانتے تھے کہ ہماری یہ کوہ پیمائی ایک بڑی اور اہم مہم کی تیاری کے لیے ہے۔ اس سفر میں ہم پہاڑوں کے موسم سے واقف ہو گئے تھے۔ ہم نے پہاڑوں کے مزاج کو پہچان لیا، ان کے گرم و سرد سے مانوس ہو گئے۔ سنگلاخ پہاڑوں سے لے کر برف پوش پہاڑوں تک سب کے اسرار ہم پر ہویدا ہو چکے تھے۔ ہمیں یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ایسے علاقے میں ہمیں کس قسم کے

زادِراہ کی ضرورت ہو سکتی ہیں۔ جسم اگر برف کی شدت سے گلنے لگے تو بچاؤ کے کیا طریقے ہو سکتے ہیں۔ اس پہاڑی سفر میں، دونوں جماعتوں کے ساتھ دو دو پہاڑی بھی تھے۔ یہ دونوں لداخی تھے۔ اس سفر کے دوران میں ہم نے ان لداخیوں کے توسط سے برفانی ریچھوں کی چربی اور کھالیں بھی خریدیں جو ایسے علاقوں میں جسم کو گرم رکھنے اور سردی کی صعوبتوں سے جسم کو بچانے کا مؤثر ذریعہ ہوتی ہیں۔

شملے پہنچتے ہی اگلے دن ہم لوگ ایک ایک دن کے وقفے سے انہی دو ٹکڑیوں میں رانی کھیت پہنچے۔ پہلی ٹکڑی میری، مہندر اور جمشید کی تھی۔ ریلوے اسٹیشن پر خالد ہمارا منتظر تھا۔ ہم نے اس کے ساتھ وہ باقی دن ایک چھوٹی سی سرائے میں گزارے۔

''تم لوگوں کو آج رات ہی یہاں سے گلاب کوٹی روانہ ہونا ہے۔ پیپل کوٹی اور گلاب کوٹی کے درمیان کسی جگہ کوہستانی یا طارق تمہیں ملیں گے، پھر تمہیں انہی کے ساتھ جانا ہے اور ہاں ایک اہم بات یہ ہے کہ تمہیں یہ تمام سفر رات ہی کو کرنا ہے۔ دن میں تم سفر نہیں کرو گے بلکہ کسی غار میں یا کسی ویران اور ایسے مقام پر قیام کرو گے جہاں تم پر کسی کی نظر نہ پڑے تو اچھا ہے۔''

''تو آپ نہیں چلیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں پرسوں شام کو باقی لوگوں کے ساتھ چلوں گا۔ ان میں سے کسی نے یہ علاقہ نہیں دیکھا ہے۔'' خالد نے کہا۔ ''پھر ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ اس علاقے میں لوگوں کو بلاوجہ اپنی سرگرمیوں کا احساس دلا دیں۔ میں دوسری جماعت کو یہاں اتاروں گا بھی نہیں بلکہ اسے کاٹھ گودام پر اتارا جائے گا اور وہاں سے ہم اپنا سفر شروع کریں گے۔''

ہمارے ساتھ پانچ خچر تھے۔ تین پر ہم سوار تھے اور دو پر ہمارا سامان لدا ہوا تھا۔ یہ تمام سامان خوراک اور خیموں پر مشتمل تھا۔ اسلحہ میں ہمارے پاس صرف پستول تھے جن میں گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ ہمارے پاس فالتو راؤنڈ بھی نہیں تھے۔ بہ ظاہر ہم اس انداز میں سفر کر رہے تھے جیسے سیر و سیاحت کے بے ضرر شائقین سفر کرتے ہیں۔ پستولوں کے لائسنس بھی ہمارے پاس تھے، گویا وہ اسلحہ بھی ہم قانونی طور پر لے کر جا رہے تھے، محض اپنی حفاظت کے خیال سے! مجھے یہ احتیاط پسندی واقعی اچھی لگی تھی۔

پانچ دن بعد ہم پیپل کوٹی کی بستی کو چھوڑ کر گلاب کوٹی کی طرف بڑھ رہے تھے کہ میں نے ایک سمت سے کوئل کی آواز سنی۔ یہ وہ اشارہ تھا جس سے میں، مہندر اور جمشید بھی واقف تھے۔ میں نے بھی جواب میں ویسی ہی آواز نکالی۔ ذرا ہی دیر بعد دائیں طرف

پہاڑ کی بلندی سے ایک شخص ہماری طرف بڑھا۔ اس کی چال سے میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کوہستانی ہے۔

ہم تینوں بڑی گرم جوشی کے ساتھ اس سے گلے ملے اور پھر اس کی رہبری میں آگے بڑھنے لگے۔ ہمارا یہ سفر پانچ گھنٹے بعد رات کے پچھلے پہر ختم ہوا۔ ہم جھاڑیوں کے پیچھے سے گزرتے ہوئے ایک بڑے غار میں پہنچ گئے۔

غار میں طارق بیگ اور سشما ہمارے منتظر تھے۔ چھ پیالیوں میں گرم گرم کافی سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ہم چاروں، غار کی دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے بستروں پر ڈھیر ہو گئے۔ سشما بڑی محبت سے مہندر کو دیکھ رہی تھی۔ مصافحوں اور ابتدائی کلمات کے بعد میں نے کافی پیتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا۔ ''تمہارا اندازہ کمال کا ہے بھئی سشما! یعنی پیالیوں میں گرم گرم کافی تیار ملی۔''

''یہ میرا نہیں، ہمارے مواصلاتی نظام کا کمال ہے۔'' سشما نے کہا۔ ''ارے میں اسے اطلاع تو دے دوں کہ معزز مہمان یہاں پہنچ گئے ہیں ورنہ وہ بے چارہ پریشان ہو گا۔'' پھر اس نے غار کے دہانے کے ساتھ لگی ہوئی ایک آہنی چرخی میں تار سے بندھے ہوئے ایک گولے کو پکڑ کر تین مرتبہ کھینچا۔ ''یہ ہے ہمارا مواصلاتی نظام!'' سشما نے کہا۔ ''بس یہ نظام پندرہ منٹ کی مسافت تک دونوں جانب قائم ہے۔'' اس نے کہا اور غار کے دہانے کی دوسری جانب لگی ہوئی ویسی ہی چرخی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ دوسری جانب کا مواصلاتی سلسلہ ہے لیکن آج رات صرف دائیں طرف کا نظام کام کر رہا ہے۔''

''مگر یہ نظام...... کیا اس کے باہر سے نظر آنے کا خطرہ نہیں؟'' میں نے دریافت کیا۔

''ہمارا یہ تمام نظام زیر زمین ہے۔ یہ تار، لوہے کے پائپوں سے گزرتے ہیں جنہیں زمین کھود کر دبا دیا گیا ہے۔ یہاں سے دوسرے سرے تک صرف تین موڑ ہیں جہاں ہمیں پلیاں لگانی پڑی ہیں لیکن وہاں پہلے ہی جھاڑیاں اور بیلیں اگی ہوئی تھیں، سو وہ پلیاں بھی نظر نہیں آ سکتیں۔''

''اوہ!'' میں نے کہا۔ ''تم لوگ یہاں خاصا کام کرتے رہے ہو!''

''یہ ہمارا مستقر ہے نا!'' سشما نے کہا۔ ''اسی لیے اس کے تحفظ کی خاطر ہم نے کچھ خاص انتظامات کیے ہیں۔''

''یہ ان غاروں میں سے نہیں ہے جن کی نشاندہی میں نے کی تھی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں یہ غار دراصل طارق کی تلاش ہے۔'' کوہستانی نے کہا۔ ''اس غار کی دریافت کے بعد ہی ہم نے اسے اپنا مستقر بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس غار میں کئی خصوصیات ہیں۔ یہ آواز سن رہے ہو؟ غور سے سنو!''

''یہ تو پانی کے بہنے کی آواز ہے۔'' مہندر نے کہا۔

''ہاں! ادھر آؤ۔'' یہ کہہ کر کوہستانی اٹھا اور ٹارچ روشن کر کے غار کے عقبی حصے میں چلا گیا جہاں یہ غار ایک چٹان سے بند ہو جاتا تھا۔ اس چٹان کے دامن میں پانی بہہ رہا تھا۔ پانی، چٹان کے ساتھ غار کی دیوار کے نیچے غائب ہو جاتا تھا۔ ''یہ پانی کہاں سے آتا ہے، کہاں غائب ہو جاتا ہے، کچھ پتا نہیں۔'' کوہستانی نے تبصرہ کیا۔ ''پانی کا یہ چشمہ اس غار کی سب سے اہم خصوصیت ہے۔'' کوہستانی نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا۔

پھر ہم اسی غار میں سو گئے۔ علی الصبح میری آنکھ اچانک کھل گئی۔ ابھی سب لوگ سو رہے تھے صرف طارق بیگ جاگ رہا تھا اور وہ بھی سفر کی تیاری کر رہا تھا۔ ''کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے اس سے کہا۔

''بھئی میں اس اسلحہ سازی فیکٹری کو ضروریات کی بعض چیزیں فراہم کرنے لگا ہوں۔'' اس نے بتایا۔ ''میں روزانہ دوپہر کو وہاں دودھ دے کر آتا ہوں، ہفتے میں دو مرتبہ انڈے سپلائی کرتا ہوں اس کے علاوہ سبزیاں اور پھل بھی فراہم کرتا ہوں۔''

''یہ کیسے ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''بس ایک دن میں یہاں کے لیے کھانے پینے کا سامان لے کر آ رہا تھا کہ راستے میں دو انگریز فوجی ملے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھ گچھ کی تو میں نے ان سے کہا کہ میں اپنے گھر والوں کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لے جا رہا ہوں۔ اس پر انہوں نے میرے گاؤں کا نام پوچھا تو میں نے پیپل کوٹی کا نام لے دیا۔ اس پر انہوں نے کہا کہ پیپل کوٹی کا راستہ یہ نہیں ہے۔ میں نے یہ کہہ کر انہیں تسلی دی کہ پہاڑ پر مقدس دیوتاؤں کا استھان ہے۔ میں وہاں مہینے میں ایک مرتبہ ضرور حاضری دیتا ہوں۔ میں نے یہ بات غلط نہیں کہی تھی۔ یہاں سے کوئی تین میل کے فاصلے پر جو پہاڑ ہے، اس کی چوٹی پر، ایک چٹانی دیوار ہے۔ اس دیوار پر مختلف مورتیاں ترشی ہوئی ہیں۔ میری خوش قسمتی یہ تھی کہ میں اس وقت اسی پہاڑ کے دامن میں تھا۔ میں اس سے پہلے دو تین مرتبہ ادھر جا چکا تھا۔ وہ انگریز افسر میرے ساتھ اس پہاڑ پر چڑھے جہاں میں نے سب سے بڑی مورتی کے قدموں میں

دودھ ڈالا اور وہیں سے کچھ پھول توڑ کر مورتی کے قدموں میں رکھ دیے، پھر عبادت کے انداز میں مورتی کے قدموں پر سر ٹکا دیا۔''

میں اس کی کارگزاری کی تفصیل بڑی دلچسپی سے سن رہا تھا۔ ''یار تم تو بڑے چالاک نکلے۔''

''بس جی، وقت کی بات ہے۔'' طارق بیگ نے کہا۔ ''میں تو یہی سوچتا ہوں کہ اگر اس وقت اس پہاڑی سے آگے نکل چکا ہوتا تو کیا جواب دیتا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر انہیں میری بات کا یقین آ گیا کیوں کہ وہ اس پہاڑی پر موجود مورتیوں سے واقف تھے۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں ان کی کمپنی کے لیے کھانے پینے کی اشیا فراہم کیا کروں۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ لیا ہے کہ میں کسی کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ میں کھانے پینے کی اشیا اس علاقے میں انگریز فوج کو فراہم کر رہا ہوں۔ انہوں نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر میں نے کسی کو کچھ بتایا تو مجھے جان سے مار دیا جائے گا۔ وہ اس کے لیے مجھے زیادہ معاوضہ دیتے ہیں۔ معلوم ہے، میں پچھلے دو مہینے میں پانچ سو روپے کما چکا ہوں۔''

''مگر آج تم کیسے سامان لے کر جاؤ گے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے معلوم تھا کہ آپ لوگ پہنچنے والے ہیں لہٰذا میں کل شام ہی دودھ لے آیا تھا۔ دیکھو، دودھ کا ڈبا ادھر ٹھنڈے پانی میں رکھا ہے۔ پھر انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ ان کے لیے کافی سامان رانی کھیت یا کاٹھ گودام سے لے کر آنا ہے۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ میں آج کافی گدھے لے کر آؤں گا اور رانی کھیت روانہ ہو جاؤں گا۔ اس میں یہ تمام خچر لے جاؤں گا اور آپ لوگ بھی انہیں چھپانے کے جھنجٹ سے بچ جائیں گے۔''

''اور یہ کوہستانی کہاں گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ باہر ہیں۔ وہ بھی میرے ساتھ جا رہے ہیں۔''

''کیا کہا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں میں نے کوہستانی کو اپنا بھائی بنا کر پیش کیا ہے۔ ایک دن میں بخار کی وجہ سے نہ جا سکا تھا۔ اگلے دن بھی میں بخار کی حالت میں وہاں پہنچا اور ان سے کہا کہ اگر وہ اجازت دیں تو اپنے بھائی کو بھی چھاؤنی دکھا دوں تا کہ اگر کبھی میری طبیعت خراب ہو جائے تو بھائی سامان فراہم کرتا رہے۔ انہوں نے اجازت دے دی تھی لیکن اس سے بھی

انہوں نے راز داری کا وعدہ لیا ہے۔ ہم دونوں نے گوتم بودھ کی قسم کھائی ہے، خدا معاف کرے!''

یہ خبر خوش آئند تھی۔ اس طرح کم از کم دو افراد کسی شبہے سے بالاتر ہو کر ٹھیک اس فیکٹری تک جا سکتے تھے۔ یہ ایک ایسا پہلو تھا جو ہماری کامیابی میں ایک اہم عنصر ثابت ہو سکتا تھا۔

''مگر آج تو تم ٹھیک ہو، پھر کوہستانی کو کیوں لے جا رہے ہو؟ انہیں اعتراض نہیں ہو گا؟''

''اعتراض کیسے ہو سکتا ہے! اتنا سامان منگوایا ہے کہ چھ خچر بھی شاید کم پڑیں۔ اتنا سامان میں اکیلا تو نہیں لا سکتا؟'' طارق بیگ نے کہا۔

واقعی وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اس کا جواز ٹھیک ہی تھا۔ پھر طارق بیگ دودھ کا ڈبا لے کر غار سے نکلا تو میں بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر آیا۔ ابھی رات کی سیاہی پوری طرح نہیں چھٹی تھی۔ آسمان پر تارے چمک رہے تھے لیکن چڑیوں نے آمد صبح کے راگ الاپنے شروع کر دیے تھے۔ کوہستانی ایک چٹان پر فجر کی نماز پڑھنے میں مصروف تھا۔ میں وہیں کھڑا پھیپھڑوں میں تازہ ہوا بھر رہا تھا کہ ایک طرف سے ایک اور شخص کا ہیولا بڑھتا ہوا نظر آیا۔ اس کا رخ ہماری ہی طرف تھا۔ وہ ابھی کافی نشیب میں تھا۔

''طارق! کوئی آ رہا ہے۔'' میں نے چپکے سے کہا۔

طارق نے اس طرف دیکھا۔ ''ارے وہ تو اعجاز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آپ کو جانتا ہے۔ چوراچوری میں یہی تو چوکی نمبر دو پر تھا۔''

تب مجھے یاد آیا کہ اعجاز، غزنوی کا وہی دوست تھا جس نے چوراچوری میں غزنوی کے اہل خاندان کی مدد کی تھی۔

ہم پھر اندر پہنچے تو سشما اٹھ کر کافی بنا رہی تھی۔ مہندر اور جمشید اب بھی سو رہے تھے۔ پھر سشما نے ان دونوں کو بھی جگا دیا۔ ہم سب نے مل کر ناشتہ کیا۔ یہ ناشتہ بسکٹوں اور چائے پر مشتمل تھا۔

ناشتے کے بعد طارق اور کوہستانی وہاں سے چلے گئے۔ ابھی تک سورج افق سے نمودار نہیں ہوا تھا لیکن صبح کا دھندلکا پھیل چکا تھا۔

تمام دن ہم لوگ اسی غار میں محدود رہے۔ اب ذرا سی بھی بے احتیاطی نقصان دہ ہو سکتی تھی۔ اس دن سشما اور اعجاز ہمیں بتاتے رہے کہ وہ لوگ اس علاقے میں کیا کچھ کر

چکے ہیں۔ انہوں نے اس علاقے میں پانچ چوکیاں بنائی تھیں۔ یہ چوکیاں آپس میں ایک دوسرے سے پندرہ منٹ سے لے کر پچیس منٹ کی مسافت پر تھیں بشرطیکہ آدمی تیز رفتاری سے سفر کرے۔ دوسرے علاقے میں انہوں نے تین چوکیاں بنائی تھیں اور ان کے درمیان فاصلہ بھی کم و بیش اتنا ہی تھا۔

''دراصل بات یہ ہے......'' سشما نے ایک نقشہ کھول کر درمیان میں رکھ دیا۔ انگریز جو فیکٹری بنا رہے ہیں، وہ ایک مربوط اور ہر اعتبار سے مکمل اور خود کفیل فیکٹری ہو گی۔ اس سمت جدھر ہم ہیں، یعنی گلاب کوٹی کی سمت انہوں نے فیکٹری بنائی ہے۔ یہ فیکٹری زمین دوز ہے۔ کیمیائی اسلحہ میں استعمال ہونے والا کچھ خام مال اسی سمت کے ایک چھوٹے پہاڑ سے کھود کر نکالا جا رہا ہے۔ اس میں استعمال ہونے والا دوسرا خام مال جوشی مٹھ کی سمت اس بلند و بالا پہاڑی سلسلے کی دوسری جانب ایک پہاڑ سے دریافت ہوا ہے، یعنی جوشی مٹھ کی طرف!'' سشما ایک لمحے کو رکی اور اس نے نقشے پر ایک مقام پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہے گلاب کوٹی......اور یہ ہے وہ مقام جہاں فیکٹری تعمیر کی گئی ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جس کی نشان دہی کوہستانی نے اپنی رپورٹ میں کی تھی۔'' میں اس تنظیم سے واقف تھا۔ میں کوہستانی کے ساتھ خود وہاں تک گیا تھا۔ ''اور یہ وہ جگہ ہے جہاں ہم ہیں۔ اس فیکٹری سے ایک گھنٹے کی مسافت پر اور ہمارے اگلے مورچے سے صرف پندرہ منٹ کی مسافت پر!''

سشما خاموش ہو گئی۔ وہ غالباً چاہتی تھی کہ ہم نقشے میں وہ مقامات دیکھ کر سمتوں کا اچھی طرح تعین کر لیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ پھر بولی۔ ''اور یہ دیکھو، یہ رہا جوشی مٹھ، اس پہاڑ کے دوسری سمت! لیکن عین گلاب کوٹی کے مقابل! اگر اس پہاڑ میں سرنگ نکالی جائے یا اس پہاڑ کو اوپر سے نیچے ڈبل روٹی کے توسوں کی طرح کاٹ کر راستہ بنایا جائے تو پیپل کوٹی اور جوشی مٹھ کے درمیان اس وقت جو پندرہ میل کا فاصلہ ہے وہ صرف ڈیڑھ میل رہ جائے گا۔ یہی صورتِ حال یہاں بھی ہے۔ اس فیکٹری کا دوسرا حصہ جو فیکٹری کو مختلف خام مال فراہم کرے گا بلکہ زیادہ تر خام مال وہیں سے آئے گا، جوشی مٹھ کی سمت عین اسی فیکٹری کے مقابل ہے۔ عام راستے سے فیکٹری کے دونوں حصوں کے درمیان یہ فاصلہ چوبیس پچیس میل کے قریب بیٹھے گا لیکن انگریزوں نے اس فاصلے کو سرنگ کے ذریعے سمیٹ کر دو ڈھائی میل کے قریب کر دیا ہے۔ یہ دیکھو عام راستہ یوں جاتا ہے۔'' اس نے ایک تنکے سے نقشے پر گویا لکیر کھینچ کر راستے کی نشان دہی کی۔ ''لیکن سرنگ کے ذریعے فیکٹری کے یہ دونوں حصے

یوں ملا دیے گئے ہیں۔'' اس نے ذرا سا نشان بناتے ہوئے کہا۔

''مگر سوال یہ ہے کہ انہوں نے یہ فیکٹری جوشی مٹھ کی طرف ہی کیوں نہیں بنائی؟'' میں نے پوچھا۔

''شاید اس لیے کہ اتنی لمبی سڑک بنانے پر اخراجات بھی اس سرنگ سے زیادہ آتے اور فاصلہ بھی زیادہ ہو جاتا۔'' اعجاز نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔'' مہندر نے کہا۔ ''اب یہ بتاؤ کہ جوشی مٹھ کی سمت ہم نے کتنی چوکیاں قائم کی ہیں؟''

''تین۔'' سشما نے جواب دیا۔ ''ہماری اب تک کی اطلاعات یہی ہیں کہ انگریز جنگی قیدیوں سے کان کنی کا کام لے رہے ہیں۔ دن بھر کام کرنے کے بعد وہ شام کو اسی سرنگ سے فیکٹری کی طرف آ جاتے ہیں جہاں ان کے لیے علیحدہ بیرکیں بنی ہوئی ہیں اور دوسری سمت صرف دو محافظ رہ جاتے ہیں۔ بس میں یہیں تک جانتی ہوں، باقی باتیں تمہیں سالار ہی بتا سکیں گے۔''

''ان چوکیوں میں کیا ہے؟''

''کوہستانی اور طارق نے ان تمام چوکیوں میں وہ تمام بارود اور ڈائنا مائٹ وغیرہ ذخیرہ کر دیا ہے۔ جب ہم فیکٹری کی تباہی کے منصوبے پر عملدرآمد شروع کریں گے تو بیشتر اسلحہ اور گولہ بارود دونوں محاذوں کی اگلی چوکیوں پر منتقل کر دیا جائے گا۔'' سشما نے کہا۔ ''جانتے ہو شیرازی! یہ وہی اسلحہ ہے جو تم برما سے لے کر آئے تھے۔''

دوپہر کا خشک کھانا کھانے کے بعد ہم پھر اسی غار میں پڑ کر سو رہے۔ سرفروشوں کو سخت ہدایت تھی کہ اندھیرا ہونے سے قبل کوئی اس غار سے نہ نکلے اور رات کو اندھیرا پھیلنے کے بعد غار سے نکل کر آس پاس کے علاقے کا جائزہ لیا جائے، خاص طور پر فیکٹری کے آس پاس کے علاقے کا!

اگلے دن سشما کی معرفت مجھے اور مہندر کو یہ پیغام ملا کہ ہم رات تک فیکٹری کی تباہی سے متعلق اپنے اپنے منصوبے تحریری طور پر سشما کو دے دیں تاکہ وہ انہیں سالار کو پہنچا سکے۔ اسی دن ہمارے دوسرے ساتھی بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے کافی پی، کچھ دیر آرام کیا اور خالد کے ساتھ اگلی چوکیوں کی طرف بڑھ گئے۔

دس دن تک ہمارا یہی معمول رہا۔ ہم دن بھر غار میں سوتے یا باتیں کرتے رہتے اور رات کو باہر جا کر علاقے کا جائزہ لیتے اور فیکٹری کے اردگرد چکر لگا کر، وہاں کے معمولات کا

زہ لیا کرتے۔ پھر گیارہویں دن، فیکٹری کی تباہی کے لیے منتخب کیے جانے والے تمام وش مستقر میں جمع تھے۔ ہم سب نو تھے، یعنی میں، مہندر، سشما، کوہستانی، غزنوی، ی، صحرائی، اعجاز اور دہقانی! ہمارے علاوہ خالد اور سالار بھی موجود تھے۔ سالار اس وقت پنے مخصوص لباس میں تھا اور چہرہ حسب معمول سیاہ نقاب سے چھپا ہوا تھا۔

''گویا پوری ٹیم موجود ہے۔'' سالار نے تمام لوگوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی، پھر سالار نے کہا۔ ''فیکٹری کی تباہی کے لیے تم لوگوں نے صوبے پیش کیے تھے، میں نے ان سب کا جائزہ لیا ہے۔ اس جائزے کے بعد ہم نے ی منصوبہ بنایا ہے جس میں ان تمام منصوبوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ تمام منصوبے لیے ناقص تھے کہ تم لوگوں کو نہ تو مکمل معلومات حاصل تھیں، نہ تازہ ترین حالات کا علم ۔'' کچھ دیر کے لیے خاموشی رہی گویا سالار ہمیں یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ تازہ ترین ات اور مکمل معلومات اس قسم کے منصوبوں کے لیے کتنی ضروری ہیں۔ ''تازہ ترین ات یہ ہیں کہ اس فیکٹری میں کام شروع ہو گیا ہے۔ جرمن ڈاکٹر شمٹ یہیں موجود ہے۔ اں ترک اور جرمن جنگی قیدیوں کی تعداد سو کے لگ بھگ ہے۔ انگریز فوجیوں کی تعداد ں سے پینتیس کے درمیان رہتی ہے۔ پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ کوہستانی اور رق کی رسائی اس فیکٹری تک ہو گئی ہے۔ وہ کچن کے لیے تقریباً روزانہ ہی سامان لے کر ہاں جاتے ہیں۔ اس آمد و رفت کے نتیجے میں ان کے جرمن ڈاکٹر اور سائنس داں شمٹ ے بھی تعلقات پیدا ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کچن میں کام کرنے والے ترک اور جرمن یوں سے بھی جان پہچان ہو گئی ہے۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر شمٹ ہماری کے لیے آمادہ ہو گیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ یہ خطرناک بم جو اب تک تیار ہو چکے ہیں، اں سے لے جانے سے قبل ہی تباہ کر دیے جائیں۔''

یہ واقعی اہم باتیں تھیں اور ان سے ہم اپنے منصوبے کو زیادہ موثر بنا سکتے تھے۔

''ہم نے جو منصوبہ تیار کیا ہے اس میں ان تمام باتوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔'' ار نے کہا اور غار کی ایک دیوار پر چاک سے نقشہ بنا کر اپنے پلان کی تفصیلات بتانا ع کر دیں۔ یہ اس مربوط فیکٹری کی مکمل تباہی کا منصوبہ تھا جو دو حصوں پر مشتمل تھا۔ چار کی ایک پارٹی کو خالد کی قیادت میں جوشی مٹھ کی طرف سے کانوں اور سرنگ کے نے پر یلغار کر کے سرنگ کے راستے ہم سے آملنا تھا۔ دوسری پارٹی کو جس میں سات شامل تھے، اصل فیکٹری پر یلغار کرنا تھی۔ اس کی قیادت خود سالار نے اپنے ذمے لی

تھی۔اس پارٹی کو دو حصوں میں منقسم ہو کر اپنا کام کرنا تھا۔ایک حصے کا سربراہ میں تھا اور دوسرے کا مہندر۔

''آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد......'' سالار نے کہا۔''ہم یہ فیکٹری مکمل طور پر تباہ کر چکے ہوں گے۔''

ہم سب کے دل دھڑک رہے تھے۔باہر موسم کی پہلی برف باری کے آثار ہویدا تھے۔ہوا بہت سرد اور تیز تھی۔شام ہی کو ژالہ باری ہوئی تھی۔

☆======☆======☆

ٹھیک پندرہ دن بعد!

تمام ماحول برف کی سفید چادر اوڑھے رات کی خاموشی میں رات کی خاموشی میں چودھویں رات کے چاند کی برستی ہوئی چاندنی میں سو رہا تھا۔میں اپنے ساتھیوں اور طارق کے ساتھ سفید لباس پہنے اس غار سے نکلا جو گلاب کوٹی کے محاذ پر ہماری آخری چوکی کا کام دے رہا تھا۔اس مہم کے لیے ہمارے دستے نے سفید لباس پہن رکھے تھے تاکہ سفید پس منظر میں ہماری نقل و حرکت نہ دیکھی جا سکے۔حد تو یہ ہے کہ اس دن سالار اعظم نے شاید پہلی مرتبہ اپنے مخصوص سیاہ لباس کی بجائے سفید لباس پہنا تھا۔اس کے چہرے پر سفید نقاب تھی۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ابھی پانچ منٹ اور تھے۔پانچ منٹ بعد مہندر اپنی پارٹی کے ساتھ یقیناً نیچے پہاڑ کے دامن میں قیدیوں اور انگریز محافظوں کی بیرکوں کے آس پاس پہنچ جاتا۔پھر پوزیشن لیتے ہی اسے اپنے چند ساتھیوں سمیت انگریز محافظوں کی بیرک پر دستی بم پھینکنا تھے۔اس ہنگامے اور افراتفری کے دوران میں کوہستانی کو رائفلوں کے بوجھ کے ساتھ خاردار تاروں کی باڑھ سے گزر کر، جرمن اور ترک قیدیوں کی بیرک میں پہنچ کر رائفلیں اور کارتوس قیدیوں کو پہنچانا تھے اور پھر انہیں بھی ہمارا ساتھ دینا تھا۔اس ہنگامے کے دوران میں ان تین محافظوں کا بھی خاص خیال رکھا گیا تھا جو احاطے کے باقی تین کونوں پر بنے ہوئے مچانوں پر متعین تھے کیوں کہ پہلے کونے پر متعین پہرے دار کو تو پہلے حملے میں نشانہ بنایا جانا تھا۔ٹھیک اسی وقت جوشی مٹھ کی کانوں کی سمت سے خالد اور اس کے ساتھیوں کو اپنی کارروائی شروع کرنا تھی۔

اور مجھے بھی ٹھیک اسی وقت طارق کے ساتھ حرکت میں آ جانا تھا۔پہلے دھماکے کے ساتھ ہی خام مال لے جانے والی لفٹ نما ٹرالی کو پہاڑ کی کوکھ میں زیر زمین بنی ہوئی فیکٹری

سے اوپر آنا تھا۔ڈاکٹر شمٹ نے یقین دلایا تھا کہ وہ اور اس کے چند ساتھی اس ٹرالی میں ایسی خرابی پیدا کر دیں گے جس کی وجہ سے خام مال اوپر سے نیچے آنا بند ہو جائے گا اور خطرناک قسم کے بموں کی تیاری رک جائے گی۔انگریز اتنے پاگل ہو رہے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں کوئی تاخیر برداشت نہیں کریں گے کیوں کہ انہیں ایک ہفتے بعد مقررہ تعداد میں یہ بم تیار کر کے رانی کھیت بھیج دینا تھے جہاں سے انہیں کہیں اور بھیجا جانا تھا۔کام رک جانے کی وجہ سے فیکٹری میں، بموں کی تیاری میں مصروف شفٹ کے قیدیوں کو بھی بیرکوں میں بھیج دیا جانا تھا اور ڈاکٹر شمٹ کو چند ساتھیوں سمیت فیکٹری میں رہ کر ہی ٹرالی کی مرمت کرنا تھی۔اس نے وعدہ کیا تھا کہ پہلے دھماکے کی بعد ہی وہ ٹرالی کو اوپر بھیج دے گا۔

پانچ منٹ بعد ہی تباہی کی یہ مشینری حرکت میں آ گئی۔فضا میں ایک سنسناہٹ ابھری اور پھر یہ سنسناہٹ صرف میرے کانوں میں ابھری تھی۔میں زمین دوز فیکٹری کے اوپر ایک بڑی سی چٹان کی آڑ میں طارق کے ساتھ موجود تھا۔ہماری نظریں سامنے اس آہنی مچان پر لگی ہوئی تھیں جس کے نیچے فیکٹری میں اترنے والی لفٹ نما ٹرالی کی حرکت کے لیے کنواں بنا ہوا تھا۔اس ٹرالی سے ایک طرف پہاڑ میں موجود کان سے خام مال کھود کر نیچے پہنچایا جاتا تھا۔کان کا دہانہ اس ٹرالی کے نظام سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر تھا۔میں اور طارق اس کا پہلے ہی جائزہ لے چکے تھے۔وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔

اب میں اور طارق نیچے پہاڑ کے دامن میں پہلے دھماکے کی آواز کے منتظر تھے۔ ہمارے کانوں نے وہ آواز سن ہی لی۔پہلے دھماکے کی خوشگوار آواز کے بعد ہی پے در پے کئی دھماکے ہوئے مگر ہمارے کان مچان کے نیچے بنے ہوئے کنویں میں ٹرالی کے کھسکنے کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

ہماری توقع کے مطابق، ٹرالی کے قریب بنے ہوئے مچان پر متعین محافظ چونک کر نیچے اترا تھا اور میری رائفل سے نکلی ہوئی گولی نے اسے لاش میں تبدیل کر دیا تھا۔اگلے لمحے میں اور طارق دوڑتے ہوئے، مچان کے نیچے پہنچے۔ٹرالی اوپر آ چکی تھی اور ہمیں نیچے لے جانے کی منتظر تھی۔

پھر ہم تیزی سے خام مال لے جانے والی ٹرالی میں سوار ہو گئے۔تھوڑی دیر بعد ہم اس میں بیٹھے ہوئے نیچے زمین دوز فیکٹری میں اتر رہے تھے۔نیچے پہاڑ کے دامن سے اٹھنے والا شور اب ہمارے کانوں تک نہیں پہنچ رہا تھا۔کنویں سے گزر کر، ٹرالی اس زمین دوز ہال میں پہنچ گئی جہاں فرش پر اسے ٹھہرنا تھا۔میں نے نیچے دیکھا۔ڈاکٹر شمٹ اور اس

کے دو ساتھی، دو انگریز محافظوں سے الجھے ہوئے تھے۔ میں نے پستول نکالا اور ٹھیک اس وقت گولی چلا دی جب ان میں سے ایک محافظ ڈاکٹر شمٹ کو دھکا دے کر رائفل سیدھی کر چکا تھا۔ انگریز محافظ گولی کھا کر الٹ گیا۔ اس کے ہاتھ سے رائفل گر گئی۔ دوسرا انگریز محافظ بھی اسی انجام سے دوچار ہوا تھا۔ اسی دوران میں ٹرالی فرش پر پہنچ کر رک چکی تھی۔ ہم دونوں اچھل کر ٹرالی سے نکلے۔ اسی وقت دہائیں کی ایک آواز ہوئی۔ ایک سیٹی سی میرے کان پر سے گزر گئی۔ پھر دوسرا دھماکا ہوا اور میرے الٹے بازو میں آگ اتر گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ انگریز محافظ جو میری پہلی گولی سے زخمی ہوا تھا، سرنگ کی دیوار سے ٹکا بیٹھا تھا اور اس کی رائفل میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اسے تیسری گولی چلانے کا موقع نہیں مل سکا۔ طارق کے پستول سے نکلی ہوئی گولی اسے دوسری دنیا کی سیر کرا گئی تھی۔

ڈاکٹر شمٹ کے دونوں ساتھی، اس عرصے میں انگریز محافظوں کی رائفلوں پر قبضہ کر چکے تھے۔ ان کے علاوہ ہم بھی پانچ رائفلوں اور کافی گولیاں ایک لمبے سے تھیلے میں بھر لیے تھے۔ ڈاکٹر شمٹ نے انگریز محافظ کی کمر سے، ایک پٹی کھول کر میری گردن میں ڈال دی تھی اور میرا زخمی بازو اس پٹی کے حلقے میں ڈال دیا تھا۔

"تم میں سے ایک......" میں نے ڈاکٹر شمٹ کے ایک ساتھی سے کہا۔ "کانوں کی طرف سے آنے والے راستے کے دہانے پر جم جاؤ۔ اگر ادھر سے کوئی انگریز محافظ اِدھر آئے تو بلا دریغ اسے گولی مار دینا۔ ویسے اس کی اُمید نہیں۔"

پھر میں، ڈاکٹر شمٹ، طارق اور ڈاکٹر شمٹ کے ساتھی کے ہمراہ، سرنگ کے اس دہانے کی طرف بڑھ گیا جو پہاڑوں کے دامن میں اس طرف کھلتا تھا جہاں مہندر اور اس کے ساتھ مصروفِ جنگ تھے۔

دو دستی بموں سے سرنگ کے دہانے پر لگا ہوا آہنی جنگلا ٹوٹ گیا۔ ان دھماکوں کی آواز زیرِ زمین تعمیرات کی دیواروں میں دیر تک گونجتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد ہم سرنگ کے دہانے پر تھے۔

جرمن اور ترک جنگی قیدی، مہندر کی پارٹی کے لائے ہوئے اسلحہ سے جنگ کر رہے تھے۔ انگریز محافظ اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے تھے اور ابھی بہر حال کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ فاتح کون ہو گا، مفتوح کون!

☆======☆======☆

سرنگ کا گیٹ ٹوٹنے کے ساتھ ہی ترک اور جرمن قیدیوں اور ہمارے ساتھیوں نے پرجوش نعرے لگائے۔ ان کی طرف سے فائرنگ میں شدت آ گئی۔ دوسری طرف سے انگریز محافظوں نے بھی فائرنگ تیز کر دی۔ اس فائرنگ کے درمیان زخمی ہونے اور مرنے والوں کی چیخیں بھی ابھر رہی تھیں۔

ہم پانچوں سرنگ کے ٹوٹے پھوٹے گیٹ سے ذرا فاصلے پر سرنگ کی دیوار کے ساتھ چپکے کھڑے تھے۔ پھر ڈاکٹر شمٹ کے اشارے پر اس کے دو ساتھی فرش پر رینگتے ہوئے گیٹ سے باہر پہنچے ہی تھے کہ پے در پے کئی گولیاں چلیں اور وہ دونوں سرنگ کے باہر ہی الٹ گئے۔

"اٹیک!" قیدیوں کی بیرک سے ایک آواز ابھری۔

ابھی یہ آواز ختم ہوئی ہی تھی کہ دستی بموں کے پے در پے تین دھماکے ہوئے۔ یہ دھماکے انگریز محافظوں کی بیرک میں ہوئے تھے۔ میں، طارق اور ڈاکٹر شمٹ، فرش سے چپک کر کھسکتے ہوئے سرنگ سے باہر آئے اور لپک کر ایک بڑی سی چٹان کی آڑ میں ہو گئے۔

ترک اور جرمن قیدیوں کا ایک دستہ فائر کرتا ہوا انگریز محافظوں کی بیرک کی سمت بڑھ رہا تھا، ان کے عقب سے بھی ترک فوجی بیرک سے مسلسل فائر کر رہے تھے۔ انگریز محافظ جو دستی بم کے دھماکوں سے ذرا دیر کے لیے پریشان ہو کر رہ گئے تھے، پھر سنبھل چکے تھے اور انہوں نے یلغار کرنے والے قیدیوں پر فائرنگ شروع کر دی تھی۔

"سیکنڈ کمپنی! اٹیک!" قیدیوں کی بیرک سے پھر کاشن ابھرا۔ اس کے ساتھ ہی، محافظوں کی بیرک پر دستی بموں کی بارش ہوئی۔ قیدیوں کا ایک اور دستہ نعرے لگاتا ہوا انگریز محافظوں کی بیرک کی طرف بڑھا۔

اسی وقت انگریز محافظوں کی بیرک سے تین فائر ہوئے اور بیرک کی ٹوٹی ہوئی چھت سے آگے پیچھے تین روشن لکیریں آسمان کی بلندیوں میں پہنچ کر گم ہو گئیں۔ انگریز محافظوں نے یہ آتشیں فائر شاید اپنے ساتھیوں کو خطرے کی اطلاع دینے اور مدد طلب کرنے کے لیے سگنل کے طور پر کیے تھے۔ اس کے سوا ان فائروں کا کوئی مقصد ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ آسمان کی بلندیوں میں پہنچنے والی روشن لکیریں بہت تیز تھیں۔

لڑائی بہت زوروں پر تھی۔ میں نے دائیں طرف دیکھا ڈاکٹر شمٹ اپنی جگہ نہیں تھا۔

"طارق!" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر شمٹ؟"

محافظوں اور قیدیوں کی بیرکوں کے درمیان برف سے ڈھکے ہوئے میدان میں کئی افراد مردہ پڑے ہوئے تھے۔ کئی افراد، فائرنگ کرتے ہوئے محافظوں کی بیرک کی طرف کھسک رہے تھے۔ اسی وقت پھر دستی بموں کے دھماکے ہوئے۔

دستی بموں کے دھماکوں کے فوراً بعد دو اور دھماکے ہوئے، اس کے ساتھ ہی شمٹ کی تیز آواز ابھری۔ ''انگریزوں کی بیرک سے دور رہو! انگریزوں کی بیرک سے دور ہٹ جاؤ!''

شمٹ کی آواز مہندر نے بھی سن لی تھی اور یلغار کرنے والے بعض قیدیوں نے بھی! انہوں نے ڈاکٹر شمٹ کا یہ پیغام دہرایا۔ ذرا دیر میں یہ پیغام ہر طرف گونج گیا۔ پیش قدمی کرنے والے قیدی پسپا ہونے لگے۔

انگریزوں کی طرف سے مزاحمت ختم ہوگئی۔ اس دوران میں کئی انگریز محافظوں نے بیرک سے نکلنے کی کوشش کی لیکن وہ سب گولیوں کا نشان بن گئے۔ انگریز محافظوں کی مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔

شمٹ میرے پاس واپس پہنچ چکا تھا۔

نصف گھنٹے بعد ہم سب مل کر زخمیوں اور مرنے والوں کا شمار کر رہے تھے۔ ڈاکٹر شمٹ اور سالار سرنگ کے اندر باتوں میں مصروف تھے۔

اس یلغار میں تمام انگریز محافظ جن کی تعداد پینتیس تھی، کام آ گئے تھے۔ سینتیس ترک اور جرمن قیدی مارے گئے تھے، پندرہ شدید زخمی تھے۔ ہمارے ساتھیوں میں دہقانی ہلاک ہوا تھا۔ بہر حال ہماری کوشش کامیاب رہی تھی۔ فیکٹری پر اب ہمارا قبضہ تھا۔

ترک اور جرمن قیدی اب ایک منظم اور مسلح فوجی یونٹ کی صورت میں مستعد تھے۔ خودکار نظام کی طرح وہ جرمن کرنل، شولز کی کمان میں اس طرح سرگرم تھے جیسے کوئی فوج قلعے میں محصور ہو کر ایک جنگی پلان کے مطابق اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہو۔ اسی دوران میں تمام زخمیوں کی مرہم پٹی کی جا چکی تھی۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ اس کام میں سشما بھی پیش پیش تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں سالار اور ڈاکٹر شمٹ دو گہرے دوستوں کی مانند کمرے سے نکل آئے۔ ہم سب لوگوں کی نظریں ان کی طرف اٹھ گئیں۔

''دوستو!'' ڈاکٹر شمٹ نے کہا۔ ''میں تمہارا تعارف ہندوستان کے ایک عظیم مجاہد سے کرا رہا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے سالار کا تعارف مختصر الفاظ لیکن مؤثر انداز میں کرایا۔

''سالار اور ان کے ساتھیوں کا مقصد اس ہولناک فیکٹری کو تباہ کرنا تھا۔ اسی مقصد کے تحت ان کے ساتھیوں نے ہم سے رابطہ قائم کیا تھا۔ میں نے وعدہ کیا ہے کہ اب اس فیکٹری کی مکمل تباہی کا کام ہم کریں گے۔ ہمیں یہ فیکٹری اس طرح تباہ کرنا ہے کہ انگریز اسے دوبارہ استعمال نہ کر سکیں۔ انگریز فوجیوں نے اپنی ہلاکت سے قبل خطرے کا سگنل دیا تھا۔ اس کے بعد ادھر فوجی کمک آنا لازمی ہے لیکن برف باری کی وجہ سے یہ کمک یہاں سات آٹھ گھنٹے سے قبل نہیں پہنچ سکتی۔ اسی مدت میں ہمیں اس تمام شیطانی نظام کو مکمل طور پر تباہ کرنا ہے۔ اس فیکٹری کی تباہی کے لیے سالار کے ساتھیوں نے آس پاس دو مقامات پر بارود، ڈائنامائٹ اور متعلقہ سامان کا ذخیرہ کر رکھا ہے۔ وہ مقامات تمہیں دکھا دیے جائیں گے۔ کرنل شولز اس پلان کے انچارج ہوں گے۔''

پھر سالار اعظم نے مختصر سی تقریر میں ترک اور جرمن قیدیوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس فیکٹری کی مکمل تباہی ہندوستان، ترکی اور جرمنی کے اتحاد کی علامت بن کر تاریخ کے صفحات میں درج ہوگی۔ سالار کی مختصر سی تقریر کے خاتمے پر فضا، ترک جرمن اور ہندوستان کی دوستی زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔

''کوہستانی! طارق!'' سالار کی آواز گونجی۔ ''تم دونوں کرنل شولز کے آدمیوں کو وہ غار دکھاؤ گے جہاں ہم نے فیکٹری کی تباہی کے لیے دھماکا خیز سامان کا ذخیرہ کر رکھا ہے۔''

کوہستانی اور طارق، کرنل شولز کی طرف بڑھ گئے۔ کام شروع کرنے سے قبل جرمن قیدیوں نے سب لوگوں کو گرما گرم کافی پلوائی اور پھر وہاں ایک سرگرمی شروع ہوگئی۔ کرنل شولز اس دوران میں ایک میز پر بیٹھا، تیزی سے کاغذوں پر اپنا پلان مرتب کر رہا تھا۔ اس کام میں تین ترک اور جرمن فوجی اس کی مدد کر رہے تھے۔

اس نے اپنے ساتھیوں کے تین گروپ بنائے تھے۔ دو گروپوں کو کوہستانی اور طارق کے ساتھ ان غاروں سے تباہی کا سامان فیکٹری میں منتقل کرنا تھا جس میں سے ایک غار، گلاب کوٹی کی طرف اور دوسرا جوشی مٹھ کی سمت تھا اور تیسری پارٹی کے سپرد فیکٹری میں تباہی کی تیاریاں مکمل کرنا تھیں۔

میں، مہندر اور سشما کے ساتھ ایک میز کے ساتھ پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھا تھا۔ کوہستانی اور طارق دو پارٹیوں کو لے کر جا چکے تھے۔ پھر میں نے ڈاکٹر شمٹ کو کرنل شولز کے ساتھ بیرک سے نکل کر فیکٹری کی طرف بڑھتے دیکھا۔ بیرک اب خالی ہو چکی تھی۔ صرف دو جرمن اور ترک قیدی، بیرک کے باہر پہرے پر موجود تھے۔ سالار، ڈاکٹر شمٹ

اور شولز کو بیرک کے برآمدے میں چھوڑ کر واپس آ گیا۔

''کہو دوستو!'' سالار نے کہا۔ ''کیسا رہا؟''

''بہت سنسنی خیز!'' سشما نے کہا۔

''دہقانی......'' مہندر نے کہنا چاہا۔

''ہاں، دہقانی!'' سالار نے کہا۔ ''ہمارے دلوں کے قبرستان میں ایک اور ساتھی کی قبر کا اضافہ ہوا ہے۔ ایک اور گم نام مجاہد آزادی کی راہ میں کام آیا۔ ہمارے جسم غلامی سے بنجر ہو جانے والی اس سرزمین میں کھاد بن کر اس دیس کی سرزمین کا بانجھ پن ختم کر دیں گے اور اسے وہ زرخیزی عطا کریں گے جس سے آزادی کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی۔''

''اب ہمارا کیا کام ہے؟'' مہندر نے کہا۔

''اب ہمیں یہاں سے واپس چلنا ہے۔ پیپل کوٹی اور گلاب کوٹی کے راستے رانی کھیت یا کاٹھ گودام پہنچنا اب خطرے سے خالی نہیں ہے۔'' سالار نے کہا۔ ''پھر ہم سب ایک ساتھ واپس بھی نہیں چل سکتے۔ ہمیں یہاں سے ٹکڑیوں میں واپس جانا ہوگا۔''

''خالد اور اس کے ساتھی؟'' میں نے پوچھا۔

''انہیں یہ ہدایت تھی کہ وہ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد ہماری طرف سے پہلا رابطہ قائم ہوتے ہی اس علاقے سے نکلنے کی کوشش کریں۔ وہ اس وقت جوشی مٹھ کی سمت اس غار میں موجود ہوگا جہاں ہم نے دھماکا خیز اشیا کا ذخیرہ کر رکھا ہے۔ میں نے طارق کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ خالد کو وہاں سے نکل جانے کے لیے کہہ دے۔ طارق، شولز کی ایک پارٹی لے کر اسی طرف گیا ہے۔''

''اور یہ جرمن اور ترک فوجی؟''

''یہ لوگ فیکٹری کو تباہ کرنے کے بعد تبت، سنکیانگ اور کاشغر کے راستے فرار ہو کر ترکی پہنچنے کی کوشش کریں گے۔'' سالار نے کہا۔ ''مہندر! کوہستانی کے واپس آتے ہی تم، سشما اور کوہستانی یہاں سے واپس ہو لو گے۔ تمہیں یہاں سے مسوری پہنچنا ہے جہاں سے تم دہرہ دون پہنچو گے۔ مسوری تک کا سفر تمہیں پیدل ہی کرنا پڑے گا۔ کوہستانی اس علاقے سے خوب واقف ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم صحیح سلامت مسوری پہنچ جاؤ گے۔''

''مگر جناب!'' مہندر نے کہا۔ ''میں اس فیکٹری کو تباہ ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''فیکٹری کی تباہی چھ سات گھنٹے سے پیشتر ممکن نہیں۔'' سالار نے کہا۔ ''اسی دوران میں ہمیں یہاں سے دور نکل جانا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ امدادی سگنل ملنے پر انگریز کس

پیمانے پر کارروائی کریں گے۔''

''مگر پاپا!'' سشما نے کہا۔ ''ہم اس فیکٹری کی تباہی کے بعد بھی تو نکلنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔''

''تم اگر نہ ہوتیں تو شاید میں مہندر کی بات مان لیتا۔'' سالار نے کہا۔ ''میں اپنے بیٹوں کا غم برداشت کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنے کئی بیٹوں کے غم برداشت کیے ہیں لیکن لالی کے بعد...... لالی کے بعد...... میں کسی اور بیٹی کا غم برداشت نہیں کر سکتا۔ نہیں میری بیٹی نہیں! سشما! تمہیں میری بات ماننا ہی پڑے گی۔'' اس وقت سالار کا لہجہ اتنا غم ناک تھا کہ ہم سب بھی غمگین ہو گئے تھے۔ لالی کا حوالہ ہی ایسا تھا۔

''اور آپ؟'' مہندر نے پوچھا۔

''میں اس فیکٹری کی تباہی تک یہیں رہوں گا اور پھر ترک اور جرمن فوجیوں کے ساتھ ہی یہاں سے درہ کامٹ کی طرف جاؤں گا۔ انہیں درہ کامٹ پر چھوڑ کر میں واپس شملہ پہنچوں گا۔ تمہارے جانے کے بعد آفاق، طارق کے ساتھ لال پہاڑ کی طرف جائے گا۔ اس وقت کسی زخمی کو ہم اس علاقے سے لے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔''

ہم سب خاموش ہو گئے۔ سالار نے جو کچھ کہا تھا قطعی اور فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔ اس پروگرام میں کسی رد و بدل کی گنجائش نہیں تھی لیکن ہم تینوں سالار کے اس فیصلے سے مایوس ہوئے تھے کیوں کہ ہم تینوں ہی اس فیکٹری کو اپنی آنکھوں سے تباہ ہوتے دیکھنا چاہتے تھے۔

''ایک اہم بات اور سنو! یہ بات اس پارٹی میں صرف تم تینوں ہی کو بتائی جا رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم یہ بات کسی اور کو نہیں بتاؤ گے۔'' سالار ایک لمحے کے لیے رکا۔ ''میں نہیں جانتا کہ میری واپسی کب تک ہوگی۔ مزید ہدایات کے لیے اگر تمہیں تنظیم کے سرکردہ لوگوں سے رابطے کی ضرورت محسوس ہو تو بمبئی کے نیشنل ٹریڈرز کی معرفت خالد کو خط لکھ دینا یا اس سے مل لینا۔ نیشنل ٹریڈرز کا دفتر جوہو کے علاقے میں ہے۔ پوسٹ بکس نمبر تین سو دس ہے۔ نیشنل ٹریڈرز ہماری تنظیم کا ہیڈ کوارٹر بھی ہے اور ہماری تنظیم کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کا ذریعہ بھی۔''

نصف گھنٹے بعد کوہستانی واپس آ گیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میں ان تینوں کو رخصت کر رہا تھا۔ ہم میں سے کسی کو پتا نہیں تھا کہ ہم اب کتنی مدت کے بعد ملیں گے اور ملیں گے بھی یا نہیں! ہم سب کی آنکھیں نم تھیں۔ ان تینوں نے دہقانی کی قبر پر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی

اور چند منٹ کی خاموشی کے بعد روانگی اختیار کی۔ میں انہیں چھوڑنے کے لیے پہاڑی کے اوپر اس جگہ آیا جہاں مچان کے نیچے سامان لانے لے جانے کے لیے ٹرالی کا نظام موجود تھا اور جہاں سے میں، طارق کے ساتھ فیکٹری میں اترا تھا۔

''مہندر!'' میں نے چپکے سے کہا۔ ''مجھے نہیں پتا کہ ہم اب کب ملیں گے۔ میری ایک درخواست ہے، اگر کہیں تصدق حسین تمہیں نظر آئے تو اسے بخشنا نہیں۔''

''بے فکر رہو دوست!'' مہندر نے کہا۔ ''یہ ہم دونوں کا مشترکہ قرض ہے۔''

''اگر تمہارے پروگرام میں کسی وقت لکھنؤ جانا شامل ہو تو منصور کے گھر جا کر میری بہن زیب سے ضرور ملنا۔ میری طرف سے اسے ڈھیروں پیار کرنا، کہنا اس کا بھیا ضرور اس سے ملنے آئے گا۔ میں اس کی طرف سے بہت پریشان ہوں۔''

میں چٹان پر بنے مچان کے پاس کھڑا ہوا ان تینوں کو دور ہوتے دیکھتا رہا۔ جرمن اور ترک فوجی ٹرالی سے دھماکا خیز سامان پہاڑ کی کوکھ میں اتار رہے تھے۔

تھوڑے تھوڑے فاصلے کے بعد وہ پلٹ کر دیکھتے اور ہاتھ ہلاتے۔ وہ پہاڑ کی بلندی پر چڑھتے چلے گئے۔ ڈھلتے چاند کی دھندلائی ہوئی روشنی میں جھلملاتی برف پر وہ سفید دھبوں کی مانند حرکت کر رہے تھے۔ پھر فاصلے نے انہیں نگل لیا۔ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

''تم لوگ پھر ملو گے۔'' سالار نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

''میں وہاں کب تک رہوں گا؟''

''زخم مندمل ہونے تک!'' سالار نے کہا۔ ''پھر جب تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو طارق کے ساتھ شیلانگ پہنچو گے۔''

''شیلانگ!'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''مگر وہ تو بہت دور پڑے گا۔''

''ہاں شیلانگ!'' سالار نے کہا۔ ''تمہیں صحت یاب ہونے میں تین مہینے تو لگیں گے ہی۔ اس دوران میں برف باری سے راستے بند ہو جائیں گے اور تم اسی علاقے میں پھنس جاؤ گے۔ جب تم واپسی کے لیے تیار ہو گے تو شمالی ہند میں ہماری کارروائیاں عروج پر ہوں گی۔ اس وقت اس طرف سے آنا تمہارے لیے مناسب نہیں ہو گا۔''

''میری آپ سے ایک درخواست ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔'' سالار نے کہا۔ ''تم اس فیکٹری کی تباہی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو گے۔''

سالار واقعی قیافہ شناس تھا۔

مہندر وغیرہ چلے گئے تو تقریباً نصف گھنٹے بعد طارق بھی واپس آ گیا۔ اس وقت میں، کرنل شولز کے پاس ہی کھڑا تھا۔ سالار، ڈاکٹر شمٹ سے باتیں کر رہا تھا۔ کرنل شولز نے طارق کے ساتھ واپس آنے والے سے جرمن زبان میں چند باتیں کیں اور ڈاکٹر کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

''کہو، تمام سامان ضرورت کے مطابق ہے۔'' سالار نے کرنل سے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''آپ لوگوں نے کمال کیا ہے۔ یہ تو اتنا سامان ہے کہ اس جیسی تین فیکٹریاں تباہ کی جا سکتی ہیں۔ ہم اس تمام سامان سے تو یہ فیکٹری سرمہ بنا دیں گے۔''

صبح کا ملگجا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ فیکٹری کی تباہی کا کام آخری مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ ڈائنامائٹ کی چھڑیوں اور بارود کے تھیلوں کو مختلف جگہ باندھا جا رہا تھا۔ تار پھیلائے جا رہے تھے۔ ترک اور جرمن فوج کے ماہر سپاہی یہ تمام کام نہایت انہماک اور استغراق سے کر رہے تھے۔

انگریز فوج کی کمک کے وہاں پہنچنے میں، اندازے کے مطابق ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی تھا کہ کرنل شولز نے کام ختم ہو جانے کی اطلاع دی۔

تمام لوگ تباہ ہونے والی فیکٹری اور سرنگ سے محفوظ فاصلے پر اس جگہ جمع ہو گئے جہاں وہ لیور تھا جس سے کئی تار آ کر منسلک ہوئے تھے۔ یہ ایک بلند مقام تھا جہاں سے ہمیں نیچے وہ پہاڑی نظر آ رہی تھی جس کے بطن میں وہ خطرناک فیکٹری موجود تھی۔

سالار، ڈاکٹر شمٹ اور ایک ترک میجر ناصر بے نے مل کر اس لیور کا ہینڈل ایک طرف کھینچا اور چند لمحوں بعد ہی اس علاقے میں جیسے زلزلہ آ گیا۔ پے در پے اتنے ہولناک دھماکے ہوئے کہ ہمیں اپنے کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ ان دھماکوں کی ہولناک آواز وادی میں گونجتی رہی۔ مٹی پتھر اور برف کا ملا جلا بادل بلند ہوا تھا، پھر دیر تک دھوئیں اور مٹی کا مرغولہ فضا میں بلند رہا تھا۔

اس کے بعد کانوں کو دھماکوں کے ذریعے تباہ کر دیا گیا تھا۔ پھر ہم سب وہاں سے تیزی کے ساتھ فیکٹری کی سرنگ کے اس دہانے کی طرف بڑھے تھے جو جوشی مٹھ کی طرف تھا۔ اس طرف کرنل شولز کو صرف اب کانیں تباہ کرنا تھیں جس کا نظام پہلے ہی تیار ہو گیا تھا۔

''تم اب یہاں سے جوشی مٹھ کی طرف سیدھے روانہ ہو جاؤ گے۔'' سالار نے مجھے

اور طارق کو ہدایت دی۔ ''اب ہمارے ساتھ تمہارا رہنا مناسب نہیں۔''

ہماری اور ان کی راہیں جدا ہو گئیں۔ طارق نے جوشی مٹھ جانے کے لیے طویل اور دشوار گزار راستہ اختیار کیا تھا۔ یہ ایسا راستہ تھا جس پر انگریز فوج کی کمک سے مڈبھیڑ ہونے کی توقع نہیں تھی۔ ہم چلتے رہے، میرا زخمی ہاتھ اس وقت بہت تکلیف دے رہا تھا۔ ابھی ہمیں چلتے ہوئے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ ہوا تھا کہ خاموش پہاڑوں میں دھماکوں کی گونج سنائی دی۔ ''وہ کانیں بھی تباہ کر دی گئیں۔'' میں نے مسرت سے کہا۔

مگر طارق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جوشی مٹھ ابھی کافی دور تھا۔ اس کی نگاہیں دور پہاڑوں کے نشیب و فراز میں کھوئی ہوئی تھیں۔

''جوشی مٹھ کتنی دور ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تین گھنٹے کا راستہ ہے۔'' طارق نے کہا۔ ''کیوں، کیا ہاتھ میں تکلیف ہو رہی ہے؟''

''اس کی پروا نہ کرو۔'' میں نے کہا۔ ''تم یہاں رک کیوں گئے؟''

''آرام کرنا چاہو تو یہاں ایک غار ہے۔'' طارق نے کہا۔ ''ورنہ پھر ڈھائی گھنٹے بعد ایسا موقع ملے گا۔''

''میرا خیال ہے ہمیں بڑھتے رہنا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے تم آرام کرنے کی کیوں سوچ رہے ہو؟''

''ٹھیک ہے۔'' طارق نے کہا۔ ''میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں یہیں آرام کرنا چاہیے یا آگے جا کر! بات یہ ہے کہ میں تمہیں لے کر رات کو جوشی مٹھ پہنچنا چاہتا ہوں تاکہ لوگوں کو یہ پتا نہ چلے کہ کوئی زخمی جوشی مٹھ آیا ہے۔''

سورج کی تیز چمک برف پر منعکس ہو کر آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔ برف باری کی وجہ سے ہمارا راستہ اور بھی دشوار گزار ہو گیا تھا۔ بعض جگہ تو طارق میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے سہارا دے کر آگے بڑھتا۔ ایسے بعض موقعوں پر مجھے اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے زخمی ہاتھ کو بھی حرکت دینی پڑتی جس سے تکلیف اور بھی شدید ہو جاتی تھی۔

ڈھائی گھنٹے کی بجائے یہ سفر چار گھنٹے کا ثابت ہوا۔ اس وقت میں تھک کر چور ہو چکا تھا۔ وہ چھوٹا سا غار مجھے کسی محل سے بھی زیادہ آرام دہ محسوس ہوا تھا۔ ٹھنڈ سے میری ٹانگیں پنڈلیوں تک سن ہو کر رہ گئی تھیں، ناک اور آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ غار کے نیم سرد ماحول میں آ کر میں نے جیسے اطمینان کا سانس لیا۔

پتھر اور مٹی کے فرش پر اپنے تھیلے رکھ کر، ہم بیٹھ گئے۔ طارق نے تھرماس سے گرم

گرم کافی نکالی اور میری طرف بڑھا دی۔

اس غار میں پناہ لیے ہوئے ابھی ہمیں ایک ہی گھنٹہ ہوا تھا کہ نیچے پہاڑی راستے پر ہم نے سرگرمی محسوس کی۔ میں اور طارق غار کے دہانے پر آ گئے۔ نیچے انگریز فوج کا ایک دستہ تیزی سے ایک سمت بڑھتا جا رہا تھا۔ ''یہ کدھر جا رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اسی فیکٹری کو خام مال فراہم کرنے والی کانوں کی طرف۔'' طارق نے کہا۔

''گویا وہ دونوں طرف سے فیکٹری کی حفاظت کے لیے آئے ہیں۔'' میں تلخ انداز میں بولا۔

☆=====☆=====☆

جوں جوں وقت گزرتا رہا، میری پریشانی بڑھتی گئی۔ طارق کہہ کر گیا تھا کہ وہ پندرہ بیس منٹ میں واپس آ جائے گا لیکن اب اس کو گئے ہوئے تین گھنٹے ہو چکے تھے۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ طارق کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ میرے لیے اب ضروری ہو گیا تھا کہ میں خود بستی کی طرف جاؤں اور دیکھوں کہ معاملہ کیا ہے؟

اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ بستی خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ہوا بہت تیز ہو گئی تھی۔ برف باری کا سلسلہ کسی وقت بھی شروع ہو سکتا تھا۔ میرے سامنے اس وقت دو ہی راہیں تھیں یا تو واپس اسی غار میں جا کر رات گزاروں جہاں دن میں ہم نے آرام کیا تھا یا پھر بستی میں جا کر طارق کا پتا چلاؤں کہ اس پر کیا بیتی۔ میں نے دوسری راہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

میں نے ایک گھنٹہ اور انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں چاہتا تھا کہ جب بستی میں داخل ہوں تو کوئی بھی جاگتا ہوا نہ ہو اور نہ مجھے دیکھنے والا ہو۔ پتھروں کے درمیان کھڑے ہوئے میری حالت اور بھی خراب ہو گئی تھی۔ سردی کی وجہ سے میرا تمام جسم جیسے سن ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے اپنے پیروں کو جنبش دینا چاہی تو ایسا لگا جیسے رگوں میں خون منجمد ہو کر رہ گیا ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے اعصاب کو حرکت دی، دائیں ہاتھ کو شانے کے جوڑ سے چرخی کی طرح گھمایا، تھرماس سے کافی نکال کر پی اور سوچنے لگا کہ میرا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔

ٹھیک گیارہ بجے میں وہاں سے نکلا۔ میرا رخ سردار لکھمن کے مکان کی طرف تھا۔ یہ مکان بستی کے ایک سرے پر تھا۔ یہ چھوٹا سا مکان دو منزلہ تھا۔ اس کا مہمان خانہ بالائی منزل پر تھا۔ مکان کیوں کہ پہاڑی کے دامن میں بنا ہوا تھا اس وجہ سے اس پر پڑی ہوئی

ٹین کی ڈھلواں چھت پہاڑی کی طرف سے اتنی نیچی تھی کہ اس پر آدمی بغیر کسی مشکل کے چڑھ سکتا تھا۔ اسی سمت دیوار میں روشن دان بنے ہوئے تھے۔ میں لمبا چکر کاٹ کر پہاڑی سے گزرتا ہوا اسی سمت آیا تھا۔

اسی وقت میں نے اچانک بہت سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں سنیں۔ میں لپک کر مکان کے کونے پر آیا اور جھانک کر دیکھا۔ نیچے تین چار آدمی باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک آواز سن کر میرا دل خوف اور نفرت سے بھر گیا۔ یہ آواز خان تصدق حسین کی تھی۔

''یہ کم بخت کہاں سے آمرا؟'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

پھر لکڑی کے زینے پر چڑھنے کی آوازیں آئیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ طارق پھنس ہی گیا ہے۔

اچانک ہوا اور بھی تیز ہو گئی، ساتھ ہی برف باری بھی شروع ہو گئی۔

وہ آوازیں اب بالائی منزل پر آ گئی تھیں۔ میں اپنی جگہ سے ہٹ کر اب پہلے روشن دان میں آ گیا تھا۔ وہ لوگ اس کمرے سے گزر کر جس میں یہ روشن دان کھلتا تھا، دوسرے کمرے اور پھر تیسرے کمرے کی طرف بڑھے۔ میں تیسرے روشن دان کے پاس آ گیا۔ یہی روشن دان تھا جس سے میں جھانک کر نہیں دیکھ سکا تھا اور آوازیں سن کر مکان کے کونے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

میں نے جھانک کر دیکھا۔ طارق اندر ایک چارپائی پر بیٹھا تھا۔

''یہ ہے وہ؟'' تصدق حسین نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' ایک انگریز فوجی نے جواب دیا۔

''تمہیں یقین ہے۔'' تصدق حسین نے پھر انگریز فوجی سے پوچھا۔ ابھی تک اس نے طارق سے ایک بھی سوال نہیں کیا تھا۔ سوال تو وہ انگریز فوجی سے کر رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں طارق کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔

''جی ہاں، مجھے یقین ہے۔ میری ڈیوٹی بھی فیکٹری پر رہی تھی، انہی دنوں میں نے اسے وہاں سامان وغیرہ لاتے دیکھا تھا۔''

''کیا نام ہے تمہارا؟'' تصدق حسین نے اس مرتبہ طارق سے سوال کیا۔

''طارق۔''

''کہاں رہتے ہو؟''

''دابا میں۔''

''کیا کرتے ہو؟''

''مزدوری، قلی کا کام کرتا ہوں۔''

''تم فیکٹری میں سامان لے کر جاتے تھے؟'' تصدق حسین نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' طارق نے کہا۔ ''صاحب لوگوں نے حکم دیا تھا۔''

''یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟'' تصدق حسین نے سردار مکھن سے پوچھا۔

''مجھے نہیں پتا صاحب، یہ کس فیکٹری کو سامان لے جاتا تھا۔'' سردار مکھن نے کہا۔ ''مجھے تو بس یہی معلوم تھا کہ یہ محنت مزدوری کرتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ ادھر کوئی فیکٹری تھی؟''

''تم نے اسے بتایا کیوں نہیں تھا؟'' اس مرتبہ تصدق حسین نے طارق سے پوچھا۔

''صاحب لوگوں نے منع کر دیا تھا کہ کسی کو نہ بتاؤں ورنہ مجھے مار ڈالا جائے گا۔'' طارق نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

''فیکٹری کس نے تباہ کی ہے؟'' تصدق حسین نے اچانک پوچھا۔

''جی!'' طارق نے حیرت کی انتہائی کامیاب اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''فیکٹری، تباہ......''

تصدق حسین اس وقت طارق کو بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ ''ہاں، فیکٹری کس نے تباہ کی ہے؟''

''جی مجھے پتا نہیں! فیکٹری تباہ ہو گئی؟ کب؟''

''اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟'' تصدق حسین نے پوچھا۔

''ساپوبان سے۔'' طارق نے کہا۔ ''میں جوشی مٹھ جا رہا ہوں۔''

''ساپوبان کدھر ہے؟'' تصدق حسین نے سردار مکھن سے پوچھا۔

''اتر میں، سرائے طوطا کی طرف!'' سردار مکھن نے کہا۔

''کون کون سے دن سامان لے جاتے تھے فیکٹری میں؟''

''جس دن صاحب لوگ کہتے تھے۔ میں کل سامان لے کر گیا تھا۔ اب انہوں نے ایک ہفتے بعد سامان لانے کے لیے کہا تھا۔'' طارق نے جواب دیا۔

''کیا کیا سامان منگایا تھا انہوں نے؟''

طارق نے کوٹ کی جیب سے ایک کاغذ نکال کر تصدق حسین کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ سامان ہے جی!''

تصدق حسین نے وہ فہرست پڑھ کر واپس کر دی۔ ''تم پہلی مرتبہ وہاں فیکٹری کیسے پہنچے تھے؟''

طارق نے انہیں وہی تفصیل بتا دی جو وہ ہمیں سنا چکا تھا۔

''اس کا ایک اور بھائی بھی ہے؟'' انگریز فوجی نے تصدق حسین کو بتایا۔

''تمہارا بھائی کہاں ہے؟'' تصدق حسین نے پلٹ کر طارق سے پوچھا۔

سردار مکھن کے چہرے پر حیرت کے آثار پیدا ہوئے، وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ اس سے پہلے طارق بول پڑا۔ ''وہ رانی کھیت میں ہے۔''

''کل کس وقت فیکٹری گئے تھے؟'' تصدق حسین نے سوال کیا۔

''دو پہر کے وقت۔''

''کوئی خاص بات تو نہیں دیکھی تم نے؟''

''نہیں جناب!'' طارق نے کہا۔ ''مجھے کیوں پکڑا گیا ہے جناب؟ میں نے کیا کیا ہے؟''

تصدق حسین نے پلٹ کر انگریز فوجی سے کہا۔ ''یہ تو ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال ہم فی الحال اسے یہیں روکیں گے۔''

پھر وہ پلٹ کر طارق سے مخاطب ہوا۔ ''یہ کہتا ہے تمہارے کچھ ساتھی بھی تھے، تمہارے ساتھ! اسے یہ بات سرائے طوطا کی طرف سے آنے والوں نے بتائی تھی۔ تمہارے وہ ساتھی کہاں ہیں؟''

''جی!'' طارق نے پھر حیرت کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تو اکیلا ہی آیا ہوں۔ راستے میں تو مجھے کوئی نہیں ملا، کن لوگوں نے بتایا تھا؟ انہیں شاید غلط فہمی ہوئی ہو گی۔''

''ہم دیکھیں گے تمہاری غلط فہمی!'' تصدق حسین نے کہا۔ ''آج رات تم یہیں رہو گے!''

''مگر جناب، میرا قصور، مجھے پتا تو چلے۔''

''سردار مکھن! اس کے لیے یہاں سونے کا انتظام کرو۔'' تصدق حسین نے کہا۔ ''اور تم سنو، کل ہم تمہارے بھائی کو بھی رانی کھیت سے بلوائیں گے، پھر دیکھیں گے تمہارا کیا کیا جائے!'' یہ کہہ کر اس نے سامنے باہر کی سمت کھلنے والی کھڑکی کا جائزہ لیا۔ وہ کھڑکی لکڑی کے موٹے تختوں کی تھی۔ ''سردار مکھن اس میں تالا ڈال کر چابی میرے حوالے کر

یہ کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔ اس کے پیچھے باقی لوگ بھی کمرے سے نکل گئے، یعنی سردار ن، انگریز فوجی اور ایک مقامی آدمی!

میں اب دوسرے روشن دان سے کمرے میں جھانک رہا تھا۔ ''اب میں سوؤں گا، دن ہو گیا ہے بھاگ دوڑ کرتے ہوئے! ایک کپ گرم گرم کافی بنا لاؤ۔'' تصدق حسین واز آئی۔

اب مجھے پھر انتظار کرنا تھا، سو میں انتظار کرتا رہا۔

پندرہ منٹ کے اندر اندر تصدق حسین کو کافی دے دی گئی اور وہ بیچ والے کمرے میں ئے اور نرم بستر پر سو گیا۔ اس کے برابر والے کمرے میں انگریز فوجی سو رہا تھا۔ طارق رے کی کھڑکی میں تالا لگا کر چابی تصدق حسین کے حوالے کر دی گئی تھی اور بیچ والے ے کا دروازہ تصدق حسین نے اندر سے بند کر لیا تھا۔ طارق کے لیے بھی بستر مہیا کر دیا تھا لیکن وہ سویا نہیں تھا۔ وہ مضطرب تھا اور مسلسل کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ اسے یقیناً ے بارے میں ہی میں تشویش تھی۔ پھر وہ اٹھ کر دیواروں میں کیلیں تلاش کرنے لگا۔ دو یلوں کو اس نے ہلا جلا کر بھی دیکھا مگر اس مایوسی ہوئی۔ وہ بہت سختی سے بند تھیں۔

اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ ہوا اور بھی زناٹے سے چل رہی تھی۔ برف باری اور شدید ہو گئی تھی۔ میں نے باری باری دونوں کمروں کا جائزہ لیا تھا۔ انگریز فوجی اور ق حسین سو گئے تھے۔ اس وقت میں نے روشن دان کو آہستہ سے دھکا دے کر کھولا اور ے کوئل کی آواز نکالی۔

طارق نے چونک کر روشن دان کی طرف دیکھا اور میں نے روشن دان کے خلا سے نکال کر اسے اشارہ کیا۔ ہنگامی حالات کے لیے مخصوص کٹ بیگ سے میں نے رسی ا اور اس کے ایک سرے میں مضبوط موٹا تار باندھ کر اسے روشن دان سے نیچے لٹکا دیا۔

طارق نے رسی کو پکڑ کر دو مرتبہ جھٹکا دیا۔ اس اشارے کا مطلب یہی تھا کہ میں رسی روں، سو میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد طارق نے موٹے تار کی مدد سے تالا کھولا کی کے پاس ہی لگی ہوئی کھونٹی سے رسی باندھ کر باہر لٹکا دی۔ چند لمحوں بعد وہ رسی کے ے کھڑکی کے راستے باہر پہنچ چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ چکر کاٹ کر میرے پاس آ گیا تھا۔ ہم بغیر کچھ کہے سنے تیزی سے یے۔ ہم دونوں اس جگہ پہنچے جہاں طارق مجھے چھوڑ کر سردار مکھن سے ملنے گیا تھا۔ رف ہٹا کر ہم نے اپنے تھیلے نکالے اور دریا کے ٹھنڈے پانی میں اتر گئے، پھر دریا پار

کرلیا۔

برف باری کا طوفان اور شدید ہوگیا تھا۔

''اب ہم کہاں چلیں گے؟'' میں نے چیخ کر طارق سے پوچھا۔

''تھوڑی دوری پر ایک غار ہے؟'' طارق نے کہا۔

''مگر وہ ہمارے قدموں کے نشانات سے وہاں پہنچ جائیں گے۔'' میں نے کہا۔

''اتنی شدت برف باری ہے، صبح تک یہ نشانات مٹ جائیں گے۔ ویسے اس وقت کچھ اور کیا بھی نہیں جا سکتا۔''

☆======☆======☆

برف باری کا طوفان اگلے دن بھی جاری رہا۔ جس غار میں ہم نے پناہ لے رکھی تھی۔ وہ چھوٹا بھی تھا اور نم بھی۔ کافی کب کی ختم ہو چکی تھی۔ سردی ہمارے جسم گلائے دے رہی تھی لیکن ہم اس غار سے نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

طارق کا خیال ٹھیک ہی نکلا۔ وہ لوگ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہم دریا پار کا راستہ اختیار کریں گے۔ اس موسم میں دریا پار کرنا واقعی ایک مشکل کام تھا۔ برف باری نے ہمارے لیے سامنے دیکھنا ناممکن بنا دیا تھا۔ تیز ہوا ہمارے قدم اکھاڑے ڈال رہی تھی لیکن ہم پہاڑی دریا کے درمیان ابھرے ہوئے پتھروں اور چٹانوں پر سے گزرتے ہوئے بس بڑھتے ہی چلے گئے تھے۔ دریا پار کرنے کا یہ قدرتی راستہ عام دنوں میں بھی بے حد خطرناک تھا۔ ذرا سا پاؤں پھسلتے ہی دس بارہ فٹ گہرائی میں جا گرنا اور پھر برف اور پانی کی تہہ میں دھنس کر وہیں بے بسی سے ختم ہو جانا، قوی امکانات میں سے تھا لیکن طارق کی مہارت اور جان بچانے کی لگن نے ہمیں یہ پل صراط پار کرا ہی دیا تھا۔

رات ہوتے ہی برف باری کا طویل اور خوف ناک سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ ''بس اب ہمیں یہاں سے نکل لینا ہے۔''

''اب ہم کدھر جائیں گے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''ہم سیدھا راستہ چھوڑ بیٹھے ہیں۔'' طارق نے کہا۔ ''پہلے ہم سویا بان، سرائے طوطا، جوما اور مالاری سے گزرتے ہوئے بمپا پہنچتے لیکن اب یہاں سے سیدھے بمپا جائیں گے۔ یہ راستہ اگرچہ بہت خطرناک ہے لیکن محفوظ ہے۔ اس موسم میں کوئی بھی یہ راستہ اختیار کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ ویسے میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ تم زخمی بھی ہو۔''

''میرے زخم کی پروا نہ کرو۔'' میں نے کہا۔ ''بس یہاں سے نکل چلو۔'' مجھے اس کی

ئے سے اتفاق تھا۔ عام راستے اب ہمارے لیے زیادہ ہی خطرناک تھے۔ تصدق حسین ب بھیڑیا تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ اتنی آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔

ہم وہاں سے نکل لیے۔ میرا بایاں زخمی بازو اب بہت زیادہ تکلیف دینے لگا تھا۔ م کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ فرسٹ ایڈ کا جو سامان ہمارے پاس تھا وہ اس قسم کے ہوں کو مندمل کرنے کے لیے ناکافی تھا مگر ہم کر بھی کیا سکتے تھے۔ پھر سردی نے میرے ہوں کو تقریباً سن کر دیا تھا۔ پیروں کی انگلیاں سوج گئی تھیں جن کی وجہ سے جوتے پہننا شکل ہو گیا تھا۔ یہی حالت کانوں کی تھی جن کی لویں پھول کر لٹک گئی تھیں۔ طارق اگرچہ وزانہ برفانی ریچھ کی چربی سے میرے ہاتھ پیروں اور چہرے کی مالش کرتا تھا لیکن سردی ہ اتنی شدید تھی کہ وہ بھی کچھ اثر کرتی معلوم نہ ہوتی تھی۔ ''اس سے اگر کوئی فائدہ نہیں ہے اتنی دردسری مول لینے سے فائدہ؟'' میں نے کہا تھا۔

''اگر اس کی مالش نہ کر رہے ہوتے تو اب تک تمہارا گوشت سردی سے گل چکا ہتا۔'' طارق نے کہا اور میں کپکپا کر رہ گیا۔

مالاری تک کے اس ہول ناک سفر نے تو مجھے نیم جاں کر دیا تھا۔ میرا تمام وجود ایک ڈا پھوڑا بن کر رہ گیا تھا۔ ساٹھ میل کا یہ سفر کتنا کٹھن اور دشوار گزار تھا اس کا اندازہ صرف بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دن میں ہم کبھی پانچ میل سے زیادہ کا سفر نہ کر سکے۔ طارق نہ ہوتا تو شاید میں کبھی زندہ سلامت نہ پہنچتا۔ وہ اس علاقے کا کیڑا تھا اسی لیے نے ہر رات کسی نہ کسی غار ہی میں گزاری لیکن صرف بسکٹ کھا کھا کر تو ہم توانائی بحال رکھ سکتے تھے۔

پندرھویں دن ہم مالاری سے چار میل کے فاصلے پر ایک غار کے سامنے کھڑے تھے طارق کے چہرے پر الجھن تھی۔ اس کی الجھن کا سبب میری بھی سمجھ میں آگیا تھا۔ وہ ف پر بنے ہوئے پیروں کے نشانات دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہاں انسانوں کی آمد و رفت ہو۔

''دیکھا جائے گا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھ میں ہمت نہیں ہے۔'' یہ کہہ کر میں غار میں یا۔ مجھ میں واقعی اب اتنی ہمت نہ تھی کہ آگے جاتا۔ میرے پیچھے پیچھے طارق بھی آگیا تھا۔

غار کے اندر پہنچ کر ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ چھوٹے سے اس غار میں سا نرم اور گرم بستر بچھا ہوا تھا۔ موٹے موٹے کمبل رکھے تھے۔ ایک طرف بڑا سا س اور اس کے ساتھ ٹارچ رکھی تھی۔

ہم دونوں غار کے اندر اس سامان کو دیکھتے رہے۔ میرے قدموں میں سکت نہیں تھی۔ میں وہیں اپنے تھیلے پر بیٹھ گیا اور تھرماس اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولا۔ میں نے تھرماس کی بوتل سے کارک ہٹایا۔ اندر سے گرم گرم کافی کی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ طارق ایک مرتبہ پھر باہر جا چکا تھا۔

میں نے تھرماس سے کافی انڈیلنے کے لیے ڈھکنا سیدھا کیا۔ اس میں ایک کاغذ رکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ کاغذ نکالا۔ اس کاغذ پر ایک تحریر بھی تھی۔

شیرازی! طارق!

اطمینان سے کافی پیو اور آرام کرو۔ رات کسی وقت ملاقات ہوگی۔

سالار

''طارق!'' میں چیخا۔ ''ادھر آؤ!''

وہ لپکتا ہوا واپس آیا۔ جب میں نے اسے تمام بات بتائی تو وہ حیران رہ گیا۔ ہم نے جلدی جلدی گرم گرم کافی کے دو دو مگ پیئے، پھر برفانی علاقوں میں سفر کا لباس اتار کر بستر میں گھس گئے۔

''مجھے حیرت ہے، اس غار کا علم سالار کو کیسے ہوا؟'' طارق نے کہا۔

''ہوا ہوگا یار!'' میں نے کہا۔

کئی دن کے بعد ہمیں اطمینان، سکون اور مناسب بستر ملا تھا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کافی دنوں بعد ہمیں تحفظ کا احساس بھی ہوا تھا۔ یہ احساس ہمیں سالار کی تحریر نے دلایا تھا۔ پھر یہ کہ مسلسل تھکن نے ہمیں نڈھال کر رکھا تھا۔ اونی کمبلوں کی گرمی رفتہ رفتہ ہمارے جسموں میں بیٹھی ہوئی سردی کو ختم کر رہی تھی۔

ذرا دیر میں ہم گہری بے ہوشی کی نیند میں کھو گئے تھے۔

رات کا پتا نہیں کون سا پہر تھا کہ سالار نے ہمیں جگا دیا۔ غار کے ایک کونے میں ٹارچ روشن تھی۔ سالار ہمارے لیے کھانا لایا تھا۔ جسے ہم دونوں نے سیر ہو کر کھایا۔ غنودگی کے اثر سے ہمارے ذہن رفتہ رفتہ صاف ہوتے چلے گئے۔

''میں تین دن سے یہاں روزانہ تمہارا انتظار کرتا رہا ہوں۔'' سالار کی کھرکھراتی آواز ابھری۔

''آپ کو کیسے یقین تھا کہ ہم یہیں آئیں گے؟'' طارق نے سوال کیا۔

''تمہارا یہ خیال درست نہیں کہ یہ غار تمہاری دریافت ہے۔'' سالار نے کہا۔ ''بہر

حال سنو، فیکٹری کی تباہی کے بعد ترک اور جرمن ساتھیوں سے بہت کہا کہ میں انہیں تبت کی سرحد تک پہنچا آؤں مگر انہوں نے میری بات نہ مانی۔ ان کی ضد تھی کہ میں واپس چلا جاؤں کیوں کہ ہندوستان میں میری زیادہ ضرورت ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ انگریز فوج ان کا تعاقب ضرور کرے گی۔''

''یہ ان کی قسمت ہے لیکن ترک اور جرمن واقعی زندہ قومیں ہیں۔ انہوں نے اس خطرے کو بھانپ لیا تھا اس لیے ان کے زخمیوں اور پانچ فوجیوں نے سوسائڈ اسکواڈ بنا لیا ہے۔ یہ لوگ جوشی مٹھ کی سمت کارخانے کی سرنگ کے دہانے سے قریب ایک تنگ درے میں مورچہ بند ہو کر بیٹھ گئے ہیں۔ ان کے پاس اتنا اسلحہ ہے کہ وہ دو تین سو فوجیوں کے دستے کو ایک ہفتے تک وہاں روک سکتے ہیں۔ اس ایک ہفتے میں ان کے ساتھی بہت دور نکل چکے ہوں گے۔ ایک ہفتے میں وہ یا تو اس علاقے سے نکلنے کی کوشش کریں گے یا ناکامی کی صورت میں خود کو ختم کر ڈالیں گے۔ طارق کافی نکالو!''

طارق نے تین مگوں میں کافی انڈیلی۔ سالار نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''بہر حال میں گلاب کوٹی میں تھا کہ مجھے اطلاع ملی، تصدق حسین نے جوشی مٹھ میں طارق کو پکڑ لیا تھا لیکن وہ رات کے وقت اپنے ساتھی کی مدد سے فرار ہو گیا۔ تصدق حسین کا خیال تھا کہ تم دونوں یا تو مالاری کی طرف جا سکتے ہو یا پھر گلاب کوٹی کی طرف! لہٰذا اس نے اپنے چند لوگوں کو گلاب کوٹی کی طرف روانہ کر دیا اور خود چند انگریز فوجیوں کے ساتھ مالاری کی طرف بڑھ گیا۔ یہ خبر سنتے ہی میں گلاب کوٹی سے جوشی مٹھ پہنچا۔ وہاں مکھن سنگھ سے میں طارق کے دوست کی حیثیت سے ملا۔ مکھن سنگھ، طارق کے لیے بہت پریشان تھا۔ اسے یہ یقین دلانے میں کہ میں طارق کا دوست ہوں، بہت مصیبت پیش آئی تھی۔''

''تو پھر اس غار کا پتا مکھن سنگھ نے ہی آپ کو بتایا ہوگا۔'' طارق نے کہا۔

''ہاں۔'' سالار نے کہا۔ ''اسی نے مجھے بتایا کہ تم مالاری جانے کے لیے کون سا راستہ اختیار کرو گے۔ وہ میرے ساتھ مالاری آیا ہوا ہے۔ اسی نے اندازاً بتایا تھا کہ تمہیں تین دن قبل یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔''

''اب کیا حالات ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تصدق حسین یہاں سے آگے بڑھ گیا ہے۔'' سالار نے کہا۔ ''لیکن یہاں مالاری میں اس نے کچھ فوجی طلب کر لیے ہیں۔ اسے معلوم ہے کہ طارق دابا کا رہنے والا ہے لہٰذا وہ اس علاقے میں، دابا تک تمہارا تعاقب کرنا چاہتا ہے۔''

"مگر دابا تو تبت میں ہے۔" میں نے کہا۔ "وہاں اس کے کیا اختیارات ہوں گے؟"

"یہ تم کیسی احمقانہ باتیں کر رہے ہو؟" سالار نے کہا۔ "اصل اختیارات طاقت سے حاصل ہوتے ہیں، وہ اس کے پاس ہے۔" سالار نے کافی کا آخری گھونٹ لے کر کہا۔ "میں اب یہاں سے لوٹ جاؤں گا۔ تصدق حسین درہ نیٹے کی راہ سے دابا کی طرف گیا ہے کیوں کہ یہ راستہ مختصر ہے۔ تم ایسا کرو کہ درہ چارموٹے سے گزر کر لال پہاڑ پہنچو۔"

پھر سالار نے میرے زخم کی ڈریسنگ کی جو بہت ہی خراب ہو چکا تھا۔ شدید سردی کی وجہ سے زخم کے آس پاس کی کھال اور گوشت گلنے لگا تھا۔ ڈریسنگ کے دوران میں مجھے سخت تکلیف ہوئی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ تمہارے زخم کے لیے میں مناسب دوائیں نہیں لا سکا۔ ارے، تمہیں تو بخار بھی آ رہا ہے!" سالار کی آواز میں تشویش تھی۔

"تھکن کی وجہ سے آ گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"بہر حال تم کل اور آرام کرو، پھر تمہیں اپنے سفر پر روانہ ہونا ہی ہے۔" سالار نے فیصلہ کیا۔

"میرا خیال تھا کہ مجھے سیدھا نینی تال ہی جانا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔

"نینی تال، رانی کھیت یا کاٹھ گودام کا صرف ایک راستہ اس برف میں کھلا ہے۔ اس طرف سے کسی زخمی آدمی کا جانا یا پھر طارق کا جانا، اب اور بھی خطرناک ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ تم طارق کے ساتھ تبت کی طرف نکل جاؤ اور جب مکمل طور پر صحت یاب ہو جاؤ تو واپس ہندوستان آ جاؤ۔"

☆======☆======☆

اس دن مجھے احساس ہوا تھا کہ سالار کو اپنے ایک ایک سرفروش کا کتنا خیال تھا۔ جونہی اسے اطلاع ملی تھی کہ تصدق حسین ہمارے تعاقب میں ہے، وہ فوراً حرکت میں آ گیا تھا اور نہ معلوم کیا کیا خطرات مول لے کر ہم سے رابطہ قائم کر کے ہماری رہبری کی تھی اور ہمیں ان خطرات سے آگاہ کیا تھا جو ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ اگلی رات ہم دونوں پھر اس برف پوش علاقے میں سفر کے لیے تیار تھے۔

سالار نے ہمیں گرم جوشی سے رخصت کیا۔ اس وقت اس کا لہجہ بوجھل تھا۔ "اچھا میرے بیٹو! خدا حافظ! اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔ چھ ماہ کے بعد میں تمہاری طرف

سے پیغام کا انتظار شروع کروں گا۔ پتا یاد ہے نا، نیشنل ٹریڈرز کا؟"

"جی ہاں!" میں نے کہا۔

یہ سفر پہلے مرحلے سے بھی زیادہ کٹھن ثابت ہوا۔ بہ مشکل تمام اٹھارہ دن بعد ہم درہ چارموٹے سے گزر کر ششال پہنچے تھے۔ لال پہاڑ ابھی بہت دور تھا لیکن اب ہمارے لیے مزید سفر کرنا بہت دشوار تھا۔ وجہ یہ تھی کہ درہ چارموٹے میں ایک چٹان سے گزرتے ہوئے میں نیچے کھڈ میں گر گیا تھا اور پھر سخت جدوجہد کے بعد طارق مجھے سے نکال پایا تھا۔ اس عرصے میں میری دائیں ٹانگ برف میں مسلسل دبی رہنے کی وجہ سے بالکل سن ہو کر رہ گئی تھی۔ جب اس نے مجھے نکالا تھا تو یہ پتا چلا تھا کہ میرے لیے اب اس ٹانگ پر زور دے کر چلنا بھی ناممکن ہو گیا تھا۔ اس کے بعد ہمارا یہ سفر اور بھی کٹھن ہو گیا تھا اور یہ طارق ہی کی ہمت تھی کہ وہ مجھے اس علاقے سے لے کر ششال آیا تھا۔ طارق کا کہنا تھا کہ یہاں اس کے ماموں کا ایک دوست بدھ خانقاہ میں بھکشو ہے۔ اس نے اسی بھکشو سے مدد لینے کا فیصلہ کیا تھا۔

یہ خانقاہ ہمارے لیے بڑی اچھی پناہ گاہ ثابت ہوئی۔ یہیں بھکشو نے ایک مقامی وید سے میرا علاج کرایا۔ اس نے اپنی سی تمام کوشش کی لیکن پھر مجبور ہو کر میری زندگی بچانے کے لیے بازو سے میرا الٹا ہاتھ کاٹ دیا۔ وجہ یہ تھی کہ میرا گوشت مسلسل سردی کھاتے رہنے سے گلتا چلا جا رہا تھا۔ خیریت یہ تھی کہ گوشت گلنے کی رفتار نیچے کی طرف زیادہ تھی۔ اگر اوپر کی طرف یہ رفتار تیز ہوتی تو اب تک میرا خاتمہ ہو چکا ہوتا۔

میری دائیں ٹانگ میں نہ صرف موچ آئی تھی بلکہ برف میں پانچ گھنٹے دبے رہنے کی وجہ سے اس کا گوشت بھی گلنے لگا تھا۔ میرا پیر اپنی جگہ بٹھانا اس صورت میں ناممکن تھا کیوں کہ ذرا سے دباؤ کی وجہ سے گوشت میں انگلیاں دھنس سکتی تھیں اس لیے وید نے پہلے گوشت کو گلنے سے روکنے کا علاج کیا۔ جب وہ اس میں کامیاب ہو گیا تو پیر کی اتری ہوئی ہڈی کو اپنی جگہ بٹھانا ناممکن ہو چکا تھا کیوں کہ گوشت سڑنے کے بعد اس کا اندمال اس طرح ہوا کہ پیر کو ٹخنے کے جوڑ پر گھمانا بھی محال ہو گیا تھا۔

سات ماہ مجھے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں لگے۔ اس دوران میں دو مرتبہ تصدق حسین ادھر سے گزرا بھی لیکن بھکشو کی وجہ سے اسے میرا پتا نہ چل سکا۔ اسی عرصے میں طارق بھی اپنے ماں باپ سے مل آیا تھا۔

پھر ایک دن میں اور طارق، بھکشو سے رخصت ہو رہے تھے۔

ہم نیپال سے ہوتے ہوئے دارجلنگ پہنچے اور وہاں سے کلکتہ۔

کلکتے میں ہم نے مچھوا بازار میں ایک بڑا سا مکان کرائے پر لیا تھا۔ ہمارے پاس کافی رقم تھی جو ہمیں تبت کے سفر سے قبل دی گئی تھی۔ اپنے قیام کا انتظام کرنے کے بعد ہم نے سالار کو نیشنل ٹریڈرز بمبئی کے پتے پر اپنی آمد سے مطلع کر دیا۔ ایک ہفتے بعد ہی مہندر ہمارے پاس پہنچ چکا تھا۔ میری یہ حالت دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''شیرازی جی، یہ سب کیا ہو گیا!''

☆======☆======☆

پھر ہم ایک دوسرے کو دیر تک اپنی کتھا سناتے رہے۔

''وہاں میں زیب سے ملا تھا۔'' مہندر نے مجھے بتایا۔ ''وہ منصور کی والدہ کے پاس ہے، منصور کو پانچ سال قید کی سزا ہوئی ہے، اس کے باوجود انہیں کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ مجھے دیکھ کر وہ لپٹ گئی تھی۔ وہ مجھ سے تمہاری باتیں کرتی رہی، میں نے تمہاری طرف سے اسے ایک گڑیا دے دی تھی۔ تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔ خان بہادر اس کے اخراجات کے لیے ایک لگی بندھی رقم دیتے ہیں۔ کبھی کبھار اسے دیکھنے بھی آتے ہیں او وہ سہم کر منصور کی والدہ سے چمٹ جاتی ہے۔''

''خان بہادر شیرازی!'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''انہیں نہ انسانی رشتوں کی پروا ہے نہ دھرتی سے انسان کی عقیدت کی، انہیں صرف اپنی خان بہادری عزیز ہے۔''

''اور ہاں......'' مہندر نے کہا۔ ''ایک بات تو تمہیں بتانا ہی بھول گیا۔ میری اور سشما کی منگنی ہو گئی ہے۔ خود سالار نے یہ منگنی کرائی ہے۔ انہوں نے سشما کو اپنی بیٹی بنا لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں، اللہ نے مجھ سے لالی لے کر مجھے سشما جیسی بیٹی عطا کر دی۔''

وہ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ سالار کو لالی کی بجائے سشما بیٹی مل گئی مگر میری لالی تو مجھ سے بچھڑ چکی تھی۔

پھر وہ چلا گیا تھا۔ سالار نے مہندر کو اسی لیے بھیجا تھا کہ وہ میرے بارے میں مکمل رپورٹ دے کہ میری جسمانی حالت کیسی ہے۔ سالار کو یقین تھا کہ اس سفر میں میرا بازو ناکارہ ہو گیا ہو گا لیکن اسے یہ پتا نہیں تھا کہ میں اب ایک معذور آدمی تھا۔

کٹے ہوئے بازو اور ناقص پیر کی وجہ سے اب میں تنظیم کی چھاپا مار مہموں کے لیے ناکارہ ہو چکا تھا۔ میری افادیت اب صرف اتنی رہ گئی تھی کہ تین سال میں ایک آدھ مرتبہ برما کا چکر لگاؤں اور تنظیم کے لیے اسلحہ کی فراہمی کا انتظام کرتا رہوں۔ اس کے علاوہ میری ایک اور ذمے داری یہ بھی تھی کہ تنظیم جو نئے اراکین بھیجے انہیں اسلحہ کے استعمال کی

تربیت بھی دوں۔

میری بدقسمتی یہ تھی کہ میں عین اس وقت ناکارہ ہو کر رہ گیا تھا۔ جب ہماری تنظیم جوان ہو چکی تھی، جب تنظیم کے اراکین بڑے بڑے معرکے سر کر رہے تھے۔ وہ انگریزوں پر کاری ضرب لگانے کے لیے ملک کے مختلف علاقوں میں مصروف عمل تھے۔ میں ان کے کارناموں کے بارے میں تنظیم کے سرفروشوں سے واقعات سنتا اور دل ہی دل میں کڑھتا رہتا۔

میرے کڑھنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہندوستان کے سیاسی حالات ہم انقلابیوں کی توقع کے برعکس مسلسل کروٹیں لے رہے تھے۔ مسلمان اور ہندو رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے دور ہو کر ایک دوسرے کے حریف اور دشمن بن گئے تھے۔ ان دونوں قوموں کو باہم دست و گریباں کرنے کی وہ سازش جس کا سراغ ہمیں بمبئی میں ملا تھا، کامیاب ہو چکی تھی۔

بارہ برس کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزر گیا تھا۔ اب 1939ء تھا۔

اور اس بارہ برس کے عرصے میں بہت کچھ ہو چکا تھا۔ سائمن کمیشن، چودہ نکات، نہرو رپورٹ، اس کے درمیان پورے ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات اور ہندو مسلم فسادات، سب کچھ ہوتا رہا۔ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ طور کیا تھا لیکن چودہ نکات اور نہرو رپورٹ نے دونوں قوموں کو متحارب فریق بنا دیا تھا اور پورا ہندوستان ان کی باہمی آویزشوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔

پھر 1935ء کا دستور نافذ ہوا۔ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں۔ تب دنیا نے دیکھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں ہندوؤں کے عزائم کیا ہیں۔ پورے ہندوستان میں کانگریسی وزارتوں کے تحت ہندوؤں نے منظم طور پر عوامی سطح پر مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا اور سرکاری سطح پر انہوں نے مسلمانوں کی معاشرتی اور معاشی زندگی پر کاری ضربیں لگائیں۔ کانگریس وزارتوں نے سب سے زیادہ مظالم، سی پی، برار اور بہار میں توڑے۔

اس پُرآشوب دور میں تنظیم کی سرگرمیاں انہی علاقوں میں زوروں پر رہیں۔ وہ فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دینے والوں کے خلاف کارروائیاں کرتے لیکن اس سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ سب سے نمایاں واقعہ برار کے ضلع کھام گاؤں کے شہر بسوا چاند ورہ میں ہوا۔ کانگریس پارٹی کے مقامی صدر جگدیو پٹیل نے مرہٹی زبان میں مسلمانوں کی دل آزاری کے لیے ایک نظم ''قرآن کی غزل'' کے نام سے لکھ کر چھپوائی اور بڑے پیمانے پر اسے تقسیم کرایا۔ یہ

ایک بڑی دل آزار نظم تھی۔ پھر اس نے یہ انتظام بھی کیا تھا کہ شورش پسند نوجوانوں کی ٹولیوں کو یہ نظم یاد کرادی۔ اس پر خاصا ہنگامہ ہوا جس کی آڑ میں جگدیو پٹیل نے بسوا چاندورہ میں مسلمانوں پر مسلح حملے کرائے۔

تنظیم نے اس کی کوشش کو ناکام بنانے کی بہت کوشش کی لیکن بے سود، اسے باز آنا تھا نہ آیا۔ سی پی میں کانگریس کا راج تھا۔ وہ ملکاپور کانگریس کمیٹی کا صدر تھا۔ چھوٹے بڑے حکام سب ہندو تھے، پھر بھلا اسے روکنے والا کون تھا۔ ایک دن وہ کچھ لوگوں کو لے کر بسوا چاندورہ پہنچا جو ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ یہ لوگ بسوا چاندورہ کی مسجد کے سامنے پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے مسجد میں گوبر پھینکا اور چند خنزیروں کو مسجد میں ہانک دیا۔ ہنگامہ ہوگیا۔ پٹیل اس ہنگامے میں مہلک طور پر زخمی ہوا۔

بس پھر کیا تھا، کانگریس پارٹی، کانگریس حکومت، ہندو افسر، ہندو اہل کار سب حرکت میں آگئے۔ مسلمانوں کو بڑے پیمانے پر گرفتار کیا گیا۔ ان گرفتار شدگان سے ہندو پولیس نے وہ سلوک کیا کہ بلیک ہول کا واقعہ تازہ ہوگیا۔ سینکڑوں افراد کو تیس فٹ لمبی اور بیس فٹ چوڑی کوٹھری میں بند کردیا گیا۔ ہندو جج تھا، ہندو وکیل استغاثہ تھا اور ہندو پولیس افسر تھے۔ کئی گرفتار شدگان کو سکھائی پڑھائی گواہی کی بنیاد پر پھانسی اور عمر قید کی سزا ہوئی۔ جنہیں ایک سال بعد ناگپور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس نے تمام الزامات سے باعزت بری کردیا اور اسے ایک لغو، بے بنیاد، من گھڑت مقدمہ قرار دے کر تمام عدالتی کارروائی کو انسانیت سوز ٹھہرایا۔

سی پی، برار، بہار، یوپی وغیرہ میں کانگریس کی صوبائی حکومتوں کے زیر اثر مسلمانوں پر جہاں اس قسم کے انسانیت سوز مظالم توڑے جارہے تھے، وہیں ان کی تہذیبی، معاشرتی، مذہبی اور معاشی زندگی پر بھی حملے کیے جارہے تھے۔ ان ہنگاموں سے متاثر ہوکر بنگال کے انتہا پسند ہندو بھی صوبے کی فضا کو مسموم بنانے کے درپے ہوچکے تھے۔ تنظیم نے فیصلہ کیا تھا کہ بنگال کو اس قسم کے ہنگاموں سے بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ اسی مقصد کے تحت تنظیم کے کئی سرفروش کلکتے پہنچ چکے تھے۔ میں کلکتے میں عارضی طور پر مچھوا بازار کے جس مکان میں مقیم تھا اسی کو ہنگامی ہیڈ کوارٹر میں تبدیل کردیا گیا تھا۔

کلکتے پہنچنے والے سرفروشوں میں مہندر اور سشما بھی تھے۔ وہ دونوں میرے ساتھ ہی ٹھہرے تھے۔ ایک عرصے بعد میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس مرتبہ مجھے مہندر بہت بجھا بجھا سا لگا۔ یہ وہ مہندر ہی نہیں تھا جسے میں جانتا تھا، مضطرب، بے چین، سیماب صفت،

آتش زیرپا! مہندر کی جگہ اس مرتبہ ایک کھویا کھویا مہندر میرے سامنے تھا۔ لگتا تھا اس کے سینے میں دہکنے والا انقلابی الاؤ سرد پڑ چکا تھا۔ وہ ہر وقت کسی سوچ میں گم رہتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ اس سے پوچھا بھی مگر اس نے ہمیشہ مجھے ٹال دیا۔

ایک دن جب میں اس کے سر ہو ہی گیا تو وہ مردہ سی آواز میں بولا۔ ''شیرازی جی! لگتا ہے میرے تمام خواب شکست ہوگئے ہیں۔ میرے تمام آدرش بکھر گئے ہیں۔''

میں سمجھا شاید وہ ہندوستان کی عام سیاسی فضا اور فرقہ وارانہ کشیدگی کے سبب پریشان ہے۔ ''یہ حالات تو ہمیشہ سے تھے مہندر! ہم نے کبھی ان سیاسی لیڈروں سے بہتری کی توقع نہیں کی تھی۔''

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں تھی۔ ''میں زندگی کے ایک نازک دوراہے پر آپہنچا ہوں شیرازی جی! مجھے فیصلہ کرنا ہے کہ دو میں سے کون سی راہ اختیار کروں۔ میں ابھی تک قطعی طور پر طے نہیں کرسکا ہوں کہ جو فیصلہ میں کرنا چاہتا ہوں، وہ حقیقت پسندانہ تجزیے پر مبنی ہے یا اس میں سراسر میری جذباتیت کو دخل ہے!''

''مجھے بتاؤ!'' میں نے کہا۔

''جب میں اپنے رویے کے بارے میں کسی یقینی نتیجے پر پہنچ جاؤں گا تو تمہیں بھی بتا دوں گا۔'' اس نے کہا۔

دو دن بعد مجھے اس کی ذہنی کشیدگی کا علم ہوا۔

تنظیم کے کارکنوں کا اجلاس ختم ہوچکا تھا۔ تمام کارکن وہاں سے جاچکے تھے۔ اس اجلاس میں طے کیا گیا تھا کہ کلکتے کو ہندو مسلم فسادات کی آگ سے کس طرح بچایا جائے۔ کس طرح ہندو انتہا پسندوں کو ان کے مذموم عزائم سے باز رکھا جائے۔ یہ وہ صوبہ تھا جو ابھی تک فرقہ وارانہ فسادات سے بچا ہوا تھا۔

اس اجلاس میں بھی مہندر بجھا بجھا سا رہا۔ اب تک میں اس کے ساتھ اس قسم کے جتنے اجلاسوں میں شامل ہوا تھا۔ اس نے ہمیشہ ان کی کارروائیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا بلکہ اپنی طرف سے تجاویز بھی پیش کرتا تھا لیکن اس دن وہ صرف خاموش تماشائی بنا رہا۔

جب تمام کارکن وہاں سے چلے گئے تو سالار نے مجھے اور مہندر کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اس مکان کا یہ کمرہ صرف سالار کے لیے مخصوص تھا۔ اس کمرے کو سالار نے اس لیے پسند کیا تھا کہ اس کا ایک دروازہ گلی میں بھی کھلتا تھا۔ سالار کس وقت اس کمرے میں آتا تھا اور کب وہاں سے جاتا تھا، ہمیں کچھ پتا نہ چلتا تھا۔ اندر کھلنے والا دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔

ہمیں ہدایت تھی کہ تین مرتبہ دستک دے کر کمرے میں داخل ہوں۔

''آج تم بہت خاموش ہو مہندر!'' سالار نے کہا تھا۔ ''کوئی خاص وجہ؟''

''جی ہاں!'' مہندر نے کہا۔ ''میں خود آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔''

''کہو کیا بات ہے؟'' یہ کہتے ہوئے سالار نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر اس کی تہہ کھولی اور کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھی، پھر اسے تہہ کر کے میز پر رکھ دیا۔ اب وہ اس کاغذ کو انگلیوں سے تھپتھپا رہا تھا۔

''میں بہت شرمندہ ہوں جناب!'' مہندر نے کہا۔ ''بہر حال میں تنظیم کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔''

مہندر کا یہ جملہ میرے لیے دھماکے سے کم نہ تھا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا کہ میں نے جو کچھ سنا تھا، وہ ٹھیک تھا۔

''ہوں......'' سالار نے گہرا سانس لیا۔ میز پر رکھے ہوئے کاغذ پر اس کی انگلیاں زیادہ تیزی سے پڑنے لگیں۔ ''اس بات پر ہم بعد میں غور کریں گے کہ تم تنظیم چھوڑ سکتے ہو یا نہیں۔ پہلے وجہ بتاؤ کہ تم نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟''

تو یہ بات تھی جس پر مہندر سوچ رہا تھا، جس نے مہندر کو ذہنی طور پر پراگندہ کر رکھا تھا۔ میں نے سوچا۔

''تنظیم سے علیحدگی کا فیصلہ میں نے بہت غور و خوض کے بعد کیا ہے حالانکہ میرے والد، میری بہن اسی تنظیم پر قربان ہو چکے ہیں۔ اس تنظیم کو میرے خاندان نے اپنے خون سے تقویت دی ہے۔''

''جذبات پر اپنے فیصلے کی عمارت نہ اٹھاؤ مہندر!'' سالار نے کہا۔ ''سیٹھ وشوانا تھ مجھے اپنے بھائی کی طرح عزیز تھا۔ لالی مجھے اپنی بیٹی سے زیادہ عزیز تھی۔ ان لوگوں کے بارے میں جو جذبات میرے ہیں ان کا تم اس لیے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس وقت تم خون کے رشتوں کو زیادہ اہمیت دے رہے ہو۔ خون کے اسی رشتے کی اہمیت کے لحاظ سے تم جان لو کہ وہ مجھے اپنی بیٹی سے بھی زیادہ عزیز تھی، تم آج اس بات کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ بات صرف سیٹھ وشوانا تھ جان سکتا تھا۔ تم وہ اسباب بتاؤ جن کی بنا پر تم نے تنظیم سے علیحدگی کا فیصلہ کیا ہے؟''

''بات یہ ہے جناب......'' مہندر نے کہا، اس کا لہجہ مجھے بہت اجنبی لگا تھا۔ ''میں ایک خاص نظریے کے ساتھ اس تنظیم میں شامل ہوا تھا مگر اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تنظیم

کا نظریہ میرے نظریات سے متصادم ہے۔''

میرے سر پر جیسے پے در پے کئی گولے پھٹ گئے، میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یہ اچانک مہندر ہم سے اتنی دور کیسے چلا گیا ہے؟ میں نے سوچا تھا۔

''اب تم نے بات کی ہے کام کی!'' سالار نے سرد لہجے میں کہا۔ ''کچھ یاد ہے تم اس تنظیم سے سن چوبیس میں وابستہ ہوئے تھے اور یہ سن انتالیس ہے۔ تمہیں پندرہ برس لگے یہ معلوم کرنے میں کہ تنظیم تمہارے نظریات سے متصادم ہے؟''

''اس کا احساس مجھے گزشتہ چند مہینوں میں ہوا ہے۔'' مہندر نے کہا۔ ''میں اس خیال سے تنظیم میں شامل ہوا تھا کہ تنظیم قومی بنیادوں پر ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کرے گی۔ یہ فرقہ وارانہ خطوط پر کام نہیں کرے گی مگر تجربے سے پتا چلا کہ میرا ندازہ غلط تھا۔''

''مہندر!'' سالار نے کہا۔ ''تم بہت گھٹیا بات کہہ رہے ہو۔''

''میں بڑے دکھ سے یہ حقیقت بیان کر رہا ہوں!'' مہندر نے کہا۔

''تم نے یہ غلط اندازہ کیسے لگایا؟'' سالار نے دریافت کیا۔

''پچھلے دنوں سی پی، برار، بہار اور یوپی میں تنظیم کی سرگرمیوں کی بنا پر! ہر جگہ تنظیم مسلمانوں کی خاطر حرکت میں آئی ہے، اس نے مسلمانوں کی حمایت کی ہے۔ اس نے انگریزوں کے خلاف اپنی عظیم جدوجہد کو فراموش کر دیا ہے۔'' مہندر نے کہا۔

''تم نے تنظیم کے ان مقاصد کو نہیں سمجھا جو پچھلے دنوں تنظیم کی سرگرمیوں کی بنیاد رہے ہیں۔ تمہارا یہ کہنا غلط ہے کہ تنظیم کو مسلمانوں کی حمایت میں استعمال کیا گیا۔ ہماری کارروائیوں کا اصل مقصد فرقہ وارانہ فسادات کو روکنا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے شانتا بمفورڈ سے ملنے والی اطلاعات کے بعد تنظیم نے ہندو مسلم اتحاد کو برقرار رکھنے کے لیے کوششیں کی تھیں، اسی طرح تنظیم کی یہ مہمیں بھی تھیں۔''

''مگر ہر جگہ نتیجہ کیا نکلا، تنظیم کے اراکین کو مسلمانوں ہی کی مدد کرنا پڑی یا ان کی حمایت میں تنظیم کو میدان میں آنا پڑا۔ آج تک کہیں بھی تنظیم ہندوؤں کی حمایت میں سرگرم عمل نظر نہیں آئی۔''

''مہندر!'' سالار نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ تم جیسا منطقی ذہن رکھنے والا اور حقیقت پسند انسان بھی جذباتیت میں بہہ کر منطقی استدلال اور حقیقت پسندی سے منحرف ہو گیا ہے۔'' مہندر خاموش رہا۔

سالار اس وقت سخت غصے میں تھا۔ ''مجھے بتاؤ، تنظیم کے اراکین نے جہاں کہیں بھی مسلمانوں کے حق میں کارروائی کی ہے، کیا وہاں مسلمان مظلوم نہیں تھے؟ مجھے بتاؤ کہ اب تک جتنے بھی فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں، کیا ان میں پہل ہندوؤں نے نہیں کی؟ کیا وہاں تمام تر شرارت ہندوؤں نے نہیں کی؟ تم مجھے ایک بھی ایسا علاقہ بتاؤ جہاں مسلمانوں نے شرارت کی ہو؟ مجھے افسوس ہے مہندر کہ تم نے تنظیم کے بارے میں اس نہج پر سوچا۔'' سالار نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ ''ویسے اس کے علاوہ کچھ اور بھی باتیں تم نے محسوس کی ہیں؟''

''جی ہاں۔'' مہندر نے کہا۔ ''تنظیم میں اب صرف میں واحد شخص ہوں جو مسلمان نہیں ہے۔''

''لاحول ولاقوۃ!'' سالار نے کہا۔ ''بات یہ ہے مہندر کہ انسان جب حقائق کی طرف سے منہ موڑ لیتا ہے تو وہ اسی انداز میں سوچتا ہے۔ کبھی یہ سوچا کہ اگر یہ تنظیم مسلمانوں کی ہی جماعت ہے تو تم اس میں کیسے شامل ہو گئے! اور کیا تم بھول گئے کہ اس تنظیم میں تم خود کیسے شامل ہوئے! ویسے ایک بات تمہیں بتادوں کہ تنظیم کے چار بڑوں میں دو ہندو بھی شامل ہیں۔''

مہندر خاموش ہو گیا لیکن اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ اپنے فیصلے پر قائم ہے۔

''میرا خیال ہے کہ تم تنظیم چھوڑنے کا فیصلہ حتمی طور پر کر چکے ہو۔'' سالار نے چند لمحے خاموش رہ کر کہا۔ ''ویسے مجھے بتاؤ، اب تمہاری راہ کیا ہو گی؟''

''جدوجہد کی راہ میری زندگی ہے۔'' مہندر نے کہا۔ ''میں کمیونسٹ پارٹی کے تحت کام کروں گا۔''

''ویسے تم چھاپا مار تنظیموں کا ایک بنیادی اصول بھول گئے۔'' سالار نے کہا۔ ''ان میں داخل ہونے کا راستہ تو ہوتا ہے، باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا، سوائے موت کے!'' سالار کا لہجہ سرد اور فیصلہ کن تھا، میں کپکپا کر رہ گیا۔ ''آج رات تم اور غور کر لو۔ صبح تم میرے ساتھ ناشتہ کرو گے۔ میں نے جو باتیں تمہیں بتائی ہیں، ان پر ٹھنڈے دل سے غور کر لو۔''

''صبح بھی میرا فیصلہ یہی رہے گا۔'' مہندر نے کہا۔ ''میں نے یہ فیصلہ جذباتی انداز میں اور اچانک نہیں کیا ہے۔''

''بہر حال صبح تم ناشتہ میرے ساتھ ہی کرو گے۔ اس تنظیم کے رکن کی حیثیت سے

تمہارے لیے یہ میرا آخری حکم ہے۔'' سالار نے کہا اور وہ پرچہ جو اس کی انگلیوں کے نیچے دبا ہوا تھا، اٹھا لیا۔ ''تمہارے اس ذہنی خلجان کا تنظیم کو پتا تھا۔ یہ دیکھو تنظیم کے چار بڑوں میں سے ایک کی تمہارے بارے میں رپورٹ! اس میں لکھا ہے کہ مہندر تنظیم کے بارے میں شبہات کا شکار ہو گیا ہے۔ وہ اس تنظیم کو حریت پسند چھاپا مار تنظیم کی بجائے ایک فرقہ وارانہ جنگجو جماعت سمجھنے لگا ہے۔ اس کی طرف سے ہوشیار اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ بہتر ہو گا کہ اسے راستے سے ہٹا دیا جائے ورنہ وہ تنظیم کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے کرم چند۔'' یہ کہہ کر اس نے پرچہ مہندر کو تھما دیا۔

مہندر نے وہ پرچہ پڑھا اور سالار کو واپس دے دیا۔

''تمہیں پتا ہے مہندر، چھاپا مار تنظیموں کا یہی اصول ہوتا ہے کہ برگشتہ ہونے والے رکن کو ختم کر دیا جائے لیکن میں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا ہے کیوں کہ یہ میرا ایمان ہے، تم تنظیم سے الگ ہو کر بھی تنظیم کو نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔ کم از کم میری تربیت اتنی ناقص نہیں ہو سکتی۔''

مہندر خاموش رہا، پھر وہ کمزور لہجے میں بولا۔ ''میں پھر شرمندگی کا اظہار کرتا ہوں مگر مجبور ہوں۔''

''میں تمہاری مجبوری جانتا ہوں۔'' سالار نے کہا۔ ''میں تم سے اتنی بات ضرور کہوں گا کہ تمہیں یہ مایوسی ہر تنظیم سے ہو گی بشرطیکہ تمہارا اندازِ فکر اسی طرح غیر منطقی، جذباتی اور غیر حقیقت پسندانہ رہا۔ اچھا اب تم لوگ جا سکتے ہو۔''

ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''سنو مہندر! تم چاہو تو اسی وقت جا سکتے ہو۔ صبح ناشتے پر ملاقات کی ضرورت بھی نہیں رہی۔ بلاوجہ کہیں تم یہ سمجھو، میں صبح تک تمہیں اس لیے روک رہا ہوں کہ کرم چند کے مشورے پر عمل کیا جا سکے۔ ایسا نہیں ہے مہندر بیٹا، ایک باپ کبھی ایک اچھے اور فرماں بردار بیٹے سے ایسا سلوک نہیں کر سکتا۔ وہ تو ایسی اولاد کی حفاظت کرتا ہے۔ مہندر! تم مجھے شیرازی سے زیادہ عزیز ہو، تم مجھے اپنے بیٹے سے زیادہ عزیز ہو۔ مجھے دکھ ہے کہ تم جو ایک اچھے اشتراکی انسان بننا چاہتے تھے، محض ایک اشتراکی ہندو بن کر رہ گئے ہو۔ میں جانتا ہوں ایسا کس لیے ہوا ہے، کس نے تمہاری وسیع النظری کو تنگ دلی میں تبدیل کر دیا ہے!''

''یہ میرا اپنا فیصلہ ہے جناب!'' مہندر نے کہا۔ ''مجھے کسی نے سکھایا پڑھایا نہیں ہے۔''

''شاید تم بھی صحیح کہہ رہے ہو مگر نادانستگی میں تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ تمہارا المیہ یہ ہے کہ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ اچھا الوداع!''

کمرے سے نکل کر میں نے محسوس کیا کہ دنیا بدل چکی ہے۔ میں اس دنیا میں تنہا رہ گیا ہوں۔ مہندر مجھ سے بہت دور چلا گیا ہے۔ ہم دونوں خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئے جہاں طارق موجود تھا۔

''سشما بی بی چلی گئی ہیں۔'' طارق نے مہندر سے کہا۔ ''وہ تھیٹر روڈ پر اپنی کسی سہیلی کے پاس گئی ہیں۔ کہہ رہی تھیں کہ آپ پتا جانتے ہیں، وہیں پہنچ جائیں، انہیں دیر ہو جائے گی۔''

''کب گئی تھی سشما؟'' مہندر نے پوچھا۔

''پندرہ بیس منٹ پہلے۔'' طارق نے کہا۔

''اچھا شیرازی! میں چلتا ہوں۔'' اس نے کمزور لہجے میں کہا۔

''واپس نہیں آؤ گے؟''

''آؤں گا، سشما کو لے کر!'' مہندر نے کہا۔ ''میں شاید نہ آتا لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ سالار یہ خیال کریں کہ میں نے ان کی نیت پر شبہ کیا ہے اور اس ڈر سے چلا گیا ہوں کہ کہیں مجھے صبح تک ٹھکانے نہ لگا دیا جائے۔ میں صبح سالار کے ساتھ ناشتہ کروں گا۔ تنظیم کے رکن کی حیثیت سے ان کے اس آخری حکم کی تعمیل میرا فرض ہے۔''

وہ چلا گیا۔

تنہائی کا بیکراں سناٹا میرے چاروں طرف پھیل گیا۔ دیر تک میں پلنگ پر لیٹا کروٹیں بدلتا اور سوچتا رہا کہ آخر وہ کون ہے جس نے مہندر کے خیالات کو اس قدر تبدیل کر دیا ہے؟ دو بجے تک میں مہندر اور سشما کی واپسی کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہیں آئے۔ وہ اب نہیں آئیں گے میں نے سوچا تھا۔ بھلا اب وہ واپس آ کر کریں گے بھی کیا؟ وہ رفاقت جو ختم ہو چکی تھی، اب بحال نہیں ہو سکتی تھی۔ یہی سب کچھ سوچتا سوچتے میں سو گیا لیکن یہ نیند سکون اور اطمینان کی نیند نہیں تھی۔

رات اپنے پچھلے پہر میں داخل ہو چکی تھی کہ اچانک سالار نے مجھے اور طارق کو جھنجھوڑ کر جگا دیا۔

''پولیس آ گئی ہے اور مکان کی ناکہ بندی کر رہی ہے۔'' سالار نے کہا۔

ہم دونوں اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ سالار کے ایک ہاتھ میں اسلحہ کا ایک تھیلا اور

دوسرے ہاتھ میں پستول تھا۔ ہم نے بھی اسلحے کے وہ تھیلے اٹھا لیے جو ہمیشہ ہمارے بستروں کے ساتھ تیار رکھے رہتے تھے۔ پستول ہمارے ہاتھوں میں بھی تھے۔

''دستی بم نکال لو۔'' سالار نے کہا۔ ''طارق! تم میرے ساتھ رہو گے۔ شیرازی! تم میرے کمرے میں جاؤ۔ تم وہاں ہمارے آنے تک ٹھہرو گے۔''

''مگر آپ؟'' میں نے کہا۔

''تم جاؤ!'' سالار نے سخت لہجے میں کہا۔ ''ادھر کا دروازہ کھلا رکھنا۔ دوسری طرف سے کسی کو اندر نہ آنے دینا۔ طارق! تم میرے ساتھ آؤ۔''

میں وہاں سے اس کمرے میں آ گیا جہاں سالار کا قیام تھا۔ اندر کا دروازہ میں نے پورا کھول دیا اور پچھلے دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دروازے کے باہر محتاط آہٹیں سنائی دے رہی تھیں۔ میرے ہاتھ میں پستول تھا۔ ایک دستی بم میں نے اپنے ٹنڈے ہاتھ کی بغل میں دبا رکھا تھا۔ میں کمرے میں ایسی جگہ کھڑا تھا۔ جہاں سے سالار اور طارق کی کارروائیاں دیکھ سکتا تھا۔

ان دونوں نے جلدی سے وہ کمرہ کھولا تھا جس میں ہنگامی ضرورت کے لیے تھوڑا بہت اسلحہ اور بارود وغیرہ رکھا تھا۔ طارق اور سالار نے اس کمرے میں بارود کے تھیلے اور دستی بم بیرونی دروازے کے آگے ڈھیر کر دیے تھے۔ دروازے کی دونوں طرف دو کمرے بنے ہوئے تھے جن کے اوپر بھی کمرے بنے ہوئے تھے۔ اس طرح گویا دروازہ صحن سے پھوٹنے والی ایک گلی میں تھا۔ سالار اور طارق نے دھماکا خیز مادے کا ڈھیر اسی گلی میں لگایا تھا۔ پھر وہ دونوں تیزی سے میری طرف آئے تھے۔ انہوں نے ایک ایک رائفل بھی اٹھا رکھی تھی۔

''ہم اس کمرے کی چھت پر جا رہے ہیں۔'' سالار نے کہا۔ ''ہم چھت سے فائرنگ کر کے گلی صاف کریں گے، پھر جب تم ٹرک رکنے کی آواز سنو تو دروازہ کھول کر ٹرک میں داخل ہو جانا۔''

''اور آپ؟''

''ہم چھت سے ٹرک میں کود جائیں گے۔'' سالار نے کہا۔ ''تم ایسا کرنا کہ جیسے ہی ہم اوپر سے فائرنگ شروع کریں۔ بارود اور دستی بم کے اس ڈھیر پر پستول سے پے در پے فائر کر دینا تاکہ سب کچھ ایک ہی دھماکے سے اڑ جائے۔'' یہ کہہ کر سالار، طارق کو لے کر ایک سیڑھی کے سہارے چھت پر چلا گیا۔

میں اس وقت حیران تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ ٹرک کہاں سے آئے گا؟ کون اسے چلا رہا ہو گا؟ کیا سالار کو پولیس کے اس چھاپے کا پہلے سے پتا تھا؟ کیا اسے سن گن مل گئی تھی؟ اگر سن گن ملی تھی تو پہلے ہی سے کیوں نہ اس مکان کو خالی کر دیا گیا؟ اس وقت میں اس سے زیادہ کچھ نہ سوچ سکا۔

میں نے سیڑھی چڑھتے ہوئے سالار کی آواز سنی۔ ''غزنوی! ہم آ رہے ہیں۔ گولی نہ چلا دینا۔''

یہ میرے لیے ایک اور حیرت انگیز انکشاف تھا، گویا غزنوی بھی یہاں موجود تھا اور چھت پر تھا۔

پے در پے تین فائر ہوئے، پھر فائر ہوتے ہی چلے گئے۔ میں بھی پستول سے فائر کر چکا تھا۔ بارود کے ذخیرے میں زوردار دھماکے ہوئے تھے، دروازہ ٹوٹا تھا، پھر دونوں طرف کے کمروں کی دیواریں بیٹھ گئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی بالائی کمرے بھی نیچے بیٹھ گئے تھے۔ باہر ایک شور و غوغا مچ چکا تھا۔ پھر مجھے دو اور دھماکوں کی آوازیں سنائی دیں، ان کے بعد ایسے ہی دو اور دھماکے ہوئے۔ یہ دھماکے دستی بموں کے تھے اور باہر کی سمت ہوئے تھے۔ باہر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ پولیس کی سیٹیاں بج رہی تھیں۔ دروازے پر اب بھی دھماکے ہو رہے تھے۔ پولیس کے سپاہی شور مچا رہے تھے۔ پھر مزید چند دھماکے ہوئے۔ آوازوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ سالار، طارق اور غزنوی نے باہر کھڑے ہوئے پولیس کے ٹرکوں کو دستی بموں کا نشانہ بنایا تھا۔ میں لپک کر باہر کھلنے والے دروازے کے پاس آ گیا تھا۔ میں نے گلی میں ٹرک داخل ہونے کی آواز سنی تھی۔

میں دروازہ کھول کر باہر آیا اور ٹرک میں بیٹھ گیا۔ اسی وقت اوپر سے دھم دھم کر کے سالار، طارق اور غزنوی ٹرک میں کود دیے تھے۔ پھر سالار ہمیں وہیں بیٹھنے کی ہدایت دے کر ٹرک سے اتر کر آگے گیا تھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا اور ٹرک تیزی سے روانہ ہوا۔

یہ گلی کیا تھی، ایک تنگ سڑک تھی۔ ابھی ہمارا ٹرک گلی کے موڑ پر بھی نہیں پہنچا تھا کہ گلی کے دوسرے سرے سے پولیس کے چند سپاہی گلی میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے ٹرک پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی۔ ٹرک کے پہلو میں جو تختے تھے، ہم اس کا سہارا لے کر گھٹنوں کے بل بیٹھے، فائرنگ کر رہے تھے اور ٹرک اپنی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ اسی وقت گلی میں پہلو کے ایک دروازے کی آڑ سے بھی ایک شخص نے فائرنگ شروع کر دی۔ اچانک ہمارا ٹرک لہرایا، پھر بہ مشکل تمام ٹرک، پہلو کی دیواروں سے ٹکراتے ٹکراتے بچا تھا

اور ایک جگہ رک گیا تھا۔

پولیس کے سپاہی اب عقب سے بھی ٹرک کے پیچھے آ رہے تھے۔ ٹرک رکا ہوا تھا۔ پھر سالار کی آواز ابھری۔

''شیرازی! اعجاز ہلاک ہو گیا ہے، میں زخمی ہوں، تم عقب کا خیال رکھو، میں ٹرک اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

طارق اور غزنوی نے عقب سے بڑھنے والے سپاہیوں پر بے تحاشا فائرنگ شروع کر رکھی تھی۔ اس دوران میں انہوں نے دو دستی بم بھی ان پر مارے تھے۔ ٹرک اب بھی بے حرکت تھا۔

پھر میں نے اسی شخص کو چیختے ہوئے سنا جو ہمارے سامنے سپاہیوں پر فائرنگ کر رہا تھا۔ ''ٹرک کیوں روک دیا ہے؟ ٹرک نکال کر لے جاؤ!''

یہ آواز میرے لیے مسرت انگیز حیرت کا باعث ہوئی۔ یہ آواز میرے دوست مہندر کی تھی۔

''مہندر!'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''ڈرائیور ہلاک ہو گیا ہے۔''

پھر میں نے مہندر کو تیزی سے ٹرک کی طرف دوڑتے دیکھا۔ اسی وقت دو پولیس والوں نے گلی کی آڑ سے نکل کر مہندر پر فائرنگ کی، میں نے بھی پستول سے فائر کیے۔ گولیاں مہندر کے دائیں بائیں نکل گئیں۔ آخر کار وہ ٹرک میں داخل ہو ہی گیا۔

''شیرازی! تم خیال رکھنا! میں ٹرک اسٹارٹ کر رہا ہوں۔''

میں ڈرائیونگ کیبن کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ اب سامنے گلی مجھے دور تک نظر آ رہی تھی۔

''طارق! غزنوی! پیچھے دو دستی بم پھینک کر آگے آ جاؤ!'' میں نے چیخ کر کہا۔

وہ اگلے لمحے دستی بم پھینک کر میرے برابر آ گئے تھے۔ مہندر ٹرک اسٹارٹ کر چکا تھا۔

میں نے ان دونوں سے چیخ کر کہا۔ ''جیسے ہی ٹرک گلی کے نکڑ پر پہنچے اس سے ذرا دیر پہلے ایک ایک دستی بم دائیں بائیں پھینکنا۔'' ساتھ ہی میں نے چیخ کر مہندر سے کہا تھا۔ ''مہندر! ٹرک پوری رفتار سے دوڑا دو۔''

مہندر میرے کہنے کے ساتھ ہی اس مشورے پر عمل کر چکا تھا۔

ٹرک ابھی گلی کے موڑ سے چھ سات فٹ دور تھا کہ غزنوی اور طارق نے دائیں بائیں ایک ایک دستی بم اچھال دیا۔ ٹھیک اس وقت دو دھماکے ہوئے جب ٹرک گلی کے موڑ

سے نکلا تھا۔ دھماکوں کی شدت سے ٹرک ایک طرف ذرا سا لہرایا تھا اور پھر سڑک پر مڑ کر تیزی سے بڑھنے لگا تھا۔ ذرا ہی دیر میں ہم تمام ہنگامے کے مرکز سے بہت دور پہنچ چکے تھے۔

مجھے نہیں پتا تھا کہ اب ہم کہاں جائیں گے۔ ٹرک مختلف موڑ کاٹتا ہوا کسی انجانی سمت بڑھا جا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مہندرا اسی سمت جا رہا ہے، پھر مجھے اعجاز کی ہلاکت اور سالار کے زخمی ہونے کا خیال آیا۔ پتا نہیں سالار کے زخم کی نوعیت کیا ہے؟ میں نے سوچا۔

پھر ٹرک ایک مضافاتی علاقے میں داخل ہو گیا۔ یہاں چاروں طرف کھیت اور ہموار میدان تھے۔ راستہ بھی کچا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک ایک بڑے سے احاطے میں جا کر ٹھہر گیا۔ چاروں طرف ناریل اور اناناس کے درخت لگے ہوئے تھے۔ ٹرک رکتے ہی خالد شکرے اور چند سرفروشوں نے ٹرک کو گھیر لیا تھا۔

''تمام سرفروشوں کو خبر کر دو کہ وہ تنظیم کے عارضی ہیڈ کوارٹر کا رخ نہ کریں۔'' سالار نے خالد شکرے سے کہا۔ ''پھر اس ٹرک کو بھی ٹھکانے لگا دو، ٹرک میں اعجاز کی لاش ہے، اسے یہیں احاطے میں دفن کر دو۔''

''آپ بھی تو زخمی ہیں۔'' خالد نے کہا تھا۔

''میری فکر نہ کرو، زخم ٹھیک ہو جائیں گے۔ پہلے اس خطرے کو دور رکھنے کے انتظامات کرو جو بہت قریب آ پہنچا ہے۔'' سالار نے کہا۔ ''یہ تینوں میرے زخم کی ڈریسنگ کر دیں گے۔''

ہم تینوں سالار کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اچانک سالار نے پوچھا۔ ''وہ سشما کہاں ہے؟''

''وہ اپنی ایک سہیلی کے گھر ہے۔'' مہندر نے جواب دیا۔

سالار کے دائیں بازو اور دائیں گال پر ہی زخم آئے تھے۔ سالار نے ہمیں گال کے زخم کی پروا نہ کرنے کی ہدایت کی۔ ''اس کی پروا نہ کرو۔ گولی بس رگڑ کھا کر گزر گئی تھی۔ تم بازو کے زخم کی ڈریسنگ کر دو۔ گولی گوشت پھاڑ کر نکل گئی ہے۔ خیریت ہے کہ ہڈی بچ گئی۔''

ہم نے زخم کی ڈریسنگ کے لیے جب سالار کا دایاں بازو کھولا تو زخم سے کچھ اوپر کئی نام بازو پر گدے ہوئے دیکھے۔ ان میں سے کئی نام ہمارے جانے پہچانے تھے۔

''اب ان ناموں میں اعجاز کے نام کا اضافہ ہو جائے گا۔'' سالار نے کہا۔

فرسٹ ایڈ کے سامان سے ہم نے ڈریسنگ بھی کی اور وہ نام بھی پڑھتے رہے۔

''لالی کا نام تلاش کر رہے ہو؟'' سالار نے مجھ سے کہا۔ ''وہ میرے سینے پر نقش ہے، لالی میری بیٹی!''

زخم کی ڈریسنگ ہونے کے بعد سالار نے کہا۔ ''بس اب تم جاؤ۔ چہرے کے زخم کی ڈریسنگ میں خود کر لوں گا۔''

میں نے دیکھا خون سے سیاہ نقاب تر ہو رہی تھی۔ سیاہ نقاب کے پھٹے ہوئے حصے سے سرخ سرخ گوشت جھلک رہا تھا۔

ہم باہر آ گئے۔ خالد شکرے نے بتایا کہ ایک شخص موٹر سائیکل پر تمام سرفروشوں کو مطلع کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ ایک سرفروش اس ٹرک کو دریائے ہگلی میں گرانے لے گیا ہے۔ ناریل کے ایک درخت کے نیچے ہم نے اعجاز کے لیے قبر کھودی اور اپنے اس عزیز ساتھی کو قبر میں اتار دیا۔ اس وقت میرا دل بری طرح رو رہا تھا۔ کاش اس کی جگہ میں مر جاتا۔ میں نے سوچا تھا، تنظیم ایک صحیح سالم عملی سرفروش سے تو محروم نہ ہوتی مگر کتنی خواہشیں، کتنی تمنائیں ایسی ہوتی ہیں جو تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہیں۔ اگر سب خواہشیں ہی پوری ہوتی چلی جائیں تو مشیت ایزدی کا قائل کون رہے!

اس کام سے ہم فارغ ہوئے تو صبح صادق طلوع ہو چکی تھی۔

خالد شکرا ہمیں ایک کمرے میں چھوڑ کر، جہاں ہمیں سونا تھا، سالار کی طرف چلا گیا تھا۔

''ارے ہاں غزنوی!'' میں نے کہا۔ ''یہ تم چھت پر کہاں سے آ ٹپکے تھے اور یہ اعجاز؟''

''جب سے سالار اس مستقر پر آ کر مقیم ہوئے تھے میرا ٹھکانا وہی چھت تھی۔'' غزنوی نے بتایا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے کہا۔ ''یعنی تم اتنے دنوں سے وہیں موجود تھے؟''

''ہاں۔'' غزنوی نے کہا۔ ''سالار نے یہ حفاظتی انتظام پیش بندی کے طور پر کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم لوگوں کو کسی بھی وقت بے خبر اور مطمئن نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ ہر وقت ہوشیار، چوکنا اور محتاط رہنا چاہیے۔ میری اور اعجاز کی ڈیوٹی چوبیس گھنٹے کی تھی۔ میں رات کو جاگتا تھا، دن میں سوتا تھا اور اعجاز جو وہاں سے تھوڑی ہی دور ایک ٹرک کے ساتھ موجود تھا، دن کو نگرانی کرتا تھا اور رات کو سوتا تھا۔''

ناشتے پر سالار بھی ہمارے ساتھ تھا لیکن اس وقت وہ کچھ کھا پی نہیں رہا تھا۔ ''مہندر! مجھے خوشی ہے کہ اس وقت تم ہمارے ساتھ ناشتے پر موجود ہو۔'' چہرے کے زخم کی وجہ سے سالار ٹھہر ٹھہر کر بات کر رہا تھا۔

''آپ کا حکم تھا جناب!'' مہندر نے کہا۔

ناشتے کے بعد مہندر ہم سے رخصت ہو گیا لیکن اس وقت میرے دل سے ایک بوجھ ہٹ گیا تھا۔ رات کے تجربے کے بعد میں ایک غیر محسوس سی مسرت محسوس کر رہا تھا۔ مہندر اب بھی میرا دوست تھا، ہماری منزل اب بھی ایک تھی۔

مہندر کے جانے کے بعد خالد نے بتایا تھا۔ ''سالار کے چہرے کا زخم خاصا گہرا ہے۔ جبڑے کی ہڈی صاف نظر آ رہی ہے، کافی گوشت اڑ گیا۔ بس خیریت ہی ہو گئی۔ میں نے ڈاکٹر کو بلایا ہے۔ ٹانکے لگ جائیں گے تو زخم جلد بھر جائے گا۔''

اسی رات مجھے ہدایت کی گئی کہ میں کلکتے سے ڈھاکہ چلا جاؤں۔

☆======☆======☆

دوسری جنگِ عظیم چھڑے دو ایک مہینے ہی ہوئے تھے، جرمنی تباہ کن یلغار کرتا ہوا یورپ میں بڑھتا جا رہا تھا۔ مجھے سالار کا پیغام ملا کہ میں طارق کے ساتھ فوراً برما جا کر تنظیم کے لیے مسلسل اور مستقل اسلحہ کی فراہمی کا انتظام کروں۔ یہ ہدایت بھی تھی کہ اب میں مستقلاً برما میں ہی ڈیرا ڈال دوں اور اسلحہ کو ہندوستان لانے کا کام طارق کے سپرد کر دیا جائے۔ تنظیم نے فیصلہ کیا تھا کہ اس وقت جب کہ انگریز کی تمام توجہ اور طاقت جنگ پر لگی ہوئی ہے، تنظیم کو پورے ہندوستان میں اپنی چھاپا مار سرگرمیوں میں اضافہ کر دینا چاہیے۔

میں حکم کی تعمیل میں برما چلا گیا اور اپنا کام انجام دینے لگا۔ یہیں 1941ء کے اواخر میں میری ملاقات کریم غنی سے ہوئی۔ وہ ایک سچا مسلمان، پکا محب وطن اور پُر جوش انقلابی تھا۔ یہ برما کے ان حریت پسندوں میں سے تھا جو اس وقت برما کو برطانوی سامراج کے تسلط سے آزاد کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اس کی دوستی میرا ایک قیمتی سرمایہ تھی اور اسے جب میری سرگرمیوں کا علم ہوا تو ہماری دوستی اور مستحکم ہو گئی۔

میں برما میں ہی مقیم تھا کہ 42ء کے اوائل میں جاپان، مشرق بعید میں داخل ہو گیا۔ پرل ہاربر پر حملے سے لے کر برما پر چڑھتے سورج کا پھریرا لہرانے تک صرف چند ماہ کا عرصہ تھا۔ سنگاپور، ملایا اور برما میں لاکھوں فرنگی فوجیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ انگریز فوجیں برما سے بڑی افراتفری میں بھاگیں۔

میں ان دنوں منڈالے میں تھا کہ ایک دن کریم غنی میرے پاس آیا۔ برما کے حریت پسند رہنما کی حیثیت سے اس کا نام جاپانیوں کے لیے نیا نہیں تھا۔ پھر اس کے تعلقات ہندوستان میں مقیم بعض ان ہندوستانی فوجیوں سے بھی تھے جو انگریزوں کی فوج میں بھرتی ہو کر برما میں متعین تھے۔

''سنو شیرازی!'' اس نے کہا۔ ''تمہارے ہندوستان کی آزادی کے دن بھی قریب آ گئے ہیں۔''

''خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔'' میں نے کہا۔

''آؤ اور میرے ساتھ چلو'' اس نے کہا۔ ''آج ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم دن ہے۔''

میں اس کے ساتھ چلا آیا۔ وہ مجھے دراصل سبھاش چندر بوس، کیپٹن شاہنواز، لیفٹیننٹ ڈھلوں اور کیپٹن عبدالرشید سے ملانے لایا تھا۔

تب مجھے پتا چلا کہ سبھاش چندر بوس اور اس کے تمام ساتھیوں نے کریم غنی کے توسط سے جاپانی جنرل کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ وہ برما اور ملایا میں انگریزی فوج کے ساتھ گرفتار ہونے والے ہندوستانی فوجیوں کی مدد سے آزاد ہند فوج قائم کریں گے اور اس کے ذریعے ہندوستان کو انگریزوں کے وجود سے پاک کر دیں گے۔ اس محاذ کی طرف سے بے فکر ہو کر جاپان ان علاقوں پر اپنا قبضہ مستحکم کرنے کی تدابیر کرے۔

اس دن برما میں قائم کیے جانے والے آزاد ہند ریڈیو سے، آزاد ہند حکومت اور آزاد ہند فوج کے قیام کا اعلان ہوا۔ اس حکومت میں کریم غنی کو وزیر دفاع بنایا گیا۔

کریم غنی ایک خاص ارادے سے مجھے ملانے لے گیا تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔ ''لو بھئی یہ ہیں ہمارے وزیر اطلاعات ونشریات!''

میں اس پر حیران ہی تو رہ گیا تھا اور جب میں نے اس سے انکار کیا تو کریم غنی بہت مایوس ہوا تھا۔ تب میں نے کہا۔ ''دوستو! میری تمام ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔ میری تمام خدمات آپ کے لیے وقف ہیں لیکن جہاں تک کوئی عہدہ سنبھالنے کا تعلق ہے تو میں معذور ہوں۔''

''آخر کیا وجہ ہے، کیا مجبوری ہے؟'' کیپٹن عبدالرشید نے کہا تھا۔

''بات یہ ہے کہ میں یہاں اپنی تنظیم کی طرف سے بھیجا گیا ہوں۔ تنظیم کی اجازت کے بغیر میں کوئی ایسا منصب قبول نہیں کر سکتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ میں اپنی ذاتی حیثیت میں

آپ کے لیے ہر وہ کام کروں جو اطلاعات اور نشریات کے شعبے سے متعلق ہو۔ میں آزاد ہند حکومت اور آزاد ہند فوج کے ایک ادنیٰ اعزازی کارکن کی حیثیت سے ہر خدمت بجالانے کو تیار ہوں۔ مجھے آپ لوگوں کے مقصد اور عزائم سے پورا اتفاق ہے۔ ویسے بھی میں نام ونمود سے زیادہ کام اور صرف کام کو اہمیت دیتا ہوں۔''

اس دن سے میری تمام تر سرگرمیاں آزاد ہند ریڈیو کے پروگراموں کے لیے وقف ہو کر رہ گئیں۔ میں اس کے لیے پروگرام لکھتا، اس کے پروگرام پروڈیوس کرتا، اس کی خبریں بناتا اور خبریں پڑھتا۔ آج بھی اگر آزاد ہند فوج کے کچھ لوگ زندہ ہیں تو انہیں اپنا ایک ٹنڈا اور لنگڑا ساتھی ضرور یاد ہوگا جس کی آواز اور الفاظ نے ایک آگ لگادی تھی، ایک اودھم مچادیا تھا۔

جنگ کیوں کہ ہندوستان کی سرحدوں تک آپہنچی تھی اس لیے اب میرا اپنی تنظیم سے رابطہ بالکل منقطع ہوگیا تھا۔ تنظیم کے لیے سامانِ حرب کی فراہمی کا سلسلہ بھی معطل ہوگیا تھا اس لیے اب میری تمام دلچسپیاں اور سرگرمیاں آزاد ہند فوج کے شعبۂ اطلاعات ونشریات تک محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔

پھر 1945ء کا وہ منحوس دن آیا جب جاپان پر پہلا ایٹم بم گرایا گیا۔ جاپان نے ہتھیار ڈال دیے۔ برما میں جاپانی فوج اسیر ہوئی اور انگریز فوج پھر فاتح ٹھہری۔ آزاد ہند فوج کے اراکین پکڑ لیے گئے۔ میں بہ مشکل تمام کریم غنی کے ساتھ فرار ہو کر سیرابوم کی اس بستی میں پہنچا جو کہتن کی بستی تھی۔ کہتن کے باپ نے ہم دونوں کا کھلے دل سے استقبال کیا اور ہمیں پناہ دی۔

وہاں قیام کے دوران میں ہمیں کچھ پتا نہ تھا کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے کیا نہیں۔ انگریز فوجیں پورے برما میں ہندوستان کے ان فوجیوں کو تلاش کرتی پھر رہی تھیں جنہوں نے جاپانیوں کی امداد اور تعاون سے آزاد ہند فوج قائم کی تھی۔

ہم ڈیڑھ سال تک سیرابوم میں چھپے رہے۔ میں نے اس دوران میں کئی مرتبہ ہندوستان واپس آنے کا ارادہ کیا لیکن ہر مرتبہ کہتن کے باپ نے مجھے روک لیا۔ اس کا کہنا تھا۔''بیٹا آفاق! مجھے معلوم ہے تمھیں اپنے ماں باپ، اپنا ملک اپنا شہر سب یاد آرہے ہوں گے لیکن ابھی تمہارے لیے سرحدیں محفوظ نہیں ہیں۔''

تب مجھے ایک خیال آیا اور میں نے کہتن کے باپ سے کہا۔''دادا! میرا ایک کام کر دو۔''

''بولو۔'' دادا نے کہا۔''وہ کیا کام ہے۔''

''میں ہندوستان میں اپنے ایک دوست کو خط لکھتا ہوں۔ تم منڈالے کسی تاجر کے پتے پر اس کا جواب مجھے منگوادو۔''

پندرہ دن بعد دادا نے مجھے منڈالے کی کسی تجارتی فرم کا لیٹر پیڈ لاکر دیا۔ اس لیٹر پیڈ پر میں نے بہت احتیاط سے خط لکھا۔ مجھے ڈر تھا کہ شاید اب بھی خطوط سنسر کیے جاتے ہوں کیوں کہ برما میں اب بھی انگریز فوج بہت سرگرم تھی اور آئے دن ایک نہ ایک مفرور ہندوستانی فوجی پکڑا جاتا رہتا تھا۔ میں نے اس خط میں صرف اپنی خیریت کی اطلاع تھی اور مزید ہدایات طلب کی تھیں۔

خط لکھنے کے بعد میں مطمئن تھا کہ میں نے اپنی تنظیم سے رابطے کی ایک صورت پیدا کرلی ہے۔ اس کے بعد میں نے خط کے جواب کا انتظار شروع کردیا۔ اڑتی اڑتی خبریں مل رہی تھیں کہ برطانیہ ہندوستان کو آزادی دینے پر آمادہ ہوگیا ہے۔ یہ خبریں جہاں مجھے بے چین اور مضطرب کر رہی تھیں، وہیں کریم غنی کو بھی بے تاب کر رہی تھیں۔ پھر ایک دن اس کے صبر کا پیمانہ چھلک ہی گیا اور وہ ہم سے رخصت ہو کر برما کی پُرشور سیاست میں حصہ لینے کے لیے نکل گیا۔

میں نے اسے بوجھل دل سے رخصت کیا۔ کیسا انقلابی آدمی تھا وہ بھی!

اس کے بعد میری اس سے ملاقات چار پانچ سال قبل کراچی میں ہوئی تھی۔ اسے برما کی حکومت نے جلاوطن کردیا تھا کیوں کہ وہ برمی مسلمانوں کا سرگرم اور انقلابی رہنما تھا۔ اس ملاقات کے موقع پر اس نے مجھے بتایا تھا کہ اسے رنگوں پہنچتے ہی گرفتار کرلیا گیا تھا۔ یہ انقلابی شخص بعد میں برما کی اسمبلی کا رکن بنا، ڈاکٹر بوما کا سیکرٹری رہا، پھر برما کے مسلمانوں کے لیے مؤثر آواز اٹھانے کی پاداش میں جلاوطن ہو کر سنگاپور پہنچا۔ وہاں ایک نو مسلم ولندیزی دوشیزہ کے مسئلے پر اس نے وہ دھواں دھار تقریریں کیں کہ سنگاپور کے انگریز حکام نے اسے گرفتار کرلیا۔ جیل میں اسے زہریلے ٹیکے لگائے گئے جس سے وہ تپ دق اور فالج کا مریض بن گیا۔ مرتا کھپتا کسی نہ کسی طرح وہ پاکستان آیا اور کراچی کے جناح ہسپتال میں گمنامی کی موت مرگیا۔ ہاں وہ پچھلے برس ہی تو مرا تھا۔ لگتا ہے صدیاں گزر گئیں۔ آخر دم تک وہ ایک مجاہدانہ شان سے مسلمانانِ عالم کی خدمت کرتا رہا۔ نام ونمود اور صلے کی تمنا کیے بغیر، وہ موتمر العالم اسلامی کے ہفت روزہ مسلم ورلڈ کو مرتب کرتا رہا۔ جب وہ مرا تو اس کے قریب کوئی نہ تھا، سوائے موتمر کے ایک بوڑھے ملازم کے!

مرنے سے پہلے اس کی صرف ایک خواہش تھی، وہ بھی پوری نہ ہو سکی کہ وہ کسی طرح برما جا کر اپنے بچوں سے مل لے۔ کراچی میں میری اس سے چند ملاقاتیں ہوئی تھیں، آخری مرتبہ جب میں اسے ملنے گیا تو پتا چلا، وہ ہسپتال میں ہے۔ ہسپتال گیا تو پتا چلا، وہ مر گیا ہے۔ وہ ایسا ہی سیماب صفت آدمی تھا۔ اس کے ساتھ چلنے والے ہانپ جاتے تھے، وہ ہمیشہ ان سے آگے رہتا تھا۔

اپریل 47ء کے اوائل میں مجھے اس خط کا جواب ملا۔ مجھے فوراً کلکتہ پہنچ کر مہندر سے ملنے کی ہدایت کی گئی تھی اور نوید بھی دی گئی تھی کہ ہندوستان آزاد ہونے والا ہے اور مسلمانوں کے مطالبے پر پاکستان کا قیام عمل میں آنے والا ہے۔ یہ جواب مجھے خالد شکرے نے دیا تھا۔

دادا مجھے سرحد تک چھوڑنے آیا۔ ''اچھا بیٹا! کہٹن کے بھائی! تمہیں اپنے وطن کی آزادی مبارک ہو! اپنے باپ کو میری مبارک باد دینا۔ کبھی کبھی اپنے بھائی کہٹن اور مجھے اپنی دعاؤں میں یاد کر لینا۔''

میں دادا سے اس احساس کے ساتھ رخصت ہوا کہ اس سے یہ میری آخری ملاقات ہے اور اب شاید کبھی میرا ان علاقوں اور ان لوگوں میں آنا نہ ہو جنھوں نے تنظیم کو حرب و ضرب کی قوت فراہم کی تھی اور تمام خطرات مول لے کر مجھے اور میرے ساتھیوں کو تحفظ فراہم کیا تھا۔

آگ اور خون کے سمندر سے گزرتا ہوا، میں اس کلکتے میں پہنچا جہاں ان دنوں انسانی لہو ارزاں تھا۔ آسام کی سرحدوں سے کلکتے تک میں نے سفر میں ہر طرف ابلیس کو رقص کرتے دیکھا، ان انسانوں کو دیکھا جن کی آزادی کے لیے ہم جدوجہد کر رہے تھے۔ وہ سب ایک دوسرے کے دشمن تھے، ایک دوسرے کے خون کے پیا ے تھے۔ انہیں اپنی دشمنی میں پھول جیسے بچوں پر نہ پیار آتا نہ نازک کومل سی عورتوں پر رحم آتا تھا، نہ بوڑھوں اور معذوروں پر وہ ترس کھاتے تھے۔ انسان، اپنی تمام حسین خصوصیات کھو بیٹھا تھا۔ اب وہ ایک وحشی اور خون خوار، سفاک اور بے رحم درندہ تھا۔ کاش کوئی ایسی بھی تنظیم ہو جو انسان کو اس کے اس وحشی روپ سے نجات دلانے کے لیے قائم ہو۔ کاش کوئی ایسی تنظیم قائم ہو کہ انسان کو درجۂ انسانیت پر فائز کر سکے۔ میں یہی سوچتا ہوا اور خون کے آنسو روتا ہوا سفر کرتا رہا۔

میں عین اس دن کلکتے پہنچا جس دن تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان ہوا تھا۔ مہندر

میرا منتظر تھا اور اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا تھا۔ تقسیم ہند کے منصوبے کی خبر ہم دونوں نے ریڈیو پر سنی تھی اور ایک دوسرے سے گلے مل کر خوب روئے تھے اور مبارکباد بھی دی تھی۔ یہ بہ یک وقت خوشی اور غم کا موقع تھا۔ خوشی اس بات کی کہ برصغیر کو انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ سے نجات ملی تھی، غم اس بات کا کہ ایک ملک تقسیم ہو گیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی خبر تھی، ایک بہت بڑی خوش خبری تھی، ایک ایسی منزل تھی جس تک پہنچنے کے لیے ہندوستان نے دو صدیوں کا سفر کیا تھا اور منزل پر پہنچنے والے آپس میں دست و گریباں تھے۔

''آزادی مل رہی ہے شیرازی!'' مہندر نے کہا۔ ''مگر یہ کیسی آزادی ہے جی اندر ہی اندر ڈر رہا ہے۔ میں جانتا ہوں شیرازی، ہندوستان، ہندوؤں کی اپنی تنگ دلی سے تقسیم ہوا ہے۔ وہ ہندوستان کی مکمل حکمرانی چاہتے ہیں۔ وہ اختیارات میں مسلمانوں کو حصہ نہیں دینا چاہتے وہ ہندوستان کو انسانوں کا نہیں صرف ہندوؤں کا وطن بنانا چاہتے ہیں۔''

''آدمی جب مذہب کی بنیاد پر انسان دشمنی کو اپنا مسلک بنا لے تو ایسے ہی عظیم المیے جنم لیتے ہیں۔'' میں نے کہا تھا۔

''سالار سچ کہتے تھے۔ میں قدم قدم پر مایوس ہوا ہوں۔ تنظیم سے علیحدگی کے بعد میں نے یہی محسوس کیا کہ یہاں کوئی بھی انسانوں کے بارے میں انسانی بنیاد اور انسانی سطح پر سوچنے کے لئے تیار نہیں۔''

تب اچانک مجھے سشما کا خیال آیا تھا۔ ''یہ میری بھابی، سشما کہاں ہیں؟''

''وہ یہاں میرے دل میں!'' مہندر نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا، پھر سر پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور یہاں میرے ذہن میں!''

''کیا مطلب؟'' میں نے سہم کر پوچھا۔ ''کیا کہہ رہے ہو؟''

''تمہیں وہ رات یاد ہو گی جب مچھوا بازار میں تنظیم کے مستقر پر چھاپا پڑا تھا۔'' مہندر نے کہا۔ ''وہ چھاپا سشما کی مخبری پر پڑا تھا۔ اس رات جب میں تمہارے ساتھ سالار کے کمرے میں گیا تو سشما دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہو گئی تھی کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ میں اس ملاقات میں سالار کو تنظیم چھوڑنے کے متعلق اپنے فیصلے سے آگاہ کرنے والا ہوں۔ دوران گفتگو میں جب اس نے سالار کا یہ جملہ سنا کہ تنظیم سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا اور پھر سالار کا یہ حکم سنا کہ میں صبح ناشتہ انہی کے ساتھ کروں تو وہ گھبرا گئی۔ اس نے سمجھا

کہ سالار نے صبح تک مجھے ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کرلیا ہے اس لیے وہ فوراً ہی وہاں سے چلی گئی اور کسی نہ کسی طرح اس نے پولیس کو ہمارے بارے میں اطلاع دے دی۔ میں وہاں پہنچا تو سشما مجھے نہیں ملی تھی، وہ اپنی سہیلی کے ساتھ چلی گئی تھی اور مجھ سے وہیں انتظار کرنے کے لیے کہہ گئی تھی۔'' مہندر دھیمے غم انگیز لہجے میں کہتا رہا۔ پھر وہ اچانک کہیں گم ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا۔ ''وہ رات گئے واپس آئی تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ سالار مجھے وہاں سے زندہ نکلنے دیں گے۔ اس نے اپنی سہیلی سے مل کر ایسا انتظام کیا تھا کہ میں نہ پکڑا جاؤں۔ اس کی سہیلی کے والد اس علاقے کے ڈی ایس پی تھے۔ پھر باتوں ہی باتوں میں اس کی سہیلی نے مجھے بتا دیا کہ سشما کیا کر چکی ہے۔ جب مجھے یہ پتا چلا تو میں اندھا دھند وہاں سے مچھوا بازار پہنچا تھا، عین اس وقت جب کہ پولیس چھاپا مار چکی تھی۔''

''پھر کیا ہوا؟''

''پھر وہی ہوا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔''

''کیا کیا تھا تم نے؟'' میں نے تمام اندیشوں کے ساتھ پوچھا۔

''سشما تنظیم کی مخبری کرنے والوں کے انجام سے دوچار ہوئی۔ یہ سزا خود میں نے اسے دی تھی۔''

''نہیں...... نہیں، مہندر!...... نہیں!'' میں چیخا مگر حقیقت اگر میرے چیخنے سے بدل سکتی تو میں آج تک مسلسل چیختا ہی رہتا۔ ''تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا مہندر! سشما نے جو کچھ کیا تھا، صرف تمہارے لیے کیا تھا۔''

''سالار نے کہا تھا......'' مہندر گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''تنظیم میں داخل ہونے والے اپنی انفرادی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ ایک بڑی مشین کے کل پرزے بن جاتے ہیں جو اس مشین کو متحرک رکھتے ہیں، پرزہ خراب ہو جاتا ہے تو اسے بدلنا ہی پڑتا ہے، سو میں نے ایسا ہی کیا۔''

''اور آج تک تم اس کی یاد دل میں بسائے بیٹھے ہو۔'' میں نے کہا اور ریڈیو پر رکھی ہوئی سشما کی تصویر کو دیکھنے لگا۔ میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

''اس دل پر میرا اختیار نہیں ہے۔'' مہندر نے کہا۔

مہندر نے بتایا تھا کہ ملک بھر میں خونی فرقہ وارانہ فسادات کے بعد تنظیم کے کارکنوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے اپنے عزیزوں کے پاس چلے جائیں۔ اسے خالد شکرے

نے اطلاع دی تھی کہ میں اس کے پاس پہنچنے والا ہوں لہٰذا وہ کلکتے میں میرا انتظار کرے۔ ''اس دنیا میں اب تمہارے سوا کوئی ایسا نہیں جسے میں مروجہ معنوں میں اپنا عزیز کہہ سکوں اس لیے میں تمہارا یہیں انتظار کر رہا ہوں۔''

کلکتے سے میں نے ہرکرن ناتھ مصرا، چودھری خلیق الزماں، خان بہادر اور منصور سبھی کو تار دیے تھے لیکن پورا ہفتہ گزر جانے کے باوجود کہیں سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ ڈاک، تار اور مواصلات کا نظام گڑبڑ تھا۔ میں نے پھر لکھنؤ چلنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ مہندر بھی میرے ساتھ تھا۔

آگ، خون، آہوں، کراہوں، شور وشغب اور تباہی و بربادی کے مناظر دیکھتے ہوئے، ہم ایک ہفتے بعد بہ مشکل تمام لکھنؤ پہنچے، اجاڑ اور ویران لکھنؤ میں! محبت اور اخوت کی وہ فضا جو لکھنؤ کو لکھنؤ بناتی تھی، اب اس کی جگہ خوف اور دہشت نے لے لی تھی۔ میں منصور کے گھر گیا۔ اس کے گھر والے گھر چھوڑ کر جا چکے تھے۔ میرے گھر میں سوائے بابا کے کوئی نہ تھا۔ اس نے رو رو کر بتایا کہ منصور کے گھر والے لاہور چلے گئے ہیں کیوں کہ اب لکھنؤ میں مسلمانوں کا رہنا محال ہو گیا ہے۔ وہ لاہور کے اپنے ایک عزیز کا پتا دے گئے ہیں۔''

''بڑے صاحب؟'' میں نے سوال کیا۔

''بڑے صاحب چند دن ہوئے بمبئی سے یہاں آئے تھے، جب انہیں پتا چلا کہ منصور اور اس کے گھر والے لاہور چلے گئے ہیں تو وہ زیب بی بی کے لیے انہی کے پیچھے چلے گئے ہیں، مجھ سے کہہ گئے تھے کہ آفاق میاں آئیں تو میں انہیں بتا کے چلا جاؤں۔ میں کہاں جاؤں گا میاں! میرا کون ہے؟''

''بابا جی! میں بھی لاہور جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں زیب کے بغیر نہیں رہ سکتا میں وہاں پہنچ کر زیب کو تلاش کرنے کے بعد تمہیں بلا لوں گا۔''

''بڑے صاحب کہہ گئے تھے کہ آپ اس مکان کو خلیق صاحب کی نگرانی میں دے دیں۔''

اگلے دن ہی میں مہندر کے ساتھ وہاں سے چل دیا تھا۔ ٹرین میں ہرکرن ناتھ مصرا سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ خان بہادر جس گاڑی سے لاہور جا رہے تھے، اس پر دہلی سے قبل حملہ ہوا جس میں کئی افراد ہلاک اور زخمی ہوئے۔ ''زخمی ہونے والوں میں خان بہادر بھی شامل ہیں۔ میں انہی سے ملنے دہلی جا رہا ہوں۔''

دہلی کے ہسپتال میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ خان بہادر شیرازی تو دو دن بعد ہی وہاں سے جامع مسجد میں منتقل ہو گئے تھے جہاں دہلی کے خانماں برباد مسلمانوں نے پناہ لے رکھی تھی۔ یہاں ہرکرن ناتھ مصرا ہمیں چھوڑ کر واپس چلے گئے تھے۔ دہلی ان دنوں فسادات کی آگ میں جل رہا تھا۔ انسان نے انسانیت کو ننگا کر دیا تھا، اس کی حرمت اور عظمت کو پامال کر دیا تھا۔ میں اور مہندر وحشت و بربریت کے اس طوفان سے گزر کر جامع مسجد پہنچ گئے تھے۔ اس دوران میں ہمیں اپنا کچھ ہوش نہ تھا۔ جامع مسجد میں ہم نے خان بہادر کو بہت تلاش کیا مگر وہ نہ ملنے تھے نہ ملے۔ اسی دوران میں منصور کے ایک عزیز سے وہاں میری ملاقات ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ خان بہادر تین دن قبل وہاں سے چلے گئے تھے کیوں کہ یہاں یہ خبر پہنچی تھی کہ جس گاڑی سے منصور لاہور روانہ ہوا تھا، وہ امرتسر میں کاٹ دی گئی تھی۔ ''وہ زیب کے لیے بہت پریشان تھے۔ ہم نے انہیں بہت روکا کہ وہ زخمی ہیں۔ ان کے زخم خطرناک ہیں، ابھی انہیں یہاں سے نہیں جانا چاہیے مگر وہ نہ مانے وہ یہی کہتے تھے۔ میں نہیں رک سکتا۔ میرے سب بیٹے بچھڑ گئے ہیں، میرا آفاق پتا نہیں کہاں ہے! میں زیب کو تلاش کروں گا، کہیں وہ بھی مجھ سے نہ چھن جائے۔''

منصور کے عزیز نے مزید بتایا۔ ''ان کے سر میں شدید زخم آئے ہیں جس کی وجہ سے ان کا ذہنی توازن بھی کچھ خراب ہو گیا ہے۔ کبھی وہ ہوش مندوں کی طرح باتیں کرتے ہیں، کبھی پاگل پن کا دورہ پڑتا ہے اور نہ معلوم کیا کیا باتیں کرتے رہتے ہیں۔''

وقت نے کیا کیا کروٹیں لی تھیں۔ وہ خان بہادر جنہیں اپنے بیٹے اور بیٹی سے زیادہ اپنی خان بہادری عزیز تھی، لاٹ بہادر کے راج کے خاتمے کے ساتھ ہی پھر اپنوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ آج پھر انہیں اپنا بیٹا اور بیٹی یاد آ رہے تھے۔ آج وہ خان بہادر جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے، اپنی بیٹی کی تلاش میں ایک عام آدمی کی طرح محض ایک باپ بن کر خاک چھانتے پھر رہے تھے۔

دہلی کے فسادات اتنے شدید تھے کہ ہم بس جامع مسجد میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔
ایک دن میں نے لالی کو بھی چند لٹے پٹے افراد کے ساتھ اسی جامع مسجد میں پناہ کے لئے آتے دیکھا تھا۔ ہاں، وہ لالی کی ہمشکل خان بہادر تصدق حسین کی بیٹی تھی جو اپنی ماں اور چند عزیزوں کے ساتھ مسجد میں داخل ہوئی تھی۔ پتا چلا تھا کہ خان بہادر تصدق حسین کی حویلی پر بلوائیوں نے حملہ کر دیا تھا۔ اس حملے میں تصدق حسین مارا گیا تھا۔ اس کی بیٹی اور بیوی کسی نہ کسی طرح وہاں سے بچ کر نکل آئی تھیں۔ یہاں میں نے ان سے ملاقات کی۔ وہ

ہمیں پہچان گئیں اور سوائے پھوٹ پھوٹ کر رونے کے کچھ نہ کر سکیں۔

ایک ماہ وہاں محصور رہنے کے بعد ایک دن میں نے اور مہندر نے وہاں سے ہر قیمت پر نکل جانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ ہم کس طرح وہاں سے نکلے اور کس طرح بیل گاڑی سے اٹاری پہنچے۔ یہ ایک دل خراش داستان ہے۔ کئی جگہ ہماری بیل گاڑی کو آگے بڑھنے کے لیے لاشوں پر سے گزرنا پڑا تھا۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ سفر کتنا ہولناک رہا ہو گا اور انسان نے انسان پر کتنے مظالم کیے ہوں گے۔

کیسا عجیب اتفاق تھا کہ میں نے اپنی انقلابی زندگی کا پہلا سفر تقریباً ربع صدی قبل بیل گاڑی میں لیا تھا اور اپنی انقلابی زندگی کا اختتامی سفر بھی بیل گاڑی میں ہی کیا۔

کتنا عجیب سفر تھا، چلے تو دوپہر تھی، منزل پر پہنچے تو شام ہو چکی تھی، سورج غروب ہو رہا تھا۔

اس طوفانی سفر کا آغاز ہم نے ''جان بیٹا خلافت پہ دے دو۔'' کی پُرسوز لے کے سائے میں لیا اور یہ سفر ''لے کے رہیں گے پاکستان، بٹ کے رہے گا ہندوستان'' کی رزمیہ دُھن کی تعبیر کے موقع پر اختتام کو پہنچا تھا۔ ہم پچیس برس پہلے اپنے بدترین سامراجی دشمن اور نوآبادیاتی آقا پر ضرب کاری کا عزم جواں لے کر نکلے تھے اور منزل پر پہنچے تو آزادی کے زخموں سے چور تھے۔ ہم نے جوانی کی دوپہر میں کوچ کیا تھا اور بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچے تو منزل آئی تھی۔

ربع صدی کا یہ طوفانی سفر، ہم مڑ کر دیکھتے تو کل ہی کی بات لگتی تھی۔

اٹاری، پنجاب کا وہ شہر تھا جو تقسیم ہند کے منصوبے کے مطابق پاکستان میں شامل ہونے والا تھا۔ لاہور امرتسر ریلوے لائن پر یہ پہلا پاکستانی اسٹیشن تھا۔ یہ چھوٹا سا قصبہ ہندوستان کی طرف سے لٹ پٹ کر آنے والے مہاجروں کے لیے پاکستان میں مہینوں تک پہلا پڑاؤ بنا رہا۔

یہ چودہ اگست کا دن تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

اسٹیشن کے آس پاس میدان میں آزادی کے خون ریز سیلاب میں تنکوں کی طرح بہہ کر آنے والے شکستہ حال انسانوں نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ مجھے یوں لگا تھا کہ زمین سے زرد جھاڑیوں کی بجائے انسان نکل پڑے ہیں۔

ہم نے اپنی بیل گاڑی اسٹیشن کے پاس ہی دیوار کے ساتھ روک دی۔ راستے میں ہم نے ایک مختصر سے خاندان کو جو میاں بیوی اور دو بچوں پر مشتمل تھا، اپنی گاڑی میں بٹھا لیا

تھا۔ اسے ہم بیل گاڑی کے پاس ہی چھوڑ کر خانماں بربادوں کی اس عارضی بستی کا چکر لگانے کے لیے نکل پڑے۔

وہ سب شکستہ حال تھے، خاک بہ سر تھے، زخمی اور نڈھال تھے۔ انہوں نے آزادی کی بڑی بھاری قیمت دی تھی۔ ان سے مطالبۂ پاکستان کی بڑی بھاری قیمت لی گئی تھی۔ جان، مال، عزت، آبرو، سبھی کچھ ان سے چھین لیا گیا تھا۔ پھر بھی وہ خوش تھے کہ سب کچھ لٹا کر پاک سرزمین پر پہنچ گئے تھے۔ ان میں بے حد جوش وخروش تھا کیوں کہ اس رات قیام پاکستان کا باضابطہ اعلان ہونے والا تھا۔ ''پاکستان زندہ باد'' کے نعرے لگ رہے تھے۔

''ان کا جرم کیا ہے آفاق؟'' مہندر نے کہا۔ ''صرف یہی نا کہ انہیں نے بھی اپنی آزادی طلب کی تھی لیکن ان لوگوں نے جو صدیوں سے ان کے ساتھ تھے، جو خود آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے، ان لوگوں کے ساتھ وہی سلوک کیا جو انگریز دو سو برس سے تمام ہندوستان کے عوام کے ساتھ کرتا آ رہا تھا۔ مجھے بتاؤ آفاق، لوگ اصولوں کو اتنا توڑتے مروڑتے کیوں ہیں! مجھے بتاؤ کہ وہ جو غالب ہوتے ہیں، طاقت ور ہوتے ہیں، اتنے تنگ دل کیوں ہو جاتے ہیں؟''

میں کیا جواب دیتا، میں خاموش رہا۔

رات گیارہ بجے سے ہی اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بڑا ہجوم تھا۔ اسٹیشن ماسٹر اپنا ریڈیو نکال لایا تھا اور سب لوگ قیام پاکستان کا اعلان سننے کے لیے بے تاب تھے۔

میں اور مہندر بھی اسی بھیڑ میں شامل تھے۔ ہمارے ساتھ ہی ایک خستہ حال اور نحیف بوڑھا کھڑا تھا۔ اس کے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں وہ بار بار ہمارے درمیان سے ہو کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر وہ اعلان ہوا۔

لوگوں میں بے پایاں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ کچھ من چلوں نے خوشی کے اس موقع کو شایان شان طریقے پر منانے کے لیے پٹاخوں کا انتظام کیا تھا۔

پھر لوگوں نے رقص شروع کیا اور اس دوران میں ہجوم جو پیچھے ہٹا تو ہم دور تک اس کے ریلے میں بہہ گئے۔ اس دوران میں ایک انسانی چیخ ابھری، پھر وہ چیخ کئی چیخوں میں بدل گئی۔

میں اور مہندر تیزی سے ادھر لپکے۔ یہ وہی بوڑھا تھا جو ہجوم کے مسرت سے بے قابو ہونے کی وجہ سے لڑکھڑا کر گرا تھا اور لوگوں کے قدموں میں روندا گیا تھا۔

لوگوں کو ہٹاتے ہوئے ہم اس کے پاس پہنچے، اس کے سر کی پٹیوں سے خون بہنے لگا تھا۔ ہم اسے اٹھا کر پلیٹ فارم کے ایک کونے پر لے آئے۔

بوڑھا نیم بے ہوش تھا۔ اس کے سر اور سینے سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی بغل میں اب بھی ایک گٹھری تھی۔ ہم نے وہ گٹھری لینا چاہی تو اس نے جھڑک دیا۔ ''نہیں، یہ نہیں لو۔''

یہ آواز میرے لیے ایک مانوس آواز تھی۔ یہ آواز میرے والد کی آواز تھی جنہیں میں ان کے بڑھاپے اور چہرے پر بڑھی ہوئی داڑھی کی وجہ سے نہیں پہچان سکا تھا۔ میں کوئی بیس سال بعد انہیں دیکھ رہا تھا۔

''ابا جی!'' میں نے کہا۔ ''یہ میں ہوں آفاق۔''

''آفاق!'' خان بہادر شیرازی نے کہا۔ ''آفاق میرے بیٹے! تو کہاں تھا؟ زیب، میری زیب!'' یہ کہہ کر وہ بے ہوش ہو گئے۔

''تو کیا یہ تمہارے والد؟'' مہندر نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے کہا۔

مگر تھوڑی ہی دیر بعد وہ پھر کراہ اٹھے۔ ''آفاق! میں نے معلوم کیا تھا۔ ابھی اس اسٹیشن سے یونین جیک اتار کر سبز ہلالی پرچم لہرایا جائے گا۔ میں وہ منظر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

مجھے ان کی زبان سے یہ بات سن کر حیرت تو ہوئی مگر ہم انہیں اٹھا کر ایسی جگہ لے آئے جہاں سے اناری اسٹیشن کی چھت پر لہراتا ہوا یونین جیک نظر آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی آہستہ آہستہ یونین جیک نیچے کھسکتا چلا آیا۔ میں نے غور سے اپنے والد کے چہرے کو دیکھا، ان کی آنکھوں میں چمک عود کر آئی تھی۔ ان پر سخت نقاہت طاری تھی لیکن وہ اپنی تمام قوت مجتمع کر کے خود کو ہوش وحواس میں رکھنے کی جدوجہد کر رہے تھے۔

پھر یونین جیک کی جگہ سبز ہلالی پرچم بلند ہوا اور لہرانے لگا۔

''پاکستان!'' ایک صدا لگی۔

''زندہ باد!'' جواب آیا۔

زندہ باد کے اس پُرزور جواب میں میرے والد کی نحیف آواز بھی شامل تھی۔

ہماری کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔ مہاجروں کے اس عارضی کیمپ میں ایک بھی ڈاکٹر نہیں تھا۔ ہم کچھ بھی نہ کر سکتے تھے سوائے اس کے کہ ہم ان کے پاس بیٹھے رہیں۔

رات کے پچھلے پہر انہیں تھوڑی دیر کے لیے ہوش آیا۔ ''آفاق بیٹا! منصورا بھی

لاہور نہیں پہنچا۔ اس کے عزیزوں نے بتایا ہے کہ وہ ابھی ہندوستان میں ہے۔'' خان بہادر شیرازی نے کہا۔

''میں ہندوستان میں اسے تلاش کروں گا۔ زیب آپ تک پہنچ جائے گی۔''

''یہ مہندر ہے ابا! میرا دوست!'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''میں جانتا ہوں، سیٹھ وشواناتھ کا بیٹا مہندر! سیٹھ وشواناتھ بھی میرا بڑا گہرا اور بڑا عظیم دوست تھا۔'' خان بہادر شیرازی نے اٹک اٹک کر کہا۔ ''تم دونوں یوں ہی میرے پاس بیٹھے رہو میں تمہیں جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وہ دیر تک ہمیں دیکھا کیے، ہمارے ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھے۔ پھر ہمارے ہاتھوں پر ان کی گرفت مضبوط ہوگئی۔ ''خدا حافظ!'' ان کے منہ سے نکلا اور وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئے۔

صبح جب ان کی تدفین کی تیاریاں ہورہی تھیں تو ہم پر ایک اور انکشاف ہوا۔

خان بہادر شیرازی کے دائیں بازو پر ہماری تنظیم کے بہت سے اراکین کے نام گدے ہوئے تھے۔ مہندر نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا، ان ناموں کے نیچے زخم کا ایک سیاہ نشان تھا۔

میں نے تیزی سے ان کی قمیص ہٹا کر ان کا سینہ دیکھا۔ ان کے سینے پر لالی کا نام گدا ہوا تھا۔

اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میں واقعی یتیم ہوگیا ہوں۔

پھر میں اور مہندر پہلی مرتبہ خان بہادر کی موت پر پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے اس لیے کہ وہ ہمارا سالارِ اعظم بھی تھا۔

اگلے روز شام ڈھلے میں مہندر کو رخصت کر رہا تھا جو واپس ہندوستان جا رہا تھا۔

☆====== ختم شد ======☆